ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

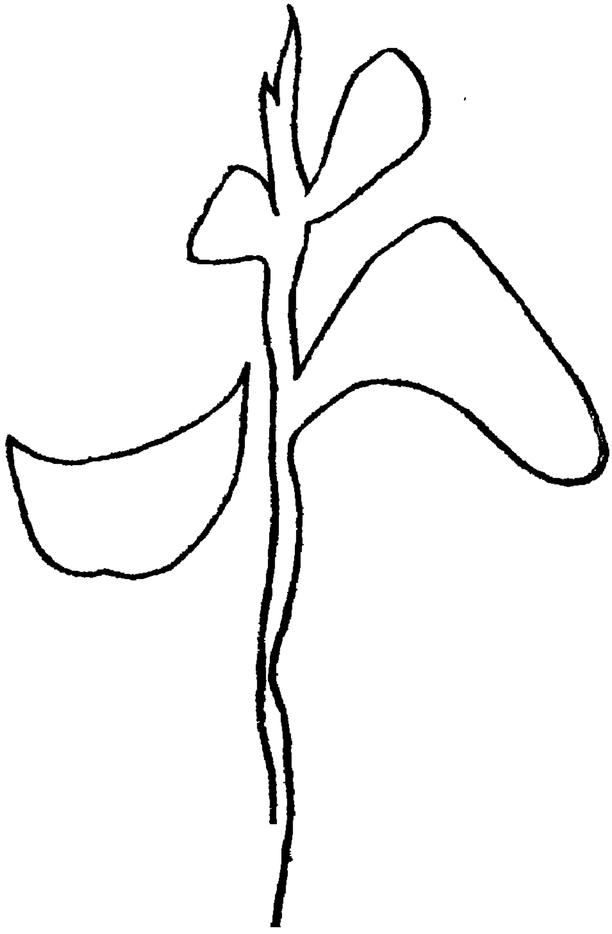
# DUE DATE

*Cl. No.* ______________ *Acc. No.* 86090

Late Fine Ordinary books 25p. per day, Text Book Re 1 per day, Over night book Re 1 per day.


| | | | |
|---|---|---|---|
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |
| | | | |

# ادارہ ادبیات اردو



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سن اجرائ ۱۹۳۸ء فون : ۳۸۴۴۶۹

# ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵ شمارہ : ۱ جنوری ۱۹۸۶ء

مدیر اعزازی : مغنی تبسم
شریک مدیر : محمد منظور احمد
معاون مدیر : وقار خلیل

مجلس مشاورت :
صدر : حامد علی عباسی نائب صدر : ہاشم علی اختر
معتمد : پروفیسر مغنی تبسم

## ارکان

عابد علی خاں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ۔ محمد اکبر الدین صدیقی ۔ پروفیسر سراج الدین ۔ محمد منظور احمد

قیمت فی پرچہ : ۲ روپے ۵۰ پیسے
سالانہ : ۲۰ روپے کتب خانوں سے : ۲۵ روپے

بیرونی ممالک سے :

ہوائی ڈاک سے
مشرق وسطیٰ : ۱۵ ڈالر
امریکہ : ۲۰ ڈالر
پاکستان/برما/سیلون : ۱۰ ڈالر
انگلستان : ۸ پونڈ

بحری ڈاک سے :
۶ ڈالر
۷ ڈالر
۴ ڈالر
۳½ پونڈ

سن رائج سکینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار مینار میں چھپوا کر پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۸۲ سے شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ :

ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

کتابت : اقبال

# مشمولات



SV02

Accession Number
86090
Date 21 · 12...

# اپنی بات

'ادارۂ ادبیاتِ اردو' نے 'حیدرآباد دیدہ و شنیدہ' کے نام سے ایک دلچسپ اور مفید سلسلہ شروع کیا ہے جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ایسے اصحاب کو اپنے تاثرات پیش کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے جنھوں نے قدیم حیدرآباد کی زندگی اور تہذیب کا مشاہدہ کیا ہے یا اپنے بزرگوں سے سُنی ہوئی باتیں ان کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔ ماہِ نومبر ۱۹۸۵ء میں یومِ زورؔ کا ادبی اجلاس اسی موضوع کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اس طرح کے جلسے آیندہ بھی منعقد کیے جائیں گے۔ ان میں پڑھے گئے مضامین اور تقریروں کے اقتباسات ہم سلسلہ وار 'سب رس' میں شائع کریں گے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی جناب حسن الدین احمد صاحب کا مضمون شاملِ اشاعت ہے۔

ماہِ دسمبر ۸۵ء میں پروفیسر حمید الدین شاہد اور جناب اعجاز حسین کھٹّا کراچی سے حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ ان کے اعزاز میں بہت سے تہذیبی اور علمی اداروں نے تہنیتی جلسے منعقد کیے۔ پروفیسر حمید الدین شاہد کے خیرمقدم کے لیے ایک جلسہ ایوانِ اردو میں منعقد کیا گیا تھا۔ پروفیسر شاہد ڈاکٹر زورؔ کے خاص رفیقِ کار رہ چکے ہیں۔ 'سب رس' کی مجلسِ ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ ادارے سے ان کی وابستگی اتنی گہری تھی کہ پاکستان جانے کے بعد وہاں انھوں نے "ایوانِ اُردو" قائم کیا اور ماہنامہ "سب رس" جاری کیا۔ اس شمارے میں ان کے دیرینہ رفیق جناب رشید قریشی کا لکھا ہوا خاکہ شائع کر رہے ہیں۔

اُردو کے ممتاز شاعر ڈاکٹر شہریار ماہِ اکتوبر میں پیرس میں منعقدہ فسٹیول آف انڈیا میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شعرا کے ساتھ اردو کے نمایندہ کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ وہاں سے وہ لندن گئے۔ لندن سے لوٹنے کے بعد امریکہ میں انھیں مدعو کیا گیا۔ انھوں نے واشنگٹن، سان فرانسسکو، شکاگو، اٹلانٹا، بوسٹن، اور نیویارک میں مشاعرے پڑھے۔ ادبی سنگم نیویارک نے ان کی ادبی خدمات کے

ڈاکٹر انور سدید

# وجودیت کی تحریک

وجودیت اگرچہ بیسویں صدی کی ایک اہم تحریک ہے تاہم اس کے لیے زمین انیسویں صدی میں ہی تیار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی درحقیقت تجسس اور اضطراب کی صدی تھی۔ اور اس صدی میں انسان زندگی، عقل، معاشرہ اور اخلاق کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ چنانچہ جب وہ نقطۂ انجام پر پہنچتا اور مسئلے کے گرد نور کا سنہری ہالہ ابھرنے لگتا تو یہ اچانک الجھ جاتا اور مسئلہ حساب کے سوال کی طرح لاینحل ہو کر رہ جاتا۔ ہربرٹ اسپنسر نے زندگی کے داخلی اور خارجی رشتوں کی اہمیت واضح کی اور ان کے ربطِ باہم کو زندگی کے ارتقائے مسلسل کا نام دے دیا۔[1] ڈارون نے اس ارتقائے مسلسل کا ابتدائی سرا بندر میں تلاش کیا اور یوں اس اشرف المخلوقات کو جو نیابتِ الٰہی کا دعوے دار تھا، آسمانی مسند سے اتار کر جانوروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ ہیگل نے زندگی کو جدلیاتی تحریک سے تعبیر کیا اور عمل کی ہر قوت کے لیے ردِّ عمل کی ایک مخالف قوت کی موجودگی اور ان کے تصادم پر زور دیا۔ ہیگل کے مطابق نئی تعمیر اس تصادم کے بعد ہی ظہور میں آ سکتی ہے۔[2] یوں انسان کی تمام تر توجہ زندگی کے خارجی زاویے کی طرف مڑ گئی لیکن درحقیقت وہ اپنی روح سے کٹا نہیں تھا اور ایک اضطراب زیرِ سطح کلبلاہٹ پیدا کر رہا تھا۔

۱۸۴۱ء میں جب شیلنگ نے برلن یونیورسٹی میں ہیگل کے نظریات کو نشانۂ تنقید بنایا تو اس کے سامعین میں اینگلز (ENGELS)، بکونن (BAKUNIN)، برکہارٹ (BURCKHARDT) اور

---

1. HERBERT SPENCER – PRINCIPLE OF BIOLOGY PAGE-290
2. WILL DURANT – THE STORY OF PHILOSOPHY PAGE-295

اور کیرکے گور بھی شامل تھے۔ اگرچہ شیلنگ تجریدی صداقت اور مطلق صداقت میں ربطِ باہم
تلاش نہ کرسکا تاہم اس نے ہیگل کی جدلیات اور نظامِ عقل پر شدید حملے کیے اور اس کے
نظریات سے کیرکے گور کو سوچ کی ایک نئی سمت مل گئی اور اس نے انیسویں صدی کے فرد کے
ذہنی انتشار پر نئے زاویے سے غور و فکر کرنا شروع کردیا۔ سائنس کی نئی دریافتوں نے
قوت کا نیا ذخیرہ ہی دریافت نہیں کیا تھا بلکہ ٹھوس مادے کے تجزیے سے بوتل میں چھپے ہوئے
جن کو بھی باہر نکال دیا تھا۔ نٹشے نے اس قوت کو انسان کے داخل میں موجود پایا اور اس مخزن تک
نفسیات کے ایسے وسیلے سے رسائی حاصل کی جس کی سائنس ابھی تک نادریافت پڑی تھی۔
نٹشے کو بالعموم فرائڈ، ایڈلر اور ژونگ کا پیش رو قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ نظر انداز کردیا جاتا ہے
کہ نٹشے سے قریباً چالیس سال قبل کیرکے گور نے انسان کے شعور کا تجزیہ کیا۔ اس کے داخل
اور خارج کی ماہیت دریافت کی اور فرد کی مجروح، ریزہ ریزہ شخصیت کو موضوعِ گفتگو بنایا
اور ذہنِ انسانی کو ناامیدی، بے یقینی اور عدمِ اعتماد کے بحران سے نجات دلاکر اپنی ذات میں یقین کا
پیدا کرنے کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ کیرکے گور وہ پہلا مفکر ہے جس نے خیر و شر کی ثنویت کو
ختم کرکے انسان کے وجود کو اہمیت دی اور اسے ناموجود کے برعکس زندگی کے موجود کی طرف
متوجہ ہونے کا سبق دیا۔ اسباب و علل کے مروّجہ فلسفے میں کیرکے گور کی یہ آواز اعتمادِ ذات
کی ایک اہم آواز تھی۔ چنانچہ اس نے دعویٰ کیا کہ وجود جوہر پر فوقیت رکھتا ہے۔ ارادہ فہم پر
حاوی ہے اور آدمی اس کے سوا کچھ نہیں جو وہ خود کو بناتا ہے۔

کیرکے گور کے نظریات میں ان یونانی حکماء کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے جنھوں نے
سب سے پہلے "میں ہوں" کو تسلیم کیا۔ عقلی معروضیت کے خلاف اوّلین آواز اٹھائی اور "اپنے آپ
کو پہچانو" کا قول اخذ کیا اور اس قول کو ڈلفی مندر کے صدر دروازے پر آویزاں کردیا کہ بندگانِ
عالم اپنی کھوئی ہوئی ہستی کو تلاش کرلیں۔ حکیم فیثاغورث کی طرح سقراط نے بھی مظاہر کی دنیا کو
اہمیت نہ دی اور اقدار کے نظام کو زیادہ قوی قرار دیا۔ رواقیوں اور نو افلاطونیوں نے اس
روحانیت کو زندہ رکھنے کی کوشش کی اور اقدار سازی کے لیے انسان کو محرک قوت قرار دیا۔

---

PAUL TILLICH – EXISTENTIAL PHILOSOPHY PAGE, 32

POLO MAY – EXISTENCE PAGE, 23

پاسکل (PASCAL) نے انسان کی توجہ کوپرنیکس کے نظریات سے ہٹائی اور اسے روح اور جسم فنا اور بقا کے تصورات پر غور کرنے کی تلقین کی۔ یہاں صاف نظر آتا ہے کہ پاسکل وجود کی اساسی اتفاقیت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو ہی حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ڈیکارٹ نے تو اپنی ہستی کا ادراک عقل سے کیا اور کہا "میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں" لیکن پاسکل نے اس کے دوسرے رخ کو اہمیت دی اور کہا "میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں"۔ وجودیت کے ان نظریات کا مبہم سا پرتو ولیم بلیک کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے اور بقول پروفیسر صفی الدین [illegible] "بعض حالیہ کتب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے مشہور شاعر اور نقاد کارنٹ [illegible] وجودی فلسفے کے بانی کیرکے گور کے نظریات کی پیش گوئی کی تھی"[۵]

وجودیت کے یہ سب نظریات دو آثار بکھری ہوئی منتشر صورت میں تو نظر آجاتے ہیں لیکن ان سے ایک مرتب فلسفہ سامنے نہیں آتا۔ کیرکے گور نے ان نظریات کو پہلی مرتبہ فلسفے کا منظم استدلال عطا کیا۔ وجودیت نے عقل کی مطلق العنان حکمرانی اور معروضی سوچ کو مہمل قرار دے دیا اور ہیگل کے فلسفے کے خلاف ایک ایسی آواز بن کر ابھری جو محض تصوراتی منطق نہیں تھی بلکہ "وجود" کو نظام کائنات میں افضل ترین مقام دینے کی ایک تحریک بھی تھی۔[۶]

وجودی فلسفے کے مفکر دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سے کیرکے گور، جبریل مارسل (GABRIEL MARCEL)، رین ہولڈ نائیبر (REINHOLD NIEBURE) رچرڈ کرونر (RICHARD KRONER) اور ٹلیش (TILLISH) کا رجحان زیادہ تر مذہب کی طرف تھا۔ دوسری طرف ژاں پال سارتر (ZAN PAUL SARTRE) اور مارٹن ہیڈیگر (MARTIN HEIDEGGER) ایسے وجودیت پسند ہیں جنھوں نے اپنے نظام فلسفہ سے خالق کائنات کی موجودگی کو بے ضرورت قرار دیا اور صرف فرد کے وجود کو اہمیت دی جو افعال کا فی نفسہ خالق اور اپنی تقدیر کا کارساز ہے۔ فرد کی اس اہمیت کا تذکرہ یوں تو کیرکے گور کے علاوہ نطشے، ہیڈیگر، یاسپرز، دستوئیفسکی، کرکے، کافکا سب کے یہاں نظر آتا ہے لیکن سارتر نے [illegible] فرانسیسی مزاج کی روح سمو دی اور اس سے وہ کام لیا جس سے زندگی، ادب اور فن کے شعبے متاثر ہوئے۔

---

۵ پروفیسر صفی الدین صدیقی۔ "وجودیت" ادبی دنیا دور پنجم شمارہ ۵ صفحہ ۲۲۳

سارتر نے بنیادی طور پر یہ نکتہ اٹھایا کہ جب وجود ماہیت پر مقدم ہے تو موضوعیت (SUBJECTIVITY) کو نقطۂ آغاز کیوں مانا جائے؟ صنّاع جب کسی شئے کو تخلیق کرتا ہے تو اس سے پہلے اس شئے کا تصور، تخلیق سے تکمیل تک پہنچانے کے مراحل اور اس کا افادی تصور کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر جب خدا تخلیق کرتا ہے تو وہ بھی جانتا ہے کہ کیا تخلیق کر رہا ہے اس طرح انسان کی تخلیق سے پہلے انسان کا تصور خدا کے ذہن میں موجود ہے اور یہی تصور انسان کے وجود کو اس کے خالق پر فوقیت عطا کرتا ہے۔ چنانچہ سارتر یہ نتیجہ نکالا کہ اگر خدا موجود نہ ہو تب بھی ایک ذات BEING ایسی رہ جاتی ہے جس کا وجود ایک لازمی حقیقت ہوگا۔ ہائیڈگر نے اسے انسانی حقیقت (HUMAN REALITY) کا نام دیا۔ چنانچہ کائنات کا تمام منظر آدمی کی شہادت ہے۔ آدمی خود ہی عمارت ہے اور خود ہی معمار۔ پس آدمی کا ارادہ (WILL) اس علامت (IMAGE) کی تشکیل کرتا ہے جو ہر عہد کے ہر فرد بشر پر پوری اترتی ہے۹۔ اس طرح وجودی فلسفہ صرف فردِ واحد کی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ اس کی ذمہ داری کا دائرہ مزید وسعت اختیار کرتا ہے اور وہ اپنی ذات میں بنی نوع انسان کو بھی شامل کر لیتا ہے اور یوں وہ اس کرب (ANGUISH) سے دوچار ہوتا ہے جو احساسِ ذمہ داری سے پیدا ہوتا ہے۔ کیرکے گور نے ذمہ داری کے اس احساس کو ایمان کے ساتھ متعلق کیا ہے اور اس مشکل کی نشاندہی کی ہے جس سے انسان دوچار ہو سکتا ہے۱۰۔

کیرکے گور نے اس کی اوّلیں مثال حضرت یعقوب میں تلاش کی جنھوں نے ایمان کی پختگی کی وجہ سے بیٹے کی جدائی کا کرب برداشت کیا۔ دوسری مثال حضرت ابراہیمؑ کی ہے۔ جنھوں نے بیٹے کی قربانی پیش کرنے سے گریز نہ کیا حالاں کہ انھیں اعتماد تھا کہ خدا ان کے بیٹے سے زندگی نہیں چھینے گا۔ ان دونوں مثالوں میں چوں کہ انسانی عمل کا ایک زاویہ آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے اس لیے تناقضِ مطلق (ABSOLUTS PARADOX) پیدا ہو جاتا ہے

---

۷ ڈاکٹر جمیل جالبی ادب اور تنقید صفحہ ۳۶۹

۸ H.J. BLACKHAM _ SIX EXISTENTIALIST THINKERS _ PAGE, 92

۹ J.P. SARTRE _ BEING AND NOTHINGNESS

۱۰ ممتاز احمد ۔ وجودیت منظر و پس منظر ۔ فنون جولائی اگست ۱۹۶۶ء صفحہ ۹۸

اور پیغمبرانِ خدا کو بھی کرب کی شدید ترین اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ یہ شواہد تلاش کرنے کی سعی کرتا کہ فرشتہ واقعی ایک وجود رکھتا ہے اور یہ حکم ملاءِ اعلیٰ کا حکم ہی ہے تو اس کا فیصلہ بقول کیرکے گور مختلف ہوتا اور وہ شاید اس کرب سے دوچار نہ ہوتے۔ چنانچہ معاشرتی نظام میں نتیجہ معلوم ہونے کے باوجود ہم نتائج و عواقب کی تمام ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور یہ صورتِ حال انسان کی بے کسی (FORLORN) کو جنم دیتی ہے جو ایمان کا بالواسطہ نتیجہ ہے اور وہ آزاد پیدا ہونے کے باوجود عقیدے کے جبر میں گرفتار ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس پر سارتر شدید ترین نفرت سے کہتا ہے کہ "انسان کو آزادی کی سزا دی گئی ہے"[11]

اہم بات یہ ہے کہ انسان کی یہ آزادی بھی اعمال کے امکانات سے مشروط ہے اور دو امکانات (POSSIBILITIES) میں اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ انھیں عبور کرنے کے لیے انسان مایوسی کا سامنا کرنے پر مجبور ہے چنانچہ جب ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ "دنیا کو فتح کرنے کے بجائے اپنے آپ کو فتح کرو" تو اس کا بنیادی مفہوم یہی تھا کہ دنیا کا کوئی منصوبہ امکانات کو انسان کے ارادے سے ہم آہنگ نہیں کر سکتا۔ سارتر نے اس تصور کو فاکنر کے ایک کردار کے حوالے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کردار خودکشی کرتا ہے[12] لیکن موت کے آخری لمحے تک اس دن کی جزئیات انجام کی طرف راہبری نہیں کرتیں۔ وقت کو گرفت میں لینے کے لیے یہ کردار گھڑی کی سوئیاں اکھاڑ پھینکتا ہے لیکن گھڑی کی ٹک ٹک پھر بھی جاری رہتی ہے وقت کا اعلان ختم ہو جاتا ہے لیکن وقت کی رفتار نہیں رُکتی اور بالآخر نتیجہ وارد ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

وجودی فلسفے سے بالعموم یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وجودیت انسان کو بے چارگی، ناامیدی اور خود غرضی کا سبق دیتی ہے یہ حق قدروں کو نظر انداز کرتی ہے اور فرد کو تنہائی کے احساس سے دوچار کر دیتی ہے۔ خدا سے انکار کر کے فرد ایک بہت بڑے روحانی سہارے سے محروم ہی نہیں ہو جاتا بلکہ تنہائی اور بے بسی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی کی دو عالمگیر جنگوں نے یورپ کے مادہ پرست انسان کو بُری طرح

---

[11] 'MAN IS CONDEMNED TO BE FREE.' J.P. SARTRE, BEING AND NOTHINGNESS PAGE. 83 [12] EVERETT.W.KNIGHT. LITERATURE AS PHILOSOPHY PAGE 113.

پر تھوپ دیا تھا۔ سائنس کی ایجادات عالمی عافیت پیدا کرنے کے بجائے انتشار، تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بن گئی تھیں۔ پہلی عالمگیر جنگ تمام روئے عالم سے جنگ کا خاتمہ کرنے کے لیے لڑی گئی۔[13] دوسری عالمگیر جنگ نے جمہوریت کو آمریت پر فتح حاصل کرنے کا دعویٰ کیا لیکن ہر جنگ کے بعد ایک نئی جنگ کے لیے میدان ہموار ہوتا چلا گیا اور عالمی جمہوریت کا خواب ایک عالمی آمریت کی شکل میں رونما ہونے لگا۔ سارتر نے ظلم و تشدد کا یہ نظارہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں نازیوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہوا اور فرانس کی شکست کے بعد جنگی قیدیوں کے کیمپ میں نو ماہ تک گرفتار رہا۔ چناں چہ اس کا ایقان تھا کہ صداقت ان لوگوں کے پاس ہے جو جنگ میں فتح یاب نہیں ہو سکے۔[14] اس نے ظلم کے خلاف مزاحمت کے لیے قلم اٹھایا اور THE FLIES اور NO EXIT لکھے۔ اس زمانے میں اس نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ( BEING AND NOTHINGNESS ) مکمل کی جو وجودی فلسفے اور سارتر کے فکر و نظر کی اہم ترین کتاب شمار ہوتی ہے۔

سارتر کی دوسری بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس نے وجودی فلسفے کے لیے نہ صرف نظریات وضع کیے بلکہ اسے تحریک کی صورت دینے کے لیے ادب بھی تخلیق کیا اور ادبی نظریات کو نئی توضیعات سے متاثر کرنے کی سعی بھی کی۔ سارتر کی نظر میں ادب زندگی کا آئینہ نہیں بلکہ یہ انسان کے وجود کو ثابت کرنے کا ایک اہم ترین وسیلہ ہے اور ادیب کرداروں کو تخلیق نہیں کرتا بلکہ ان کی مدد سے اپنے ہی وجود کا سراغ لگاتا ہے۔ چناں چہ فلسفہ جس کی روح کو سائنس کی تربیت نے یکسر ہضم کر لیا تھا، وجودی ادبا کی تخلیقات میں ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہونے لگا اور زندگی کی بے معنویت، مہملیت اور لغویت وغیرہ ایک ایسا موضوع ہے جو مغرب کے ادیب کو بار بار اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کی تخلیقات میں موضوعیت ایک معروضی حقیقت بن کر سامنے آنے لگتی ہے۔ چناں چہ وجودیت کی تحریک نے جدید فن کو ایک ایسی جہت دے دی جس میں عدم خود ایک حقیقت بن جاتا ہے۔ سارتر، کامیو، ریلکے، کافکا اور دوستووسکی کی تخلیقی نگارشات میں وجود کو جوہر پر فوقیت دینے کا

---

۱۳ ولولینڈ رابرٹ۔ ادب اور جدید ذہن صفحہ ۶۹ JEAN PAUL SARTRE

۱۴ JEAN PAUL SARTRE - PAGE, 115

رجحان واضح صورت میں موجود ہے۔

دستو وسکی کی تخلیق (NOTES FROM THE UNDERGROUND) میں جن وجودی نظریات کا اظہار کیا گیا ہے اس سے نطشے اور کافکا دونوں متاثر ہوئے۔ کافکا کا ناول THE TRIAL کا ہیرو ایک ایسے جرم میں گرفتار ہے جس کا اسے علم تک نہیں۔ چناں چہ وہ ایک ایسے المیے سے دوچار نظر آتا ہے جس سے نجات اس کے حیطۂ عمل سے باہر ہے۔ کافکا کا یہ ناول اس اضطراب اور پریشانی کا مظہر ہے جسے وجودی فلسفہ نمایاں کرنا چاہتا ہے اور یہ اس خواب کی طرح ہے جس میں زندگی سرابوں میں کھو جاتی ہے۔

سارتر نے 'ناشیا' (NAUSEA) میں وجود کی انفعالی کیفیت پیش کی ہے۔ اس کا ہیرو شیکسپیئر کے ہیملٹ کے مماثل ہے جو غور و فکر کی بنا پر عمل کی قوت کھو دیتا ہے۔ تاہم THE FLIES میں سارتر کے کردار کراہیت کی منزل سے نکلنے اور آگے بڑھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ کافکا کے بے نام کردار" کے' (K) اور کامیو کا 'اجنبی' سیموئیل بیکٹ کے ہاں نیم مجذوب حالت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا وجود فالج زدہ اور روح زخمی ہے۔ بقول ممتاز شیریں یہ کردار آج کے انسان کا اسم ہے[۱۵]۔ کامیو کا خیال تھا کہ زندگی ہر باشعور انسان کے لیے ایک بے معنی بوجھ بن چکی ہے۔ وہ اس زندگی کے بوجھ کو اپنی پیٹھ پر لادے سسی فس کی طرح زندگی کا پہاڑ عبور کر رہا ہے چناں چہ اس بے معنویت نے زندگی کو ایک مہمل عادت بنا دیا ہے کامیو کے ناول" اجنبی" کا ہیرو انھیں تصورات کا وجودی پیکر ہے وہ موت کا اس لیے دشمن ہے کہ اس میں زندگی کا شعور پوشیدہ ہے چناں چہ کامیو کا یہ کردار اس عہد کی بے معنویت کا ایک اہم کردار ہے اور یہ سسی فس کے مماثل ہے جو زندگی، موت اور دیوتاؤں سے بھی نفرت کو سامنے لاتا ہے۔ وجودی افسانے کا ایک اور اہم نام سائمن ڈی بوائر کا ہے۔ SHE CAME TO STAY میں سائمن ڈی بوائر نے بے جان اشیا کو بھی وجود اور زندگی عطا کر دی ہے اور انھیں یوں ماضی اور حال کا نمائندہ بنا کر ان میں زمان و مکان کے رشتے بھی پیدا کر دیئے ہیں۔

وجودیت کی تحریک نے یورپ کی مشینی زندگی میں گم ہوتے ہوئے انسان کو برآمد

---

[۱۵] ممتاز شیریں۔ معیار ۔ صفحہ: ۱۲۶

کرنے کی کوشش کی اور یوں انبوہ کے مقابلے میں فرد کو اہمیت تفویض کی۔ المیہ یہ ہوا کہ انسان کو جو اعلیٰ منصب عطا کیا گیا تھا، ماحول کی بے معنویت اس سے ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ چناں چہ قنوطیت، مایوسی اور بے چارگی نے فرد کے ولولوں کو سرد کر دیا اور وہ زندگی کو تخلیقی سرچشمہ میں تبدیل کرنے کے بجائے خود زندگی کو ختم کرنے کے درپے ہوگیا۔ دوسری طرف وجودیت نے انسان کو کارساز تو بنا دیا لیکن فلسفہ، مذہب اور فن کے ذریعے اسے نامعلوم سے رشتہ قائم کرنے کی جو صلاحیت ملی تھی اس سے یکسر محروم کر دیا۔ افلاطون کی مثالیت کو مذاہب نے یوں پروان چڑھایا تھا کہ اس میں جوہر اور وجود کی کوئی تخصیص باقی نہ رہنے دی اور ان کے امتزاج باہم کو ضروری قرار دیا اور یوں کائنات کا "کل" داخل کی پُراسرار جہت کی طرف لپکا اور برقلموں انکشافات منظرِ عام پر لانے لگا۔ ان انکشافات کی توضیح تجرباتی سائنس کے فارمولوں سے تو ممکن نہیں تھی لیکن جبلّت انھیں قبول کرتی اور وجدان ان کے آگے سر جھکا لیتا تھا۔ مغرب میں یہ رشتہ چونکہ سائنس نے توڑ دیا تھا اس لیے وہاں وجودیت کی تحریک اُبھری اور مشرق جہاں روحانی قدروں پر کبھی زوال نہیں آیا، وجودیت کی تحریک کچھ زیادہ فروغ حاصل نہ کر سکی۔ اہم بات یہ ہے کہ مغرب میں بھی وجودیت کی تحریک کا اثر و عمل زیادہ طویل عرصے تک قائم نہیں رہ سکا اور اب کچھ عرصے سے اس کے خلاف ردِ عمل بھی شروع ہو چکا ہے۔

وجودیت کے خلاف یہ ردِ عمل عقلیت کی کسی نئی تحریک نے ظاہر نہیں کیا بلکہ یہ ایک ایسے شخص کا ردِ عمل ہے جس نے اپنے وجود کو موجودیت کے فلسفے سے ہی دریافت کیا ہے یہ ایک شخص ایک مفلوک الحال مزدور گھرانے کا فرد کولن ولسن ہے جس نے قنوطیت پرست وجودیت میں روحانیت کے پہلو کو پھر نمایاں اہمیت دے دی ہے۔ کولن ولسن کا خیال ہے کہ وجودیت اپنی اساسی ڈگر سے ہٹ چکی ہے اور اس تحریک کے قائدین نے نظریاتی اساس کو بالائے طاق رکھ کر ذاتی تعصبات کا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے۔ چناں چہ کولن ولسن نے اس انتشار کو سمیٹنے کی کوشش کی جسے وجودی مفکرین اب کثرتِ تعبیر سے ابھار رہے تھے۔

کولن ولسن کا بنیادی کردار "آؤٹ سائڈر" OUTSIDER بظاہر کامیو یا جینے کی طرح معاشرے میں پابہ گل نہیں ہو سکا تاہم وہ مایوسی اور قنوطیت کا شکار نہیں۔ وہ بے اقدار دنیا پر یقین رکھتا ہے لیکن اس نے فکر میں روحانی ارتقا کی گنجائش موجود سمجھ درده

دنیا کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کے لیے اقتدار پر قبضہ جمانے کے لیے بھی قوت پیدا کرنے کے حق میں ہے۔ کولن ولسن کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس نے اس نئے اندازِ فکر میں وجودیت اور روحانیت میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اور یوں نٹشے کے سپرمین اور اقبال کے مردِ مومن کو وجودی لباس پہنا دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وجودیت میں فرد اور اس کا جوہر پس حیات چلا گیا تھا۔ کولن ولسن نے روحانوی عنصر سے اسے پھر ترفع عطا کیا۔ اس لحاظ سے کولن ولسن کی آواز رجائیت کی آواز ہے اور اسے نو وجودیت کا عنوان دیا گیا ہے۔ کولن ولسن بنیادی طور پر ادب کا آدمی نہیں لیکن اس نے ادب کی خدمت بے بہا کی ہے، اس کی تحریروں میں فلسفہ، ادب اور تنقید کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے اپنے فلسفے کے بیشتر ماخذ ادب سے تلاش کیے ہیں۔ ادب کا مطالعہ کولن ولسن کے فکر و نظر کا افق ہی وسیع نہیں کرتا بلکہ یہ ادبار کو دریافت کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ چناں چہ اس نے برنارڈ شا، گوئٹے اور دستووسکی کو اپنے ذہنی سوالات کی روشنی میں پڑھا اور انھیں نئے زاویے سے دریافت کیا۔ کولن ولسن کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس نے وجودی ہیرو کی خصوصیات متعین کیں اور فضا کے ناسازگار ہونے کے باوجود اس کی علامتی تخلیق پر زور دیا بالفاظِ دیگر وجودی فلسفے نے جس قولِ محال (PARADOX) کو لاینحل چھوڑ دیا تھا کولن ولسن نے اسے مثبت طور پر حل کرنے کی کوشش کی اور سائنس کے شور و غل میں انسان کو ایک مرتبہ پھر ادب اور فلسفے کی طرف راغب کر دیا۔ کولن ولسن نے ان نظریات کے عملی اظہار کے لیے ناول بھی لکھے اور ان میں وہ تمام باتیں کہہ دیں جنھیں وہ فلسفے کی زبان میں کہنے سے قاصر تھا چناں چہ اس کا کردار "آوٹ سائڈر" ایک آفاقی حیثیت اختیار کر گیا۔

کولن ولسن کا بالواسطہ اثر یہ ہے کہ مغرب میں روحانیت کے فروغ کی رَو پھر چلنا شروع ہو گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجودیت نے جسمانی دعووں کو جو ارتفاع عطا کیا تھا اب اس کو روحانی عرفان کا زاویہ پھر اُبھرنے لگا ہے چناں چہ اب مغرب کا رُخ پھر مشرق کی طرف ہے جہاں موجود کو پہلے لفظ کی تکرار سے توڑا جاتا ہے اور پھر اس کی قلبِ ماہیئت کر کے اسے ایک نئے وجود میں ڈھال دیا جاتا ہے لیکن یہ نیا وجود جس میں جوہر کا قیمتی عنصر بھی شامل ہوتا ہے بوجھل نہیں بلکہ یہ کافور کی طرح ہلکا ہوتا ہے اور اس میں پھولوں کی نکہت اور شبنم کی تازگی بھی شامل ہوتی ہے۔ ●●

سعادت سعید

# متحرک وجود کے مظہر افسانے

## (آنکھوں پر دونوں ہاتھ)

پھر میں جس شہر میں پہنچا وہاں کی ساری سڑکوں پہ شیشے کے
ٹکڑے بچھے تھے .......... (دکھ جو مٹی نے دیئے)

مسعود اشعر نئے اردو افسانے کی ممتاز شخصیت ہیں۔ ان کے افسانے صنعتی عہد کی شہری زندگی میں موجود ابتری کی عکاسی کچھ اس طور کرتے ہیں کہ فرد کی فکری اور جذباتی الجھنوں کی ترجمانی بھی ہو جاتی ہے اور اجتماع کی گردشوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ وہ ہمارے ادب میں علامتی افسانہ نگار کے بطور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی علامتیں حقائق کے بطن سے پھوٹتی ہیں۔ براہِ راست ترسیل کے روایتی اسلوب کے برعکس ان کا اسلوب بالواسطہ اظہار کے نئے اسالیب سے متعلق ہے۔ انھیں بنیادی طور پر وجودی رجحانات کا افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانی وجود کا کرائسس، دنیا اور اس کے معاملات ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے منقطع رہنا ان کے ضمیر کا رویہ نہیں ہے۔ افلاکی اور خلائی افکار جو انسان کو سر کے بل کھڑا کرنے پہ قادر ہیں، مسعود اشعر کے تحقیقاتی دائرے سے خارج ہیں۔ ان کا پسندیدہ واحد متکلم اپنے پاؤں پہ ہی چلتا نظر آتا ہے۔ اس کا جوہر بنا بنایا یا ڈھلا ڈھلایا نہیں ہے۔ زندگی کے عمل کے دوران اس کی صورتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ مسعود اشعر مجذوبانہ داخلیت یا خالص داخلیت کی دلدل میں دھنسنے سے محفوظ رہے ہیں۔ ان کی داخلیت خارجی وقوعات اور ہمارے شہری سماج کی اجتماعی صورت حال سے مختص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی نوعیت کے اہم مسائل سے لے کر سماجی جبر کی چکیوں میں پسنے والی فردیت کی لمناکیوں تک ہر موضوع

اور ہر معاملہ ان کی صریرِ خامہ کا حصہ ہے۔

"آنکھوں پر دونوں ہاتھ" مسعود اشعر کے افسانوں کا اولین مجموعہ ہے۔ علامتی اور استعاراتی انداز اس مجموعے کا خاصہ ہے۔ اس کے مطالعے سے کہیں بھی یہ تاثر نہیں اُبھرتا کہ مسعود اشعر محض اور محض علامت سازی ہی سے شغف رکھتے ہیں۔ وہ رواں دواں زندگی کی جزئیات کچھ اس طور جمع کرتے ہیں کہ علامتیں از خود نمودار ہوں۔ علامتی اور استعاراتی انداز میں لکھنے والے اُردو افسانہ نگاروں کا عموماً وطیرہ اُلجھنوں اور بھول بھلیوں کی تخلیق ہے اُلجھانے والے علامتی افسانہ نگار تنظیمی استعاراتی اور تنظیمی علامتی انداز اختیار کرنے سے گریزاں رہے ہیں۔ ان کے شعور کی باگ ڈور، شعور کی رو اور سوررئیلزم کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ جزئیات کا کسی تعمیری ویژن کے لیے انتخاب تخلیقی علامتی افسانوں کا خصوصی وصف ہے۔ استعارے اور علامت کا تنظیمی اظہار میکانکی استعارہ سازی اور علامت بازی سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ یہ نہ تو قاری کو سوچ کے جنگل میں گم کرتا ہے اور نہ ہی اس کے دل کی باتیں لے لوٹتا ہے۔ اس کا مدعا تو یہ ہے کہ کسی مسئلے یا استفسار کی کلی تشکیل ہو پائے یا اُلجھنوں اور بھول بھلیوں سے نکلنے کی کوئی سبیل ہو سکے۔ تنظیمی استعاراتی اور تنظیمی علامتی انداز میں افسانہ نگار کی صورتِ حال اس کے خواب اور ان کی تعبیریں متحد ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے افسانے فکری اور عقلی رجحانات کے حامل ہوتے ہیں۔ مسعود اشعر کے افسانوں میں تنظیمی استعارے اور تنظیمی علامتیں ان کے فکر اور شعور کی کمپوزیشنز کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ وہم اور حقیقت حس اور تعقل، تاثر اور نظریہ، جذبہ اور شعور اور خواب اور تعبیر کا اتحاد "آنکھوں پر دونوں ہاتھ" کے ہر صفحے کی زینت ہے۔ مسعود اشعر کے افسانے پڑھتے ہوئے ان کی قوتِ مشاہدہ سلیقۂ تعبیر اور پرتاثیر اسلوب کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔ خیالی، تخیلاتی اور مافوق الفطرت خرابوں سے گریز، بے جا تفصیلات اور بے محل جزئیات سے اجتناب اور غیر ضروری شعری اور فکری جملہ سازیوں سے پرہیز کی بدولت مسعود اشعر کے افسانے جدا اور مختلف تاثیر لیے ہوئے ہیں۔ حشو و زوائد اور خواہ مخواہ کی ارسطوئیت سے پاک نئے ذائقوں اور نئے فکری تجربوں کے امین نئے افسانے کو ایک منفرد نوع کا اسلوب عطا کرنے والے!

"آنکھوں پر دونوں ہاتھ" میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ "اپنی اپنی سچائیاں"،
[illegible] نے وسے"، "ڈار"، اور [illegible]
[illegible]

"آنکھوں پر دونوں ہاتھ"، "درخت اور دروازے"، "طیراً ابابیل"، "اندھیرے سفر میں ایک صبح"، "کابوس"، "اعراف"، "پابہ زنجیر"، "ٹوٹا پھوٹا گھر"، "موم کا شہر"، "دل کے آسیب"، "اکیلے آدمی کا سفر"، "غیر آدمی" اور "دوستی کی دیوار"۔ ان افسانوں میں حالات کی سنگینیاں، عامل شخصیتوں کی بے بسیاں، سچائیوں کی آوازیں، خود غرضیوں کے نوحے، حقائق سے مایوسیاں، تمناؤں کی تضحیک، اعصابی اختلال کی بنیادیں، سانحۂ مشرقی پاکستان کے حقائق، تہذیبی اور معاشی ریپ، صادق وجودوں کا بکھر اجانا، سرنگوں اور پیچ دار رستوں کا نہ ختم ہونے والا سفر، عوامی تحریکوں کا زوال اور اسے ختم کرنے کے لیے آقاؤں کی حکمت عملیاں، "تمام عمارتوں پر اور تمام کھیتوں میں نئے کپڑوں والے اُچکے کھڑے کر دیے گئے تھے اور آسمان پر ایک بھی ابابیل نظر نہیں آتی"۔ سماجی گندگی اور غلاظت کا شدید احساس، رہنماؤں کا زندگی اور بینائی سے محروم ہونا، محبت اور سُپر سٹرکچر کا دباؤ، تنہائیوں کے عذاب، توہمات کے کمالات، خوف اور دہشت کی فینامینالوجی، جنسیت اور غیر جنسیت کے آشوب، بے یقینی اور عدم اعتمادی کے سلاسل، طبقاتی تفاوت کے معاملات وغیرہ اپنی پوری تفصیلات سمیت رقم ہوئے ہیں۔ مسعود اشعر کا منطقۂ تفتیش نوآبادیاتی علاقوں میں رائج نظاموں اور ان میں جینے والے افراد کے استفسارات پر مشتمل ہے۔ ان کے افسانے چند استفسارات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

صحت مند زندگی کے لیے تمام پرانے داغ دھبے مٹانا لازمی ہیں لیکن ماضی اور مستقبل کی حقیقتوں کو ضرور سامنے رکھو! مگر کون سی حقیقتیں؟ (اپنی اپنی سچائیاں)

مگر ایسا کیڑا بھی تو ہوتا ہے جو اپنی پیٹھ پر اپنی دنیا لیے پھرتا ہے اور زمین اور ماحول کے مطابق اپنا رنگ تبدیل کر لیتا ہے۔ (دکھ جو مٹی نے دیے)

ندی میں تو بے شمار مگر مچھ ہیں ندی پر تو ان کا قبضہ ہے۔ انھوں نے ان لوگوں کو یہاں کیسے آنے دیا۔ (ڈاب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتلیں)

میں اس سے اپنی تمام غلطیوں اور گستاخیوں کی معافی مانگنے کو تیار ہوں میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بار ملنے کی اجازت مل جائے۔ (بیلا نائی رے جولدی جولدی)

تو پھر یہ سینکڑوں ننگے تیل ٹپکاتے جسم کہاں سے آ گئے!! وہ خوف

سے کانپ گیا کہیں اسٹیمر ہی نہ ڈوب جائے۔ (آنکھوں پر دونوں ہاتھ)

جب ہم اپنے کپڑوں پر سے گرد جھاڑ کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب تختی صاف ہوگئی اب اس پر نئی کہانی لکھی جاسکتی ہے تو یکایک ہماری آنکھیں ریت سے بھر جاتی ہیں اور تختی غلیظ سیاہی سے دوبارہ کالی ہوجاتی ہے۔

(درخت اور دروازے)

کیا ہم نے جاڑوں جاڑوں اپنی زندگی معطل کردی ہے؟ اور اس شخص کو جسے ہنسی سے خوف آتا ہے یہ آزادی دے دی ہے کہ وہ جی بھر کے نئے نئے اُپلے بنائے اور کھیتوں کے علاوہ گلی کوچوں میں بھی نصب کردے۔

(طیرا ابابیل)

غلاظت ہی غلاظت تھی چاروں طرف گندگی، صرف اتنی جگہ خالی تھی جہاں میں کھڑا تھا، محض پاؤں رکھنے کی جگہ یہ غلاظت پہلے سے تھی یا میرے وہاں پہنچنے کے بعد آئی۔ (اندھیرے سفر میں ایک صبح)

پھر اچانک بجلی کے کوندے کی طرح اس کے دماغ میں یہ خیال لپکتا ہے کہ اسٹریچر پر بیٹھی جس لاش نے اسے راستہ بتایا تھا اس کی تو دونوں آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ (کابوس)

مجھے دیکھو میں فلم دیکھ کر آیا ہوں اور اب نماز پڑھنے جارہا ہوں (اعراف)

اس گھر میں میں غیر آدمی ہوں یا وہ جس نے اپنی جان دے دی (غیر آدمی)

مسعود اشعر کے استفسارات محض اور محض استفسارات نہیں ہیں، ان کے افسانے ان کا جواب بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان کی سوچتی آنکھوں نے ناانصافیوں کے انسان کش مناظر بھی دیکھے ہیں اور ان ناانصافیوں کے خلاف انصاف والوں کا احتجاج اور ردِّ عمل بھی، انھوں نے موقع پرستوں کے کریہہ چہروں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ امارتوں کی ہوس کاریوں پر نظر رکھی ہے۔ تبدیلی کو روکنے والوں کے حربے دیکھے ہیں۔ زنا بالجبر کے نتائج کا مشاہدہ کیا ہے وطن کا آمعاجمتہ کتنا دیکھا ہے، ضمیروں میں موجود کالکوں کو پھیلتے پایا ہے، فریب کاری اور دھوکہ دہی کے ماحول کا جائزہ لیا ہے۔ سماجی فلتھ ڈپو کے مناظر کا احاطہ کیا ہے جھوٹ

کی راہنمائی کے خطرات کو سونگھا ہے۔ تہذیبی اور سماجی ثنویت کو لفظوں میں سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ عدمِ ابلاغ کے دکھ سہے ہیں۔ مسعود اشعر باضمیر خوب صورتیوں کے متمنی بھی ہیں۔ اور انسانوں کی برابری کے داعی بھی۔ مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کے اتحاد کی حقیقی منطق بھی ان کے ادراک میں ہے اور شفاف اور دھلے دھلائے ضمیروں کے امکانات بھی، صادق اور انسان دوست جذبوں سے باخبر بھی ہیں اور صاف ستھرے سماج کی تصویروں سے بھی انھیں زندہ اور بیمار راہنماؤں کی کراہتوں کا بھی اندازہ ہے اور غیر منافقانہ عملِ زیست کا بھی۔ وہ ابلاغ کے حقیقی مفہوم سے بھی واقف ہیں اور اجنبیت، خوف اور دہشت کے ماحول سے نجات پانے کی تراکیب بھی رکھتے ہیں۔ مسعود اشعر کے استفسارات خودکلامی کے استفسارات بھی ہیں اور ہمکلامی کے بھی۔ ہر دو صورتوں میں وہ جواب فراہم کرنے کے عمل کو فراموش نہیں کرتے۔

ای۔ ایل۔ ایلین نے اپنی کتاب " وجودیت کا باطن میں " وجودیت کے ضمن میں چند معروضات پیش کی ہیں ان کا کہنا ہے۔ " وجودیت کے لیے سچائی کا "کیسے ہے" بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ 'کیا ہے' 'ہے'، " وجودی طریقے سے سوچنا اس انسانی صورت سے متحد ہونا ہے، جس میں ہم حقیقی طور پر شامل ہیں۔ "

" انسان صورتِ حال میں BEING کی طرح موجود ہے اور اس کی صورتِ حال اس کے حالات کے مجموعے سے زیادہ ہے۔ وہ اپنی صورتِ حال میں خود ہی ضروری حقیقت ہے جہاں جہ وہ اس سے متعین نہیں ہوتا اسے متعین کرتا ہے۔ "

" اپنے GUILT کی شناخت کے بعد ہم اس کے خاتمے کے عمل میں مبتلا ہوتے ہیں جس سے ذات، آزاد، مکمل اور مصدقہ ہو جاتی ہے۔ "

مسعود اشعر کے افسانوں میں سچائی کی صورتِ حال بھی موجود ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں ایسی صورتِ حال کیسے ہے۔ وہ کہیں بھی اپنے ارد گرد کی انسانی زندگی سے علاحدہ نہیں ہوتے، ان کا BEING صورتِ حال میں موجود ہے۔ وہ صرف اپنی خود نوشت سوانح عمری نہیں لکھتے، اپنے سے باہر کی کائنات کے حالات کو بھی گرفت میں لیتے ہیں اور حالات سے متعین ہونے کی بجائے وہ انھیں ایک سمت دینے کی کوشش کرتے ہیں!

" ہمارے بعض نئے افسانہ نگاروں کا المیہ یہ ہے کہ بسا اوقات ان کے کردار اور ان

قاری حقیقی صورت حال سے آگاہ ہونے سے قاصر رہتا ہے۔ قدیم بغداد کا ماحول یا مغلی دور کے دہلی یا لکھنؤ کے مناظر یا پھر مغربی صنعتی شہروں کے موضوعات سے نئے افسانہ نگاروں کی اکثریت کو بہت مرغوب ہیں لیکن مسعود اشعر کے افسانوں کے ذریعے ہم یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ ان کے افسانے خالصتاً پاکستانی ماحول کے تاثرات سمیٹے ہوئے ہیں۔ مقامی ثقافت اور مقامی تہذیب سے ان کا لگاؤ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ وہ اسلامی ثقافت کا فکری تجزیہ بھی کرتے ہیں اور اس کے عناصر سے اپنے افسانوں میں رنگ بھرتے ہیں۔ منتیں مانگتی لڑکیاں، تعویذ بیچتا شخص، پیر فقیر، مسجد، اُن کے جا بجا پھول، اگر دستے، قرآن مجید کی تلاوت کرتے بڑے میاں، سورہ یٰسین پڑھتے کردار، نماز استسقا، جمعے کی نمازیں، اذانیں، مساجد میں نمازوں کی ادائیگی، سورۂ مزمل کے عامل، آیۃ الکرسی پڑھتے کردار وغیرہ۔۔۔ اس کے ساتھ ہی جن مقامات سے ان افسانوں کا تعلق ہے وہ بھی ماضی اور حال کے پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں، جناح ایونیو، کوہستان، ڈھاکہ، رانگامانی، چاٹگام، کھلنا، ملتان، بہاولپور، ڈیرہ غازی خاں، میانوالی، سرحد، کراچی، لاہور، بلوچستان، سندھ، گاندھی پارک، نواب دروازہ، راہ رضا، مردان وغیرہ۔ مسعود اشعر نے پاکستانی ماحول میں موجودہ مغربی اور صنعتی اثرات کی بھی جگہ جگہ عکاسی کی ہے، ہوٹل، مس کھا، لفٹ، بلڈنگ، بندرگاہیں، جہاز، ڈائننگ ہال، ٹیلیفون، توپیں، جیپیں، ٹرک، بھاری جوتے، بلند ہوتی نئی عمارتیں، ہسپتال، بیئر، انگریزی بولنا، فیشن، ہوزری کا کارخانہ، رامیشول، ایجنسی، انجن روم، ڈیک چیئر، کیبن، ڈیک، اسٹیمر، ریلنگ، لوئر کلاس، اپر کلاس، پورچ، رنگ برنگے قالین، سنٹرلی کنڈیشنڈ ہوا، بش شرٹ، ٹائی، سمر سوٹ، ایئر لائنز کاؤنٹر، پوسٹر، ایئر ہوسٹس، اسٹیورڈ، ٹیلی پرنٹر، لاؤنج، وارڈروب، امیگریشن، تھیٹر، ہاؤس سرجن، اسٹریچر، سینما، آرٹ سرکل، بیگمات، کلچرل کمیٹیاں، رقص گاہیں، پیانو، آرکسٹرا، فوکس ٹراٹ، چاچاچا، جرک وغیرہ۔

آنکھوں پر دونوں ہاتھ میں منعکس ہونے والا ماحول اپنے اندر متعدد جو بالا سلسلے نقشوں کو لیے ہوئے ہے۔ سو مسعود اشعر کے ہاں کاسموپولیٹن شہری زندگی کی تصویریں بھی مل جاتی ہیں اور متوسط طبقے کی مشرقیت سے بھری تہذیب بھی، مذہبی حوصلے بھی میسر آتے ہیں اور تشکیکی رویے بھی انھیں اپنی ثقافتی معنویت کا گہرا شعور ہے۔ قیام

پاکستان سے عہد حاضر تک ہماری تہذیب جس جدِ زندگی کا شکار رہی ہے اس کا اظہار بہت کم ادیبوں اور دانشوروں نے کیا ہے۔ مسعود اشعر نے اپنے افسانوں کے لینڈ سکیپ میں اس دوزنگی کا برملا اظہار کیا ہے۔ کیمرہ و ڈور طبقات کا معیار زندگی اور روشن جس نوع کے ماحول کا سنگ بنیاد رکھ چکے ہیں، ان کے قلم کی توانائیوں نے اسے موثر انداز میں سمیٹا ہے۔ مسعود اشعر کے افسانوں میں ہمارے سماجی طبقوں کے اکثر و بیشتر نمائندہ کرداروں کی عکاسی موجود ہے۔ فسطائیت زدہ کرداروں سے لے کر محبِ وطن کرداروں تک، سرمایہ داروں سے لے کر غریبی کا کشٹ اٹھاتے محنت کشوں تک، دولت کی ریلے ریس میں حصہ لیتی شخصیات سے بے روزگار افراد تک۔ ماؤں سے محبت کرنے والی وطن دوست خواتین سے لے کر عیاش فیشن پرست خواتین تک، چوری چھپے محبت کرنے والی لڑکیوں سے لے کر بیچ چورا ہے خود سپردگی کے عمل میں مبتلا لڑکیوں تک مسعود اشعر کا قلم تصویر کشی کے ہنر میں طاق ہے۔

مسعود اشعر اپنے افسانوں میں پیچیدہ اور الجھی ہوئی زبان استعمال نہیں کرتے۔ ان کے واقعات بھی ٹھوس ہیں اور کردار بھی۔ ان کے استعارے اور علامتیں جسمانی اور لسیاتی احساس رکھتے ہیں۔ فرانز برنٹینو کا کہنا ہے ذہنی مظہر پر عز نشین پر مبنی ہوگا۔ وہ جسمانی ہوگا۔ مسعود اشعر کے ذہنی مظاہر جب لفظوں میں ظاہر ہوتے ہیں تو وہ جسمانیت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس نوع کے جسمانیت سے وجود میں آنے والے استعارے اور علامتیں حسی بھی ہوتے ہیں اور ٹھوس بھی، چناں چہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لڑکی کسی علاقے کی علامت بن جاتی ہے وہ لڑکی جو ریپ ہوتی ہے جس کا چہرہ گہرا سانولا ہے مگر اندر کا بدن گندمی ہے۔ نہیں دھان کا رنگ، سنہرا دھان کی پھولوں کی طرح ملائم جس کی آنکھیں میڈو ساکی آنکھیں بنتی جا رہی تھیں۔

مسعود اشعر کے افسانوں میں سفر اور اس کے متعلقات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ریلیں، جہاز، اسٹیمر، لانچیں، بسیں، ڈرائیور، دوڑ، انجن، ندیاں، طوفان، گھاٹ کشتیاں، سکوٹر، رکشے، کاریں، زیبرا کراسنگ، ہاتھوں پر چلنا، لائف بیلٹ، مسافر، ہوائی جہاز، بلندیوں میں پروازیں، سرنگ در سرنگ فاصلے، اہالیں، اور سفر میں ایک سمت بہتا پانی، سگنل، کراس، پاؤں کا سونا، راستے، بیساکھیاں، ڈکاوٹیں، سیڑھیاں اور ان کا اندھیرا۔

ٹیکسیاں، بیگم کی کوٹھی سے آرٹ سرکل ہال کا کم فاصلہ "گلیاں، چکر" کھلی سڑکیں، چاند کا گھومنا، سورج کا طلوع و غروب، تانگے، تین مسافروں والا ڈبہ وغیرہ ۔ یہ سب کچھ مسعود اشعر کے افسانوں میں مستقل حرکتوں کی علامتیں ہیں۔ انھوں نے گھوم پھر کر زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں سفر آگے بڑھنے کے عمل کی نمایندگی بھی کرتا ہے اور مراجعت کرنے کی بھی اور یہ اس لیے ہے کہ انھوں نے ارتقا اور مراجعت کے مظاہر کو ایک ہی سماج میں ظاہر ہوتے دیکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں روشنیوں کا سفر بھی ہے اور اندھیروں کا سفر بھی' افقی توسیعی سفر بھی ہے اور کنووں اور سرنگوں کا سفر بھی' ذہنی سفر بھی ہے اور جذباتی سفر بھی' ذات کا سفر بھی ہے اور ماحول کا سفر بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسعود اشعر کی افسانوی تخلیقات' متحرک مناظر سے معمور ہیں۔ سکونت اور قیام یا اسٹل لائف اور انجماد کے حوالوں سے انھیں کوئی نسبت نہیں ہے۔ ان افسانوں میں سفر کے جو امیجز استعمال ہوے ہیں۔ محض اتفاقی اور حادثاتی نہیں جاننا چاہیئے۔ ان کا تعلق افسانہ نگار کے وجود کے رجحانات سے ہے۔ مسعود اشعر متحرک آشنا سائیکی رکھتے ہیں۔

"AN ESSAY ON MAN" میں ارنسٹ کیسرر نے لکھا ہے "حقیقت کوئی نادر یا مطلق شے نہیں ہے اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اس کی اتنی مختلف صورتیں ہیں جتنے کہ مختلف عضویاتی سانچے۔" "انسان کے عمل کے دائرے میں مقداری تبدیلیاں ہی نہیں ہیں' یہ اقداری تبدیلیوں کا بھی اثر رکھتا ہے۔" مسعود اشعر اس حقیقت سے آگاہ ہیں' یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ہر پل متغیر صورتِ حالات اور کوائف ذات کو اظہار کے کوزے میں بند کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو تاریخ کے بہتے دھارے کے سپرد نہیں کرنا چاہتے۔ ان کی تمناؤں میں اقداری تبدیلیاں شامل ہیں۔

مسعود اشعر لکھتے ہیں:

"یہ افسانے نہیں سوال ہیں' یہ وہ سوال ہیں جو میں اپنے آپ سے کرتا ہوں' مختلف اوقات میں' مختلف مواقع پر وہ باتیں ہیں جو میں نے اپنے آپ سے کی ہیں اور کرتا رہتا ہوں۔ وہ خواب ہیں بالعموم ڈراونے خواب۔ جو میں نے دیکھے ہیں اور دیکھتا رہتا ہوں۔ اب میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرا اپنا آپ ایک خاص معاشرہ اور خاص ماحول میں بھی محصور ہے کہ یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے۔" (قلیب' آنکھوں پر دونوں ہاتھ) ۰۰

شہزاد احمد

# پھر صبح ہو رہی ہے

پھر صبح ہو رہی ہے
پھر آسمان دل کی کالک کو دھو رہا ہے
اور رتجگا پھر اپنی آنکھیں بھگو رہا ہے
سورج چھپا ہوا ہے اور چاند سو رہا ہے
گلشن مہک رہے ہیں پنچھی چہک رہے ہیں
سبزہ لہک رہا ہے، غنچے چٹک رہے ہیں
اور میرے دل کے اندر وہ غم دہک رہے ہیں
جو رات نے دیے ہیں
پچھلی شبوں کی صورت
اس رات نے بھی مجھ پر کچھ ظلم ہی کیے ہیں
یہ رات تھی کہ روزِ محشر گزر گیا ہے
اور دل کی بستیوں کو (پہلے سے بھی زیادہ)
ویران کر گیا ہے
دل کی فصیل ڈھا کر سیلاب اتر گیا ہے
پھر صبح ہو رہی ہے
پھر اک پہاڑ سا دن رستے میں آ پڑا ہے

رستے چمک اٹھے ہیں آنکھیں اجڑ گئی ہیں
بیٹھے بٹھائے پھر سے سانسیں اکھڑ گئی ہیں
روز اک نیا جہاں ہے اور اس میں میں اکیلا
سیلاب سا رواں ہے اور اس میں میں اکیلا
چاروں طرف دھواں ہے اور اس میں میں اکیلا
صحرائے بے اماں ہے اور اس میں میں اکیلا
صبح و مسا یہی کچھ دل پر گزر رہا ہے
اک سیل چڑھ رہا ہے اک سیل اتر رہا ہے
اک دائرہ ہے جس میں ہر چیز گھومتی ہے
ہے رقص میں یہ عالم تصویر جھومتی ہے
اب دن بھی ایک جیسے راتیں بھی ایک جیسی
ہوتی ہیں اپنے دل سے باتیں بھی ایک جیسی
سو بار میں نے چاہا ٹوٹا نہیں وہ دھاگا
دن بھر بھی جاگتا ہے میں رات بھر بھی جاگا
مخلوق سو رہی ہے

ابرار احمد

# ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے

ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے
جلو میں کوچے مکان لے کر
سفر کے بے انت پانیوں کی تھکان لے کر
جو آنکھ کی عجز سے بھرے ہیں
انہی زمانوں کا گیان لے کر
ترے علاقوں کی سرحدوں کے
نشان لے کر
ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے
زمیں۔ چُپ
آسمان۔ وسعت میں کھو گیا ہے
فضا۔ ستاروں کی فصل سے
لہلہا رہی ہے
مکاں
مکینوں کی آہٹوں سے
دھڑک رہے ہیں
جھکے جھکے نم زدہ دریچوں میں
آنکھ کوئی
رکی ہوئی ہے

فصیلِ شہرِ مراد پر
نامراد آہٹ۔ اٹک گئی ہے
یہ خاک
تیری مری صدا کے دیار میں
پھر بھٹک گئی ہے
دیارِ شام و سحر کے اندر
نگارِ دشت و نظر کے اندر
سوادِ جان و نظر کے اندر
خموشیِ بحر و بر کے اندر
اذیتِ روز و شب میں
ہونے کی ذلتوں میں نڈھال
خوابوں کی بستیوں میں
اداس صبحوں کی اوس میں
بھیگتی ٹھٹھرتی
خموشیوں کے بھنور کے اندر
دلوں سے باہر
دلوں کے اندر
ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے

# غزلیں

**ساقی فاروقی**

میں کسی جواز کے حصار میں نہ تھا
میرا شوق میرے اختیار میں نہ تھا

دور نئی طاقتوں نے جنگ لڑی تھی
خوف ابھی روح کے جوار میں نہ تھا

صرف میری ذات سوگوار کھڑی تھی
اور کوئی نیند کے غبار میں نہ تھا

لہر کے قریب میری پیاس پڑی تھی
ابر کوئی شام کے دیار میں نہ تھا

یاد تری تھی کہ میرے طاق میں گڑی تھی
درد مرا تھا کسی شمار میں نہ تھا

**محمد خالد**

کوئی حرف غم کہیں معتبر بھی نہیں ہوا
اس کا گوشۂ چشم تر بھی نہیں ہوا

یہ پہاڑ سی کوئی رات کٹ تو گئی مگر
کوئی مرحلہ دو جہاں میں سر بھی نہیں ہوا

مری آنکھ سے کوئی خواب بھی تو جدا نہیں
ہوئی شب تمام کوئی بے خبر بھی نہیں ہوا

سر بزم کیا اسے ڈھونڈتی رہی نظر
جو معاملہ سر رہ گزر بھی نہیں ہوا

تھا خیال پرتو حسن جس کی بہت کبھی
وہ فساد اب ترے نام پر بھی نہیں ہوا

مجھے زعم اپنے بیان غم کا بھی تھا بہت
وہ مگر غمیں مجھے دیکھ کر بھی نہیں ہوا

رہے درد خوف و ہوس کی راہ سے بھی مگر
کوئی مسئلہ بس خیر و شر بھی نہیں ہوا

ہے غضب کہ لطف قیام بھی نہ ملا مجھے
ہے ایک عمر رواں، سفر بھی نہیں ملا

Dr. Zakir Husain L...
Jamia Nagar
J. M. I. New De...

# غزلیں

**اختر شمار**

اپنے سارے دکھ لفظوں میں بھر جائیں
اور پھر بے شک ہم رستے ہی میں مر جائیں
اندھی راہیں لپٹ جائیں قدموں سے
آؤ دل کے دیپ یہاں پر دھر جائیں
ایک دعا تو مانگ ہماری خاطر تو
پاگل ہو جائیں ہم یا پھر مر جائیں
چلتے چلتے، اس کے شہر میں آ پہنچے
آؤ دل کے زخم ہی تازہ کر جائیں
اک وہ ہیں ہر جیت انہی کی قسمت میں
ایک ہم ایسے لوگ جو خود سے ہر جائیں

بھیگ چلی ہے رات اکیلے سڑکوں پر
آؤ شمار اب تنہائی کے گھر جائیں

**ڈاکٹر احسن رضوی**

سفر جاری ہے مگر اب گراں سا لگتا ہے
کہ ہمسفر میرا کچھ بدگماں سا لگتا ہے
بھروسہ کیسے کروں چلتے پھرتے سائے پر
کہ اس کا ساتھ تو ابر رواں سا لگتا ہے
مرے خلوص پہ شک کر رہے ہیں اپنے لوگ
مجاہدہ مرا اب رائیگاں سا لگتا ہے
شکستہ دل میں کئی وسوسے سے اٹھتے ہیں
جو کوئی شخص کبھی مہرباں سا لگتا ہے
برس بھی جائے یہ بادل تو تھوڑی پیاس بجھے
کئی دنوں سے جو اک سائباں سا لگتا ہے
زمیں پہ ٹھہرے تو پرکھوں میں اس کی فطرت کو
ابھی یہ شخص سر آسماں سا لگتا ہے
ہوا کے رخ پہ کاغذ کی ناؤ چلتی ہے
وجود اپنا فقط بادباں سا لگتا ہے

ہزار درد سموئے ہیں دل میں احسن نے
یہ اور بات کہ وہ شادماں سا لگتا ہے

ذکی بلگرامی

# غزلیں

مثلِ آئینہ مقابل میں بٹھاؤں خود کو
ایک اک شعر لکھوں اور سناؤں خود کو

میں وہ اک نقش بہ دیوارِ خموشی ٹھہرا
لب کشائی کے لیے کیسے مناؤں خود کو

آپ اپنے کو امیدوں کا گھروندا سمجھوں
صبح کو تعمیر کروں شام کو ڈھاؤں خود کو

نوچ دوں جسم سے شاخوں کی ہری زنجیریں
برگِ آوارہ بنوں اور اڑاؤں خود کو

اپنی خاکسترِ جاں باندھ کے رکھوں کب تک
کسی دریا کے تنک رو میں بہاؤں خود کو

پرزہ پرزہ شبِ تاریک میں جوڑوں اپنا
اور پھر دن کے اجالوں میں گنواؤں خود کو

گھر کے اندر بھی ذکیؔ شور ہے گلیوں جیسا
کون سے دشت میں لے جا کے بٹھاؤں خود کو

روز و شب جذبۂ صد نقلِ مکانی مانگوں
میں جو دریا ہوں تو پھر اپنی روانی مانگوں

میری ہر شاخِ ثمر بار ترا ورثہ ہے
میرا حق ہے ترے دریاؤں سے پانی مانگوں

کیا عجب قحطِ سخن آن پڑا ہے مجھ پر
حرفِ بے مایہ سے دریائے معانی مانگوں

میں کڑی دھوپ کا باشندہ کڑے دن کا سفیر
تیرے اس شہر سے اک شام سہانی مانگوں

میں کہ بہتے ہوئے دریاؤں سے پیاسا اٹھوں
اور تپتے ہوئے صحراؤں سے پانی مانگوں

اتنا مستِ مئے غم ہوں پسِ محرابِ نشاط
فرصتِ گریۂ خوں نابہ فشانی مانگوں

مصرعۂ اولیٰ لبِ میر تقی میرؔ سے لوں
نطقِ غالبؔ سے ذکیؔ مصرعۂ ثانی مانگوں

جناب حسن الدین احمد

# حیدرآباد دیدہ و شنیدہ

دھندلکے ماضی کے بھی ہوتے ہیں حال کے بھی اور مستقبل کے بھی۔ حال کے دھندلکے ہجوم کار، بیکاری یا فکر معیشت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور مستقبل کے دھندلکے مستقبلیات کا جزو ہیں۔ دیدہ و شنیدہ ماضی کے دھندلکے ہیں۔ ماضی جو کبھی مستقبل تھا اور پھر حال بنا، آج ماضی ہے۔ ماضی کبھی حقیقت تھا اور آج بھی حقیقت ہے۔ البتہ ان حقائق پر ایک ایک دن کے تہہ در تہہ پردے حائل ہوتے جاتے ہیں اور یہ پردے ہر روز بڑھتے جاتے ہیں۔ اگر معاشرے میں زندگی اور توانائی ہو تو ماضی کے ان پردوں کو ہٹانے کی جستجو کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ماضی اپنی تابناکیوں اور کمزوریوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کی توانائیوں سے استفادہ اور اس کی کمزوریوں سے عبرت حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر معاشرے میں احساس کا فقدان ہو اور جمود کی کار فرمائی ہو تو ماضی کے دھندلکے یوں غائب ہو جاتے ہیں کہ:

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ماضی قریب کی تاریخ، ماضی بعید کی تاریخ سے زیادہ مشکل ہے۔ ماضی بعید کی بہت سی باتیں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ ماضی بعید کی کہانی ایسی ہے کہ کتبوں، دستاویزوں اور تاریخ کی کتابوں سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہم نے جانا، اس سے زیادہ تو ہم جان نہیں سکتے لیکن ماضی قریب کے حقائق چلمنوں سے لگے کچھ اس طرح بیٹھے ہیں کہ:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ماضی قریب کی تاریخ کے مطالعے کے سلسلے میں کچھ دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ ہم ماضی قریب کے واقعات کی طرف جاتے ہیں تو وہ ماضی کے دھندلکوں میں [illegible]

ہو جاتے ہیں اور صرف موہوم خیالات کو چھوڑ جاتے ہیں۔

دیدہ و شنیدہ کا موضوع ماضی قریب کی تاریخ کے مطالعہ کا موضوع ہے۔ یہ دلچسپ بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ شنیدہ کی حد تک ایک بات عرض کر دوں۔ سو راوی ہوں اور ہر راوی۔ صرف ایک فی صد مبالغہ سے کام لے تو بات سو فی صد بدل سکتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ دیدہ کی حد تک ایسا نہیں ہے مشہور ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ ذہن پر صدیوں کا جو رعب ہوا کرتا تھا اب باقی نہیں رہا کیوں کہ نہ از نصف صدی تو نظروں اور یادوں میں ہے اور زائد از ثلث صدی کی تو فہم ملازمت بھگتی ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ کل کے دفتر پر لکھائے ہوئے لوازمات کو یاد ضرور رکھنے والا مجسم نسیان، نصف صدی کی باتوں کی تفصیلات کو کہاں تک یاد رکھ سکے گا لہٰذا دھندلکے کی بات دھندلکے تک ہی رہی۔

اب تک سنتے رہے کہ معاشرہ بگڑتا ہے تو قانونِ قدرت کے تحت اس کو زوال آتا ہے اور نیا معاشرہ اس کی جگہ لیتا ہے جو بہتر ہوتا ہے اور صحت مند ہوتا ہے۔ پر سوں کے حیدرآباد کی باتیں سن کر اور کل کے حیدرآباد کو یاد کر کے آج کے حیدرآباد پر نظر ڈالی جائے تو یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ قدرت نے اس معاشرے کو کیوں ختم کیا اور آیا آج کا معاشرہ واقعی ترقی پذیر اور بہتر معاشرہ ہے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد ایک وجہ سمجھ میں آئی۔ قدرت کا اٹل قانون ہے جس کا اظہار انگریز شاعر نے یوں کیا ہے :

OLD ORDER CHANGHETH YIELDING PLACE TO NEW

GOD FULFILS HIMSELF IN MANY A WAY

LEST ONE GOOD CUSTOM SHOULD CORRUPT THE WORLD.

محض سنی سنائی باتیں غیر معتبر ہو سکتی ہیں، مرحوم مصنفین سے جو باتیں سننے میں، اور ان کی کتابوں میں دیکھنے میں آئیں ان کو بھی میں نے دیدہ اور شنیدہ کی تعریف میں شامل کیا ہے اور اس اصول کو پیش نظر رکھا ہے کہ :

جو کچھ سچ کہو جو لکھو سچ لکھو، مشعلِ آدمیت کو بجھنے نہ دو

اپنے جس ہاتھ میں تھامتے ہو قلم تم کو اس ہاتھ کی آبرو کی قسم

بچپن میں (۱۹۲۰ء کے لگ بھگ) نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے

بارے میں کافی باتیں سننے میں آئی تھیں۔ ان سے سب کو عقیدت اور محبت تھی۔ وہ محبوب علی پاشاہ کہلاتے تھے۔ ان کے انتقال کو اس وقت تک بیس سال ہی ہوئے تھے نئے فرماں روا اس وقت زیادہ ہردلعزیز نہ تھے اس لیے بھی محبوب علی پاشاہ کو لوگ یاد کرتے تھے۔

یہ باتیں سننے میں آئیں کہ محبوب علی پاشا پونے تین سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کی حیثیت سے آنکھیں کھولیں اور بچپن اور جوانی بادشاہ کی حیثیت سے گزاری اور چوالیس "۴۴" سال کی عمر میں انتقال کیا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے دروغ برگردن راوی غلط صحبتوں کے اثرات بھی مرتب ہوئے تھے۔ مختار الملک سالارجنگ ریجنٹ اور مدارالمہام یعنی وزیراعظم تھے۔ وہ پوری وفاداری سے حکومت چلاتے تھے ۱۸۸۳ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو اس وقت محبوب علی پاشا کی عمر تیس سال کی تھی۔ وہ انگریزوں کے معاملے میں بھی زیادہ قوت کا اظہار نہ کرسکے اور اپنے وزیروں کے مقابلہ میں بھی ——— لیکن وہ دل کے بہت اچھے تھے۔ طبیعت شاہانہ تھی۔ دے کر خوش ہونے والوں میں تھے۔ عوام سے بے حد محبت کرتے تھے۔ عوام بھی ان سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی کمزوریوں کو نظرانداز کرتے تھے۔ ان پر پورا اعتماد تھا کہ وہ کوئی کام عوام کے مفاد کے خلاف نہ کریں گے۔ شاہ پرستی جو آج شخصیت پرستی کا روپ دھار کر جمہوریت کے بگاڑ کا باعث بن رہی ہے، عوام کی سرشت میں داخل تھی۔ وقارالامرار نے قصر فلک نما محبوب علی پاشاہ کو نذر کردیا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ سننے میں آیا کہ اس عالی شان قصر میں وہ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ کبھی اس کے کوریڈور میں بغیر بستر زمین پر سو رہتے۔ کبھی باغ میں کام کرنے والوں کا توشہ کھول کر کھا لیتے اور خالی برتن میں اشرفیاں رکھ دیتے۔ کبھی بھیس بدل کر شہر میں گھومتے اور اپنے متعلق رائے عامہ معلوم کرتے۔ جب اپنے کانوں سے یہ سنتا کہ

"محبوب علی پاشاہ کو ریاست کی کوئی فکر نہیں۔ وہ شراب نوشی میں مصروف رہتے ہیں اور ریاست کے بدخواہ ذاتی فائدے حاصل کررہے ہیں، انگریزوں سے سازباز کر رہے ہیں۔
محبوب علی پاشاہ اگر معاملات اپنے ہاتھ میں لیں تو ریاست کی

حالت بہتر ہو سکتی ہے" تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔

میر عثمان علی خاں کی طبیعت مختلف تھی۔ وہ کفایت شعار تھے اور بہا شہرت رکھتے تھے پڑھے لکھے تھے۔ ابتداء میں کچھ عرصہ تک بغیر کسی وزیر کی مدد کے خود حکومت چلائی۔ وہ مردم شناس اور قدرداں تھے۔ سنا تھا کہ کچھ عرصہ کچھ CORRUPTION بھی رہا لیکن وفاداروں نے جو ان کے اطراف تھے زیادہ عرصہ تک اس راستہ پر چلنے نہ دیا۔ راۓ مرلیدھر نے ایک تاریخی معروضہ ۱۹۱۹ء میں پیش کیا۔ یہ معروضہ حیدرآباد کے اکثر و بیشتر افراد کو زبانی یاد تھا' دو تین سے میں نے سُنا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کو ایڈٹ کرکے روزنامہ سیاست میں شائع کیا۔ اس معروضہ میں راۓ مرلیدھر نے لکھا۔

"..... اس نصیحت عظمیٰ کو اپنے اسلاف کے قدم بقدم خُدا کے شکر کے ساتھ نباہتے چلیے ورنہ خطرناک دن دیکھنا پڑے گا۔ استحکام سلطنت کے لیے رعایا کی فارغ البالی لازم و ملزوم ہے جو کچھ آپ کر رہے ہیں غلط کر رہے ہیں۔ کچھ کسی کو دے کر خوش ہوئیے لے کر خوش نہ ہوئیے۔ خُدا نے اپنے فضل سے آپ کو کیا نہیں دیا۔ بے کسوں کو پریشان کرنے سے بہتر یہ ہے کہ سارے شرفا کو بیک وقت گولی کا نشانہ بنادیا جاۓ۔ کوئی آپ کا دشمن نہیں۔ یہ دولت بے مصرف آپ کی خطرناک دشمن ہے اس کو صرف فرمادیجیے ظل اللہ کی ذاتی قابلیت خطرناک اوقات میں سازگار نہ ہوگی"۔

سننے میں آیا کہ میر عثمان علی خان نے جن کا کہا اس وقت قانون تھا اپنے اعلیٰ ظرف کو کام میں لاتے ہوۓ اس تحریر کی تلخی کو برداشت کیا اور اس جذبۂ وفاداری کی قدر کی جو معروضہ کے ہر لفظ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ آیا ایسی تحریر جمہوری دور میں کوئی شخص کسی وزیر اعظم یا کسی چیف منسٹر کو لکھ سکتا ہے اور آیا کوئی وزیر اعظم یا کوئی چیف منسٹر ایسی سخت تحریر کو اسی طرح برداشت کرسکتا ہے جیسے کہ حضرت آصف سابع نے برداشت کیا۔ انھوں نے CORRUPTION کو دور کردیا اور کئی سال بعد بھی اپنی چھوڑی ہوئی دولت کو ٹرسٹوں کی شکل میں صرف فرمادیا۔

آخری تاجدار نواب میر عثمان علی خاں کی علم دوستی' علمی سرپرستیوں' ان کی شاعری ان کی علم طب سے دلچسپی اور ایسے ہی بیسیوں موضوعات۔ میں سے ہر ایک پر تحقیقی کام ہو سکتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ لیکن ان کی جس بات نے مجھے بہت متاثر کیا وہ ان کا

طرزِ عمل اور ردِ عمل تھا جس کا اظہار انھوں نے حکومت کھو دینے کے بعد کیا۔ ایسی دو ہی مثالیں ملتی ہیں، جب اورنگ زیب نے گولکنڈہ فتح کیا اور مغل افسر مختار خاں اور اللہ خاں ابوالحسن تانا شاہ کو گرفتار کرنے گئے، تو ابوالحسن نے نہایت خاطر جمعی کا اظہار کیا۔ جب ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی برسراقتدار آئی تو محترمہ اندرا گاندھی نے سنجیدگی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ پولیس ایکشن کے بعد حضور آصف سابع نے اپنے آپ کو نہایت خوبی سے ADJUST کیا۔ کبھی ان کے استقلال اور روایتی انداز میں فرق نہ آیا۔

حضور آصف سابع سے میرے خاندان کے قریبی روابط رہے۔ میں بچپن سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ ان کی سالگرہ اور عیدین کے موقع پر ہم سب اہلِ خاندان کنگ کوٹھی جا کر ان سے ملتے اور سلام کے بعد نذر پیش کرتے جو ایک اشرفی اور چار روپیہ پر مشتمل ہوتی پھر وہ کچھ باتیں کرتے۔ جب میں پہلی مرتبہ ان کی خدمت میں گیا تو میری عمر اور تعلیم سے متعلق استفسار فرمایا۔ وہ اپنے پاس آنے والوں سے شخصی طور پر واقف رہتے اور اکثر نام بھی یاد رکھتے۔

بچپن ہی میں میں نے سالار جنگ کے حالات بہت سنے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جن کو ہم سالار جنگ اول کہتے ہیں ان سے پہلے بھی اس خطاب کے حامل گزرے ہیں۔ میرا اشارہ اس وقت مختار الملک سے ہے۔ ۱۸۵۳ء میں افضل الدولہ کے عہد میں وہ مدار المہام مقرر ہوئے۔ سننے میں آیا کہ اس وقت حیدرآباد کی حالت زبوں تھی۔ جس کا اندازہ امیر علی ٹھگ کے تاثرات سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا:

" سبحان اللہ حیدرآباد ایک نادر جگہ ہے۔ جہاں ہم بلا خوف و خطرہ رہ سکتے ہیں۔ ہر روز یہاں ایک تازہ شکار ہاتھ آتا ہے اسی لیے میں خیال کرتا ہوں کہ ہم کو یہاں زیادہ ٹھہرنا چاہیئے۔ "

بہ سبب بے سرمایگی ریاست ناصر الدولہ اور ان کے وزیر سراج الملک کو انگریزوں سے جو قرض خواہ تھے عاجز ہونا پڑتا تھا اور صدمات دلی برداشت کرنے پڑتے تھے۔

یہ بات بہت مشہور تھی کہ سالار جنگ کے تقرر سے قبل سرکار عالی کو کنٹن جنٹ وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو ساہو پر قرض لیا جاتا تھا اور لاکھوں روپے آمدنی کے تعلقے بطور رہن دیدیے جاتے تھے۔ خود ناصر الدولہ کو شاہی جواہر تک رہن رکھنے پڑے۔

۱۸۵۰ء میں ایک کروڑ کی آمدنی پر عربوں اور پٹھانوں کا قبضہ تھا۔

سالار جنگ نے وزارت کا عہدہ سنبھالتے ہی حکومت کی ساکھ قائم کی۔ ملازمین سرکار کی تنخواہیں وقت پر ملنے لگیں۔ قرض ادا ہو گئے۔ انتظام مملکت میں بہتری پیدا ہوئی رشوت خوری کا سد باب کیا گیا۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں سے لائق افراد کو طلب کیا گیا اور مختلف عہدوں پر ان کا تقرر عمل میں آیا۔ چنانچہ عماد الملک ۱۸۷۳ء محسن الملک ۱۸۷۴ء میں ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی چراغ علی ۱۸۷۷ء میں وقار الملک ۱۸۷۵ء میں حیدرآباد آئے۔

۱۸۸۳ء میں سالار جنگ کا اچانک انتقال ہو گیا ورنہ ان کی اصلاحات کے دور رس نتائج بر آمد ہوتے۔ ان کے فرزند لائق علی خاں بھی مدار المہام رہے۔ لیکن سننے میں آیا کہ لیاقت میں بھی کم تھے اور عمر بھی کم پائی۔ ان کے فرزند یوسف علی خاں مدار المہام ہوئے تو کسی نے تاریخ نکالی: زلیخا ہو کے دیوانی میں یوسف کے گھر آئی

ان کو نوادرات سے دلچسپی تھی۔ موجودہ سالار جنگ میوزیم ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ذخیرہ ایک خاندان کا ذخیرہ ہے بلکہ ایک ریاست کا ذخیرہ ہے۔ چونکہ اس خاندان میں کئی پشتوں تک وزارت رہی اس طرح یہ نادر ذخیرہ یوسف علی خاں کے ہاتھ آیا البتہ یوسف علی خاں کو نوادرات سے خاص دلچسپی تھی۔ نواب مہدی نواز جنگ کی خصوصی دلچسپی اور نواب یوسف علی خاں کے ورثا کے تعاون سے میوزیم قائم ہو سکا۔ حیدرآباد میں کتنے ہی ذخیرے امتداد زمانہ سے بکھر گئے۔

یوسف علی خاں آخری سالار جنگ کو میں نے دیکھا ہے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے سکندرآباد کلب پر مدعو کیا تھا۔ ان سے مختلف موضوعات پر بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ حیدرآبادی کلچر کے معتبر نمائندے تھے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ ان کا مسز سروجنی نائیڈو کا اور جناب سیف الدین شباب کا جنھوں نے سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظموں کے اردو میں منظوم ترجمے کئے ایک ہی دن انتقال ہوا۔

عماد الملک کے متعلق کافی باتیں سننے میں آئیں۔ وہ ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد آئے وہ شہ عالم تھے اور علمی کاموں کی سرپرستی کرتے تھے۔ انھوں نے خسرویات میں خاص دلچسپی لی اور نواب اسحاق خاں کو اس کام کے لیے مقرر کیا کہ امیر خسرو کے جن جن دیوانوں اور مثنویات کے مخطوطے ملیں ان کو جمع کر کے ایڈٹ کریں۔ جب یہ کام مکمل ہوا اور اسحاق خاں صاحب نے اپنی

تاریخی رپورٹ پیش کی تو امیر خسروؒ کے ان دو دواوین کی طباعت کا اہتمام کیا۔ اس کے لیے مالیہ کی فراہمی میں دلچسپی لی اور اپنی ذات سے بھی اس کام میں حصہ لیا۔

وہ میرے دادا شمس العلما نواب عزیز جنگ ولا سے اکثر ملتے تھے۔ کبھی وہ ہمارے ہاں عزیز باغ آتے اور کبھی دادا صاحب ان کے پاس جاتے۔ علی یاور جنگ مرحوم جو عماد الملک کے لائق نواسے تھے مجھ سے فرماتے تھے کہ عماد الملک کی ڈائریوں میں دادا صاحب کی ہر ملاقات اور کس موضوع پر گفتگو ہوی اس کا بھی ذکر ہے۔

دادا صاحب کے مشورے سے دائرۃ المعارف کی ابتدا کی۔ انھوں نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کا کام بھی شروع کیا تھا۔ پندرہ پارے مکمل کیے۔ ہر کام کو اعلیٰ معیار سے کرنے کی عادت تھی۔ اس ترجمہ شدہ حصے کے دو سو نسخے طبع کروائے تاکہ مختلف اہلِ علم حضرات کو بھیج کر ان کی رائے منگوائی جاسکے۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ میرے پاس بھی ہے اس کو دیکھتا ہوں اور دیگر انگریزی تراجم سے جو بہت مقبول ہوے مقابلہ کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اگر عماد الملک زندگی میں کوئی دوسرا کام نہ کرتے اور صرف اسی ترجمہ کو مکمل کر دیتے اور بڑے پیمانہ پر اشاعت کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

ریاست حیدرآباد کی تاسیس حضرت آصف جاہ اول کے ہاتھوں ہوی جو اورنگ زیب کے تربیت یافتہ تھے اور صاحب علم تھے۔ پائیگاہ کے امیر نواب محمد فخر الدین خاں بھی بہت بڑے عالم تھے۔ ان کی علم دوستی اور علمی سرپرستی کی بہت سی باتیں سننے میں آئیں۔ مغربی زبانوں سے علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی پہلی کوشش انھوں نے کی اور ان کتابوں کی طباعت کے لیے ایک لیتھو کا مطبع بھی قائم کیا۔ ہندوستان میں لیتھو کی طباعت کی ابتدا ۱۸۴۱ء کے لگ بھگ ہوی تھی اور ۱۸۴۰ کے لگ بھگ نواب محمد فخر الدین خاں نے اپنے ذاتی سنگی پریس کی ابتدا کی۔

حیدرآباد کے اعلیٰ اور حکمران طبقے کے اکثر و بیشتر اصحاب عالم اور علم دوست تھے۔ نواب رفعت یار جنگ اول ایک بڑے عالم تھے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۷۵ء میں اعلیٰ تعلیم مادری زبان میں دینے کی تحریک کی اس طرح جامعہ عثمانیہ کے قیام کے تخیل نے جنم لیا۔ ابتدائی خیال کے ۴۳ سال بعد باضابطہ تحریک چلانے پر ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوا۔ انہی کے پوتے نواب سر نظامت جنگ تھے۔ مجھے ان سے ملنے اور ان سے استفادہ

کرنے کا موقع ملا۔ وہ انگریزی کے بلند پایہ شاعر تھے، جن ہندوستانیوں نے انگریزی میں اعلیٰ درجہ کی شاعری کی ان میں ہم کو صرف تین نام ملتے ہیں۔ رابندرناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو اور سر نظامت جنگ۔ سر نظامت جنگ دوسرے دو ہمعصر شاعروں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ انھوں نے اسلامی موضوعات کو اپنی انگریزی نظموں کا عنوان بنایا اور اسلامیات پر انگریزی نثر میں بھی لکھا۔ مجھے ہر اتوار کو ملنے کی اجازت دی تھی۔ اپنی تخلیقات سناتے تھے اور نصیحت آمیز باتیں کرتے تھے۔ نہایت وضع دار تھے۔ کبھی سفارش کرتے اور نہ سفارش سنتے تھے۔ میری ملازمت کے ابتدائی دور میں مجھے ایک سفارشی خط لکھا جو یقیناً ایک استثنائی شکل تھی۔ مضمون کچھ اس طرح تھا۔ اگر کوئی امر مانع نہ ہو اور اگر ضابطہ اجازت دے تو حاملِ ہذا کی جائز اور قانونی مدد کریں۔

حیدرآباد میں باہر سے آنے والوں میں بڑے بڑے شاعر بھی تھے اور عالم اور ادیب بھی۔ مولوی چراغ علی ایسے ہی ایک پایہ کے عالم تھے۔ ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد آئے۔ بڑی خدمتوں پر مامور رہے اور اہم سرکاری فرائض انجام دیئے۔ اس کے باوجود علمی کاموں کے لیے وقت نکالا کرتے تھے۔ سننے میں آیا کہ جب کبھی مخالفین اسلام علم و دانش کے نام پر جہالت و شرارت کا مظاہرہ کرتے تو یہ سینہ سپر ہو جاتے اور ان کے مدلل جواب دیتے۔ اس کام میں انھوں نے غلام احمد قادیانی کی بھی مدد کی اور ان کو مواد فراہم کیا۔ انھوں نے تحقیق الجہاد ۱۸۸۵ء میں لکھی۔ سیرت پر ایک کتاب محمد دی ٹرو پرافٹ لکھی۔ اعظم الکلام فی ارتقاء اسلام ۱۸۸۲ء میں لکھی۔ یہ سب کتابیں انگریزی میں لکھیں جب کہ ان کی عمر ۳۵، ۳۶ سال تھی۔

ان کا ایک بڑا ذاتی کتب خانہ تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو حکومت حیدرآباد نے اس کو خرید لیا اور اس طرح کتب خانہ آصفیہ کی بنیاد پڑی۔ یہ کتب خانہ پہلے اس جگہ تھا جہاں صدر شفاخانہ ہے۔ بعد میں کتب خانہ آصفیہ کی موجودہ عمارت تعمیر ہوئی۔

مولوی چراغ علی کی کتابیں اعلیٰ معیاری اور علمی حلقوں میں مقبول ہیں۔ بچپن سے ان کتابوں کے بارے میں سنتا رہا۔ جب ان کتابوں کو پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو ان کی حقیقی عظمت اور اہمیت کا اندازہ ہوا۔ آج کل یہ کتابیں ناپید ہیں۔ میں نے ان کتابوں کو دستیاب ہوسکیں دوبارہ اشاعت کا انتظام کیا۔

مولوی مہدی علی (نواب محسن الملک) ۱۸۷۴ء میں حیدرآباد آئے۔ دفتر مال کے

منتخب افراد کی طرح یہ بھی سر سید احمد خاں کی سفارش پر حیدرآباد آئے اور اہم خدمات انجام دیں۔

سننے میں آیا کہ ان ہی کی کوششوں سے ۱۸۸۴ء میں بجائے فارسی کے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ انھوں نے "تہذیب الاخلاق" میں اعلیٰ پایہ کے مضامین لکھے۔ انگریزی کتابوں کا ترجمہ کروا کر مطالعہ کرتے۔ عابد روڈ پر ان کی کوٹھی تھی جس میں بعد میں ہزیکا جی ہوٹل قائم ہوئی اب شاید تھری ایس ہوٹل ہے

سننے میں آیا کہ ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد آئے۔ ان کی آمد میں علمی شان تھی۔ انگریز حکمرانوں کا ایک طبقہ مغربی علوم کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ حیدرآباد میں امیر پائیگاہ نواب محمد فخر الدین خاں بھی اسی کوشش میں تھے۔ نذیر احمد نے ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا تو وہ نواب فخر الدین خاں کے فرزند محمد رفیع الدین خاں کے پاس پیش ہوا۔ چناں چہ سر سید احمد خاں کے توسط سے ان کو بلانے کی تحریک ہوئی۔

حیدرآباد میں آٹھ سال کے قیام کے دوران سنا کہ انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور تلگو زبان سیکھی۔ انھوں نے اردو ناول بھی اس دوران ضرور لکھے ہوں گے لیکن غالباً سرکاری مصروفیات کی وجہ سے ان کی طباعت نہ ہو سکی۔ البتہ واپسی کے بعد جلد جلد فسانہ مبتلا، ابن الوقت، رویائے صادقہ، ایامیٰ اور اردو ترجمہ قرآن منظر عام پر آئے۔ ان کتابوں کے خاکے یا ابتدائی مسودے قیام حیدرآباد کے دوران ہی مرتب ہوئے ہوں گے۔

حیدرآباد کے بڑے شاعروں میں میں نے توفیق کا نام بہت سن رکھا تھا اور ان کے اشعار بھی یاد تھے۔ اقبال، توفیق سے متاثر رہے اور کم از کم تین غزلیں ایسی ہیں جو اقبال نے توفیق کی غزلوں کی زمین میں لکھیں۔

لال بہادر شاستری پرائم منسٹر بننے کے بعد ۱۹۶۴ء میں پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے تو انھوں نے ایرپورٹ پر توفیق کا یہ شعر پڑھا: رہے سلامت جو خاکساری کبھی تو اپنی ہوا بندھے گی
کبھی تو اٹھیں گے گرد بن کر کبھی تو اونچا غبار ہوگا

یہ شعر سنا کر شاستری صاحب نے حیدرآباد کے ایک شاعر کو خراج عقیدت بھی پیش کیا، اپنی شخصیت اور مزاج کا اظہار بھی کیا اور ارادے اپنے لگاؤ کا اعلان بھی کیا لیکن ایرپورٹ پر موجود حضرات میں بہت کم یہ جانتے تھے کہ یہ شعر توفیق کا تھا۔

یہ داستان بڑی طویل ہے۔ دیے ہوئے وقت میں جن باتوں کا احاطہ ہو سکا ان کو میں نے پیش کر دیا۔ شاید ان سرسری نقوش سے اس عظمت کا کچھ نہ کچھ تصور آپ کے ذہن میں آسکے جو کبھی حیدرآباد کو حاصل تھی۔ ٥

محمد نور الدین خان

# ڈاکٹر زور کے چند خطوط

جناب سید محی الدین قادری صاحب زور نے یہ چند خط راقم الحروف کے تایا حضرت محمد کریم الدین خاں صاحب مرحوم (تحصیلدار ورنگل) کو لکھے تھے۔ محمد کریم الدین خاں صاحب نواب مشرف جنگ فیاض کے دوسرے فرزند اور نواب عزیز یار جنگ عزیز کے بھائی تھے۔ آپ کی ذہنی نشوونما شعر و ادب کی محفلوں اور اساتذۂ سخن کی صحبتوں میں پروان چڑھی اور پھر خداداد صلاحیت، علمی، ادبی اور تحقیقی ذوق سونے پر سہاگہ۔ آپ کے والد حضرت فیاض کا قیمتی اور نایاب کتب خانہ بھی آپ کے تصرف میں رہا، جس سے خاطر خواہ استفادے کا موقع ملا۔ ملازمت سے وظیفہ کے بعد اپنے مکان واقع قاضی پیٹھ میں کتب بینی میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اپنے دوست جناب عبدالرزاق صاحب بسمل کے رسالہ "شہاب" میں تنقیدی مضامین بعنوان "نقد و نظر" اور "عطارد" کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ آپ نے کئی شعرا کے کلام پر بڑی معرکتہ الآرا تنقید یں کیں جن میں حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی، ماہر القادری، علی منظور، علی اختر، باقی، ہیکش، وجد اور مخدوم وغیرہ شامل ہیں۔ ان تنقیدوں سے آپ کی سخن فہمی و زبان دانی، فن عروض پر عبور، قواعد و صرف و نحو میں غیر معمولی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی تنقیدوں کا مقصد تعمیرِ ادب اور ترقیِ زبان تھا لیکن وہ دکن کے ان فرزندوں میں تھے، جو اپنی تنقیدی صلاحیت سے اہل وطن کے اس احساسِ کمتری کو دور کرنا چاہتے تھے کہ زبان دانی کسی خاص شہر تک محدود ہے اور نہ کسی خاص طبقہ کی میراث ہے۔

تنقیدوں کا یہ سلسلہ "شہاب" میں برسوں چلتا رہا۔

آپ نے قدیم شعرائے حیدرآباد کے حالاتِ زندگی اور ان کا کلام جناب زور کی خواہش پر دستیاب و فراہم کیا تھا اور اس علمی تعاون کا اعتراف و شکریہ ڈاکٹر زور نے "مرقعِ سخن" اور "فیضِ سخن" وغیرہ میں کیا ہے۔ آپ کا انتقال بہ عمر ۹۶ برس اپنے مکان کریم منزل قاضی پیٹھ میں ۱۳ مئی ۱۹۴۹ء میں ہوا۔

جناب زور کے یہ خط ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے آئنہ دار ہیں۔ جناب ڈاکٹر زور نے دکنی ادب اور دکن کے ان قدیم اساتذۂ سخن پر جو پردۂ گمنامی میں روپوش ہو گئے تھے، تحقیقی مقالے لکھے اور اہلِ علم اصحاب سے لکھوایا۔ کس کس طرح مواد اکٹھا کرتے واقف کار اصحاب کو خط لکھتے تھے اور بہ ذات خود جا کر ملاقات کرتے تھے، اس کا تھوڑا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے:

عثمانیہ یونیورسٹی کالج، حیدرآباد، دکن

۱۹ ر شہرادر ۳۶ ف

محترمی و مکرمی!

میں آج کل حضرت فیض علیہ الرحمتہ پر کام کر رہا ہوں۔ ان کے کلام کا انتخاب کر لیا ہے جو فیضِ سخن کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی اور دیگر تصانیف سے متعلق آپ سے بھی مواد حاصل کرنا ہے۔ آپ کو جو کچھ معلوم ہو مطلع فرمائیے۔ ان کی تصویر مل سکے گی یا نہیں؟ اگر تصویر نہ مل سکے تو خطِ ظفر کا نمونہ یا ان کی قلمی تحریر مل سکے تو اس کا عکس لے لیں گے۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر نے فرمایا ہے کہ ان کی بعض کتابیں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ بھی آپ کے یہاں ہوں گی۔ شرحِ فیض اور ایک آدھ کتاب میں نے خود آپ کے یہاں دیکھی تھی۔ بہر حال جو کچھ ہو چند روز کے لیے میرے یہاں بذریعہ شیہ روانہ فرمائیں یا نواب عزیز یار جنگ بہادر کے یہاں روانہ کریں تو ان سے مجھے مل جائے گا۔

مرقعِ سخن کی دوسری جلد چھپ گئی ہے۔ اس میں آپ کی امداد کا شکریہ ادا کیا ہے۔ قریب بذریعہ وی۔ پی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔

جواب کا منتظر ——— آپ کا :

سید محی الدین قادری زور

---

کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

جناب محترم

میں اس اثنا میں علی گڈھ اردو کانفرنس کی شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ ابھی ابھی آیا تو آپ کا کرم نامہ ملا جس میں یاس صاحب اور زور صاحب کے کلام کا نمونہ بھی آپ نے زحمت فرما کر نقل کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ صرف پانچ سال کے گلدستوں سے حاصل ہوا ہے۔ یعنی ۱۳۱۱ھ، ۱۳۱۵ھ اس کے بعد یا قبل کے سنین کے گلدستوں میں بھی کلام ہوگا۔ براہ کرم ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجے اور اگر کچھ ہے تو ضرور روانہ فرمایئے۔

ستیل پرشاد صاحب خرّم کا کلام آپ نے روانہ نہیں فرمایا۔ ان کے کلام کی بھی ضرورت ہے۔

آپ کے یہاں چند کتابیں قدیم دکنی اردو کی ہیں۔ ان پر مضامین لکھنے کی ضرورت ہے یا تو آپ خود توجہ فرمائیں یا چند روز کے لیے میرے یہاں روانہ کریں تو میں ان سے اردو دنیا کو روشناس کروں۔

آپ کا : سید محی الدین قادری زور

۲۹ آذر ۲۶ ف

---

جناب مکرم

مرقع سخن کی دوسری جلد تیار ہو رہی ہے۔ اس میں تراب علی صاحب نزدر اور حفیظ الدین صاحب یاس کے متعلق بھی مضامین شریک رہیں گے لیکن ان کا کلام نہیں مل رہا ہے اگر آپ کہیں سے فراہم کر سکیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔

نواب عزیز یار جنگ بہادر نے فرمایا ہے کہ آپ کے یہاں گلدستۂ فیض اور دیگر [illegible] کلام

نقل فرماکر روانہ فرمائیں تو عین عنایت ہوگی اور خود مضامین میں بھی آپ کی اس امداد کا تذکرہ رہے گا۔

امید کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا : سید محی الدین قادری زورؔ

۱۰-۱-۴۶ ف

Dr. Zakir Hus... Jamia N...

---

رفعت منزل۔ خیریت آباد

۱۷ر اسفندار ۴۶ف

جناب محترم

عرصہ ہوا کہ آپ نے عنایت فرماکر حفیظ الدین صاحب پاس کی غزلیں روانہ فرمائی تھیں اور وعدہ فرمایا تھا کہ تراب علی صاحب زورؔ اور ستیل پرشاد صاحب محترم کا کلام بھی روانہ کریں گے۔ میں منتظر ہوں۔ ان میں سے جس کا جو کلام بھی مل سکے ضرور زحمت فرماکر روانہ فرمائیں۔ میں منتظر ہوں۔ مرقعِ سخن کی دوسری جلد کا کام طباعت شروع ہو رہا ہے۔ اس بارے میں کوئی مشورہ بھی عنایت کریں تو ہم مستفید ہوں گے۔

آپ کے یہاں بعض دکنی قدیم کے دیوان بھی تھے۔ ان پر مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ان کو چند روز کے لیے نواب عزیز یار جنگ بہادر کے توسط سے روانہ فرمائیں تو یوم ولی کے سلسلہ میں جو نمائش سٹی کالج میں ہو رہی ہے، اس میں بھی پیش کریں اور آپ اجازت دیں تو مضمون بھی لکھا جا سکتا ہے۔ جواب کا منتظر

آپ کا : سید محی الدین قادری زورؔ

---

رفعت منزل، خیریت آباد

۶ر مہر ۴۶ف

جناب محترم

کرم نامہ کا شکریہ، عربی کتابیں ڈاکٹر نظام الدین صاحب ہی کے یہاں ہیں۔ قریب میں ان سے لے کر ان پر نوٹ لکھ لوں گا۔ آپ کے یہاں حضرت

فیض کی اردو و فارسی کتابیں متن شمس الدین اور شرح شمس الدین میں نے خود دیکھی تھیں۔ یہاں کی جلد بندی وغیرہ میں دیر لگے گی۔ براہ کرم آپ خود ان کے موضوع، تعداد صفحات، مطبع، تاریخ تصنیف و طباعت کے متعلق نوٹ لکھ کر جلد میرے یہاں روانہ فرمائیں۔ اگر ہر دو کتابوں کی عبارتوں کا بھی کچھ نمونہ نقل کر کے ارسال فرمائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ کتاب فیض سخن چھپ گئی ہے صرف میرا مقدمہ ان معلومات کی وجہ سے رُکا ہوا ہے۔ اگر اور کوئی امور آپ کو فیض صاحب کے متعلق معلوم ہوں تو ضرور مطلع فرمایئے۔ میں ممنون ہوں گا اور حضرت کی روح خوش ہوگی۔ ان کی مزار کی تصویر بھی چھاپ رہا ہوں۔ ان کی تحریر ہو تو بھیجئے یا اس کی فوٹو ـــــ بہرحال آپ جلد مدد فرمائیں۔

جواب کا منتظر : سید محی الدین قادری زور

۶ر مہر ۱۳۴۶ف

---

صفحہ ۳ کا سلسلہ :　　**اپنی بات**

اعتراف میں ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں انھیں ایک پبلک پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر شہریار کے تاثرات سفر 'سب رس' کی کسی آیندہ اشاعت میں پیش کریں گے۔

اس بار ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اردو کے نامور جدید شاعر جناب بلراج کومل کو دیا گیا۔ اس اعزاز کے لیے ہم انھیں دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

(م۔ ش)


**مطبوعات ادارۂ ادبیات اُردو**

برق و آشیاں از: سعید شہیدی ۵/ روپے

اُردو انسائیکلوپیڈیا از: ادارہ ۴/ روپے　　عروض از: کلیم اللہ حسینی ۲/ روپے

بلاغت از: کلیم اللہ حسینی ۲/۵۰ روپے　　تعلیم کا مسئلہ از: ڈاکٹر رضی الدین صدیقی [illegible]

ملنے کا پتہ : ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔

رشید قریشی

# خواجہ حمید الدین شاہد

فرصت باد کہ دیوانہ نواز آمدۂ (حافظ)

(آئے ہو تو اب جانے کی جلدی نہ کرو کیوں کہ اپنے ایک دیوانے سے ملنے آئے ہو۔)

خواجہ حمید الدین شاہد سے میری پہلی ملاقات اسی رفعت منزل میں ہوئی تھی آج تقریباً ۴۵ سال بعد ہم پھر وہیں مل رہے ہیں لیکن اِس ملاقات اور اُس ملاقات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت جو ملے تھے تو ایسا محسوس ہوا تھا اب ہم جُدا نہ ہوں گے کیوں کہ اس ملاقات کا نقشہ ہی کچھ ایسی مستحکم بنیاد پر مرتب ہوا تھا کہ جدائی کے تصور تک کے لیے گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔

ہوا یوں تھا کہ گرمی کی چھٹیوں کے لیے جامعہ بند ہوئی تو ڈاکٹر زور اپنے ساتھ رفعت منزل لے گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی تو ڈاکٹر زور نے حمید الدین شاہد کو آواز دی۔ وہ آئے تو انھوں نے کہا:

"یہ بھگوڑا اب تمہاری تحویل میں ہے۔ اسے اپنے کمرہ میں بند رکھو۔ اس سے روزانہ ایک افسانہ لکھوانا اور جب تک اس کے افسانوں کا مجموعہ شائع نہیں ہو جاتا اسے اس چار دیواری سے باہر قدم نہ رکھنے دو۔ اس ناگہانی گرفتاری نے مجھے پریشان کر دیا تو ڈاکٹر زور نے تسلی دی۔ "تمہارے والدین کو تمہاری خیر و عافیت کی اطلاع وقتاً فوقتاً دی جاتی رہے گی"۔

میں نے حمید الدین شاہد کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر دو کیفیتوں کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ ایک کیفیت کہہ رہی تھی۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ اور دوسری کیفیت متنبہ کر رہی تھی۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

میں سہما سہما حمید الدین شاہد کے کمرہ میں گیا تو انھوں نے اپنی شفقت کی وسعتیں مجھ پر کھول دیں: "یہ پلنگ میرا ہے۔ وہ پلنگ آپ کا ہے۔ البتہ آپ کے پلنگ پر زعم صاحب کے والد حضرت زعم صاحب کبھی کبھی دن میں استراحت فرمایا کریں گے۔"

اتنے میں ایک گول مٹول، سرخ و سفید، چلبلا بچہ چھڑی گھماتا ہوا اندر آیا۔

"یہ مائی ڈیئر بلا کون ہے؟"

میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ ڈاکٹر زور کی آواز آئی۔

"عنایت پاشاہ وہ کل کی بات پوچھا" اور عنایت پاشاہ نے کل کی بات دہرادی:

"اجاڑ صورت۔" ڈاکٹر زور کا قہقہہ بلند ہوا۔

"عنایت پاشا کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میری تعلیم ہے۔"

اسی وقت زعم صاحب تشریف لائے، پہنچتے ہی انھوں نے پوچھا۔

"شادی ہوگئی تمہاری؟" میں نے نفی میں گردن ہلادی۔ زعم صاحب کے چہرے پر ناگواری نمایاں ہوگئی۔

"حمید الدین شاہد شادی نہیں کرتا، تم بھی غیر شادی شدہ ہو۔ یہ کیا ہوگیا ہے تم دونوں کو؟" حمید الدین شاہد نے بات کو ہنسی میں اڑادیا۔

"حضرت قبلہ شادی کی جلدی کیا ہے۔ پڑھیں گے، لکھیں گے، بڑے ہولیں گے۔۔"

زعم صاحب نے ٹوک دیا۔ "اور کتنے بڑے ہوں گے؟"

حمید الدین شاہد نے کہا۔

"بڑے ہونے سے مطلب ہے جب خوب کمائیں گے، بڑا بنگلہ بنائیں گے، پھر شادی کریں گے۔"

زعم صاحب پوچھتے: "اگر اس وقت تک تمہاری جوانی رخصت ہوگئی تو؟"

حمید الدین شاہد اپنی جوانی کی پائیداری پر یقین کا اظہار کرتے ہوئے موضوع بدل دیتے۔

"جوانی کو بے قابو نہ ہونے دیا جائے تو وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی اور حضرت قبلہ نظام آباد سے کچھ لوگ آپ کو لے جانے آئے تھے۔"

حضرت قبلہ زیر لب کہتے۔ "اب قطب ہم گیا حیدرآباد میں، اب کہیں نہیں جاتا۔"

کھانے کا وقت ہوتا تو ... اوپر سے خوانِ نعمت نیچے آتا۔ یہ کھانا اس اعتبار کا ہوتا

کہ ہم دونوں سیر ہو کر کھا لیتے۔ حمید الدین شاہد البتہ اپنے آپ کو میزبان سمجھتے اور اپنے حصے میں سے بھی کچھ میری رکابی میں ڈال دیتے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر زورؔ کو اپنے شاگرد رشید کا خیال آتا تو بنگلہ پر سے گھنگھرو بندھی ٹوکری چھم چھم نیچے اترتی۔ اس میں کبھی کوئی پھل ہوتا کبھی کوئی مٹھائی۔ میں پکار کر پوچھتا۔

"یہ کیا میرے لیے ہے؟"

جواب ملتا "تم دونوں کے لیے"۔ حمید الدین شاہد ایک انداز استغنا سے گردن کا اشارہ کرتے

"تم ہی کھا لو"

یہ چھم چھماتی ٹوکری ہمارے اور ڈاکٹر زورؔ کے درمیان ترسیل کا ذریعہ تھی۔ اسی میں ہمارے افسانے اور زورؔ صاحب کے نام آئے خطوط اور پارسل اوپر جاتے۔ زورؔ صاحب کے "فرامین" اور ہدایتیں نیچے اترتیں۔

کام تو میرا زورؔ صاحب کا کھانا اور حمید الدین شاہد کے کپڑے پہننا اور افسانے لکھنا تھا لیکن میں دیکھتا تھا، ڈاکٹر زورؔ اور حمید الدین شاہد صبح سے شام تک دنیا جہاں کے کاموں میں مصروف رہتے۔ مجھے بڑی کوفت ہوتی کہ میں ایک چالو کارخانہ میں جھولا جھولتا رہتا ہوں۔ ڈاکٹر زورؔ کو میرے اس رجحان کا علم ہوا تو انھوں نے ادارے کا کچھ کام میرے تفویض کردیا اور میں بھی اس کارخانہ میں ایک پرزے کی طرح پیوست ہو گیا۔

شام میں میکش آجاتے تو ہم تینوں تفریح کے لیے بنجارہ ہلز کی طرف نکل جاتے۔ کسی چٹان پر بیٹھ کر مغرب کی طرف دیکھتے تو شفق کی سرخیاں رخساروں کے تمتماتے ہجوم کی طرح سامنے ہوتیں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، گنگناتے، گدگداتے گزرتے تو میکش غزل خواں ہو جاتے۔ ان کا ایک شعر تو آج بھی میرے حافظے میں اسی طرح محفوظ ہے، جیسے ان کی جواں مرگی کی یاد!

وہ بھی زمیں پہ آتے ہی بے نور ہو گئے
تارے اڑا کے لائے تھے کچھ آسماں سے ہم

میں غزل کے جادو میں دو، دو، تین تین دن مبتلا رہتا لیکن خواجہ حمید الدین شاہد کو دیکھتا کہ وہ دوسری ہی صبح غزل کے اثر کو جھٹک کر ایک تازہ دم مشینی پرندہ کی طرح متحرک ہو جاتے اور کام کی ایسی بے پناہ صلاحیت اور استعداد کا مظاہرہ ہوتا کہ سوچنا پڑتا

کہ آخر کتنے حمید الدین شاہدوں کو جمع کر کے اس ایک حمید الدین شاہد کو بنایا گیا ہے کہ زمین بھی گھومتے گھومتے تھک جاتی ہے یہ شخص نہیں تھکتا۔ نہ اس کی تیوری پر بل نہ اس کی زبان پر شکایت۔ کام کے دوران وہ کبھی سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگتے۔ یہ ان کے سوچنے کا انداز تھا اور میں حیران رہ جاتا کہ آخر وہ کس بلندی کو تاک رہے ہیں!

ادھر میں ٹھہرا ایک دن رات کا "خواب بین" افسانوی دنیا کا باسی۔ میرا اور خواجہ حمید الدین کا ساتھ' تین پاؤں کی دوڑ کے لیے پاؤں بندھے کچھوے اور خرگوش کا ساتھ تھا۔ وہ کام میں منہمک رہتے اور میں سوچتا رہتا میں کیا کروں! ڈاکٹر زور اپنا ہنٹر کڑکاتے۔ "یہ کیا بھولوں کی طرح اونگھتے بیٹھے رہتے ہو' اور کچھ کام نہیں تو یہ ڈسٹر لو اور کتابوں پر سے دھول جھٹکو یاد رکھو۔ حرکت حیات ہے۔"

اور مجھے حمید الدین شاہد کے مسکراتے ہونٹ اور ان کی شگفت مسکراتے والی آنکھیں بھی یاد ہیں۔ وہ کام کرتے کرتے مسکرا اٹھتے اور زور صاحب ٹوکنا بھی چاہتے تو رک جاتے میری طرف دیکھ کر کہتے۔

"اسے دیکھو! کتنی اجاڑ صورت بنا کر لٹکتا بیٹھا ہے۔ ارے تجھے حمید الدین شاہد کی طرح مسکراتے مسکراتے خوش دلی سے کام کرنا کیوں نہیں آتا؟"

میں رنجیدہ ہو جاتا تو کہتے۔ "ارے اس جلی صورت پر کون عاشق ہوگا! ذرا آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر مسکرانے کی مشق کیا کر۔" اور جلد ہی اس مشق کو آزمانے کا موقع مل گیا۔

پونہ سے ایک دیشپانڈے صاحب اپنی بیٹی کے ساتھ ڈاکٹر زور سے ملنے آئے۔ یہ لڑکی اپنے باپ کی بیٹی نظر نہیں آتی تھی۔ کسی مجسمہ ساز کی تخلیق دکھائی دیتی تھی۔ وہ ڈاکٹر زور کی نگرانی میں اردو میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتی تھی۔

بات چیت کا مرحلہ ختم ہوا تو دیشپانڈے صاحب جانے کے لیے اٹھے۔

"ڈاکٹر صاحب میں آج ہی پونہ واپس جا رہا ہوں۔ اب یہ میری بیٹی آپ کی ہے۔ وہ یہیں آپ کے پاس رہے گی۔"

ڈاکٹر زور جو گلابوں کا گلدستہ بنے ہوئے تھے' خشک ریت کا ڈھیر ہو گئے۔

انھوں نے میری طرف [illegible] خواجہ حمید الدین شاہد کو مسکراتے [illegible]

مسکراتا ہوا لڑکی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر زور نے متاسف اور معذرتی لہجے میں کہا۔ "ویشی پانڈے صاحب! گھر آپ کا ہے۔ آپ کی صاحبزادی چاہیں تو یہاں رہ سکتی ہیں۔ لیکن فی الوقت ریسرچ روم میں دو نوجوان کنوارے اسکالر ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

ویشی پانڈے اور ان کی صاحبزادی رخصت ہو گئے تو زور صاحب مجھ پر برس پڑے۔

"تم کیوں آ گئے تھے اجاڑ صورت۔ اُدھر ہمارہ ہاتھ میں تم کو کوئی نہیں ملتا مسکرا مسکرا کر دیکھنے کے لیے۔ دیکھو حمید الدین شاہد اِدھر آیا؟"

میں نے زیرِ لب کہا: "وہ تو سنیاسی ہیں۔"

ڈاکٹر زور حمید الدین شاہد کو سراہتے۔

"کام کی لگن میں سنیاسی ہی بننا پڑتا ہے۔ تب کام ہوتا ہے۔ سنے بیوقوف صاحب۔"

اور میں بیوقوفوں کی طرح منہ لٹکائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر زور نے مجھے پکارا۔

"ارے کہاں ہے رشید قریشی' ارے اِدھر آ' میں تیرے نام کا عاشق تجھے پکار رہا ہوں۔ رشید قریشی...' میں بگڑتا منتا' ان کے سامنے جا کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر زور نے میری طرف پاندان دھکیل دیا۔

"زندگی کو محبوبہ سمجھو اور اسے حاصل کرنے کے جتن کرو' بس' لو۔ پان کھاؤ۔"

حمید الدین شاہد پہ ڈاکٹر زور نے سارے کاموں کا بوجھ ڈال دیا تھا۔ ایک کام ہوا نہیں کہ دوسرا' پھر تیسرا۔ آخر میں تو کہنے لگے تھے۔

"میں کام دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔ یہ حمید الدین شاہد کس مٹی کا ہے کہ کام کرتے رہتا ہے اور تھکتا نہیں۔ لوگ اس پر بھروسہ کریں گے' اسے چاہیں گے'... معشوقہ کی طرح...'

ایک کے بعد ایک منزل ایسی بھی آئی کہ ڈاکٹر زور کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی' حمید الدین شاہد اپنی زور شناسی کے زور سے بھانپ لیتے' اب کون سا کام آنے والا ہے اور اس کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ ڈاکٹر زور کی اسی تربیت کے زیرِ اثر انھوں نے شاید زندگی کے گلشن سے صرف تین پھول چنے۔ جو ان کے فرزند' چمن اور 'ثمر' گلشن کے کاروبار کے لیے وقف ہو گئے۔

پھر ہمارے راستے بدل گئے۔ منزلیں بدل گئیں۔ زمین و آسمان بدل گئے۔ لیکن ——— حمید الدین شاہد نہیں بدلے ——— یہی وجہ ہے کہ اتنے برسوں بعد بھی وہ آئے ہیں تو ہر دل کے دروازے ان پر اس طرح کھلے ہیں ——— جیسے ایک سفیرِ محبت اپنے وطن سے پردیس گیا اور پردیس کو اپنا وطن بنا کر، پھر اپنے وطن لوٹ آیا۔

انقلابوں کو سہتے ہوئے، زندگی کو ہر موڑ پر سلام کرتے ہوئے، اب جو انھوں نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا ہے تو محبت کو محبت دینے والے دل یہ ماننے کے لیے آمادہ نہیں کہ وہ کبھی یہاں سے گئے تھے ——— اور اب پھر یہاں سے جانے والے ہیں۔ ٭

(پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کے خیر مقدم کے لیے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی جانب سے منعقدہ جلسے (۱۵ دسمبر ۸۵ء) میں پڑھا گیا۔)

---

سلسلہ ص۴۸ سے آگے: **اردو نامہ**

۲۶ دسمبر: صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی کے سالانہ اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو تحریکِ آزادی کی زبان ہے اور اس زبان کا فروغ ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ اس موقع پر مسٹر جی نارائن راؤ اسپیکر نے بھی مخاطب کیا۔ جناب سید وقار الدین صدر اکیڈمی نے خیر مقدمی خطاب کیا۔

۲۷ دسمبر: ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی کا سالانہ اجلاس صدر مرکزی کمیٹی جناب سید وقار الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں آندھرا کے علاوہ تامل ناڈو، کرناٹک، کیرالا، گوا اور مہاراشٹرا کے مندوبین نے شرکت کی اور اردو کے مسائل پر رپورٹ پیش کی۔ صدر جلسہ نے کہا جنوبی ہند میں اردو کے لیے مقابلتاً بہتر فضا پائی جاتی ہے کیوں کہ ان علاقوں زبان سے تعلق رکھنے والے اُردو سے فکر و کار جہان نہیں رکھتے۔ اس موقع پر جنوبی ریاستوں میں اردو کو دوسری زبان قرار دیئے جانے کے باب میں قرارداد بھی منظور کی گئی۔ جناب اکرام جاوید جنرل سکریٹری نے رپورٹ پیش کی۔

۲۸ دسمبر: حیدرآباد اسوسی ایشن نے جناب حسن چشتی کے اعزاز میں محفلِ شعر آراستہ کی۔ صدر مشاعرہ امیر احمد خسرو کے علاوہ سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، قیراط ندیم، ڈاکٹر افرخندہ لیقؔ، صلاح الدین نیر، رؤف ساختر، محمد منظور احمد، فیض الحسن خیال، ڈاکٹر یم بی قمر، صادق نقوی، جوہر ہاشمی اور راجہ لال راجہ نے کلام سنایا۔ ٭

وقار خلیل

# اُردو نامہ

## اردو کی علمی ادبی وتہذیبی خبریں

یکم دسمبر: اردو گھر میں جواں فکر شاعر منیر الزماں منیر کے مجموعۂ کلام "شفق رنگ" کی رسم اجرا جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کے ہاتھوں انجام پائی۔ جناب سید مکرم شاہ سابق صدر نشین قانون ساز کونسل نے صدارت کی۔

• حیدرآباد لٹریری فورم کی طرف سے مہمان اہلِ قلم احباب پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد اور جناب اعجاز حسین کھٹا کا پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ صدر حلقہ پروفیسر مغنی تبسم نے صدارت کی۔ جناب شاہد نے اس موقع پر پاکستان میں رفتارِ ادب پر مخاطب کیا اور ہند پاک دوستی کے تقاضوں پر زور دیا۔ جناب کھٹا نے دکھنی کلام سنا کر استقبالیہ کی رونق دوبالا کی۔ غیاث متین نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

• مسٹر جی نارائن راؤ اسپیکر آندھرا پردیش نے اربابِ شعر و ادب کے ایک اجتماع میں کیشور چندر عالم فیض آبادی کے مجموعہ کلام "دل کے تار" کی رسم اجرا انجام دی۔

• نامور فلم اسٹار دلیپ کمار نے رویندرا بھارتی میں "غزل فیسٹول" کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ غزل اردو زبان اور مشترکہ تہذیب کی روشن تر علامت کا نام ہے۔ میوزک ڈائرکٹر اقبال قریشی نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ حیدرآباد کے معروف موسیقاروں و غزل سراؤں، رکن الدین خان اطہر، حبیب علوی، امیر محمد خاں اور حکیم راگی نے غزلیں سنا کر سماں باندھا۔

۳؍ دسمبر: بزم اردو چیف انجینئر اور پنچایت راج آفس کے زیر اہتمام شامِ غزل کے موقع پر جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے جریدہ "آبِ رواں" کی رسم اجرا انجام دی۔ معتمد بزم میر احمد علی خاں نے استقبالیہ تقریر کی۔

۵؍ دسمبر: ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی کے تین سالہ انتخابات مرکزی کمیٹی کے صدر جناب سید وقار الدین ایڈیٹر روزنامہ "رہنمائے دکن" کی نگرانی میں منعقد ہوئے۔ پروفیسر سیدہ جعفر صاحبہ بلا مقابلہ صدر ریاستی کمیٹی اور مسرز محمد امان اللہ خاں رائیم ایل اے، ڈاکٹر اشرف رفیع، مرزا النصر بیگ، سردار کرتار سنگھ

اور ڈاکٹر بیگ احساس معتمد منتخب ہوئے۔

۷ر دسمبر: ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ایوان اردو میں ادارہ کے دیرینہ رکن اور پاکستان میں ادارہ کے ادبی سفیر پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد اور جناب اعجاز حسین کھٹا کا "ایوان اردو" میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جناب محامد علی عباسی نے صدارت کی۔ جناب رمولال سکسینہ معتمد عمومی نے ہردو مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ جناب رشید قریشی نے پروفیسر شاہد پر خوبصورت خاکہ سنایا۔ پروفیسر محمود حسین، الحاج مرزا شکور بیگ، محترمہ بانو طاہرہ سعید، جناب عبدالوہاب اور محترمہ طیبہ بیگم نے مہمانوں کی حیدرآباد عرصے کے بعد آمد کو باد نو بہار سے تعبیر کیا اور مستقبل میں خوشگوار ہند پاک ادبی تعلقات کی آرزو کا اظہار کیا۔ پروفیسر شاہد نے اپنے ہی ادارے میں ان کے خیر مقدم پر جذباتی انداز میں مخاطب کرتے ہوئے بانی ادارہ ڈاکٹر زور کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ جناب کھٹا نے حیدرآباد، جامعہ عثمانیہ اور حضور نظام پر اپنی متاثر کن کلاسیکی دکھنی نظمیں سنائیں۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۸ر دسمبر: ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کی جانب سے نو تشکیل شدہ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی گورننگ باڈی کے خیر مقدم میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ ریاستی وزیر اوقاف و اردو اکیڈیمی جناب ین فاروق نے خیر مقدمی جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ حکومت نے اردو اکیڈیمی کی گرانٹ دس لاکھ کر دی ہے۔ اس جلسے کی صدارت سید وقار الدین ایڈیٹر رہنمائے دکن نے کی۔ نو تشکیل شدہ اردو اکیڈیمی کے صدر ڈاکٹر شیخ داؤد، مسٹر گردناتھ پرشاد سکسینہ نائب صدر، مسٹر اکرام جاوید، صمد عاطلہ، جناب خلیل الرحمن ڈائرکٹر اکیڈیمی اور جناب نصر بیگ نیز پاکستانی اہل قلم اصحاب پروفیسر شاہد اور جناب اعجاز کھٹا کا اس موقع پر پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور گلپوشی بھی ہوئی۔

٭ اقبال اکیڈیمی نے پاکستانی مہمانوں پروفیسر شاہد اور جناب کھٹا کے اعزاز میں علمی محفل منعقد کی، جس کی صدارت جناب ظہیر الدین احمد نے کی۔

۹ر دسمبر: ریاستی انجمن ترقی اردو نے اردو ہال میں پاکستانی مہمانوں کے اعزاز میں استقبالیہ ترتیب دیا۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان نے صدارت اور سرحواس لاہوتی نے نظامت کی۔

۱۰ر دسمبر: حلقۂ ارباب ذوق (نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری) کی طرف سے پاکستانی مہمان اصحاب کو خوش آمدید کہا گیا۔

۱۱ر دسمبر: عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے پاکستانی

مہمانوں کے خیر مقدم میں ادبی محفل منعقد کی۔ پروفیسر سیدہ جعفر صدر شعبہ اردو نے صدارت کی۔

۱۴ر دسمبر: محفل خواتین کا ماہانہ شعری و ادبی اجلاس محترمہ سعید جہاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نجمہ کمال الدین اور شفیعہ قادری نے نئی نثری تخلیقات پیش کیں اور خواتین شعرا نے کلام سنایا۔

• اردو سبھا کا سالانہ نعتیہ مشاعرہ مولانا عظیم الدین قادری کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ اختر واحدی نے نظامت کی اور راجہ لال راجہ نے شکریہ ادا کیا۔

• دہلی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام سہ روزہ غزل سمینار میں حیدرآباد کی نمائندگی پروفیسر سیدہ جعفر اور وقار خلیل نے کی اور دکنی غزل پر مقالے سنائے۔ جناب مجتبیٰ حسین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۱۵ر دسمبر: آل انڈیا میر اکیڈمی نے پروفیسر گیان چند اور حیدرآباد کی دو خواتین مصنفوں پروفیسر ثمینہ شوکت اور ڈاکٹر لئیق صلاح کو مطبوعات پر میر ایوارڈ کا مستحق قرار دیا۔

• اردو گھر میں پاکستانی مہمانوں پروفیسر شاہد اور جناب سلطانہ کے اعزاز میں علمی محفل جناب سید مکتر شاہ کی صدارت میں ہوئی۔ جناب منوہر راج سکسینہ اور جناب علی احمد جلیلی نے مخاطب کیا۔

۲۲ر دسمبر: سیکولرسٹ فورم کے زیر اہتمام اردو گھر میں یوم ابوالکلام آزاد کو قومی اتحاد تقاریب کی صورت میں منایا گیا۔ جناب صادق علی سابق گورنر تاملناڈو نے صدارت کی۔ مرکزی وزیر محنت مسٹر ٹی انجیا کے علاوہ پروفیسر اشتیاق عابدی، جناب ابوالحسین سحر، جناب محمود انصاری اور مسٹر موہن سنگھ سلوجا نے آزاد کی شخصیت اور فکر و فن پر اظہار خیال کیا۔ جناب سید حسین سکریٹری نے نظامت کی۔ محفل مشاعرہ میں جناب [illegible] سلیم، وقار خلیل، کنول پرشاد کنول، خواجہ شوقؔ، خیرات ندیم، رضا وصفی، صغریٰ عالم، صلاح الدین نیر، داؤد نصیب، اختر واحدی، سعد حسن، محب کوثر، تاج مہجور، راز عابدی اور راجہ لال راجہ نے کلام سنایا۔

۲۴ر دسمبر: بزم اردو جدہ کے صدر جناب حسن چشتی نے اخبار والوں کو اپنے قیام حیدرآباد کے دوران بتایا کہ بزم کی طرف سے ڈاکٹر شاذ تمکنت کو بعد از مرگ ۵ ہزار روپے کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔

۲۵ر دسمبر: ادبی سنگم کا سالانہ مشاعرہ پروفیسر سیدہ جعفر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کنول پرشاد کنول، غیاث صدیقی، اشرف رفیع، وقار خلیل، تاج مہجور، رومی قادری، رضا وصفی، اختر وحیدی، جوہر ہاشمی اور دیگر شعرا نے کلام سنایا۔

• سلسلہ صفحہ ۴۹ پر

12 / JUL 1986



Dr. Zakir Husain Library
Jam… Nagar
J. M. I. New Delhi

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سن اجرا: ۱۹۳۸ء        فون: ۳۸۹۹۹۰

New Delhi

# ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد: ۵۰    شمارہ: ۲    فروری ۱۹۸۶ء

مدیر اعزازی: مغنی تبسم
شریک مدیر: محمد منظور احمد
معاون مدیر: وقار خلیل

مجلس مشاورت:
صدر: محامد علی عباسی    نائب صدر: ہاشم علی اختر
معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

ارکان

...خاں — پروفیسر گوپی چند نارنگ — محمد اکبر الدین صدیقی — پروفیسر سراج الدین — محمد منظور...

...راج سکسینہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے
نیشنل پرنٹنگ پریس چادرگھاٹ میں چھپواکر
پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد-۴۸۲ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ:
ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو
پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد-۵۰۰۴۸۲
کتابت: اقبال

قیمت فی پرچہ: ۱ روپے ۵۰ پیسے
سالانہ: ۲۰ روپے، کتب خانوں سے: ۲۵ روپے
بیرونی ممالک سے:

ہوائی ڈاک سے
مشرق وسطیٰ: ۱۵ ڈالر
امریکہ: ۲۰ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون: ۱۰ ڈالر
انگلستان: ۸ پونڈ

بحری ڈاک سے
۶ ڈالر
۷ ڈالر
۲ ڈالر
۳½ پونڈ

# مشمولات



★

# وفیات

نیا سال اردو والوں کے لیے ایسا محسوس ہوتا ہے آزمائشوں اور جدوجہد کا سال رہے گا۔ جنوری ۱۹۸۹ء کی ابتدا ہی سے اردو دنیا کو اپنے مخلص ادیبوں اور ممتاز شاعروں کی وفات کے صدمے سے گزرنا پڑا۔ ۲ جنوری کو طنز و مزاح کے ممتاز شاعر جناب ہلال رضوی رامپوری ۷۲ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ اسی دن ممتاز متین بزرگ شاعر جناب رشید احمد رشید، بیدر، کرناٹک میں واصل بحق ہوئے۔ مرحوم کا مجموعۂ کلام "زخم آبرو" مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ۱۰ جنوری کو اردو کی ممتاز شاعرہ محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ لکچرار ممتاز کالج کے شوہر ڈاکٹر ولی اللہ، اسوسی ایٹ پروفیسر ایگریکلچرل یونیورسٹی حیدرآباد بعارضۂ قلب رحلت کر گئے۔ ۱۲ جنوری کو حیدرآباد کے بزرگ شاعر صاحبزادہ [illegible] کا انتقال ہوا۔ جنوری کے [illegible] جناب احمد حسین راشد نقوی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کی ایک کتاب "تمنائی کی حکایات" ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ برصغیر کے ممتاز افسانہ نویس جناب حیات اللہ انصاری ۱۵ جنوری ۸۸ سال کی عمر میں بمقام [illegible] رحلت کر گئے۔ ان کی وفات دنیائے افسانہ کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ [illegible] وہ جن روایات اور اقدار کے پاسدار تھے [illegible] ۱۸ جنوری کو بار [illegible] ممتاز [illegible] شاعر جناب [illegible] کا انتقال [illegible] اردو کی [illegible] طور پر [illegible] [illegible]

(و۔خ)

سعادت سعید

# اسلامی ثقافت کی روح

## (اقبال کا خطبہ پنجم)

فلسفہ انسانی شعور کی ارتقائی تشکیل کا وسیلہ ہے۔ انسانی شعور کی بنیادیں سماجی تجربات میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ فلسفے کا منصب حسی سطح کے انسانی تجربات کو عقلی سطح عطا کرنا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس میں نفسیات، اخلاقیات، جمالیات اور منطق کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعات کے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ بعض فلسفوں کا تفتیشی سائیکل استخراجیت سے استقرائیت کی منزل کی جانب چلتا نظر آتا ہے اور بعض کا استقرائیت سے استخراجیت کی جانب۔ فلسفیانہ طریق کار کی نوعیت ہی کسی فکر کو مفروضاتی اور کسی کو تجرباتی بناتی ہے۔ عہدِ جدید میں جدلیاتی اور مظہریاتی طریق ہائے کار نے فلسفے کی کائنات میں امکانات کے نئے در وا کیے ہیں۔ ہر دو طریق ہائے کار کی وساطت سے استخراجی اور استقرائی میں پھیلاؤ اور توسیع کا انداز نمایاں ہوا ہے۔ ہیگل اور ہسرل دو ایسے نام ہیں، جنھیں فلسفے کی تاریخ میں ارسطو اور افلاطون کی سطح کے مفکر ہی جاننا چاہیے۔ اس عرض داشت سے اس مغالطے کا بھی احتمال ہے کہ مذکورہ فلسفیوں کی فکری صلاحیتوں کی نشان دہی مقصود ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ جس طرح قبل مسیح سے اٹھارویں صدی عیسوی تک فلسفیانہ تحریروں میں افلاطون اور ارسطو کی فارمولیشنز نے اپنی جڑیں پھیلائے رکھیں اسی طرح سے ہیگل اور ہسرل کی فارمولیشنز بھی کئی صدیوں تک فلسفے کو اپنے دائرۂ اثر میں رکھیں گی۔ اگرچہ اس قسم کی پیش گوئی فی نفسہٖ ایک مفروضاتی تشکیل ہے تاہم اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ دورِ جدید کے یہ دو فلسفی کس قدر [illegible]

ان کے ساتھ ہی نئے فلسفے کی ایک اور شخصیت وٹگنسٹائین بھی ہے۔ مارکسزم کو ہیگل نے، وجودیت کو ہسرل نے اور منطقی مثبت پسندی کو وٹگنسٹائین نے بنیادیں فراہم کی ہیں۔ مارکس نے ہیگل کو اور سارتر نے ہسرل کو سر کے بل کی جگہ پاؤں پر کھڑا کرنے کا دعویٰ کیا ہے اور وٹگنسٹائین کے بارے میں تو یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔ ہیگل اور ہسرل کو استخراجیت پسند قرار دیا گیا ہے اور مارکس، سارتر اور وٹگنسٹائین کو استقرائیت پسند۔ چناں چہ فلسفے کا ہر طالب علم یہ سوچنے میں حق بجانب ہے کہ استخراجی اور استقرائی طریقِ ہائے کار کے استعمال کے باوجود فلسفیانہ نتائج مختلف اور جداگانہ ہوسکتے ہیں۔ سو فلسفے کے میدانوں میں ان طریق ہائے کار کے علاوہ فلسفیوں کے ذاتی ویژن اور آؤٹ لک کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ یہ ویژن یا آؤٹ لک فلسفیوں کی مخصوص سماجی، شعوری، سیاسی اور تہذیبی صورتِ حال کے تناظر سے ابھرتے ہیں۔ جب ہم "اسلامی فکر کی تشکیلِ نو" کے حوالے سے لکھے گئے اقبال کے خطبات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں ایک بہت اہم خطبہ "دی اسپرٹ آف اسلامک کلچر" بھی نظر آتا ہے۔ یہ سات خطبوں کی لڑی میں سے پانچواں خطبہ ہے۔ اس خطبے میں انھوں نے استقرائی طریق کار کو خالص اسلامی طریقِ کار قرار دیا ہے اور کھل کر لکھا ہے کہ یونانی استخراجی منطق کے مقابلے میں مسلم مفکرین نے استقرائی منطق کو اپنایا ہے لیکن اس استقرائی منطق کا مطمحِ نظر دہریت اور شرک کا خاتمہ ہے۔ سارتر اور وٹگنسٹائین اسی منطق کے حوالے دہریت کے پرچارک ہیں۔

خطباتِ اقبال کے مطالعے کے دوران ہم پر کھل جاتا ہے کہ باطنی روحانی تجربات، وحی، الہام اور کشف و کرامات کا صحیح مفہوم مذہب ہی کے وسیلے سے واضح ہوسکتا ہے اور مذہب اپنے بطن میں حسی اور تعقلی عناصر کو بھی سمیٹے ہوئے ہے اس لیے علامہ اقبال نے پروفیسر وائٹ ہیڈ کے ہم آواز ہوکر کہا ہے کہ مذہب کا ہر عہد عقلیت کا عہد تھا۔ اقبال نے اپنے خطبات کے ذریعے مغربی دنیا کی اس غلط فہمی کو دور کردیا ہے کہ اسلامی فلسفہ اور فکر یونانی مفروضہ پسند فلسفیوں کی عطا ہے۔ قرآن نے انسانوں کو غور و فکر کرنے کی جو دعوت دی ہے وہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام میں تجرباتی اور عقلی منطق کے دروازے ہیں۔ اقبال نے وجدان کو فکر کی اعلیٰ صورت ٹھہرایا ہے۔ وہ فکر کو جامد نہیں سمجھتے تھے۔ کائنات اور انسان کے رشتے اور تعلق کو فکری سطح پر دریافت کرنا ایک اچھے مسلمان

کے لیے ناگزیر ہے۔ خود فکر کے حوالے سے حاصل ہونے والے علم میں حواسِ پنجگانہ بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ صوفیانہ احساس جس میں مکاشفے اور الہام کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اسے بھی تعقل سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب ہم زمان و مکاں کی حقیقت کے بارے میں اقبال کے تصورات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں ان نظریات سے مکمل اختلاف کیا ہے جو انجماد اور سکون کو حتمی جانتے ہیں۔

نطشے، اشاعرہ، فخر الدین رازی اور سائنسی دبستانِ فکر نے زمان و مکان کے خارجی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے لیکن اقبال ان کے داخلی پہلوؤں کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں وہ پروفیسر وائٹ ہیڈ کی اس تعبیر سے مکمل اتفاق رکھتے ہیں جو انھوں نے نظریۂ اضافیت کی مدد سے کی ہے۔ یعنی وہ کائنات کو ایسے واقعات کا مجموعہ خیال کرتے ہیں جو اپنے اندر مسلسل تخلیقی بہاؤ کی خاصیت رکھتے ہیں۔ زمان و مکان ان کے خیال میں غیر حقیقی یا محض تصوراتی نہیں ہیں بلکہ اضافی اور حقیقی ہیں۔ برگساں زمان کے احساس کے لیے تغیر و حرکت کو اپنا مذہب مانتا ہے لیکن اقبال تغیر و حرکت کو فعلیتِ مطلقہ (کہ جو شعور و ارادہ کی ہی کوئی صورت ہے) کی اساسی صفات مانتے ہیں۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ اقبال وحدت الوجودی نہیں تھے وہ قرآنی حوالوں سے اس مسلک کی تردید کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذات ایسی لامتناہی ہے اور مکان قیاسی۔ وہ حقیقتِ مطلق کا تصور بطور انا کرتے ہیں اور کائنات کے مقصد کو اس کے انکشافاتِ ذات پر محمول سمجھتے ہیں۔ زندگی میں ہر شے کی انفرادیت ان کے نزدیک بنیادی اہمیت کا مسئلہ ہے۔ وحدت الوجودی صوفیا کہتے ہیں کہ انسان کی روح بنیادی طور پر پیدائی ہے۔ وہ عبادتوں اور ریاضتوں کے واسطے سے دنیا میں رہتے ہوئے درجۂ کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ اقبال نے اس روش سے علاحدہ روش اپنائی اور خودی کی مطلقیت کو ذاتِ باری تعالیٰ کی مطلقیت سے علاحدہ قرار دیا۔ قرآن کے نزدیک بھی انسان خدا کا برگزیدہ یعنی خلیفۃ الارض اور ایک آزاد شخصیت کا حامل ہے۔ اس مرحلے پر جبر و قدر کا مسئلہ بھی سر اٹھاتا ہے۔ فلسفے کے دو دبستان جبریہ اور قدریہ دو انتہاؤں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ایک دبستان انسان کو کلی طور پر آزاد مانتا ہے اور دوسرا کلی طور پر مجبور۔ اقبال نے اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ اس مرحلے پر نظریۂ زمان و مکان کو بنیاد

تخیلات بھی سکھاتے ہیں اور امکانات کے لامحدود ہونے کی اطلاع دیتے ہیں۔ یعنی یوں انسان مجبوریوں اور تقدیر پرستیوں کے چنگل سے باہر آتا ہے۔ قرآن میں نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے کہ انسان جسمانی طور پر اس جہان میں لوٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ دنیا میں اپنے شعور سے کام لے کر خیر و شر کے راستے اپناتا ہے۔ موت اقبال کے نزدیک آزمائش کی وہ گھڑی ہے جس میں خودی اپنے تمام اعمال کو جانچ پرکھ سکے گی اور اپنے آپ کو وحدت میں تحلیل کرنے کے لیے اس نے جو کچھ کیا ہوگا اس کا جائزہ لے گی۔ اقبال نے "اسلامی فکر کی تشکیل نو" کے پہلے چار خطبوں میں جن بنیادی مسائل کو چھیڑا ہے ان کے اجمالی جائزے کے بعد پانچویں خطبے میں انھوں نے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے ان میں ختم نبوت کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ یہیں سے اسلام کے استقرائی طریق کار کی گتھی سلجھتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک موروثی بادشاہت بھی روا نہیں ہے۔ قرآن میں عقل و فکر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور عالم فطرت اور عالم تاریخ کو انسان کے علم کا وسیلہ ٹھہرایا گیا ہے۔ اقبال نے ان سب تصورات کو ختم نبوت کے دلائل کے طور پر ہی بیان کیا ہے۔ اس خطبے کی ابتدا میں انھوں نے صوفی اور نبی میں فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صوفی خدا سے وصال کے تجربے کے بعد نوعِ انسانی کو کچھ نہیں دیتا لیکن معراج سے نبی کا لوٹنا تخلیقی ہے۔

'HE RETURNS TO INSERT HIMSELF INTO THE SWEEP OF TIME WITH A VIEW TO CONTROL THE FORCES OF HISTORY AND THERE BY TO CREAT A FRESH WORLD OF IDEALS.'

اسلام کے ظہور کو اقبال نے استقرائی عقل کے ظہور سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام میں نبوت چوں کہ اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی اس لیے اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا۔ حضورؐ کے وجود کی بدولت انسان اور زندگی پر علم و حکمت کے دروازے کھلے۔ اسلام نے بقول اقبال یہ دیکھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور کی تکمیل کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ خود اپنے وسائل کو بروئے کار لائے۔

اسلام کے اس نقطۂ نظر سے سائنسی سوچ اور عقلی تفتیش کے طریق ہائے کار کی

حیثیت حاصل ہوئی لیکن اقبال کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ جذبات کے لیے اس مذہب میں کوئی جگہ نہیں ہے کہ یہاں تو منطق مثبت پسندی کی استقرائی منطق کو ماننا لازم آئے گا۔ جذبات کو اسلام سے نہ خارج کیا جا سکتا ہے نہ یہ ہو سکتے ہیں بلکہ علم کی ہر شکل کو عقلی حوالوں سے پرکھنا ممنوع نہیں ہے۔ چناں چہ اقبال لکھتے ہیں کہ ختم نبوت کے نظریے کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اب کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ نبی ہونے کا دعویٰ کرے۔

اقبال نے اسلامی ثقافت کی روح کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب مسلمانوں نے اس حقیقت کا سراغ لگا لیا کہ کائنات میں حرکت اور ارتقا ہے تو انھوں نے یونانی فلسفے کی کھلی مخالفت کی کیوں کہ یہ فلسفہ استقرائی طریق کار سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا یعنی اس کی بنیاد حقائق کی دریافت کی بجائے نظریات کے نفاذ پر تھی۔ انھوں نے اشراقی اور ابن تیمیہ کی خدمات کا اعتراف کیا ہے جنھوں نے کھلے بندوں یونانی نظریات کی تردید کی۔ ابن حزم کا "ادراک بالحواس" کا نظریہ انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ مغرب کے اس تصور کی تردید کریں۔ تجرباتی طریقِ کار کی ایجاد کا سہرا مغرب کے سر ہے۔ وہ اس ضمن میں البیرونی اور کندی کی خدمات کو بھی سراہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں اگرچہ دیمقراطیسی نظریہ جوہر کو قبول عام حاصل نہیں ہوا تو اس کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ اس نظریے کے وسیلے سے مکانِ مطلق کا اثبات لازم آتا تھا۔ چناں چہ اشاعرہ مجبور ہو گئے تھے کہ وہ نظریۂ جوہر کی بنیاد کو بدل دیں۔ اقبال یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں طوسی نے مکانِ کثیر الابعاد میں حرکت کے اس تصور کو دریافت کیا جو جدید دنیا کی فکر میں جاری و ساری ہے۔ یہاں اقبال نے حرکت اور اضافیت کے ضمن میں آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت پر وائٹ ہیڈ کے نظریے کو ترجیح دی ہے۔ ارتقا کے ضمن میں انھوں نے جاحظ اور ابن مسکویہ کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ جاحظ نے سب سے پہلے ان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا کہ جو نقل مکانی سے جانوروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ابن مسکویہ نے اسے آگے چل کر ایک باقاعدہ اور مرتب نظریے میں تبدیل کیا۔ اقبال عراقی کے ارسطالیسی تعصبات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں

اور کہتے ہیں کہ چوں کہ وہ تحلیل کے طریق کار سے ناواقف تھے اس لیے انھوں نے خدا اور کائنات کے حرکی تصور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریے کو ابن مسکویہ کے اس نظریے نے مزید سہارا دیا کہ زندگی کی حرکات ارتقائی حرکات ہیں۔ ڈاروِن کا نظریۂ ارتقا تو بہت بعد کی پھلجڑی ہے۔ کائنات کے حرکی تصور کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اقبال نے قرآنی آیات سے بھی استدلال کیا ہے۔ سورۃ ابراہیم، الاعراف، آل عمران، التوبہ اور الجمعہ کی مختلف آیات سے انھوں نے قرآن کے تصورِ حرکت اور غور و فکر کی وضاحت کی ہے۔ سورۃ الرحمٰن، المجادلہ اور یونس سے بھی انھوں نے اسلامی ثقافت کی روح سمجھنے میں مدد لی ہے۔ چناں چہ ان ہی کے حوالے سے اقبال نے ثابت کیا ہے کہ قرآنِ پاک نے تاریخ کو علم کا ایک وسیلہ ٹھہرایا ہے اور یہ کہ امتوں اور قوموں کا انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطحوں پر محاسبہ ہوتا ہے اور یہ کہ دنیا ہی میں انسانوں اور قوموں کو اپنی بداعمالیوں کی سزائیں مل جاتی ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں :

" قرآنِ پاک میں بار بار حقائق پر زور دینا اور اس کے ساتھ ساتھ پھر اس امر کی ضرورت کہ آنحضرتؐ کے ارشادات صحت کے ساتھ متعین ہوں اور مسلمانوں کی یہ آرزو کہ اس طرح آیندہ نسلوں کو اکتسابِ فیض کے دوامی سرچشمے مل جائیں۔"

وہ عوامل تھے جن کے زیرِ اثر ابن اسحٰق، طبری اور مسعودی ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ اسلامی تاریخ اور فکر میں زندگی کو بطور وحدتِ نامیہ دیکھنا اور زمانے کو ٹھوس حقیقت جاننا بنیادی نوعیت کے حقائق ہیں۔ فلنٹ کے حوالے سے اقبال نے اسلامی مفکرین کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ یورپ کے سائنسی تصورات کا مآخذ اسلامی فکر و فلسفہ ہے۔ اقبال نے اس خطبے کے آخر میں اسپینگلر کی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا ہے کہ اسلامی تہذیب خالصتاً مجوسی ہے اور یوں بقول اقبال اس نے اسلام کو غلط اور فاسد نظروں سے دیکھا ہے۔ اقبال نے اس ضمن میں اپنے خطبات کے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بہر حال اسلام پر بھی مجوسیت کا ایک غلاف چڑھ گیا تھا ان خطبات میں میری بڑی یہ کوشش رہی ہے کہ مجوسیت کے ان غلافوں کو ہٹا کر اسلام کی حقیقی روح کو قارئین کے سامنے لایا جائے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ مجوسی بہر حال خدایانِ باطل کے وجود کا قائل تھا لیکن اسلام نے تو خدایانِ باطل کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا۔

اس خطبے کی روشنی میں جب ہم اقبال کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں احساس ہو اسلامی ثقافت کی مذکورہ بالا روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے حسنِ فطرت سے مسرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے اسرار و رموز کو منکشف کرتے ہیں۔ عقل و عشق کی درست بنیادوں کی نشان دہی کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں اور حیات و ممات کے فلسفے کی تشریح سے بھی عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کی گتھیاں سلجھاتے ہیں اور حشر و نشر، ثواب و عذاب اور خیر و شر کے معاملات کی علمی اور مذہبی توجیہات بھی عطا کرتے ہیں۔ یہی نہیں انسان، سماج، کائنات اور زندگی کی اجتماعی جڑوں کا سراغ بھی لگاتے ہیں۔ تاریخ، اخلاقیات، سائنس اور مذہب کے تصورات ایک حسین امتزاج کی صورت ان کی نظموں اور غزلوں میں عکس فگن ہیں۔ ذوقِ تسخیر اور خودی کے استحکام کے معاملات ہمہ وقت ان کے سامنے رہتے ہیں۔ اسلامی فکر کی تشکیلِ نو، تسخیرِ نفس، جدید علم و دانش سے استفادہ، فعالیت اور بحث کوش، حرکیت و ارتقا اور انسانوں کے مابین رشتۂ وحدت کی تلاش۔۔۔ یہ وہ معاملات ہیں جو ان کے کلام کو جدید دنیا کے قاری کے لیے راہنمائی کا وسیلہ بناتے ہیں۔

اقبال کے فکر و فلسفہ سے مغربی رجحانات کی اس یلغار کو روکنے میں مدد ملی جس کے نتیجے میں مسلم نوجوان گمراہیوں کی تاریک ترین دلدلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ معقولہ اور خیالی منطق کی بھول بھلیوں سے نکلنا جدید انسان کے لیے ازبس ضروری تھا۔ خطبات اقبال کے وسیلے سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا یوں مسلم شعور کو ارتفاع حاصل ہوا۔ اقبال نے سماجی تجربات سے حاصل ہونے والے تجربات کو رد نہیں کیا۔ انھوں نے جسی سطح کے انسانی تجربوں کو عقلی سطح عطا کر کے مسلم دنیا کے لیے جدید فکر و خیال کے ایسے راستے کی نشاندہی کی جسے صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ ان کے خطبات اور شاعری میں نفسیات، اخلاقیات، جمالیات، سوشیالوجی، تاریخ، طبیعات، مابعد الطبیعات اور دیگر کئی علوم باہمد گر مربوط ہو کر قارئین کی ذہنی کشادگی کے اسباب مہیا کرتے ہیں۔ ان کا تفتیشی سائیکل استقرائیت سے استخراجیت اور پھر اس استخراجیت سے استقرائیت کی جانب رواں دواں رہا ہے اب آپ منطقیاتی طریق کار کی ذیل میں رکھ لیں یا جدلیاتی! نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ اقبال

جدید علوم اور جدید افکار کو نہ تو مکمل طور پر قبول کیا ہے اور نہ ہی رد۔ یہی کلیہ قدیم علوم کے حوالے سے بھی ان پر صادق آتا ہے۔ دہریت اور شرک سے مسلم نوجوان کو بچانا وقت کی اہم ترین پکار تھی۔ اقبال نے اس پکار کو سنا اور ایسے سہ ہمارا راستہ دکھایا وہ راستہ جو فروغِ علوم کا بھی تھا اور ارتقائے زیست کا بھی' جس پر چل کر عقل و عشق کی دوئی کا خاتمہ ہو سکتا تھا' مغرب کو آئینہ دکھایا جا سکتا تھا' مسلم علوم و فنون کی بازیافت ہو سکتی تھی۔ اخلاقی زوال کے ہر چھوٹے بڑے سبب کی بیخ کنی ممکن تھی۔ ستاروں سے آگے کے جہانوں کا سراغ دستیاب ہو سکتا تھا اور یوں نقشِ امکاں ایک نقش پا ٹھہر سکتا تھا۔ مسلم ثقافت ایسی اجتماعیت سے ہمکنار ہو سکتی تھی جہاں جہادہ لالے کے داغ کا فتیلہ بن جاتا' سکڑتے ہوئے ذہن پھیل جاتے' روشن خیالی کا دور دورہ ہوتا' عقل و عشق کی آمیزش سے کائناتی مسائل کی گتھیاں سلجھتیں' فرقہ وارانہ تعصبات سے نجات حاصل ہوتی زندگی خدا اور اس کے رسول ؐ کے احکامات کے تابع ہوتی۔ دنیا سے اسلام سے ذہنی و مادی غربت' ناداری اور افلاس کا خاتمہ ہوتا' حرم کعبہ سبھی کے لیے سب مسلمان ایک ہوتے کلمۂ توحید کے حقیقی معانی سماج اور سماجی نظام میں رائج ہوتے۔

برِصغیر پاک و ہند میں اقبال کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی سامراج اپنے عروج پر تھا۔ مسلمان غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کبھی کبھی حقوق کے لیے جو آواز اٹھائی جاتی تھی وہ دبا دی جاتی تھی۔ اقبال کے سامنے بھی ہر مسلمان فرد کی طرح تین راستے تھے۔ ایک تو ترکِ دنیا کا راستہ کہ حالات کو مجبوری کے تحت اپنی خودی کو بے خبری کے غلاف میں لپیٹ لیا جائے دوسرا راستہ انگریز حکمرانوں سے یا انگریزی تہذیب سے سمجھوتے کا تھا اور تیسرا راستہ حصولِ آزادی کا تھا جو بہت کٹھن تھا یعنی اس پر چل کر ذاتی آزادی کے ساتھ ساتھ اجتماعی آزادی کے لیے بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ اقبال نے یہی کٹھن راستہ اپنایا۔ کسی قوم کی آزادی کے لیے محض شمشیر و سنان ہی کی ضرورت نہیں ہوتی فکر و قلم کے ہتھیار بھی درکار ہوتے ہیں۔ اقبال نے مسلم قوم کو یہ ہتھیار مہیا کیے۔ حرکت' عمل اور تبدیلی کی اقدار پر ان کا مکمل اعتقاد اس کا کھلا ثبوت ہے۔ بیسویں صدی کے وہ فلسفے جن پر عمل کر کے قوموں' انسانوں اور ملکوں نے آزادی حاصل کی تھی وہ حرکت' عمل اور تبدیلی کی قدروں کو مسلمہ جانتے تھے۔ ان کے فلسفۂ خودی کی بنیاد میں مسلم فکر کا تناظر

ستیاب ہو سکتا تھا۔ اقبال کا خطبہ اسلامی ثقافت کی روح ان ہی بنیادی مسائل
رالے سے لکھا گیا ہے اور اسے پڑھ کر قاری کے دل میں مسلم برادری کی تمنا شدت
بیدار ہوتی ہے اور اس کا سر فخر سے تن جاتا ہے کہ دنیا کو سائنسی یا استقرائی منہاج
م ہی کے حوالے سے حاصل ہوا ہے۔ •

---

# بقیہ: اردو نامہ

(صفحے تک : ) ڈاکٹر ایم ایل نگم، صلاح الدین نیر، ناصر کرنولی، رحمٰن جامی،
یا اختر، علی الدین نوید، فیض الحسن خیال اور عزیز التماز ضیا نے کلام سنایا۔
۱۷ر جنوری : پروفیسر محمد حسن (جواہر لال یونیورسٹی دہلی) نے سنٹرل یونیورسٹی میں
نو ادب میں عوامی ادب' پر لکچر دیا۔ پروفیسر مجاور حسین رضوی نے صدارت کی
• "قلم انسو ۸۶ء" میں شرکت کرنے والے ہندی ادیبوں نے ایک جلسہ کو مخاطب
ہوتے کہا کہ "حیدرآباد دکن اردو اور ہندی کا دوسرا گھر ہے"۔
• حیدرآباد کرناٹک لٹریری اسوسی ایشن کی طرف سے رشید احمد رشید مرحوم کی
ں تعزیتی اجلاس منعقد ہوا۔ علی احمد جلیلی، رشید قریشی، منوہر راج سکسینہ، صلاح الدین نیر
یا اختر اور احمد حسین چندا نے رشید مرحوم کے فکر و فن کو خراج عقیدت ادا کیا۔
۲۲ر جنوری : ریاستی اردو اکیڈیمی نے بزرگ صحافی جناب رضا علی کے علاج معالجہ
رض سے ڈیڑھ ہزار روپے کی طبی اعانت منظور کی۔
۲۸ر جنوری : اندرا پریہ درشنی کالج میں وزارت تعلیم حکومت ہند کے ادارہ
اردو بیورو کی طرف سے مرکز آرائشی خطاطی برائے طالبات کا مسز کمود بین جوشی
ر آندھرا پردیش نے افتتاح کیا اور ریاست میں اردو زبان کو نظرانداز کیے جانے
رجحان پر افسوس ظاہر کیا۔ ڈاکٹر حمیدہ بیگم ڈائرکٹر T.U.B.، پروفیسر نوشیدہ
، عثمانیہ یونیورسٹی اور مسز کے او مائچی سکریٹری تعلیمات کے علاوہ مسز جلیل پاشا صدر
تعلیمی کانفرنس نے بھی مخاطب کیا۔ •

ثروت سلطانہ

# اپنے اور وجود کے درمیان...

تم دستک سن کر
باہر اٹھ کر گئے ہو
(کوئی نہیں محض ہوا کا جھونکا)
واہ!
ہواؤں کی کہانی سُنی ہے نا؟
وہی پہچان جیتی پُرانی کہانی
آنکھیں جب کچھ نہ کر سکیں تو دیکھتی ہیں
تم میری آنکھوں میں انتظار رکھ گئے ہو
میں اس کے سوا کون سا موسم دیکھوں؟
چاہتوں کی کلیاں اداس ہو چکی ہیں
اور دُکھ کاغذوں پر ہی پرانے ہو گئے ہیں
کہ میرے وجود کی اُڑان تتلی سے زیادہ نہیں

پُرانے اور نئے خوابوں کے بیچ
اک راستہ ہے
پچھلے موسم میں کاشت کے خواب
سرکنڈوں کا گیت بن گئے
پانی کے بیچ
تنکوں پر ناچتی تتلی
تھک کر نڈھال گر پڑی .....
آوازوں کے تعاقب میں
(ایک طے شدہ راستے پر)
تم سنبھل سنبھل کر بڑھ رہے ہو
پر کبھی
کوئی ہوا کا جھونکا
تمہیں چونکا تو دیتا ہے!

حامد مجاز

## طنز

رقص کرتے پانیوں میں
خود نگاہی کے بھنور —
گیلے گیلے خواب
آنکھوں میں سلگتے ہی رہے
میرے ہونٹوں سے
تبسم کا دُھواں اٹھتا رہا!

## امکان

فرازِ کوہ سے گزرتی رہ گذر
نحیف و تنگ
جسم کے ستون
پگھلتا آسماں
صدا بکف یہ کون ہے کھڑا ہوا
اُسے کہو کہ مٹھیوں کو کھول دے —
صدا!
زمیں کو سونپ دے!!

## میں

سمندر ہی سمندر تھا
نظر جس سمت اٹھتی تھی
بس اک لمحے میں
میں نے
یہ سمندر پار کر ڈالا
سمندر سے پرے کوئی نہیں تھا
ہُو کا عالم تھا
بس اک آوازِ پا تھی
جس کے پیچھے مجھ کو جانا تھا!

ایشی کاوا تاکو بکو (جاپانی شاعر)
ترجمہ: محمد امین

# اُداس کھلونے

آج میں کچھ مطمئن ہوں
جس طرح ہم گندے ہاتھ دھو کر مطمئن ہوتے ہیں
یہ سال تو کچھ نہ کچھ اچھا گزرے گا
آج کی طرح آسمان صاف ہے اور ہوا ابھی نہیں چلتی
جس طرح جلتی شمعیں آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں
اسی طرح سامات آنے والی ہے
یہ آخری دن کیسا ہے؟
صبح ضرور کوئی نہ کوئی اچھائی ہوگی
تمنا ہی دل کو کوستے ہوئے سو جاؤں
میں اس بچے کے چہرے سے محبت کرتا ہوں
جو بلی کے کان مروڑتا ہے اور بلی کے چلانے پر
حیران ہو کر خوش ہوتا ہے
نبض دیکھنے والی نرس کے ہاتھ کی گرمی کیسی ہے
کبھی ہاتھ سرد ہوتا ہے اور کسی دن سخت
گھر واپسی کا وقت ہوا لیکن گھر میں میرا کوئی بھی منتظر نہیں
اس لیے میں سارا دن کام کرتا رہا
مجھے شک ہوا کہیں قسمت مجھے بستر پر نہ آلے
آدھی رات کے وقت احساسِ جرم سے میری رضائی
میں نے کہا حضرت عیسیٰ بھی آدمی تھے
میری چھوٹی بہن کی اداس آنکھیں مجھ پر ترس کھاتیں



شیخ سعد حسین سعد

# ملاقات اور جدائی

○ رابرٹ فراسٹ کی نظم (MEETING AND PANING)
کا منظوم ترجمہ۔

فصیلوں کے بازو پہاڑی سے نیچے اُترتے اُترتے
ذرا ایک پھاٹک سے منظر جو دیکھا اچٹتی نظر سے
قدم کچھ مڑے تھے لگا ہوں پہ پہلے پہل چھا گئے
ملے تھے پہاڑی پہ چڑھتے ہوئے جب قریب آ گئے
گزارا تھا دن ہم نے سارا مگر کام اتنا کیا تھا
کہ چھوٹے بڑے سے نقوشِ قدم کو ملا سا دیا تھا
جتنے تھے نقشے کچھ ایسے کہ دل میں یہی سوچتے تھے
کہ ہم دو نہیں ہوں مگر ایک بھی تو نہ ہم ہو سکے تھے
تمہاری وہ چھتری ہوا کی تھی تنہائیوں میں ہمارے
ہوئی بات جب تک کہیں پہ تمہیں غلطاں نگاہیں تمہاری
نظر بے سبب ڈھونڈتی ہو زمیں پر کسی شے کو جیسے
لبوں کا تبسم یہ کہتا تھا دل مجھ پہ مائل ہو جیسے
بھلا میں ؤ گر پر تمہاری جو مل کر جدا ہو گئے
تمہاری نظر تھی مرے نقشِ پا پہ پیچھے تو گئے

جہاں پہنچا تعارف سے پہلے نہ تم جا سکے تھے جہاں تک
جہاں میرا نقشِ قدم بھی نہ پہنچا گئے تم وہاں تک

رشید امجد

# نئی اُردو کہانی اور خالدہ حسین

انور سجاد نے اُردو کہانی کو جس نئے علامتی ذائقے سے روشناس کرایا تھا خالدہ حسین
تک اس نے اپنی ایک پہچان بنا لی ہے۔ اس سفر میں شامل بہت سے جدید افسانہ نگاروں
نے نئے افسانے کو رنگا رنگ تجربوں اور اسلوبی لذتوں سے آشنا کیا۔ خالدہ حسین اس
سفر کی ابتدا میں کچھ دیر تک ساتھ چل کر ایک لمبے عرصے کے لیے غائب ہو گئی تھیں۔ ان کی
باقاعدہ آمد اس وقت ہوئی جب نیا افسانہ مخالفت برائے مخالفت کے تند سیلاب سے گزر کر
اپنا ایک مقام بنا چکا تھا۔ چناں چہ انھیں اپنی کہانی کی تحسین کے لیے نسبتاً بہتر ماحول ملا۔
ان کی دونوں کتابیں "پہچان" اور "دروازہ" جدید کہانی کی ایک بڑی کتاب "استعارہ"
جیسے مخالفانہ تنقیدی عمل سے نہیں گزریں۔

خالدہ حسین کی کہانی ایک عمدہ فنی پیچیدگی سے جنم لیتی ہے جس سے کئی معنوی جہتیں
پیدا ہوتی ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا طریقۂ کار خارج کے مواد کو ذات کی گہرائیوں میں لے جا کر
نیا روپ عطا کرنے سے عبارت ہے۔ یعنی وہ اشیا اور ان کے متعلقات کو [illegible]
نظر سے دیکھتی ہیں لیکن چونکہ وہ کہانی کار ہیں اس لیے ان کے اظہار میں صوفیانہ [illegible]
ایک روحانی انداز ہے جہاں کے تجربے اور مشاہدے کو کہانی کے رنگ [illegible]
وہ کہانی کی جمالیات کا حصہ بن جاتی ہے۔

[illegible] نے "دروازہ" کے دیباچے میں لکھا ہے:

"خالدہ حسین کے افسانوں کے ساتھ ہمارے زمانے میں [illegible]
ہے جو صوفیا کے ملفوظات سے اکتساب فیض پر تکیہ کرنے [illegible]

جو علامتی کہانی، وحشی دار آدمی اور سجدہ جیسے اہم افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جنھوں نے جدید کہانی کی رفتار اور معیار کا ایک حد تک تعین کر دیا ہے۔ خالدہ حسین کی اپنی ایک واردات ہے جسے انھوں نے اپنی فنی مزاج سے کہانی کا درجہ دیا ہے۔ یہ کہانی ان کے فنی سفر کی ترجمان بھی ہے اور اس کی علامتی پیکر تراشی بھی کرتی ہے۔ پہچان وہ مرحلہ ہے جہاں جاننے کی جستجو اشیا سے نیا رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور چیزیں معمول کے معنوں سے ہٹ کر فنی معنویت کی تشکیل کے عمل میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ ابتدائی پہچان کا نقطہ بھی ہے اور جاری عمل سے جدا ہو کر ایک نئے عمل کی طرف لپکنے اور محسوساتی سطح پر جذب کرنے کا آغاز بھی۔ دروازہ اس سے آگے کی منزل ہے۔ یہ وہ جہان ہے جس میں جز اور کل ایک دوسرے کا تماشا کرتے ہیں۔ پہچان اور دروازہ کی یہ دونوں کیفیتیں جذب، تجسس اور جستجو کی واقعاتی صورتیں ہیں جن کی وجہ سے ڈاکٹر محمد اجمل نے کہا ہے کہ:

"یہ افسانے جذبۂ حیرت کی تخلیق ہیں۔"

جذبۂ حیرت کی بات صرف خالدہ تک محدود نہیں کہ جذبۂ حیرت ہر فن کار کا بنیادی اثاثہ ہے اس کے بغیر بڑا فن جنم ہی نہیں لیتا۔ اصل بات یہ ہے کہ خالدہ کے یہاں جذبۂ حیرت فن کار کے مرکزی جذبے تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس نئے نظام کا محور بنتا ہے جو خالدہ کی کہانیوں میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ نیا صوفی کل کو اپنے سیاسی سماجی پس منظر سے علاحدہ نہیں سمجھتا خصوصاً تیسری دنیا کا صوفی مکمل طور پر ایک سیاسی شخصیت ہے جو اپنے معاشرے سے خود کو علاحدہ نہیں کرتا۔ خالدہ کی کہانیاں مجموعی المیوں سے شروع ہوتی ہیں لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے براہ راست سیاسی علامتوں کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی خود کو سماجی نفسیاتی اشاروں تک محدود رکھا ہے بلکہ ان کے امتزاج سے ایک سطح وجود میں لانے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی کہانیاں اپنے عصر کی آواز ہوتے ہوئے بھی ایک ماورائے عصر خوشبو سے مہکتی محسوس ہوتی ہے۔

خالدہ حسین کی فنی بنت کاری میں جزئیات کو اکٹھا کر کے بڑی تصویر بنانے کا رجحان نمایاں ہے۔ ان کی کہانیاں بہت پھیلی ہوئی ہیں اور انھیں پڑھتے ہوئے لفظوں اور جملوں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن کہانی کی تکمیل میں یہ ساری تفصیل ایک بڑی تصویر میں مدغم ہو جاتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے منظر اور کرداروں کی ذرا ذرا حرکت کو اکٹھا کر کے کہانی کو اس

طرح پھیلاتی ہیں کہ کہانی بظاہر خارجی حقیقت نگاری سے جنم لیتی ہے لیکن اس میں ایک ایسا باطنی کیف پیدا ہو جاتا ہے جو کشفِ ذات کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ:

"جب میں اپنے آپ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں تو لکھتی ہوں"

ان کے فن کی بنیادی کنجی ہے۔ خود محسوس کرنے کا عمل انکشافِ ذات کے بعد ہی شروع ہوتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ خالدہ کے یہاں انکشافِ ذات خود کو گم کر دینے کا نام نہیں بلکہ خود احتسابی کا مسلسل عمل ہے۔ یہ خود احتسابی باطن کی ہمواری کے پہلو بہ پہلو خارج کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کی کیفیت اور جراءت سے وجود میں آتی ہے۔ خالدہ کی کہانیوں میں سماجی سیاسی عمل جس طرح ذات کا حصہ بنتا ہے اور کہانی خارجی حقیقت نگاری کے باوجود گہرا علامتی اور اشاراتی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس کا بنیادی نقطہ خالدہ کا محسوساتی کشف ہے جو ان کی سبھی کہانیوں میں تازہ لہو کی طرح دوڑتا اور انھیں تر و تازہ رکھتا ہے۔

نئی اردو کہانی نے اسلوب کے بہت تجربے کیے ہیں اور گہری علامت سے تجرید اور حقیقت نگاری تک کئی ذائقوں سے آشنا رہی ہے۔ خالدہ کے یہاں لفظ ایک خاص تخلیقی اور فنی مقام پر پہنچ کر جملے میں ڈھلتے ہیں اور خیال اپنی کئی سطحوں کے ساتھ کہانی کا حصہ بنتا ہے۔ ان کی کہانیوں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ کہانی کے خالص معنوں میں بھی کہانی ہیں لیکن دوسری سطح پر اپنے عہد کی فکری تفسیر بھی کہ ان کے سیدھے سادے جملے ایک خاص انداز سے کہانی کی اکہری سطح سے بلند ہو کر گہرے معنوں میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ جملے کی بناوٹ میں وہ زوائد کا خیال نہیں رکھتیں۔ چناں چہ نثر کی زبان کو زوائد سے پاک کر کے شعری زبان کے قریب لانے کی نثری تحریک میں ان کا کوئی کردار نہیں اس کی وجہ بھی ان کی تفصیل نگاری ہے جو ان کے عمل کو نہ صرف پھیلا دیتی ہے بلکہ بعض اوقات تکرار کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ یہ تفصیل نگاری خواتین لکھنے والیوں میں بہت ہے اور عام لکھنے والیوں سے لے کر قرۃ العین حیدر جیسی عظیم لکھنے والی کے یہاں بھی نظر آتی ہے لیکن خالدہ حسین کے یہاں عام لکھنے والیوں کی طرح جملے اور مفہوم عامیانہ پن کا شکار نہیں ہوتے بلکہ وہ ان کی معنوی دبازت اور ہمہ جہتی کو قائم رکھتی ہیں مگر یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ ان کے یہاں قرۃ العین حیدر کی طرح بلیغ تاریخی اشاریت اور ثقافتی استعارہ پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کی تفصیل نگاری کبھی تو کہانی کو پھیلا کر معنوی کینوس

وسیع تر ہوتا ہے اور کبھی پھیلاؤ اور تفصیل کا یہ سلسلہ ان کو انتظار حسین کے فنی قبیلے سے الگ کر دیتا ہے کہ یہاں بھی انتظار حسین کی طرح جملہ لپٹا ہوا اور الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جملے کی ساخت اور الفاظ کے چناؤ میں بہر حال وہ اس حد تک انتظار حسین سے مختلف ہیں کہ ان کے یہاں انتظار حسین کی طرح استعارہ اور علامت اساطیری روپ اختیار نہیں کرتے۔ یہ طریقہ انتظار کے ساختیاتی طریقہ کار سے مختلف ہے اور اس علاحدگی میں خالدہ نے اپنی علاحدہ فنی پہچان قائم کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن گڑبڑ اس وقت ہوتی ہے جب شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے اس سلسلۂ عمل میں انتظار حسین کا عکس آتا ہے۔

تفصیل نگاری اور جزئیات کے پھیلاؤ کا یہ معاملہ ان کے تخلیقی عمل کا ایک حصہ ہے جس میں انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ انفرادیت درمیانے درجے کی چیزوں میں گہرے معنی پیدا کرنے کا گُر ہے۔ بھرپور سماجی حقیقت نگاری کے باوجود ان کا علامتی اور تجریدی آہنگ متاثر نہیں ہوتا۔ یہ فنی شعور کی دلیل ہے اور کہانی پر مضبوط گرفت کے ساتھ ساتھ ان کی فنکارانہ بصیرت کی گواہی بھی ہے۔ ان تمام فنی، فکری اور اسلوبی خوبیوں کے ساتھ دروازہ ایک عمدہ مجموعہ ہے لیکن یہ خالدہ کا حرفِ آخر نہیں اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا "استعارے" کے بعد متعدد ایسے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جنھوں نے جدید اردو کہانی کو جہتیں عطا کی ہیں۔

خالدہ حسین جدید کہانی کے اس سارے سفر میں کہاں اور کس طرح کھڑی ہیں، یہ بتانا تو کسی نقاد کا کام ہے البتہ ایک قاری کی حیثیت سے میری یہ تمنا ہے کہ ان کا آئندہ مجموعہ دروازے سے گذر کر نئے جہان میں داخل ہو اور اس جہان کی خوشبوؤں کی خبر لائے اور خالدہ جیسی بڑی فنکارہ سے یہ توقع بے جا بھی نہیں۔ ״

خالدہ حسین

# مکالمہ

تب فرنیچر میں یہی انداز مقبول تھا۔

اسے اپنے گھر کا پرانے سے پرانا فرنیچر بھی اب تک یوں یاد تھا گویا وہ سب کی سب چیزیں اس کے ساتھ ساتھ زندہ رہتی چلی آئی ہوں۔ اب اس کے ساتھ سانس لیتی ہوں۔ دراصل اپنے آس پاس کی جاندار اور بے جان اشیا کے ساتھ محبت اسے ورثہ میں ملی تھی۔ اس گھرانے میں ہر شے کو سینت سینت کر رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جاندار ہستیاں تو خیر ایک طرف، بے جان ساز و سامان بھی جیتی جاگتی شخصیت اختیار کر جاتا تھا۔ مونس و غمخوار بن جاتا تھا۔ کئی کرسیاں، الماریاں، تخت، گاؤ تکیہ، شروع ہی سے اس کے رازداں چلے آتے تھے۔ درختوں، دروازوں، کھڑکیوں اور دیواروں سے گلے ملنا، حال احوال پوچھنا تو خیر اس کی ذات کا ایک حصہ تھا ہی۔

وہ نچلی منزل کے نیم تاریک ٹھنڈے کمرے میں وکٹورین انداز کے بڑے بڑے بازوؤں والے صوفے جن پر آئے دن اول بدل کر جھالر والے غلاف چڑھا دیے جاتے تھے۔ بڑی خاموش متانت کے ساتھ اسکول میں ہونے والے تمام حادثات اور دن بھر کی رپورٹ سنتے تھے، ان کی ایک خوبی یہ تھی کہ ہر لمحے ہر آن اس کی بات سننے کو تیار رہتے تھے، جب کہ آتشدان کے گرداگرد رکھے جانے والے نیچے گدے دار اسٹول اور بنچ جو ایک چوکور صورت میں رکھے رہتے۔ کبھی کبھار ہی اس سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہی رہی ہو کہ کبھی آج تک اسے فرنیچر کے ان تین ٹکڑوں کی معنویت اور افادیت کی سمجھ نہ آئی تھی۔ یہاں تک کہ آنے جانے والے بھی اکثر یہی پوچھتے اور حیران ہوتے کہ یہ چوکھٹا نما گوشہ بیٹھک کس مقصد کے لیے ہے۔

یہ تو اسے ایک عرصے کے بعد پتہ چلا کہ یہ آتش دان کے گرد بیٹھ کر آگ تاپنے کو ہے مگر مصیبت یہ تھی کہ آتش دان میں آج تک آگ ہی نہ جلی تھی، چناں چہ وہ بے چارے

فرنیچر کے تین ٹکڑے بھی اپنے وجود پر شک میں گرفتار کم ہی ہمکلام ہوتے، مگر کبھی برسات میں جب کہ سب کے سب باہر برآمدے اور لان میں برستے پانی کی سیر دیکھتے — وہ لمبے بنچ پر لیٹ جاتی۔ تب اس کے کشن اور اسپرنگوں کے اندر سے عجیب آوازیں آیا کرتیں۔ اس بنچ پر اکثر جوان بچے بھی لیٹنا پسند کرتے ہیں۔ محمود بھی ایک بار اسی پر لیٹے لیٹے سو گیا تھا اور کروٹ لینے پر دھڑام سے فرش پہ آن گرا تھا۔ اس پر وہ خود اور سب کے سب بری طرح قہقہے لگا لگا کر ہنسنے لگے تھے مگر اگلی ہی شام وہ گلی کی نکڑ پر تیز رفتار موٹر کے نیچے آ کر کچلا گیا تھا۔

پھر وہ اونچی وارڈروب تھی کہ جس کے باہر دروازے پر قد آدم شیشہ چڑھا تھا اور اندر عجیب طرح کی گھومنے والی کھونٹیاں بھی۔ یہ ایک خوشبو بھرے کپڑے لٹکے رہتے۔ چنانچہ اس گھر میں جو چیز بھی کبھی آج تک آئی تھی، مستقل بندہ آور شخصیت اختیار کر لینے کو آئی تھی۔ خواہ وہ میزوں اور تپائیوں کا سیٹ ہی کیوں نہ ہو۔

چناں چہ جب اس کے لیے فرنیچر منتخب کرنے کا وقت آیا تو بہت غور و فکر سے کام لیا گیا۔ تب فرنیچر میں فوم اور روئی بھرے کشن ہی کا رواج تھا۔ اس کے لیے تاریخی اور سلیٹی رنگ کی آمیزش والی اپہولسٹری کی گئی۔ تو اس نئے گھر میں وہ نیلے چار صوفہ سیٹ بے زبان جانور کی مانند پڑا رہتا۔ وہ خود بھی نئے انسانوں اور در و دیوار، آوازوں، ہواؤں اور خوشبوؤں کے ساتھ مانوس ہونے میں مصروف تھی۔ پس وہ دونوں ساتھی تھے۔ ایک ہی تجربے کے ساتھی اجنبی لوگوں میں گھرے — رفتہ رفتہ ان سے قریب ہونے میں مصروف کھڑا نجانے ہی میں بار بار منھ کے بل گرتے۔ ان کے بارے میں لوگوں کی تشکیک، تنقید اور تضحیک

شاید کھڑکی کے قریب دھوپ میں پڑا رہنے سے اس کا تاریخی رنگ بدرنگی اختیار کرنے لگا۔ اس نے بہت کوشش کی مگر کمرہ اس ڈھب کا تھا کہ اس کے لیے اور کوئی موزوں جگہ ہی نہ تھی۔ اگر کھڑکی سے ہٹ کر دوسری دیوار کے ساتھ ساتھ رکھا جاتا تو آدھا دروازہ بیچ میں آ جاتا۔ کرنے میں خاصا ترچھا کر دیا جاتا تو کمرہ ایک دم چھوٹا ہو جاتا۔ داخل ہونے والے دروازے کے عین سامنے سیدھا سیدھا دیوار کے ساتھ لگا دیا جاتا تو پچھلی کھڑکی اور نہ معلوم کون کون سے زاویے سے بے پردگی کا احتمال تھا۔ سو سب جتن کرنے کے بعد سب کی رائے کے مطابق اسے اسی جگہ پر رہنے دیا گیا۔ اب اگر اس پر دن کا زیادہ تر حصہ سیدھی دھوپ

بڑھ رہی تھی اور اس کا شگفتہ نارنجی رنگ بدرنگی میں بدل رہا تھا اور [illegible] ہوکر اُبھر رہا تھا تو اس میں کسی کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔

مگر حیرت یہ تھی کہ اس نے بدرنگی اختیار کرتے ہوئے ذرا بھی توقف نہ کیا۔ [illegible] نہ لیا بس تیز دھوپ اور اجنبی ہواؤں میں یوں گھلا گیا جیسے کوئی نرم و نازک [illegible] خاموش پڑ جاتی ہے۔

شروع شروع میں اسے اس کی بدرنگی کا احساس نہ ہوا۔ یوں بھی اسے اس کی رنگت [illegible] ڈیل ڈول سے زیادہ اسے اس کا اصل وجود نظر آتا تھا مگر اس کے پاس [illegible] آنے جانے والوں نے پہلے دبی زبان اور پھر علی الاعلان کہنا شروع کیا۔

'تو یہ ہے' چند ہی دنوں میں اس کا رنگ کیسے اُڑا ہے' شروع شروع [illegible] لگا دیا۔ تو کیا تھا' ہنگار وئے ایک بار۔

اب اسے اس کی ہیئت کذائی کا شدید احساس ہونا شروع ہوا۔ لہٰذا اس کی دیکھ بھال کا خاص اہتمام کیا جانے لگا۔ دن میں دو چار مرتبہ اسے جھاڑا جاتا' تب چھوٹی چھوٹی [illegible] کا رواج تھا جن پر پیتل کے خول چڑھے ہوتے۔ اس نے اس پیتل کو چمکانا شروع کیا' کپڑے پر جہاں کہیں دھبے تھے ان پر خوبصورت کڑھائی کے رومال ڈال دیے۔ آہستہ آہستہ ان رومالوں کا سائز بڑا ہوتے لگا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اس کے اپنے گھر والے عزیز و اقارب ـــ سب اس کے چہرے کی بڑھتی ہوئی بدرنگی سے شرمندہ اور فکر مند رہنے لگے۔ اسے خود ایک عرصہ تک ان کی پریشان نگاہوں کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا۔ اگر وہ کبھی دیر تک ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھنے کی عادی ہوتی تو شاید ان کے مفہوم تک پہنچ جاتی۔ مگر وہ حسب معمول واضح حقیقتوں کو بھی نہ دیکھ پاتی اور غیر مرئی خیالات' باطنی تجربوں اور در و دیوار کی گفتگو سمجھنے میں مصروف رہی۔ یہاں تک کہ اس کی نہایت عزیز اور مخلص دوست نے صورتِ حال واضح کر دی۔ اس نے آئینہ دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔

وہ درست کہتی تھی۔ بدرنگی پرچھائیں کی طرح اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی' مگر یہ کیوں کر ہوا۔ وہ مزید حیران ہوئی اور پاؤڈر کی تہہ بدرنگ حصوں پر جمانے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کا ایک خول سا چہرے پر جم گیا۔ مگر رات کو قربت کے لمحوں میں یہ خول اتر جاتا۔ وہ

نہایت قریب سے اپنی بدرنگی کا مشاہدہ کرتی۔ رفتہ رفتہ اس کے خدوخال بھی بدلنے لگے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور کنپٹیاں اندر کو دھنسنے لگیں۔

شاید موسموں کے تغیر و تبدل اور مسلسل لاپروائی کی وجہ سے صوفے کے بازو گھسنے لگے اور جگہ جگہ سے اس کا کپڑا اکھڑ گیا۔ تانے بانے علاحدہ ہوتے گئے اور کہیں کہیں سے موٹے موٹے تار ابھر آئے۔ ایک آدھ مقام سے نیچے کی روئی کی ہلکی سی تہہ ظاہر ہونے لگی اور فوم میں جلتے ربر کی بو آنے لگی۔ جب ایک بار کشنوں کے غلاف دھونے کے خیال سے اتارے گئے تو فوم کی ایک پتلی سی تہہ بھی اس کے ساتھ ہی اتر آئی۔ دھلنے پر وہ کپڑا بالکل علاحدہ اور پتلا ہو گیا۔ اب وہ دوبارہ کشن پر چڑھنے کے قابل نہ رہا۔ چنانچہ نئے کپڑے کا انتخاب ہوا۔ اب کے اس کی بدرنگی کی تلافی کے لیے شوخ چمکتے دمکتے بسنتی رنگ کو چنا گیا۔ چند کاریگر سلائی مشین لے کر گھر آن بیٹھے اور کئی دن کی مسلسل محنت کے بعد اس کا نیا چمکتا کپڑا چڑھ چکا تھا۔

اس کی مخلص دوست اس کے لیے بے حد فکرمند تھی۔

”میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ تم اپنی ذات کی طرف سے اتنی لاپرواہ بھی ہو سکتی ہو۔ مارکیٹ میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیر کلر تمام شیڈز میں موجود ہے اور جلد کو تر و تازہ رکھنے، چہرے کے روئیں ختم کرنے کے ہزاروں لوشن۔ تم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے وجود سے دوسروں کے ذوقِ جمال کو ٹھیس پہنچاؤ۔ ان کو اذیت دو۔ بالآخر یہ تمہارے ساتھ والا احتجاج پھر اگر آئے گا، کیا تم اس دن کے انتظار میں ہو؟“

اس کی بات بے حد معقول تھی گو کوئی پندرہ ایک برس پہلے ان دونوں نے عہد کیا تھا وہ کہ جھوٹی تزئین سے عمر چھپانے کے ہتھکنڈوں پر کبھی نہ اتریں گے۔

اب نئے گھر میں صوفے کو ایک محفوظ مقام مل چکا تھا۔ اس پر دھوپ نہ پڑتی تھی۔ تجربہ اور وقت نے اس کو حفاظت اور دیکھ بھال کے بہت سے گر سکھا دیے تھے۔ اب یہ کمرہ بند دروازوں اور بھاری بھاری پردوں میں محفوظ رہتا۔ اکثر فرنیچر پر بھی غلاف چڑھے رہتے۔ چاروں سمت قدیم، نیم تاریک ٹھہرے وقت کی کرم خوردہ باس تھی۔

ایک عرصے کی مسلسل محنت اور گہرے مشاہدے کے بعد اس نے بہت سے حقائق دریافت کیے تھے۔ کس قسم کی روشنی کے عین نیچے ہرگز نہ بیٹھنا چاہیے۔ چہرے کے تمام خدوخال اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ ابھر آتے ہیں۔ چہرے کی گولائی روشنی کے کس زاویے پر بہتر طور پر

ابھرتی ہے۔ کھلی دھوپ میں چہرے کے کس حصے اور ناک اور رخساروں کے کس ذرا کو رنگ و روغن سے زیادہ احتیاط کے ساتھ چھپانا چاہیئے۔ چشمے کا کون سا فریم آنکھوں اس کے گرد کے علاقے کا بہتر کیموفلاج کرتا ہے۔ گردن کے حالات کس وضع کی قمیص ڈھکے چھپے رہتے ہیں۔

اب اس کے فرنیچر کو سب حیرت سے دیکھتے۔ "نیا ہے! شکر کہ کوئی بھی پہچان کہ یہ تو وہی ہے۔ سوائے چند ایک کے"، کہ جو نہایت ہی باریک بین تھے۔

مگر کچھ ہی عرصہ میں جگہ جگہ کے تبادلوں کے باعث یہ کپڑا بھی اکھڑنے لگا اور یکا معلوم ہوا کہ بہت سا وقت گزر چکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بہت سا پانی پُلوں تلے بہہ چکا ہے۔ کبھی واپس نہ آنے کو۔ اور یہ پانی اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے گیا ہے۔ خس و خاشاک، مثلاً ریت کے ساتھ ساتھ بہت سے تصورات اور وابستگیاں بھی شامل اور بہت سے لوگ اور ان کی یادیں ہیں۔ اور ایک عفریت منہ کھولے اس کی جانب بڑ چلا آتا تھا کہ جس کو عرفِ عام میں جنریشن گیپ کہا جاتا ہے۔

اس نے حیران ہو کر دیکھا کہ دنیا بڑوں اور بزرگوں سے خالی ہوتی چلی جا رہی ہے ہر شخص نوعمری کے حصار میں داخل ہو چکا ہے۔ سوائے اس کے اپنے کہ تمام دنیا اس سے اور تر و تازہ ہے۔ اس نے آئینے میں اپنے آؤٹ ڈیٹیڈ چہرے کو دیکھا اور تنہائی۔ تیز جھکڑوں نے اسے آن لیا۔

ایک روز ان دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ چوں کہ ان میں نیا فرنیچر خریدنے کی استط نہیں، لہذا پرانے کو نئی شکل دے دی جائے۔ سب سے پہلے صوفہ سیٹ کی باری تھی کہ نہایت ماہر فن کار ہاتھ لگا تھا جو ہر شے کی صورت بدل کے رکھ دیتا تھا۔ اس نے پوری تسلی دی کہ ایسا حلیہ بدلے گا کہ بالکل آج کی شے نظر آئے گی۔

اور واقعی جب کارخانے سے وہ واپس آیا تو اس کی ساخت تک بدل چکی تھی۔ اب ا پتلی ٹانگوں اور پیتل کے خولوں کا رواج کب تھا۔ ان کی جگہ چمکتے رولر لگے تھے اور وہ نہایت خاموش نرماہٹ سے جس طرف چاہو گھوم جاتا تھا۔ پُشت اور کشن کی حدود کو موٹی موٹی گولائیو میں بدل دیا گیا تھا۔ آج کا بہترین کپڑا اپنی بہار دکھا رہا تھا۔

اپنے کے لیے ٹی وی لاؤنج میں رکھا گیا۔ اب اس سے شرمندہ ہونے اور اسے دور کرنے

کی کلائی کو پکڑ [illegible] ۔ وہ آج کا مستند سکہ تھا۔ سکۂ رائج الوقت!

اس کے نرم وجود میں دھنس کر کبھی کبھی بے خبری کے عالم میں وہ کسی لمس کی منتظر رہتی رات گئے تک ٹی وی پروگرام چلتے۔ پھر دوبی آر لگ جاتا۔ وقت ایک اندھے خلا میں قطرہ قطرہ گرتا چلا جاتا۔ ٹپ ٹپ، کبھی دھم دھم کرتی تال اور واویلا کرتے اونچے سروں کے درمیان وہ غنودگی میں چلی جاتی اور اسے لگتا بہتے دریا میں لہو کی بوندیں ٹپ ٹپ کر کے پاتوں بنتی چلی جاتی ہے وہ اس اندھیری کوٹھری میں جا نکلتی جہاں شہزادی کا سر تن سے جدا پڑا تھا اور کٹی گردن سے لہو قطرہ قطرہ دریا میں ٹپکتا تھا۔ وہ کٹا سر اٹھا کر گردن سے جوڑتی۔ پائنتی کی لکڑیاں سرہانے اور سرہانے کی پائنتی کرنے لگتی کہ شہزادی جاگ اٹھے مگر اسی وقت پائنتی کی صدائیں اس کو جگا دیتیں وہ اپنے آپ کو اس کی قدیم نرم و گرم گرفت میں پڑا محسوس کرتی۔ مگر وہ تو ایک گونگا لمس تھا۔ لمس جب تک متکلم نہیں کچھ بھی نہیں یہ تو دنیا کی سب سے قدیم اولین و آخری زبان ہے۔ اس گونگے لمس پر ایک سناٹا چاروں سمت پھیلتا اور پھیلتا چلا جاتا۔

اس رات بھی وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ ایک ایک کر کے سب اٹھ کر چلے گئے تھے مگر وہ اس رنگ برنگے اسکرین سے نظریں نہ ہٹانا چاہتی تھی کہ اس کے بعد اس کے باہر سناٹے، دبیز اندھیرے اور منہ کھولتے خلا کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ اس روشن سکرین کو تا دیر موجود، زندہ رکھنا چاہتی تھی مگر وقت ختم ہو چکا تھا اب وہ خالی سکرین کے سامنے بیٹھی رہ

پھر اچانک بغیر کسی اعلان کے محفل سماع شروع ہو گئی۔ کوئی اناؤنسر، نہ رنگ برنگ اشتہار، کوئی وقفہ نہ انتظار۔ وہ ایک عجیب بہتا ہوا تسلسل تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ آج کے دن کوئی محفل سماع نہ ہونا تھی۔ مگر وہ وہاں رنگوں اور روشنیوں کے درمیان موجود تھی۔ نیت اور فریاد بھری لے۔

"میں کی کراں کنڈا دور نی اڈیئے میں کراں۔!"

وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ کائنات پر چاروں کھونٹ بے بسی طاری تھی۔ ہر شے پکار رہی تھی۔ میں کی کروں۔ میں کراں ـــ کچے گھڑے کی بے بسی اس کے اندر اتر آئی۔ دنیا ایک کچا گھڑا، ممکنات کے جھکڑ اڑاتے محیط میں بہہ رہی تھی۔ اسے کچے گھڑے کے آسرے منجدھار میں کود جانے والی کی تقدیر نے آن جکڑا۔ وہ تو بس ایک مقدر کیا واقعہ تھا

۔۔ تھا۔ پتا چلا عمل کر رہی تھی کہ کیوں کہ اس علاقے کو بہت [illegible] ایک [illegible] اور [illegible] گیا۔

۔۔ جو ہر کے لیے عرض حاضر ہوا۔

"ایک ایک لمحہ میں [illegible] قول قرار [illegible] دوسری [illegible]"

طوفانی سیٹیاں مارتا جھکڑ، اندر جیسے پانیوں میں جھنوڑ دل [illegible] رہا تھا۔ ایک کلی۔ بدملی، قول و قرار دی۔ اس نے چاروں سمت نگاہ کی۔ ہر کوئی اپنی ذات کے ساتھ ایک قول و قرار میں بندھا تھا۔ مگر کتنوں نے اسے نبھایا۔ نبھا سکے۔ اس نے صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ اچانک کہیں اندر بہت نیچے ارتعاش پیدا ہوا۔ اس نے آہستگی سے اس کی نرم، ملائم پشت پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا تم وہی ہو؟"

وہ قریب ہو کے بولی۔ "کسی ایک رُخ سے، نہ ہونے پر بھی تم وہی ہو۔ صرف میں جانتی ہوں۔ بہت اندر ـــــ اپنی انتہائی گہرائیوں میں تم وہی ہو" اب اس نے اس کی پشت کے ساتھ کان لگا دیا۔

"اور تم ـــ کیا تم بھی وہی ہو" اُدھر سے آواز آئی۔

---

۔ زورؔ مرحوم کی اردو دوستی، خوش ذوقی اور تن دہی سے میں واقف تھا، لیکن اُن کے قائم کیے ہوئے ادارہ دیکھ کر تو آنکھیں کھل گئیں اور جتنا وقت اس وسیع و شاندار عمارت کے اندر گزرا، یہ یاد ہی نہ آسکا پایا کہ اس وقت کوئی مظلوم زبان ہے اور ہر طرح کے جور و ستم کی شکار، اور تو اور اس طلسم زار میں قدم رکھ کر نہیں چلنے پاتا کہ اردو دنیا کی کسی بھی متمدن و متمول زبان سے ہیٹا یا کسی سے کچھ قدم پیچھے ہے۔ اس چار دیواری کے اندر اردو کلچر کی ایک پوری دنیا آباد ہے، اللہ اکبر۔

بابائے اردو کا لقب مولوی ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے لیے مختص ہو چکا، ورنہ زورؔ مرحوم ہی اپنے کرامات سے اس لقب کے کچھ کم مستحق نہیں۔

● (مولانا) عبدالماجد دریابادی ([illegible] اکتوبر ۶۳ء)

اقبال حسین خالد

# پینٹو ولم

شور ہلکا ہلکا تھمتا گیا جیسے زور کا مینہ برستے برستے ایک دم رم جھم میں بدل جائے
ندر گرد کم ہونے لگی۔ ایک ایک کرکے لوگ باہر نکل رہے تھے۔ کل پھر ملنے کے وعدے
ور رہے تھے۔ وہ روزانہ ملتے ہیں اور پھر اگلے روز ملنے کا وعدہ کرکے چلے جاتے ہیں
ہ کب تک ایسے ہی ملتے رہیں گے اور پھر اس ساری ملاقات میں ہوتا بھی کیا ہے؟
ھک، ٹھک، ٹھک، ٹھک۔ ڈرن، ڈرن، زال زپ۔ اس نے تسمے بند کیے اور
ٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ نہا کیوں نہ لے، گھر میں باتھ تو ہے نہیں۔ ویسے بھی
آج پسینہ بہت آیا ہے۔ اس نے تسمے کھولے، کوٹ اتارا۔

بہت دن ہوئے کوئی خط نہیں آیا۔ چیک تو مل گیا ہوگا مگر ابھی تک جواب نہیں
آیا۔ وہ اسکول جاتا ہوگا۔ نیلا کوٹ، کالی پتلون پہنے، اس کا بستہ کتابوں سے لدا ہوتا ہوگا
ایس آکر ماں سے لڑتا ہوگا۔ وہ بہت جھگڑالو ہے۔ اپنی مرضی کرتا ہے نا، اچھا کرتا ہے
کھیلنے چلا جاتا ہے۔ شام کو جب تک بلانے نہ جاؤں، گھر نہیں آتا اور پھر رات کو پڑھنے
بیٹھ جاتا ہے۔ اکثر پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہے۔ پھر اسے اٹھا کر بستر پہ لٹاتی ہوں،
تابیں بستے میں بند کرتی ہوں۔ صبح جاگ کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ پوچھتا ہے۔ ماں!
میں کب سو گیا تھا۔ کئی بار پوچھتا ہے۔ ابا کب آئیں گے۔ بہت جلدی، بتاتی ہوں۔ اور
پھر کہتا ہے۔ اب تو مجھے ابا کی صورت بھولنے لگی ہے۔ پھر اندر جاکر تمہاری تصویر
اٹھا لاتا ہے، کہتا ہے اب تو ابا کو آ جانا چاہیے، میں ابا کو بتاؤں گا کہ میں اپنی کلاس میں
سب سے ذہین ہوں۔ میں غیر حاضری بھی تو کوئی نہیں کرتا۔ اف! بس شاذیہ کہتی ہے

تم بہت اچھے شاگرد ہو۔ ہاں آخر تمہیں ملے چار سال تو ہو گئے ہیں اب تمہیں گھر آنا چاہیئے

ہاں! مجھے گھر جانا چاہیئے۔ کل ہی چیف سے چھٹی کی بات کروں گا۔ دو ماہ تک عید آ رہی ہے۔ عید پر مجھے گھر میں ہونا چاہیئے۔

اس کے لیے بہت سے کھلونے لے کر جاؤں گا۔ موٹر کار، ہوائی جہاز، بہت خوش ہوگا کھلونے دیکھ کر۔

پیڈرسن، مجھے گھر جانا ہے چھٹی چاہیئے۔

دو مہینے؟

نہیں نہیں دو مہینے تو بہت تھوڑے ہیں۔ تم خود ہی سوچو، چار سال بعد گھر جا رہا ہوں۔ دو مہینے تو پلک جھپکتے میں گذر جائیں گے۔

ہاں چار مہینے۔ بہت شکریہ۔ پیا آئی اے یا ایس اے ایس؟

ہاں پی آئی اے بہتر رہے گی، جہاز تبدیل کرنا نہیں پڑتا۔

اس نے تولیے سے اپنا بدن خشک کیا، کپڑے پہنے اور باہر نکل آیا۔ شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر اس نے کوٹ کی جیب سے کنگھی نکالی اور بالوں کو کنگھی کرنے لگا۔

اس نے دوسروں کو الوداع کہا اور باہر نکل آیا۔

فلپس۔۔ نوردن۔۔ انشورنس۔۔ ڈپلوم آئس۔۔ ٹیکسکو۔ نوردسک آئل۔

دوکانیں تو سب بند ہو گئیں۔ بریڈ تو بالکل ختم ہو گئی تھی۔ گرین لینڈ والی دوکان کھلی ہو گی مگر صرف بریڈ کے لیے اتنی دور . . . ویسے بھی آج تھک بہت گیا ہوں۔ گھر جا کر کھانا تیار کرتے کرتے پون گھنٹہ لگ جائے گا۔ کیوں نہ آج کسی ریستوران میں کھا لوں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، سارے پیسے نکال کر گنے۔۔ بہت ہیں۔

وہ چلتے چلتے ایک ریستوران میں داخل ہو گیا۔ ریستوران میں خاصی بھیڑ تھی وہ ایک خالی میز پا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ برف شروع ہو گئی ہے اب پانچ چھ ماہ تک موسم ایسا ہی رہے گا۔ کافی دنوں سے اکبر سے ملاقات نہیں ہوئی، شاید نائٹ شفٹ کرتا ہے۔ اتنی دیر میں کھانا آ گیا اور اس نے کھانا شروع کیا۔

ساتھ والی میز پر دو بوڑھے بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ شاید آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک اٹھا۔ وہ سیدھا اسی طرف آ رہا تھا۔

"ہائے!"

"ہائے!" اس نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ہاتھ ملایا۔

"تم کہاں سے ہو؟"

"پاکستان سے!"

"اچھا۔ بہت اچھا' میں بحری جہاز میں کپتان رہ چکا ہوں۔ کراچی گیا ہوں، پچاس سال پہلے۔ اب تو کراچی بہت بدل گیا ہوگا۔ بمبئی گیا ہوں۔ میں سب لوگوں کو پسند کرتا ہوں!" بوڑھے کپتان نے ہاتھ ملانے کے لیے پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے پھر ہاتھ ملایا۔ اتنے میں بیرا پاس سے گزرا تو وہ زور سے چیخا۔ "میں نے ایک بیئر کا آرڈر دیا تھا!" اس کا سگریٹ کہیں میز کے نیچے گر گیا اور وہ اسے ڈھونڈنے لگ گیا اور ساتھ ہی زور زور سے باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ڈور مین آیا اور اس نے کپتان سے کہا کہ "تم اپنی سیٹ پر جاکر آرام سے بیٹھو۔ تم نے بہت پی لی ہے۔ اب اور نہیں ملے گی۔" پھر وہ اٹھا جاتے وقت ہنستے ہنستے پھر ہاتھ ملایا اور لڑکھڑاتا ہوا اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔

"میرا باپ بھی فوج میں تھا۔ سارا دن گھر بیٹھا رہتا ہوگا۔ دوسری جنگِ عظیم میں برما گیا تھا۔ اس نے کئی خوفناک واقعات سنائے تھے' کئی بار اس کا ایک دوست اسے ملنے آیا کرتا' دونوں فوج میں بہت عرصہ اکٹھے رہے تھے۔ وہ اور بہت سی باتوں کے ساتھ فوج اور جنگ کی باتیں مزے سے کرتے۔ آج کل تو فوج بہت سہل ہو گئی ہے۔ ڈسپلن نام کو ہے۔ مسلسل تین دنوں تک دونوں طرف سے گولوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ اگلی پوسٹوں میں سخت ابتری پھیل گئی' بہت سے ساتھیوں سے رابطہ کٹ گیا۔ سپلائی بند ہو گئی تھی اور جب تین دنوں کی مسلسل گولہ باری کے بعد دونوں طرف سے جنگ تھمی تو حاضری لی گئی۔ بہت سے جوان غائب تھے۔ پھر سارے علاقے کی گشت کی گئی۔ جھاڑیاں... ٹانگیں... بازو... گڑھے... بوٹ... رائفلیں... گھڑیاں..."

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ نو بج چکے تھے' چلنا چاہیے' باہر خاصی ٹھنڈک ہے۔ ایسے موسم میں تو بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ زکام' بخار تو آسانی سے ہو جاتا ہے پھر پڑے رہو مریض بن کر چار پائی پر۔ پان۔ پان... پان.. پان.. . پان۔ پان.. ایمبولنس! ہرٹ اٹیک' ایکسیڈنٹ...۔ خودکشی... لڑائی جھگڑا......

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ "بس اسٹاپ نزدیک ہی ہے مگر ابھی تو بس آنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔" وہ رُکا پھر چل دیا۔

آج دیوڑھی کا بلب بند ہے۔ آج اسے کسی نے جلایا ہی نہیں۔ یہ تو فیوز ہے... نے چابی گھمائی، اندھیرے میں پوسٹ باکس میں ہاتھ ڈالا اور پھر خالی ہاتھ باہر نکالا۔ ایک تو یہ سیڑھیاں بعض اوقات اتنی لمبی ہو جاتی ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ ... نے اخبار اٹھایا ساتھ اخبار کی قیمت میں خصوصی رعایت کا اشتہار تھا۔

اس نے کمرے کی بتی روشن کی۔ کپڑے تبدیل کیے اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سا... پڑے لیمپ کو جلایا۔ گھڑی کو چابی دی۔ الارم فکس کیا اور پھر بستر پر لیٹ کر اخبار...

وہ بہت تھکا ہوا تھا، اخبار پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگا اور سو گیا۔ چار بجے جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے پتہ چلا کہ وہ تو اخبار پڑھتے پڑھتے ہی سو گیا تھا۔ اخبار وہیں بستر پر پڑا تھا۔ اس نے لیمپ بجھایا اور پھر خراٹے لینے لگا۔

وہ صبح جب گھر سے نکلا تو جہاز جانے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس نے ٹیکسی لی۔ ٹیکسی ڈرائیور کتنی دیر اِدھر اُدھر گھومتا رہا، مگر اسے ایرپورٹ جانے والی سڑک ہی نہیں مل رہی تھی۔ پھر ایک دم اسے ایرپورٹ نظر آیا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں پیسے تھمائے اور جہاز کی طرف دوڑا۔ مگر جہاز کی سیڑھیاں اتار لی گئی تھیں اور دروازے بند ہو چکے تھے۔ وہ زور زور سے چلانے لگا۔

"ٹھہرو ٹھہرو، مجھے جانا ہے۔" اتنے میں جہاز کے چلنے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے ہاتھ بڑھایا اور گھڑی کا الارم بند کر دیا۔ ○○

---

—— میں آج یہاں میر تقی میر کے کچھ مخطوطات دیکھنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی سارا کام بہت آسانی سے انجام پا گیا اور کارکنوں کو حسب معمول بلکہ پہلے سے بھی زیادہ م... خدا اس ادارے کو اور ترقی دے۔

● شمس الرحمٰن فاروقی (۵ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء)

جنید حزیں لاری

# غزلیں

سکھائے پہلے تو آداب آشنائی کے
پھر اس نے بخش دیے رنج نارسائی کے

چھپا ہے کون گل و یاسمن کے پردوں میں
بڑے حسیں ہیں یہ انداز دل ربائی کے

تری تلاش میں نکلے تو اتنی دور گئے
کہ ہم سے طے نہ ہوئے فاصلے جدائی کے

ہم ایسے لوگ کہ تاج شہی کو ٹھکرا دیں
تری گلی میں، طلبگار ہیں گدائی کے

گزر ہی جائے گی دشوار منزلوں سے حیات
جواں ہیں حوصلے میری شکستہ پائی کے

دعائے نیم شبی اور غم نجات حزیں
گنہ کے پھول ہیں دامن میں پارسائی کے

---

خوشنما وعدوں کی سولی پہ چڑھانے والا
سامنے آتا نہیں خواب دکھانے والا

پھر سحر رنگ دھند لکوں نے دیا ہم کو فریب
سوچ کر خوش ہیں، نیا عہد ہے آنے والا

پھول ہیں لرزہ براندام کہ گلشن میں ابھی
محوِ گلگشت ہے وہ رنگ اڑانے والا

تو گرفتار پرندے کی طرح ہوں بے تاب
کاش ملتا کوئی صیاد نشانے والا!

چونک اٹھی ہے مرے گھر کی تنہائی بھی
چاپ قدموں کی! مگر کون ہے آنے والا

لاکھ معدوم سہی نقطۂ آغاز سفر!
اور جاتا بھی کہاں لوٹ کے جانے والا

ایک دن ٹوٹ کے رہ جائیں گے وہ لوگ حزیں
رہنما جن کا ہے پتھر کے زمانے والا

ڈاکٹر سعید اختر درانی

# غزلیں

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے لیے)

بے وطن جو بلبلیں ہیں آشیانوں کے بغیر
کیا کہیں کس سے کہیں وہ ہم زبانوں کے بغیر
وقت نے صد چاک کر ڈالی قبائے روزگار
سر برہنہ ہیں زمینیں آسمانوں کے بغیر
پاش کر ڈالے وہ بُت ہائے کہن ہم نے تو کیا،
دل اداس ہیں سجدے ہیں اب آستانوں کے بغیر
نونہالانِ چمن پر کس نے توڑے یہ ستم؟
باغ یہ کتنا حسیں تھا باغبانوں کے بغیر!
فصلِ گُل نے لعل برسائے، بجا، لیکن سنو
کیا خزاں ہے زرد پتوں کے خزانوں کے بغیر
کر گئی رنگیں پہلو سے خوں کی تابانی اُسے
داستاں بے رنگ تھی، ہم خستہ جانوں کے بغیر
آرزوئیں، حسرتیں، ناکامیاں، خوں گشتہ خواب
کب بسا ہے خانۂ دل میہمانوں کے بغیر؟
پردۂ تخیل پر لرزاں ہے سایوں کا ہجوم
اک نگر پُر ہے مکینوں سے، مکانوں کے بغیر
ریگ زارِ وقت میں عنقا ہے قرنوں کا وجود
ایک دشتِ بے کراں ہے یہ، زمانوں کے بغیر
یاد آیا ملکہ ذرّے نور کے یکجا نہ تھے
میں وہ اختر ہوں کہ سوزاں تھا جہانوں سے لو

قطرہ تھے ہم اسی کا جو دریا نہیں تھے ہم
کیا ذرّہ وار اصل میں صحرا نہیں تھے ہم؟
پرتو اسی کے نور کا ہم تھے اگر، تو کیا
اس آفتابِ حُسن کا سایا نہیں تھے ہم؟
خوابِ جنوں میں عکس ہو جیسے سراب کا
ہم یوں رہے جہان میں، گویا نہیں تھے ہم
لائی صبائے زیست اُڑا کر ہمیں یہاں
آیا ہوائے نیست کا جھونکا، نہیں تھے ہم
دُھندلا سا ایک خول تھے ہم ممکنات کا
کیا تھے؟ مگر اپنی ذات کا سایا نہیں تھے ہم
اُلجھے ہوئے تھے جبر کے تاروں میں دست و پا
کیا ساحرِ حیات کا پُتلا نہیں تھے ہم؟
ہر کہکشاں ہے مہدِ جہاں ہائے بے تعدد
لاریب، کائنات میں تنہا نہیں تھے ہم
دامن میں اپنے وسعتِ صد کائنات تھی
مت جانئے کہ ذرّہ تھے، صحرا نہیں تھے ہم
اک گوشۂ سپہر کو روشن تو کر گئے
اختر، پر اپنے بخت کا تارا نہیں تھے ہم

# غزلیں

فرحت قادری

میں شب گزیدہ حکایات کا گداگر ہوں
اور اس کے بعد بھی جو جو جہاں انگیز کر ہوں
سراب بن کے میں اُبھرا ہوں دشتِ وحشت سے
وہ کیسا تشنہ سمندر ہے جس کا پیکر ہوں
فصیلِ جسم سلامت نہ کوئی پیرہن
میں التہاب میں سو سورجوں سے بڑھ کر ہوں
وہ ایک نقطہ جو تکوین کی بنا ٹھہرا
اس ایک نقطے کے پھیلاؤ کا میں منظر ہوں
سوادِ شام کی منزل ابھی کہاں آئی
ابھی تو حلقۂ زنجیرِ شب سے باہر ہوں

حجاب میرے بدن سے بھی سر اٹھاتے ہیں
مرا خیال ہے کہ میں بھی کوئی سمندر ہوں

عبدالمتین نیازؔ

کرب کا چہرہ دکھاتی ساحری شیشے کی ہے
زندگی کی یہ برہنہ آگہی شیشے کی ہے
زخم کھا کر سیکھ لو جینا کہ تم انسان ہو
پتھروں کا خوف کرنا بزدلی شیشے کی ہے
بے خبر ہے تو اگر خود سے تو تیرا کیا قصور
جانتا ہوں میں ترے گھر میں کمی شیشے کی ہے
کس لیے مغرور ہے انسان اپنی ذات پہ
پیرہن مٹی کا ہے ہر زندگی شیشے کی ہے
تم ترس کھا کر نہ دیکھو حال کی جانب یار
دل نہیں ٹوٹا ہمارا یہ ہنسی شیشے کی ہے
پتھروں سے پیار اتنا مت بڑھاؤ دوستو
زخم دے گی ایک دن یہ دوستی شیشے کی ہے

سب کے چہرے دیکھتا ہے اور کچھ کہتا نہیں
نیازؔ جی بے خبر کتنی خامشی شیشے کی ہے

علی احمد جلیلی

( حیدرآباد دیدہ و شنیدہ )

# آصفِ سابع اور استاد جلیل

میر عثمان علی خاں آصف سابع ایک مدبر حکمراں ہی نہ تھے، دیگر اوصاف کے منجملہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی شاعرانہ عظمت بھی ہے۔ شاہ عثمان کی سخنوری اسی تاریخی ورثہ کا ایک سلسلہ ہے جو محمد قلی قطب شاہ سے شروع ہو کر ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کی شاعری کا احاطہ کرتا ہوا آصفجاہی خاندان سے آ ملتا ہے۔ آصفجاہی سلاطین نے علم و فضل اور شعر و سخن کی آبیاری و سرپرستی میں تاریخی رول ادا کیا ہے۔ ان میں نواب میر محبوب علی خاں آصف پہلے شاعر تھے جنھوں نے اردو شاعری کا وقار بڑھایا اور ان کے بعد شاہ عثمان نے اس پودے کو ایک تناور سایہ دار شجر کا روپ دیا۔ اس سلسلۂ بیان میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عہدِ گذشتہ میں جہاں کسی شاعر کا دربار سے وابستہ ہونا اس کی (شاعر) شہرت و عزت کی ضمانت تھا وہیں اساتذۂ سخن کی وابستگی سے دربار کے افتخار میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔ تاریخ ادب اردو میں اس کی کڑیاں یوں ملتی ہیں۔ انشا اور شاہ نصیر شاہ عالم کے دربار سے منسلک تھے، نواب آصف الدولہ نے میر تقی میر کی قدردانی کی۔ مصحفی اور جرات کی وابستگی سلیمان شکوہ سے تھی۔ سراج الدین ظفر کے دربار میں ذوق و غالب کی آوازیں گونجتی تھیں۔ اسیر لکھنوی اور فتح اللہ برق، واجد علی شاہ اختر کے مصاحبین میں تھے۔ امیر مینائی نوابان رامپور کے استاد تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں آصف کے دربار سے داغ دہلوی اور جناب جلیل دونوں وابستہ رہے۔ شاہ آصف کی رحلت کے بعد شاہ عثمان نے جناب جلیل کو منصبِ استادی سے سرفراز کرتے ہوئے انھیں اس کی اطلاع یوں دی :

"تم والد مرحوم کے وقت جس طرح حاضر دربار ہوتے تھے
اور مصاحبین میں شامل تھے اسی طرح برقرار رکھے جاتے ہو"۔

اس طرح شاہ عثمان کی تخت نشینی کے ساتھ استادی اور شاگردی کا یہ رشتہ قائم ہوا
مولانا سلیمان ندوی ' ہنرور شاعر اور ہنر پرور بادشاہ جب جو تلازم عہد عباسیہ
روع ہوتا ہے وہ حضرت جلیل اور میر عثمان علی خاں پر ختم ہوتا ہے ' پھر جب یہ سلسلہ
ہوا تو تا دم حیات قائم رہا۔ میں نے والد مرحوم سے سنا ہے کہ کاروبار سلطنت سنبھالنے
ایک عرصہ تک اعلیٰ حضرت نے خود کوئی شعر نہیں کہا پھر جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو
حیات قائم رہا۔ البتہ دربار میں شعر و شاعری کا تذکرہ برابر ہوتا رہتا۔ ابتدا میں ایک
تک یہ دستور رہا کہ حسب ایماے شاہ روزآنہ ایک تازہ غزل گزرانی جاتی تھی۔ یہ غزلیں
بیشتر سرکار ہی کی مجوزہ طرح پر ہوتیں۔ اس تعلق سے فرمانِ خسروی کچھ اس طرح ہوتا۔

حافظ جلیل حسن جلیل
چند مصرعے کہے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی پر دیگر طبع آزمائی ہو تو مناسب ہے۔
؏ آج کس کا تہہ شمشیر گلو آتا ہے
؏ شکستہ بال و پری نے مجھے خراب کیا ؏ نخل امید میں ثمر آئے

جہاں تک آصف سابع کی شاعری کا سوال ہے حیدرآباد کے اربابِ ذوق جانتے ہیں
وہ بڑے زود گو اور بسیار گو بھی۔ جس دن طبیعت مائل بہ سخن ہوتی ایک ایک دن میں
دس غزلیں ہوجاتیں۔ سات دیوان تو ابتدائی دورِ حکومت ہی میں شائع ہو چکے تھے۔
ازاں دفتر دفتر جو ذخیرہ جمع ہوتا رہا ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان کا ایک
اب "انتخابِ کلام آصف سابع" کے نام سے نظامس اُردو ٹرسٹ کی جانب سے
شائع ہوا ہے۔

کلام خسروانہ پر اصلاح کے طریقہ کا میں یہاں بطور خاص ذکر کروں گا۔ جیسا کہ میں
ہی بیان کر چکا ہوں کہ جناب جلیل استادِ شاہ ہونے کے علاوہ مصاحب کے علاوہ مداحیہ
ین بھی تھے۔ صبح کے اوقات میں حاضری دربار لازمی تھی۔ جب تک دربار کی حاضری کا

لزوم رہا اصلاحِ سخن کا کام دربار ہی میں انجام پاتا۔ جب کبھی کوئی غزل ہو جاتی اعلیٰ حضرت شعر پڑھتے اور اصلاح فی البدیہہ ہوتی۔ وجہِ اصلاح بھی دریافت ہوتی اور مسائلِ شاعری بھی حل ہوتے۔ یہ کلام اس کلام کے سوا ہوتا جو فرصت سے اصلاح کے لیے دیا جاتا۔ مدت تک یہی طریقۂ اصلاح جاری رہا پھر جب بوجہ پیرانہ سالی حاضریِ دربار سے معافی مل گئی تو کلام شاہانہ گھر پر آنے لگا۔ کلام مہر بند لفافے میں چوبدار شاہی کے ذریعہ ایک روز قبل آجاتا اس پر ہدایت لکھی ہوتی کہ ۹ بجے کلام واپس ہونا ہے۔ بالعموم غزلوں یا سلاموں وغیرہ کی تعداد ایک سے زیادہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ اس طریقۂ کار میں تبدیلی ہو گئی۔ اب کلام اس تحریری ہدایت کے ساتھ آتا۔۔۔ بعد صلاح اسی آدمی کے ہاتھ واپس ہو۔ اصلاح کلام کے لیے کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ صبح آٹھ بجے سے رات کے ۹ بجے تک کسی وقت بھی کلام آسکتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ہی دن میں تین چار مرتبہ کلام آتا اور ہر دفعہ فوری اصلاح کے ساتھ واپس جاتا۔

اصلاح کے سلسلے میں پہلا مرحلہ اشعار پڑھنے کا ہوتا کیوں کہ پنسل سے لکھی ہوئی تحریر بے حد شکستہ اور رواں ہوتی۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا تو ریکارڈ کے لیے غزل کو ایک رجسٹر میں نقل کر لیا جاتا۔ اصلاح کی ابتدا یوں ہوتی کہ ایک ایک شعر پڑھ کر سنایا جاتا زیادہ تر یہ کام یا تو میں انجام دیتا یا میرے برادرِ بزرگ مونس احمد۔ جناب جلیل ایک ایک مصرع دہراتے درست ہوتا تو دوسرا شعر پڑھنے کو کہتے۔ اصلاح طلب ہوتا تو تھوڑی دیر غور کر کے اصلاح تجویز کرتے۔ اصلاح دیتے وقت اس بات کا خیال رکھتا ہوتا کہ شعر کا مفہوم برقرار رہے اور قواعد و زبان کی غلطیاں درست ہو جائیں۔ کلامِ شاہ پر اصلاح کے آداب یہ تھے کہ پہلے تو اصلاح کے الفاظ سرخی سے اسی کاغذ پر لکھ دیے جاتے۔ بعد ازاں مطلع سے لے کر مقطع تک ہر شعر کی تعریف علاحدہ علاحدہ ہر شعر کے مقابل لکھی جاتی مثلاً "مطلع آفتاب" "لاجواب" "ہزار آفریں" "سبحان اللہ" "اچھوتا مضمون" "بے نظیر" "صد آفریں اور رحمت کا شعر وغیرہ۔ پھر غزل کے آخر میں بحیثیت مجموعی پوری غزل کی تعریف میں چند تعریفی جملے لکھے جاتے اور تعریف میں مبالغہ سے کام لیا جاتا۔ مثلاً اس مشکل زمین میں سرکار کی غزل ایسی معرکہ کی ہوئی ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ہر شعر گراں قدر اور تعریف سے بالاتر ہے۔ یہ گویائی سرکار ہی کا حصہ ہے۔ سبحان اللہ۔ بارک اللہ وغیرہ۔ ان ہی تعریفی

الفاظ کا اقتباس دوسرے دن صبح دکن، رہبر دکن اور نظام گزٹ اخباروں کے پہلے صفحہ پر پابندی سے شائع ہونے والی سرکار کی غزلوں پر دائرے استاد جلیل کی صورت میں ہوتا۔ اکثر اصحاب ایسا گمان کرتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت خود اپنے قلم سے ایسا لکھ لیا کرتے تھے لیکن جو حقیقت تھی وہ میں نے بیان کر دی۔

شاہ و شاگرد شاہ میں استادی و شاگردی کے علاوہ ان کے درمیان ایک رشتۂ باہمی موانست اور ادب و احترام کا تھا۔ اس کی ایسی مثال شاہ عثمان نے قائم کی کہ شاذ و نادر ہی دیکھنے یا سننے میں آتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم صاحب کے اس پہلو کو واضح کرتے ہوئے اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

"گزشتہ زمانے کے اکثر نامور شعرا ایسے گزرے ہیں جن کی شاگردی پر سلاطین بڑا فخر کیا کرتے تھے مگر جو ادب و احترام بحیثیت استاد شاہ جناب جلیل کے ساتھ اعلیٰ حضرت کے برتاؤ سے ظاہر تھا اس کی مثال گزشتہ تاریخوں میں نہیں ملتی۔ دلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے روزنامچوں سے یہ بات کہیں ظاہر نہیں ہوتی کہ بہادر شاہ سوائے استاد کا لفظ استعمال کرنے کے اور کسی قسم کی عظمت ذوق کی کرتے ہوں اس لحاظ سے ماننا پڑتا ہے کہ استاد جلیل بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کو ایک لائق اور نکتہ سنج شاگرد ملا تھا جو ایک بڑی سلطنت کا بادشاہ بھی ہے اور اس ادب و احترام کا پورا پابند بھی ہے جو مسلمانوں کی درخشندہ روایات تھیں۔"

چنانچہ واقعات و مشاہدات شاہد ہیں کہ استاد کا پاس اس قدر ملحوظ خاطر تھا کہ ہمیشہ استاد جلیل ہی کہہ کر مخاطب کرتے اور استاد کی قدر تعظیماً ایستادہ ہو کر لیتے تھے۔ تقاریب شاہی کے موقع پر ڈنر ٹیبل جو خانوادۂ شاہی کے لیے مخصوص ہوتا اس ٹیبل پر اعلیٰ حضرت کے روبرو آپ کی نشست ہوتی تاکہ مخاطبت میں آسانی ہو۔ یہ وہ اعزاز ہے جو شاید ہی کسی شاعر دربار کو نصیب ہوا ہو۔ وقتاً فوقتاً شاعری کے تعلق سے جو فرمان چھپتے ان میں اپنے استاد کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے تھے۔ اپنے قادر دیوان کی طباعت کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"زمانہ قریب میں یہ قادر کا دیوان جس میں کم و بیش پانچ سو غزلیں

ہوں گی، طبع ہونے والا ہے جو میری لگاتار دس سالہ محنت و دماغ سوزی کا ثمرہ ہے اور یہ کلام استاد فصاحت جنگ جلیل کا دیکھا ہوا ہے جو کہ فی زمانہ اس فن کے ماہر و مبتحر ہیں۔ حضرت مرحوم و مغفور نے بھی کچھ عرصہ تک اپنے کلام پر اصلاح لی تھی۔ بعد وفات فصیح الملک، داغ دہلوی۔ یہ ملک کی اطلاع کی غرض سے جریدۂ غیر معمولی میں شائع کیا جائے۔"

اس والہانہ وابستگی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بجز مہاراجہ شادکے اعیان ریاست و امرائے سلطنت میں سے کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہ استاد جلیل سے مشورۂ سخن کرے لیکن جنھیں ذوق شاعری تھا چوری چھپے ضرور اپنا کلام دکھالیا کرتے تھے۔ اس تعلق سے ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ نواب قدرت نواز جنگ نے اپنی ایک غزل پر اصلاح لی تھی اور اس کا علم سرکار کو ہوگیا۔ دوسرے دن جب نواب موصوف حاضر دربار ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے ان سے بااصرار وہ پرچۂ اصلاح غزل طلب کیا۔ کچھ دیر تک اپنے ہاتھ میں پرچہ لے کر بغور دیکھتے رہے پھر اپنا قلم اٹھا کر جتنی اصلاحیں سرخ روشنائی سے درج تھیں ان کو اس طرح قلم زد کر دیا کہ وہ دوبارہ نہ پڑھے جاسکیں۔ یہ واقعہ خود نواب صاحب نے جناب جلیل سے بیان کیا اور ساری اصلاحیں دوبارہ لکھ لے گئے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ استاد جلیل سے کسی اور کا استفادہ کرنا انھیں گوارا نہ تھا۔

ایک دفعہ بغیر کسی خواہش یا درخواست کے از خود استاد کی قیام گاہ جلیل منزل تشریف لائے پھر اس کی توجیہ ایک تحریر شاہانہ میں یوں فرمائی۔

"یہ امر میرے لیے ممکن نہ تھا کہ دوسرے مقامات پر جاؤں اور یہاں نہ آؤں۔ چناں چہ میرے پیش نظر یہ امر بھی تھا کہ تلامذہ پر استاد کے حقوق بہت ہوتے ہیں۔۔۔ میں یہاں آکر بہت محظوظ ہوا۔"

اس موقع پر جناب جلیل نے ایک عرض داشت پیش کرتے ہوئے اس میں اس آرزو کا اظہار کیا کہ سرکار کو سلطان الشعرا کے لقب سے مخاطب کرنے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ اجازت بھی الفاظ کے ساتھ ملی اس کے الفاظ قابل غور اور لائق ذکر ہیں جو استاد اور شاگرد کے رشتے کو کتنا مقدس بناتے ہیں۔ فارسی میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر تحریکِ لقب سلطان الشعرا منجانب استاد، نیامدے
وہم از طرف شخص دیگر پیش شدے، ما ہرگز قبول نہ کردے
کہ شخصیت محرکِ ہم چیزے ہست کہ مارا بر قبولش مجبور کرد۔"

اگرچہ جناب جلیل کی طرف سے لقب سلطان الشعرا کی پیش کشی شخصی تھی لیکن قبولیت کے بعد اس لقب کی باقاعدہ پیش کشی نیم سرکاری سطح پر بڑے اہتمام کے ساتھ عمائدین سلطنت، ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں ٹاؤن ہال میں انجام پائی۔ اس تقریب کے بعد ہی سے آصف سابع کے دیگر خطابات و القاب کے ساتھ سلطان الشعرا کا اضافہ ہو گیا۔

حرفِ آخر یہ کہ تخت نشینی کے وقت سے جو رشتہ استاد و شاگرد کے درمیان قائم ہوا وہ تادم آخر استوار ہوتا گیا۔ دنیا جانتی ہے کہ بادشاہوں کی نازک مزاجی سے شاعرِ دربار کا مطابقت کر لینا کتنا دشوار ہوتا ہے لیکن یہاں یہ حال تھا کہ ایک طرف جذبۂ وفاداری اور دوسری طرف عقیدت کی سرشاری، دونوں نے مل کر جو توازن پیدا کیا اس کا گواہ میرے مضمون کی ایک ایک سطر ہے، جس کے متن کی زیادہ باتیں دیدہ ہیں شنیدہ نہیں۔

آخری ایام میں استاد جلیل کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ خبر جب ہمایونی تک پہنچی تو فوراً ڈاکٹر اور اطبائے یونانی علاج کے لیے مقرر کیے گئے۔ پائیگاہ خسروی سے روزانہ حالتِ مزاج دریافت کی جاتی اس کے جواب میں استاد جلیل نے بستر علالت سے یہ شعر شکریہ میں لکھ بھیجا۔

چارہ سازی کا یہ انداز کسے آتا ہے
دردِ دل صرف غلط ہو کے مٹا جاتا ہے

انتقال کے بعد تجہیز و تکفین کا سارا انتظام سرکاری طور پر شاہی اعزازات کے ساتھ ہوا۔ خطۂ صالحین میں تدفین ہوئی۔ ذاتِ شاہانہ شرکت فرمائی، اس وقت جن خیالات کا اظہار فرمایا اس سے ان کی کیفیتِ قلبی کا اندازہ ہوتا ہے:

" ایک باکمال شخص اٹھ گیا۔ وہ نہ صرف شعر و سخن کی دنیا میں

فرد کامل تھے بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی بے مثال تھے۔ میں نے
استاد جلیل سے ربع صدی سے زائد استفادہ کیا ہے۔
اعلیٰ حضرت مرحوم و مغفور بھی ان سے داغ صاحب کے بعد
اصلاح لیا کرتے تھے۔ میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ اب کسی کو اپنا
کلام نہیں دکھاؤں گا۔"

خدا مرحوم را کہ استاد ما بود غریقِ رحمت بکناد ●●

(بزم نذر کے سلسلے میں "حیدرآباد دیدہ و شنیدہ" کے زیر عنوان منعقدہ ادبی اجلاس ۱۷ ار نوم
میں پڑھا گیا ۔)

ممتاز ماہر تعلیم اور ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
کے سابق صدر جناب پروفیسر سید علی اکبر مرحوم کے (۱۶) دلچسپ
معلوماتی اور فکر انگیز مضامین کا مجموعہ

منتخب مضامین
سید علی اکبر

مرتب:
محمد منظور احمد

قیمت: ۱۵ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ،
حیدرآباد - ۴۸۲

پروفیسر قوی علی مرزا

(حیدرآباد دیدہ و شنیدہ)

# جامعاتی تعلیم — کل اور آج

آج سے کئی برس قبل انگریزی کے مشہور رسالہ "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" میں ہندوستان کے شہروں پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا۔ شہر بمبئی پر مضمون اسپورٹس کے مشہور کالم نگار اور ریڈیو کامنٹیٹر طالع یار خاں نے لکھا تھا جس کا ابتدائی جملہ ایک سوال کی شکل میں تھا:
"کون سا بمبئی، کس کا بمبئی؟" حیدرآباد پر مضمون لکھتے ہوئے ذہن میں یہی سوال پہلے اٹھتا ہے 'کون سا حیدرآباد، کس کا حیدرآباد؟' اور جامعہ عثمانیہ کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے اس سوال کی شدت زیادہ ہی ہو جاتی ہے کیوں کہ جامعہ عثمانیہ وہ قطعی نہیں ہے جس کا نقشہ اس کے بانیوں کے ذہن میں تھا اور جس نقشے کے مکمل ہونے تک نے کچھ ایسا موڑ لیا کہ یہ حسین خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے بارے میں آپ حضرات مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اس لیے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف یہ عرض کرتا چلوں کہ جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کو سمجھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسے ایک تحریک اور ایک مشن مانا جائے۔ انگریزی اقتدار کے نقطۂ عروج پر ایک ہندوستانی زبان کو جامعہ کی سطح پر ذریعۂ تعلیم بنانا اور اس مفروضے کو کامیاب عملی جامہ پہنانا ایک انقلاب سے کم نہ تھا۔ اس جرأت پر کفر کا فتویٰ دینے والوں کی کمی نہ تھی مگر چند صاحبان فہم و ادراک نے کھلے ذہن سے اس تجربہ کا خیر مقدم کیا۔ ویسے میں یہ چنداں ضروری نہیں سمجھتا کہ تیج بہادر سپرو، رابندر ناتھ ٹیگور اور سی راج گوپال چاری جیسے مشاہیر کی متفق آراء کا سہارا اس بارے میں ڈھونڈا جائے کیوں کہ مطلع علم پر

جب یہ آفتاب نمودار ہوا تو اس کی تابانی ہی میں اس کا جواز اور ثبوت دونوں مل گئے۔ اس تجربے کی کامیابی کو جب قبولیتِ عام ملی تو یوں محسوس ہوا کہ وہ جسے مرتد قرار دیا گیا تھا وہ مومن باصفا نکلا پھر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جب ملک آزاد ہوا تو ملک کی زبان دزبان ذریعہ تعلیم باقی نہیں رہی بلکہ سابق حکمرانوں کی زبان ذریعۂ تعلیم بنادی گئی۔ جامعۂ عثمانیہ کے بارے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب یہ جامعہ اپنی ترقی کے اس مقام پر پہنچا جسے TAKE OFF STAGE کہا جاسکتا ہے تو اس کے کردار میں ایسی تبدیلی آئی کہ تقریباً تیس برس کا کیا کرایا دھرا رہ گیا۔ اور از سرِ نو اس کی نئی تاریخ شروع ہوگئی۔

ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کے بنیادی فرق کے قطعِ نظر اس وقت کی جامعہ عثمانیہ اور موجودہ عثمانیہ یونیورسٹی میں جو فرق ہے وہ دو طرح کا ہے ایک تو یونی ورسٹی تعلیم میں غیر معمولی توسیع اور دوسرے جامعاتی تعلیم کے مطمحِ نظر میں واضح تبدیلی۔ انہی دو امور کے بارے میں میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے قبل پوری ریاست حیدرآباد میں صرف ایک کالج 'نظام کالج' تھا جس کا تعلق مدراس یونی ورسٹی سے تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لوگ علی گڑھ، ڈھاکے اور بمبئی جاتے تھے یا پھر یورپ کی جامعات کا رُخ کرتے تھے۔ جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد بھی ڈگری کالج صرف دو ہی تھے 'ایک تو یونی ورسٹی کالج اور دوسرا کلیۂ اناث۔ انٹرمیڈیٹ کالج جن کا الحاق جامعۂ عثمانیہ سے تھا' وہ صرف چار تھے' شہر میں سٹی کالج اور اضلاع میں تین مقامات یعنی اورنگ آباد' گلبرگہ اور ورنگل پر۔ یہ صورتِ حال تقریباً پچیس برس تک برقرار رہی۔ پھر نظام کالج کا الحاق جامعہ عثمانیہ سے ہوا اور دو نئے انٹر میڈیٹ کالج' چادر گھاٹ کالج اور دار العلوم کالج شہر میں کھولے گئے۔ آزادی کے بعد اور خصوصاً ریاستوں کی لسانی بنیادوں کی تشکیل کے بعد جامعاتی تعلیم میں بڑی تیزی سے وسعت ہوئی۔ اب تو ریاست آندھرا پردیش میں کئی یونی ورسیٹیاں ہیں اور صرف جامعۂ عثمانیہ سے ملحقہ کالجوں کی تعداد ۱۶۰ سے متجاوز کرچکی ہے اور بیسیوں پوسٹ گریجویٹ سنٹر قائم ہوچکے ہیں۔ طلبہ کی تعداد میں اضافے کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ہم پڑھتے تھے تو انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے نتائج جو اخباروں میں شائع ہوتے تھے تو تمام کامیاب امیدواروں کے نام چھپتے تھے اور اب تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اخبار یہ اعلان کرتے ہیں کہ نتائج اخبار کے دفتر پر معلوم کیے جاسکتے

ہیں۔ ایم اے اور ایم ایس سی میں طلبا کی تعداد بہت ہی محدود ہوتی تھی۔ تقریباً چالیس برس قبل جب میں نے ایم اے انگریزی میں داخلہ لیا تھا تو میرے ساتھ دو اور طالب علم تھے۔ ان میں ایک نے تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیا اور صرف دو امیدواروں نے امتحان دیا۔ دوسرے مضامین کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ ایم اے اور ایم ایس سی میں داخلے کے لیے جو مسابقتی امتحان ہوتے ہیں، ان میں ہر مضمون کے لیے ہزاروں امیدوار شریک ہوتے ہیں اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا انتظام نہ صرف کیمپس پر ہے بلکہ شہر کے کئی کالجوں اور بیرون شہر کے کالجوں میں بھی ہے۔ اس سے ہٹ کر ہزاروں کی تعداد میں امیدوار خانگی طور پر ایم اے کا امتحان دیتے ہیں۔ جامعاتی تعلیم کی یہ غیر معمولی ترقی موجودہ نظامِ تعلیم کا ایک خوشگوار پہلو ضرور ہے۔ مگر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تعلیم میں توسیع اور معیارِ تعلیم میں تنزّل لازم و ملزوم ہیں۔

جامعاتی تعلیم میں تبدیلی کا دوسرا اہم پہلو جس کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے مقصد اور مطمحِ نظر میں ایک بنیادی فرق پیدا ہوا ہے۔ عرصۂ دراز تک بلکہ صدیوں تک جامعاتی تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو 'LIBERAL EDUCATION' فراہم کی جائے۔ روشن خیالی اور وسیع النظری کی ترویج اس نظامِ تعلیم کا اہم مقصد تھا جیسا کہ کارڈینل نیومن نے اپنی تصنیف 'IDEA OF A UNIVERSITY' میں واضح کیا ہے۔ یونیورسٹی کی زندگی کے بکھیڑوں سے کوئی راست تعلق نہیں تھا اور جامعات کی حیثیت بڑی حد تک IVORY TOWERS کی سی تھی۔ حصولِ علم میں فوقیت شعبۂ فنون کے مضامین، فلسفہ، تاریخ اور ادب کو حاصل تھی۔ سائنسی مضامین کا درجہ ان کے بعد کا تھا۔ انجینئرنگ، میڈیسن اور دوسرے فنی مضامین کی تدریس جامعات کی ذمہ داری میں شامل نہیں تھی۔ یہی حال جامعۂ عثمانیہ کے دورِ اول کا بھی تھا۔

جامعہ کے سب سے اہم اور قابلِ قدر شعبے فلسفہ، تاریخ اور ادب کے تھے۔ آرٹس کی فیکلٹی کو اولیت حاصل تھی اور کلیہ فنون یعنی آرٹس کالج مرکزی مقام تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو کیمپس پر تعمیر ہونے والی پہلی اور سب سے پُرشکوہ عمارت آرٹس کالج کی نہ ہوتی۔ اب حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب جامعات سماج کے تقاضوں کو پورا کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتی ہیں جبکہ زندگی کے طوفانی سمندر میں ایک پرسکون جزیرہ بنا رہنا اب اعلیٰ

تعلیم کے سب سے اہم شعبے انجنیرنگ، میڈیسن اور سائنس ہیں اور ایسے نئے مضامین جن کا پہلے دور دور تک پتہ نہ تھا جیسے ایم بی اے اور کامرس۔ فلسفہ اور تاریخ کی طرف اب کسی کی توجہ نہیں ہے جو طالب علم کچھ اور نہ کر سکیں وہ ادب اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں تاریخ، فلسفہ اور ادب کے اساتذہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہوتے تھے۔ اب یہ ہے کہ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ جامعاتی تعلیم کا تبدیلی بالکلیہ غیر صحت مند ہے۔ یہ تبدیلی تو ایک عالمی رجحان کی عکاسی کرتی ہے سائنسی ترقی کے اس دور میں شاید ہونا بھی یہی چاہیے لیکن پھر بھی یہ کہنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس صورت حال سے لفظ جامعہ یا یونیورسٹی کے بنیادی مفہوم کی تکذیب ضرور ہوتی ہے۔

اس مختصر مضمون میں ان تمام چھوٹی اور بڑی تبدیلیوں کا ذکر ممکن نہیں ہے جو جامعہ عثمانیہ میں اس کی بے مثال تاریخ میں آئی ہیں یا ہم نے دیکھی یا سنی ہیں۔ صرف ایک اور امر کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں اور مضمون کو ختم کروں۔ چوں کہ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے وقت اور اس کے بہت بعد تک اعلیٰ تعلیم کا تصور بالکل جداگانہ تھا اس لیے یہاں اور ہندستان کی دوسری جامعات میں ریسرچ یا تحقیق کی وہ اہمیت نہیں تھی جیسی کہ اب ہے۔ حال یہ تھا کہ ریاستی حکومت کے وظیفے پر جو طالب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے باہر جاتے تھے وہ آکسفورڈ سے HONOUR کیمبرج سے TRIPOS اور دوسری جامعات سے ایم اے اور ایم ایس سی کی ڈگریاں لے کر واپس ہوتے تھے، ہاں یہ ضرور تھا یوروپی جامعات خصوصاً جرمنی کی جامعات جانے والے اکثر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرتے تھے۔ اب حالات مختلف ہیں۔ تحقیق جامعاتی زندگی کا سب سے اہم جزو ہے اور جامعہ کے اساتذہ کے لیے ریسرچ کی ڈگری اقل ترین قابلیت سمجھی جاتی ہے اور جو لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جاتے ہیں وہ زیادہ تر امریکی یونیورسٹیوں میں داخلے لیتے ہیں۔ اس تبدیلی کے کئی مثبت پہلو ضرور ہیں لیکن ایک منفی پہلو یہ ہے کہ تدریس کو وہ اہمیت اب نہیں رہی جو پہلے تھی اور جامعہ کے استاد کا جو تصور لوگوں کے ذہنوں میں تھا اس پر بہت کم اساتذہ پورے اترتے ہیں اور علم کی ہمہ گیری کی جگہ اب STEEIDISATION نے لی ہے۔

ان خملہ

# غزلیں

صابر فخرالدین

یہ ساخوش فہم تھا وہ ڈوب کے مرنے والا
نقش پانی پہ نہیں کوئی ٹھہرنے والا

اب وحی کوئی زمیں پر نہیں آنے والی
اب صحیفہ بھی نہیں کوئی اترنے والا

سخت بھی ہوگا یہ اندازہ کسے تھا پہلے
لفظ کی چوٹ سے وہ ٹوٹ بکھرنے والا

کن اندھیروں میں مجھے چھوڑ گیا ہے تنہا
میری آنکھوں میں دھنک بن کے سنورنے والا

پھر کوئی نظم رگ و پے میں سمانے والی
پھر کوئی شعر دل و جاں میں اترنے والا

نیند کے لطف سے محروم ہیں آنکھیں میری
یا خدا ہاتھ نظر مجھکو دے سنورنے والا

عہدِ حاضر کا یہی سب سے بڑا سچ ہے خمار
ـــ ... ہے ملوا رہے مکرنے والا

○

میں اپنے کام سے آیا ہوا تھا
مگر شہر آکے گھبرایا ہوا تھا

سمندر، ریت، مونگے اور ساحل
پتہ یہ اس کا بتلایا ہوا تھا

نہ جانے بات آخر کیا ہوئی تھی
اسے غصہ بہت آیا ہوا تھا

جو میرے سائے تک سے تھا گریزاں
وہی اب میرا ہمسایہ ہوا تھا

مگر وہ پھول سا چہرہ تو صابر
تمہارے غم میں مرجھایا ہوا تھا

وقار خلیل

# اردو نامہ

(اردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں)

یکم جنوری: سالِ نو کا مشاعرہ ارباب نثر و نظم کی طرف سے جناب محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ منصف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اظہر افسر مہمانِ خصوصی تھے۔ اس مشاعرہ میں قدیم و جدید مکتب فکر کے ۳۳ شعراء نے سالِ نو کے تناظر میں کلام سنایا جن میں سعید شہیدی، وقار خلیل، داؤد نصیب، اقبال ہاشمی، اختر واجدی، روحی قادری، بشیر وارثی، رشید شہیدی، اثر غوری، فرید تحسین، فائق ترکمانی، ڈاکٹر راہی اور اکبر یوسفی قابلِ ذکر ہیں۔ وقار خلیل نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

○ حیدرآباد لٹریری فورم اور ادارۂ ذہنِ جدید عصر کی طرف سے جناب یوسف اعظمی کے مجموعۂ کلام "آسمان کا پیرہن" کی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں رسم رونمائی انجام پائی۔ اسی شام پروفیسر نارنگ نے فیض میموریل انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا۔ تقی بلگرامی صدر ایلڈرس کونسل نے صدارت کی۔ پروفیسر مغنی تبسم نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ جیلانی پیراک نے شکریہ ادا کیا اور محمد منظور احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

○ ولا اکیڈمی اور مکتبہ شاداب کی طرف سے پاکستانی تھانوی پروفیسر شاہد اور جناب کھنہ کو استقبالیہ دیا گیا اور اس موقع پر ہر دو حضرات کی شخصیت اور فکر و فن پر مضامین نظم و نثر پر مشتمل شاداب کا خاص نمبر کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جاری کیا۔ پروفیسر محمود حسین اور ڈاکٹر حسن الدین احمد نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ جناب معظم حسین نے صدارت کی اور جناب محمد منظور احمد نے نظامت کی۔

○ کل ہند صنعتی نمائش میں ادبی ٹرسٹ کی طرف سے اردو بک اسٹال قائم کیا گیا۔ جہاں اختتام نمائش تک اردو کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

۲ جنوری: اردو گھر میں روزنامہ سیاست کے زیر اہتمام سالانہ توسیعی لکچر کا اہتمام کیا گیا پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "اردو کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟" کے موضوع پر عالمانہ اور دانشورانہ لکچر دیا جسے سینکڑوں محبانِ اردو

نے توجہ سے سُنا۔ ابتدا مجتبیٰ حسین نے پروفیسر نارنگ پر خوبصورت خاکہ سنایا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے خیر مقدم کیا، پروفیسر مغنی تبسم نے نظامت کی۔ پروفیسر ثریا حسین اور مسٹر راما نج راو نے مجلس صدارت کی کرسیوں کو رونق بخشی۔

● مسٹر راما ریڈی نے کل ہند ڈرامہ فیسٹول کا افتتاح کیا، پروفیسر انور معظم نے صدارت کی۔

● پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں ادب اور سماج کے رشتے پر لکچر دیا۔ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد نے صدارت کی۔

۳ر تا ۵ر جنوری: شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام کل ہند سہ روزہ سمینار "حیدرآباد میں بیرونی شعرا" کے موضوع پر منعقد ہوا جس کا افتتاح مسز کمودبین جوشی ریاستی گورنر نے کیا، حیدرآباد کے مثالی علمی و ادبی ماحول اور جامعہ عثمانیہ کے تاریخ ساز کردار کو زبردست خراج ادا کیا گیا۔ پروفیسر ڈی نونیت راؤ، وائس چانسلر نے صدارت کی۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے استقبالیہ تقریر پڑھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد مہمانانِ خصوصی تھے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۴ اور ۵ر جنوری کو سمینار کے ۴ اجلاس منعقد ہوئے جن میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر ہاشم علی، پروفیسر عقیل رضوی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر ثریا حسین، پروفیسر یوسف سرمست، ڈاکٹر اشرف رفیع، ڈاکٹر حنیف کیفی، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ، ڈاکٹر شفیقہ فرحت پروفیسر سراج الدین، ڈاکٹر غیاث اقبال، ڈاکٹر بیگ احساس، علی احمد جلیلی، رؤف خیر، احمد جلیس، محمد منظور احمد، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، اور غیاث متین نے حیدرآباد میں بیرونی نامور شعرا داغ، حسرت، فانی، جلیل، یگانہ، امیر مینائی جوش، شاہ نصیر، نظم طباطبائی ماہر القادری اور حیرت بدایونی کے فکر و فن اور حیدرآباد کی ادبی تاریخ میں ان کے حصے پر مقالے سنائے۔ ۵ر جنوری کو شبِ غزل کے خوبصورت پروگرام پر ان تقاریب کا اختتام عمل میں آیا۔

۵ر جنوری: حیدرآباد لٹریری فورم کے اجلاس میں جناب علی ظہیر کے دوسرے مجموعۂ کلام "انگلیوں سے خون" کی اشاعت پر علمی محفل پروفیسر مغنی تبسم کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، یوسف اعظمی، غیاث متین اور حسن فرخ نے ظہیر کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا۔ آخر میں جناب فاروقی نے "اردو ادب و تنقید پر مغربی اثرات" کے زیرِ عنوان لکچر سے استفادہ کا موقع دیا۔

۶ر جنوری: پاکستانی ادیبہ

شاعر پروفیسر شاہد اور جناب
کھنڈا اپنے قیام حیدرآباد کے
بعد کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔
● ادارۂ ترقی ادب کے
جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے
مرکزی نائب وزیر تعلیم مسز
سوشیلا روہتگی نے کہا کہ اردو
کے تعلق سے مرکز کھلا ذہن
رکھتا ہے۔ مسز نیلم بالکاریڈی
(ایم ایل اے) سید رحمت علی
(ایم پی) اور منوہر راج سکسینہ
نے ریاست میں اردو کے
پیچیدہ اور حل طلب مسائل پر
اظہار خیال کیا۔ جناب کے ایم
خان نے صدارت کی۔

۸ر جنوری: ادارۂ ادبیات
اردو کے امتحانات اردو فاضل
اردو عالم (مسلمہ عثمانیہ یونیورسٹی)
زبان دانی، اردو دانی
حیدرآباد کے علاوہ اورنگ آباد،
ملی، بھینسہ، بھونگیر، جوگی
پیٹھ، محبوب نگر، رنا سرپور،
ونڈلہ، کریم نگر، مدن پلی، نظام
آباد، ورنگل، نلگنڈہ اور
شاکھا پٹنم کے مراکز پر ۸ تا ۱۱،
جنوری منعقد ہوئے۔

۹ر جنوری: ہندپاک تعلقات
کو معمول پر لانے کے تیسرے مرحلے
کے تحت حکومت ہند نے
دانشوروں، ماہرین تعلیم اور
اسکالروں پر مشتمل ایک وفد کو
پاکستان کے خیر سگالی دورہ پر
روانہ کیا۔ حیدرآباد سے پروفیسر
رفیعہ سلطانہ نے نمائندگی کی اور
حیدرآباد کے علمی، ادبی ماحول
پر مقالہ سنایا۔

۱۰ر جنوری: ڈاکٹر ولی اللہ،
اسوسی ایٹ پروفیسر اگریکلچرل
یونیورسٹی حیدرآباد کا بعارضۂ قلب
انتقال ہوا۔ مرحوم نامور شاعرہ
محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ لکچرر ممتاز
کالج کے شوہر تھے۔ ادارۂ سب
رس شعریٰ صاحبہ اور پسماندوں
سے تعزیت کرتے ہوئے مغفرت
کی دعا کرتا ہے۔

۱۱ر جنوری: محفل خواتین نے
محترمہ جیلانی بانو کو سوویت لینڈ
ایوارڈ ملنے کی مسرت میں بانو
کے ساتھ ایک شام کے زیر عنوان
علمی محفل منعقد کی۔ صاحبۂ جلسہ
نے جیلانی بانو سے گفتگو
اور فن پر اظہار خیال کیا اور شرکاء
نے ادبی مسائل پر گفتگو کی۔
محفلِ شعر میں خواتین شعراء
نے کلام سنایا۔ محترمہ فاطمہ
عالم علی نے نظامت کی۔

۱۲ر جنوری: اقبال اکیڈیمی
کی طرف سے محفلِ اقبال میں
جناب یوسف اعظمی نے
خطباتِ اقبال پر توسیعی لکچر
دیا۔ پروفیسر سراج الدین نے
صدارت کی۔ اس موقع پر
پروفیسر مغنی تبسم نے کوثر،
ناز صدیقی کے لیے گراں قدر
کتابوں کا ذخیرہ اکیڈیمی کو
بطور عطیہ پیش کیا۔
● بزرگ شاعر صاحبزادہ
ہلال آغائی کا انتقال ہوا۔

۱۹ر جنوری: کل ہند صنعتی
نمائش کے زیر اہتمام سالانہ
مشاعرہ میں سعید شہیدی، کاظم علی
احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول،
امیر احمد خسرو، خواجہ شوق،
خیرات ندیم، غیاث صدیقی

(سلسلہ ص ۱۱۱ پر دیکھئے)

# سب رس

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

31

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

سن اجرا: ۱۹۳۸ء — فون: ۴۶۹

حیدرآباد

# ماہنامہ سب رس

جلد: ۴۸ شمارہ: ۳، ۴ مارچ، اپریل ۱۹۸۶ء

مدیر اعزازی: مغنی تبسم
شریک مدیر: محمد منظور احمد
معاون مدیر: وقار خلیل

## مجلس مشاورت

صدر: حامد علی عباسی نائب صدر: ہاشم علی اختر
معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

## اراکین:

عابد علی خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، محمد اکبر الدین صدیقی، آر بی راج سکسینہ، پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد

قیمت فی پرچہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے
سالانہ: ۲۰ روپے کتب خانوں سے: ۲۵ روپے
بیرونی ملکوں سے:

| | ہوائی ڈاک سے | بحری ڈاک سے |
|---|---|---|
| مشرق وسطیٰ | ۱۵ ڈالر | ۶ ڈالر |
| امریکہ | ۲۰ ڈالر | ۷ ڈالر |
| پاکستان، بنگلہ دیش | ۱۰ ڈالر | ۴ ڈالر |
| انگلستان | ۸ پونڈ | ۳ پونڈ |

باہتمام سکینہ ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر دفتر سب رس پنجہ گٹہ حیدرآباد ۸۲ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ:
ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو، پنجہ گٹہ حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

# ترتیب



# اپنی بات

برصغیر ہند و پاک کی نامور افسانہ نویس و ناول نگار ادیبہ محترمہ جیلانی بانو کو سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ان کے ناول "بارشِ سنگ" پر ملا ہے۔

ادارۂ سب رس محترمہ جیلانی بانو کو اس ایوارڈ پر مبارکباد پیش کرتا ہے اور اپنے وسائل کے مطابق گوشۂ جیلانی بانو کے ذریعہ ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے۔

جیلانی بانو کی اب تک جملہ (۱۲) کتابیں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ تلگو اور ملیالم کہانیوں کے دو اردو تراجم بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے ناول "ایوان غزل" کا انگریزی اور ہندی میں بھی ترجمہ چھپ چکا ہے۔ بانو کی بیشتر کتابیں پاکستانی ناشرین نے بھی شائع کی ہیں۔

ذیل میں تفصیلات درج کی جا رہی ہیں۔

افسانوی مطبوعات: روشنی کے مینار ۱۹۵۸ء

ڈاکٹر محمد علی اثر

# محمد قلی کی غزل گوئی

مملکت گولکنڈہ کا پانچواں فرماں روا' سلطان محمد قلی قطب شاہ' اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جس نے صنف غزل پر باقاعدہ توجہ کی ہے اور جس کا دیوان عہد قدیم ہی میں ترتیب و تدوین سے آراستہ ہو چکا تھا۔ یوں تو محمد قلی قطب شاہ سے قبل مشتاق' لطفی' فیروز' محمود اور خیالی قدیم دکنی کے باکمال غزل گو شاعر گزرے ہیں لیکن کسی شاعر کا کلام مرتبہ دیوان کی شکل میں ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔

قدیم دکنی غزل' بالخصوص دبستانِ گولکنڈہ کی غزل گوئی کا جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش یہی خصوصیات دکنی کے دوسرے شاعروں کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر کچھ نہ کچھ اپنی انفرادی خصوصیات کا حامل ضرور ہوتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی 'بعض نمایاں خصوصیات تمام دکنی شعرا میں مشترک نظر آتی ہیں۔

محمد قلی کا ضخیم دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے' جس میں کم و بیش تمام اصنافِ شعر میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ رباعی اور مثنوی کی صنف کو چھوڑ کر محمد قلی کا تمام کلام غزل کے فارم میں ہے۔ غزل کی صنف کے لیے جس داخلی کیفیت اور خارجی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ محمد قلی کو میسر تھا' شاید اسی لیے غزل اس کی محبوب صنف بن گئی۔ یہاں تک کہ اس کی بعض تخلیقات جنھیں ڈاکٹر زور نے عنوانات قائم کر کے نظموں سے تعبیر کیا ہے۔ دراصل مختلف موضوعات کے تحت کہی ہوئی مسلسل اور مربوط غزلیں ہی ہیں۔

سادگی و سلاست، روانی و برجستگی اور اصلیت و واقعیت محمد قلی کے کلام کی اہم اور نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس نے اپنے تجربات زندگی، محسوسات اور مشاہدات کو سیدھے سادھے الفاظ اور رواں پیرایۂ بیان میں حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محمد قلی کی غزلوں میں سوز و گداز ہے اور نہ فکر کی گہرائی، درد و غم کی فراوانی ہے نہ نشتریت۔ اس نے اپنی زندگی کی بہاریں، عیش و نشاط اور راگ رنگ میں گزاریں۔ اس لیے اس کے کلام میں رنگینی و رعنائی ہے، تازگی و شگفتگی ہے، سیرابی و سرمستی ہے۔ غرض آسودگی کے تمام روپ اس کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ محمد قلی کا آرٹ کلاسیکی آرٹ کی ترجمانی کرتا ہے کہ یہ خوشحالی، اطمینان اور آسودگی کا آرٹ ہے۔ چوں کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا ایک مطلق العنان بادشاہ تھا، اس کے محلوں میں بیسیوں ملکوں کی منتخب حسینائیں جمع تھیں، اس لیے اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کے آسودہ نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ محمد قلی کی غزلیں اس کی رنگا رنگ طبیعت کی آئینہ دار ہیں، اس نے اپنے کلام میں اپنی بد نصیبی کا شکوہ کیا ہے اور نہ ناکامی اور محرومی پر آنسو بہائے ہیں اس نے اپنے آپ کو مسرور رکھا اور خوشی کے اظہار کے لیے طرح طرح سے شکر بجا لاتا رہا۔

محمد قلی ایک کثیر المحبوب شاعر ہے اس نے اپنی انگنت محبوباؤں کی تعریف و توصیف میں متعدد غزلیں کہی ہیں۔ محمد قلی کی شاعری میں محبوب مبہم نہیں رہتا، بلکہ واضح طور پر اس کے لیے صیغۂ تانیث استعمال کیا گیا ہے۔ اس نے اپنی محبوباؤں پیاریوں کو سکی، دھن، ناری، پیاری، چھبیلی، سانولی وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے محمد قلی ہندوستانیت کا بہت بڑا پرستار ہے، اس کی رگ و پے میں ہندوستانی تہذیب سرائیت کر گئی ہے۔ وہ ہندوستان کی ہر نمایاں اور مشہور رسم، تہوار اور طریق کو اپنے خیالات میں بسا لینا چاہتا ہے۔ محمد قلی کے کلام کے مطالعے سے اس عہد کی سماجی زندگی کے متعلق بہت کچھ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شادی بیاہ کے رسوم، مختلف موسموں، عید، میلاد، تہواروں اور کھیلوں وغیرہ کی تفصیلات سے دلچسپ مرقعے اس کے کلام میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر

یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ محمد قلی کی شاعری نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اپنے عہد کی ایک مستند تاریخ بھی ہے جس میں چار سو سال پہلے کی زندگی بولتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں۔

محمد قلی طبعاً راگ رنگ اور نغمہ و نشاط کا شاعر ہے۔ اسی لیے اس کی غزلو زیادہ تر رنگینی، رعنائی، آسودگی اور سیرابی و سرمستی کے تمام روپ نمایاں ہوجاتے ہ لیکن اس کی غزل محض عیش کوشی یا کامیاب عاشق کے نشاط وصل کی داستان ہی نہ بلکہ ایک دردمند اور حساس دل شاعر کے جذبات کی ترجمان بھی ہے۔ اس میں ش نہیں کہ محمد قلی کے کلام میں فراقیہ اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لیکن یہ اشع محمد قلی کے فکر و فن کی گہرائی اور گیرائی کا پتہ دیتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

بن سیر تمن ساری کلیاں سوک رہی ہیں
ٹک آ کے کرو گشت چمن جی اُٹھے سارا

خدا جیو کی بچاں کوں دکھا ایک بار　　دکھا عرض کر غم کروں خوار زار
مو نظر سامنے نہیں ہے یار　　نین پانی میں تیرتا دلدار

تج بن پیارے نیند ٹک نیناں میں منج آتی نہیں
رین اندھاری ہے کٹھن تج بن کٹی جاتی نہیں

محمد قلی کی غزلوں میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ بھی شد سے ابھرتا ہے۔ مذہبی رنگ کی غزلوں میں بھی محمد قلی نے جوش عقیدت او اعتقادات سے والہانہ وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قا پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے اور مذہبی ریت و رسوم پر بھی چلتا ہے لیکن مذ کی حقیقی روح سے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں عاری ہیں۔ اس کو مذ کے صرف تہذیبی پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اپنی عیش کو بھی نبی اور علی کا صدقہ قرار دیتا ہے۔ اسے مذہب اس لیے عزیز ہے کہ وجہ سے زندگی، حکومت، دولت، عروج اور دنیوی کامیابی حاصل ہوی۔ مذہبی موضوعات پر اس نے بیسویں غزلیں کہی ہیں، لیکن کہیں بھی وہ ایک

عاہے۔ بیزگار کی طرح عبادت کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا، بلکہ ہر تقریب میں اسے یہ فکر رہتی ہے کہ اس کی 'پیاری' یا 'سانولی' نے کون سا لباس زیب تن کیا ہے اور نبی کے صدقے سے آج وہ کتنی پرکشش دکھائی دے رہی ہے

نبی صدقے بارا اماماں کرم تھے — کر عیش جم با عا پیاریاں سوں پیارے
نبی صدقے قطب جم عیش کر کھش — کہ تج در پہ کرشے ہیں فتح و اقبال

قدیم ادب کے بعض نقادوں اور محققوں نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کو الہامی کہا ہے اور اس کو ایک عظیم المرتبت شاعر قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد قلی کے یہاں نہ تو مضامین غیب سے آتے ہیں اور نہ ہی اس نے عرش سے ادھر کی باتیں کی ہیں۔ وہ تو اسی عالم رنگ و بو کا ایک مغنی ہے جو ہمیشہ اپنی بے شمار محبوباؤں اور پیاریوں کے جھرمٹ میں گھرا رہتا ہے اور انہیں کے خد و خال، عشوہ و جمال اور رفتار و گفتار کے گیت گاتا ہے۔ محمد قلی پر 'عظیم شاعر' کی اصطلاح کا اطلاق بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوگی کیوں کہ ایک عظیم شاعر وہ ہوتا ہے جس کے کلام میں حقائقِ حیات کے بارے میں حکیمانہ بصیرت ملتی ہے۔

محمد قلی نہ بلند پایہ عالم تھا اور نہ فلسفی یا حکیم۔ اس نے اپنے محسوسات اور تجربات زندگی کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے یہی اس کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ وہ ایک خوش گو اور اردو کا اوّلین صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہی واقعہ اس کے نام اور کلام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔


## مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو

برق و آشیاں از: سعید شہیدی ۵ روپے
عروض از کلیم اللہ حسینی ۲ روپے
اردو انسائیکلوپیڈیا از ادارہ ۶ روپے

بلاغت از: کلیم اللہ حسینی (زیر طبع)
تعلیم کا مسئلہ از: ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۲ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۴۸۲

ساقی فاروقی

# غزلیں

مرے جلال نے 'انکار' سے گزار دیا
مگر سوال کی تلوار پر اُتار دیا

مری حیات اک افسردہ رات جیسی ہے
ترے جمال کا میعادِ صبح کار دیا

تو یہ عجیب ہوا اور مجھ سے اجتناب کرے
اسی خیال کے آزار نے قرار دیا

مجھے نشہ ہے کہ نقشِ عروج سے کم ہوں
مجھے زوال کی دیوار پر اُبھار دیا

وہ اختیار ملے اب کہ اختیار چلے
یہ کیا ملال کے بازار سے گزار دیا

ہماری ذات شکستہ کا بن بھی تو ہے
شدید آدمی کی تھکن بھی تو ہے

غرض ہے ایک سوئے فلک سے نہیں
ستم کہ پھر زمیں کا بدن بھی تو ہے

بلا سے ہے خار بستر میرا
تری سادگی طعنہ زن بھی تو ہے

مری جنگ مسلکِ رفوگر سے تھی
بڑا میرا پیرہن بھی تو ہے

مجھے جس دیے سے اندھیرا ملا
وہی روشنی کا وطن بھی تو ہے

امان اختر

# غزلیں

ساحل سے زندگی کی ادا ساتھ لے چلیں
مٹھی میں تھوڑی تازہ ہوا ساتھ لے چلیں

انگلی پکڑ کے شام کی گھومیں گلی گلی
لوٹیں تو ایک خواب نیا ساتھ لے چلیں

ایک ایک رنگ لے چلیں پلکوں سے باندھ کر
منظر تمام، ساری فضا ساتھ لے چلیں

خوشبو تمام پی لیں صبا کو نچوڑ کر
اگلی بہار تک کا نشہ ساتھ لے چلیں

کیا جانے کل یہ شام کہے کس جگہ قیام
بچھڑیں تو اس سے اگلا پتہ ساتھ لے چلیں

اب کہانی ختم کر انجام لکھ
اپنے دروازے پہ میرا نام لکھ

اور میں کیا کیا کروں تیرے لیے
ایک کاغذ پر وہ سارے کام لکھ

میرے آنگن میں جگا جادو ترا
دھوپ لکھے دوپہر تو شام لکھ

لکھ گیا سورج مرے ہونٹوں پہ پیاس
اپنے ہونٹوں سے تو ان پر جام لکھ

اک دریچہ تو کھلا رکھ رات میں
روشنی کچھ تو گلی کے نام لکھ

امان اختر

# غزلیں

موسمِ گل یہاں، وہاں رکھ دے
خوشبوؤں کی کہانیاں رکھ دے

شاخ در شاخ ٹانک دے گل بوٹے
پتے پتے پہ تتلیاں رکھ دے

دے ہواؤں کو پاؤں رادھا کے
ٹہنی ٹہنی میں بنسیاں رکھ دے

رنگ پہنا دے اُجڑی سڑکوں کو
اور رنگوں میں بجلیاں رکھ دے

پھر مجھے فرصتِ سخن دے دے
پھر لہو میں مرے زباں رکھ دے

گیت چنتا پھروں میں گلیوں میں
میری پلکوں پہ جھولیاں رکھ دے

اے خدا لوگ پیار بھول گئے
ان کے ہاتھوں پہ روٹیاں رکھ دے

ٹوٹتا ہے تو ٹوٹ جائے گا
شیشہ، ہاتھوں سے چھوٹ جائے گا

یہ نہ کہیے کہ ہیں سبھی اپنے
کوئی اپنا ہی لوٹ جائے گا

شام دے جائے گی کوئی سپنا
رات آئے گی، ٹوٹ جائے گا

سچ گلی تک بھی جا نہ پائے گا
دوستوں تک تو جھوٹ جائے گا

آج یہ شرط باندھ کر اُٹھیں
کون گھر تک الوٹ جائے گا

# غزلیں

## محمد عظیم الدین محبت

رخسار و لب کا تیرے رنگین ہے فسانہ
پھولوں سے ان کی یاری غنچوں سے دوستانہ

بادہ گسارو دیکھو یہ کون آ رہا ہے
نظروں سے مے کی بارش آنکھیں شراب خانہ

دیکھا تو پھول سے بھی بڑھ کر حسین نکلے
سنتے تھے نام جن کا مدت سے غائبانہ

میرے لیے تو یا رب دونوں بھی ہیں قیامت
سلجھے ہوئے وہ گیسو یا بے نیاز شانہ

زحمت نہ ہو تو چلئے کہنا ہے آپ سے کچھ
واقع ہے دو قدم پر میرا غریب خانہ

اُن کے نگر سے ہم کو نسبت ہے صرف اتنی
آئے مسافرانہ گزرے قلندرانہ

اب تک بھی تم محبت کیا ان کے منتظر ہو
آئے بھی وہ گئے بھی اور ہو گئے پرانہ

## سعد الدین سعد

یوں بھرے شہر نظر آتے ہیں ویرانے سے
جیسے سب لوگ ترے بھائی ہیں بیگانے سے

اپنے چہرے پہ بھروسہ ہے تو کھل کر ہنسئے
ورنہ چہرے تو بدل جاتے ہیں شرمانے سے

زندگی وقفِ ستم ہو ہی چکی ہے تو پھر
فرق کیا ہوگا بس اک ان کے چلے جانے سے

بدلا بدلا سا نظر آتا ہے ساقی کا سلوک
پھر نہ آئیں گے اگر اٹھ گئے میخانے سے

چلتے چلتے ہی ذرا اُرک کے انھیں دیکھا تھا
جانے کیوں لوگ بنا لیتے ہیں افسانے سے

ہم سے قائم ہے تری بزم کی رونق ورنہ
ہم چلے جائیں تو رہ جائیں گے ویرانے سے

آخرِ شب جو کل اک سعد ستارہ ٹوٹا
منزلیں دور ہوئیں راستہ کھو جانے سے

# غزلیں

**حنیف کیفی**

چھو کے بھی نہیں گزری خوشبو کتابوں کی
عالموں کے لب پر ہے گفتگو کتابوں کی

بکھرے ہے ہیں بے حرمت زندگی کی راہوں میں
جن کے دم قدم سے ہے آبرو کتابوں کی

شوق کی فراوانی ، اپنی تنگ دامانی
گھٹ رہی ہے سینے میں آرزو کتابوں کی

بات خوش مذاقی کی چل پڑی تھی یاروں میں
لے گئی نمائش تک گفتگو کتابوں کی

کیا ہوئے ہیں دیوانے آج کل کے فرزانے
جستجو شعاعوں کی گفتگو کتابوں کی

سرمۂ بصارت بھی نسخۂ بصیرت بھی!
چوم لے نگاہوں سے گرد تو کتابوں کی

گھر لٹا کے چھپوالیں اک حسین مجموعہ
مانگ آرہی ہے کیفی خوب رو کتابوں کی

**مومن خان شوق**

خزاں کا خوف کچھ کم ہوگیا ہے
نئی کونپل پہ جب غنچہ کھلا ہے

لگے ٹھوکر تو رُک کر سوچتا ہے
کہ جیسے راستہ بالکل نیا ہے

ہراسانی سے کیا ملتا ہے لوگو!
خلا کے شہر میں سب کچھ روا ہے

کئی موسم یہاں آئے گئے بھی
مگر اک شخص پیاسا تنہا ہے

فنا کے دشت میں کیا جانے کب سے
کوئی سایہ میرے پیچھے چلا ہے

کوئی جاگے کہ سوئے کون دیکھے
سنے تو شوق بھاگا جا رہا ہے

ڈاکٹر حسن الدین احمد

# اطہر راز کی نظم

## (سفر اپنی ذات کے اندر)

اردو شاعری بیشتر صنائع لفظی و معنوی، بندش، آہنگ، طرز ادا، استعاروں اور کنایوں سے عبارت رہی ہے۔ اردو شاعری میں مقررہ اور روایتی مضامین ہوتے ہیں جن کے پس منظر میں شاعری کی جاتی ہے اور ندرت خیال کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس بات کو بہت کم محسوس کیا گیا کہ اردو زبان سائنس اور علم کے میدان میں طبع آزمائی کے لیے بھی پوری اہلیت رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو شاعروں نے ابھی تک اس جانب کم توجہ کی۔ سکندر علی وجد کی مایۂ ناز نظم "کاروانِ زندگی" اور فضل الرحمن کی معرکتہ الآرا نظم "ذرّوں کا ناچ" پڑھ کر شدت سے احساس ہوا کہ کاش زیادہ سے زیادہ اردو شاعر اعلیٰ علمی اور عکیاتی حقائق کو شاعری کے پیمانوں میں پیش کرتے۔ اطہر راز کی نظم "سفر۔ اپنی ذات کے اندر" ایک ایسی نظم ہے جو اردو شاعری کی کمی پورا کرتی ہے اور اطہر راز کو اردو کے محسن شاعروں کی صف میں بٹھاتی ہے۔

## سفر اپنی ذات کے اندر

(اَنا کے دشت میں اپنی تلاش ہے مجھ کو)

میں اپنی ذات سے آگاہ کیوں نہیں اب تک
یہ امتیازِ من و تو کا سلسلہ کیا ہے

میں فکر ہوں تو مجھے فکرِ روز و شب کیوں ہے
میں ابتدا کی خبر ہوں تو یہ خبر کیا تھی
یہ میرے ذہن میں کیوں میں ہی میں کے نوحے ہیں
میں خواہشوں کا قفس ہوں تو یہ قفس کیا ہے
میں ایک تارِ نفس ہوں تو یہ نفس کیا ہے

——— (ذات)

یہ آج مجھ پہ عجب راز آشکار ہوا
مرے شعور کا غاصب مرے وجود میں ہے
میں وہ نہیں ہوں مری تنگنائے ہستی میں
وہ کوئی اور ہے جھوٹی انا کا شیدائی
جو چھپ کے ذات کی تنہائیوں میں رہتا ہے
میں شخصیت کا تماشا ہوں شخصیت وہ ہے
میں ذہنیت کی عمارت ہوں ذہنیت وہ ہے

——— (تحت الشعور)

میں اپنی ذات کی ان سرحدوں پہ آ پہنچا
جہاں یقین کی صورت میں بدگمانی تھی
یہ وہ جگہ تھی جہاں وحشتوں سے گھبرا کر
سمندِ عزمِ تجسس کا ساتھ چھوڑ گیا
شعورِ فن کا تقاضا فقط تماشا تھا
اب اپنے آپ کو پانے کی آرزو نہ رہی
میں کون ہوں یہ سمجھنے کی جستجو نہ رہی

——— (فن)

انسان کی تخلیق اس انداز سے ہوئی ہے کہ جو کچھ مادی کائنات میں ہے اس کا عکس ذہن میں سما سکتا ہے۔ ذہن انسان کو ایک فوقیت حاصل ہے۔ کائنات میں جو کچھ موجود ہے ذہن میں اس کے سوا بھی کچھ اور گنجائش ہوتی ہے۔ ذہن انسا

میں موجودات اور حادثات کے مادہ و ماغلیہ کا تخیل بھی نشو و نما پاتا ہے۔ اس تعلق سے بے شمار سوال ذہن میں ابھرتے ہیں اور ان سوالات کے جوابات بھی ملتے رہتے ہیں۔ اطہر راز نے ان تمام بنیادی سوالات کو اس نظم میں سمویا ہے اور اس طرح اپنی شاعری کو ان حدوں تک پہنچا دیا ہے جن کو اقبال نے پیغمبری کا جزو قرار دیا۔

تینتیس بند کی اس خوبصورت نظم میں الفاظ کی موزونیت، آہنگ اور معنویت کا خاص اہتمام ہے۔ روایت پسندی اور جدیدیت کی حسین آمیزش ہے۔ ہر بند سات مصرعوں کا ہے جس میں ابتدائی پانچ مصرعے بحر کے پابند لیکن ردیف اور قافیہ سے آزاد ہیں۔ آخری دو مصرعوں میں بحر کے علاوہ ردیف اور قافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔ اردو شاعری میں یہ انوکھا اور دلچسپ تجربہ ہے جو فنی لحاظ سے یقیناً کامیاب ہے۔ شاعر کی کاوش کا مجموعی تاثر خوشگوار اور حوصلہ افزا ہے۔ نظم کے ہر بند سے زبان و بیان پر قدرت اور فن شعر پر عبور اور دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

میں اطہر راز کی اس کامیاب نظم کے لیے اپنی پیاری زبان اردو کو مبارکباد دیتا ہوں جس کی شاعری کے عظیم خزانہ میں یہ ایک قیمتی اضافہ ہے۔

---

**اپنی بات** نروان (۱۹۶۴ء)، پرایا گھر (۱۹۶۹ء)، رات کے مسافر (۱۹۶۹ء)، ارم (تلگو، ۱۹۷۷ء)، ناولٹ: نغمے کا سفر (۱۹۷۸ء)، جگنو اور ستارے (۱۹۶۵ء، ۱۹۷۶ء)، ناول: پنچ غول (۱۹۷۹ء)، بارش سنگ (۱۹۸۵ء)، کتاب: کرشن چندر مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی دہلی ۱۹۸۵ء اور افسانے مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا (۱۹۸۲ء)۔ "سب رس" کی دیگر مشمولات میں اردو کے نمائندہ لکھنے والوں کی تازہ ترین تخلیقات نثر و نظم شامل ہیں۔ ادارۂ سب رس "ہمارا شیرازہ اردو اکیڈمی" کا شکر گزار ہے جس نے ادبی رسائل کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے خاطر خواہ خریدار فراہم کئے۔ امید ہے دیگر اکیڈمیاں بھی اس روایت کی پیروی کرتے ہوئے ادبی رسائل کی خریداری کے مشن کو عملی طور پر آگے بڑھانے میں تعاون دیں گے۔ اردو دوستوں، اساتذہ نیز اسکالرس صاحبان سے بھی ہماری درخواست ہے کہ وہ اس قبیل کے علمی و ادبی رسائل کی توسیع اشاعت اور خریداری کے سلسلے میں اپنا دست تعاون دراز کریں۔

— وقار خلیل

حبیب حیدرآبادی

# ہماری وضعداری

مشرقی اقدار کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ آدمی وضعدار رہے اور
اور ہر کام وضعداری سے کرے۔ ہمارے ساتھ بڑی مشکل یہ ہے کہ لوگ ہمیں [illegible]
نہیں پاتے۔ جو لوگ ہماری وضعداری کی بنا پر ہمیں اچھا سمجھتے ہیں وہ اپنا عکس ہم میں
دیکھتے ہیں اور جو لوگ اس خصوصیت کی وجہ سے ہمیں برا سمجھتے ہیں وہ ایک حد تک ہم سے
اختلاف کرتے ہیں۔ ہم نہ اچھے ہیں اور نہ برے ہیں۔ بس یونہی واجبی سے وضعدار ہیں۔
خطا و نسیان ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ان کے سرزد ہونے کے لیے ہمیں کسی قسم کی
کوئی خاص کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ خود بخود ان کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ہاں اچھی باتیں [illegible]
طور پر اپنا لیتے ہیں۔ مانگے تانگے کی چیزیں [illegible] بھی دیرپا نہیں ہوتیں۔ جب ہم نیکیوں کی طرف
مائل ہوتے ہیں تو ایک عجیب سی وحشت ہونے لگتی ہے۔ دل گھبراتا ہے، اداسی چھا جاتی
ہے۔ جب ہمارا موڈ آف رہتا ہے تو ہمارے احباب آسانی سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ
ہماری زندگی میں نیکی کا [illegible] داخل ہو رہا ہے اور ہمیں پریشان کر رہا ہے۔ نیکی
کا [illegible] پڑتا ہے تو ہم سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہونے لگتی ہیں [illegible] خود ہمیں
اپنے آپ کو [illegible] میں مشکل پیش آتی ہے۔ اس عارضی کیفیت کو دور کرنے میں
ہمیں کچھ [illegible] نہیں پڑتی۔ [illegible] دونوں کے لیے آدمی کو
[illegible] ہے۔ وضعداری کے [illegible] ہم [illegible] ہیں کہ کسی [illegible]
[illegible] اس پر زندگی بھر عمل کریں قطع نظر
[illegible] کرنے [illegible] اس کی اجازت دیتے ہوں کہ نہ

دیتے ہوں۔ وضع داری ہم سے توقع کرتی ہے کہ غلط کام ہمیشہ چوری چھپے کئے جائیں۔ بچپن میں ماں باپ کی نظروں سے دور رکھتے ہی کام غلط کئے ہوں گے۔ سب کچھ کرتے تھے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ اپنی شرارتیں کبھی گرفت میں آ بھی جاتی تو اپنے معصوم گال تھپڑوں کے لیے تیار رہتے۔ مواخذہ اور سزا سے بچنے کے لیے کیا کیا گل نہیں کھلانے پڑتے تھے۔ چھوٹی شرارتیں قابلِ معافی ہوتی تھیں بڑی شرارتیں قابلِ مواخذہ اور پھر قابلِ سزا۔

آج سے پچاس برس قبل کی گھریلو سزائیں بھی اللہ اللہ کیا کیا روح افزا ہوا کرتی تھیں۔ طمانچوں کے اسٹائیل بھی مختلف ہوتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے بزرگوں کو تھپڑ مارنے کی باقاعدہ مشق کرائی جاتی تھی۔ اس زمانے کے مرد اپنے چھوٹوں کو تھپڑ مارتے اور زیادہ طیش میں آتے تو گھونسے۔ اگر واقعی ان کو غصہ آتا تو لاتیں بھی رسید کر دیتے بید کے استعمال میں بھی وہ لاجواب ہوا کرتے تھے۔ مغرب زدہ طبقہ بیلٹ کا استعمال کرتا تھا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ عورتوں کی سزاؤں میں فری اسٹائیل کا عنصر زیادہ رہتا تھا۔ اپنی شرارتوں میں ان کی ڈانٹ ڈپٹ تو ہمارے لیے وجۂ سعادت تھی ہی۔ اس وقت ہم کو اپنے اعضا کا بڑا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ جب وہ جوتی، بیلن، چھڑی، چمچہ، جو بھی چیز ان کے ہاتھ میں ہوتی، اکثر اوقات بے ارادہ اور بعض اوقات بالارادہ استعمال کرتی تھیں۔ یہ سب باتیں اس وقت کی وضعداری میں شامل تھیں۔ وضعداری ان کو مارنے پر مجبور کرتی تھی اور ہم کو خاموش مار کھانے پر۔ مار پڑنے کے دوران اگر ایک لفظ بھی کہہ جاتے تو نہ صرف یہ وضعداری کے خلاف بات ہوتی بلکہ بدتمیزی کے مترادف ٹھہرائی جاتی۔ اس زمانے کی نسل بھی کیا عجب الطرفین ہوتی تھی کہ گالیاں اور جوتیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوتی تھی بلکہ جو ضرب شدید لگاتا اسی کی اسی شدت سے عزت کی جاتی تھی

یہ بھی زمانہ آگیا ہے کہ انہی سیدھی سادھی اور غیر مضرت رساں سزاؤں کا حق آج اگر ہم اپنے بچوں پہ کریں تو یہ پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ لکھوا دیں اور ماں باپ کو حوالات میں بند کروا دیں۔ ہم کو حوالات سے چھڑوانے کے لیے اس نفسا نفسی کے دور میں کون ہماری مدد کرتا، زندگی میں لے دے کے ادبی حلقوں کی کیفیت

اختیار کی تھی۔ ادبی حلقے کے ارکان ایسے طوطا چشم ثابت ہو سکتے ہیں کہ وہ ہماری گرفتاری پر افسانے لکھ سکتے ہیں، نظمیں لکھ سکتے ہیں، ہمارا نفسیاتی تجزیہ کر سکتے ہیں مگر کوئی [illegible] ضمانت دے کر ہم کو حراست سے نکال نہیں سکتے۔ اسی لیے حراست سے نکلنے کا ہم کو ایک ہی راستہ نظر آتا ہے کہ مچلکہ نیک چلنی پر بچوں کے سامنے دستخط کیا جائے۔ ان سے تحریری وعدہ کیا جائے کہ آئندہ سے ہمارا چال چلن ان کے ساتھ ٹھیک رہے گا۔ آئندہ ہم ان کو کبھی سزا نہیں دیں گے نہ صرف ان کی ساری غلطیاں ہمارے سایہ عاطفت میں ہوتی رہیں گی بلکہ ان کی ساری شرارتوں اور غلط باتوں پر شفقت پدری ان کا ساتھ دیتی رہے گی۔ اولاد کے سامنے وضعدار بنے رہنے کا یہ ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔

جہاں ماں باپ کو اپنی اولاد کی کھال اُدھیڑنے کا پورا اختیار حاصل تھا وہیں اساتذہ خصوصاً وہ جو ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ہمیں مرغا بنا کر یا کبھی اُٹھ بیٹھ کروا کر اپنے حافظ و مولوی ہونے کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ انگریزی پڑھانے والے ماسٹر صاحب ہمیں بھری کلاس میں بنچ پر کھڑا کروانے میں مغرب کی برتری تقرر کرتے تھے۔ ان سب کی سزائیں خاموشی سے بھگتنا اور اپنی کیے جانا مشرقی اقدار کا خاصا تھا۔ اللہ اللہ کر کے مار کھاتے ہوئے بچپن گزرا تو جوانی کے رموز و اسرار کھلنے لگے اور عجیب و غریب طریقے سے کھلنے لگے۔ انہونی باتیں ہونی کا روپ اختیار کرنے لگیں۔ بڑا مزہ آنے لگا۔ ہم جوانی کی رنگینیوں میں گُم ہونا ہی چاہتے تھے کہ ازدواجی رنگ میں رنگے گئے۔ اس کے بعد زندگی بھر ہمیں "میں تو پیا رنگ اور نہیں دیکھی بلم" گنگنانا پڑا۔

والدین کی نظروں میں جگہ پانے کے لیے خود کو تقسیم کرنا پڑتا تھا۔ گھر میں کچھ اور باہر کچھ اور یہی وضعداری کہلاتی تھی۔ اپنے آپ کو متضاد کیفیتوں میں رکھنے کی عادت پختگی نے ازدواجی زندگی کو کامیاب رکھا۔ زندگی کی دو عملی نے جہاں ہم کو بیوی کی نظروں میں سرخرو رکھا وہیں اپنے آپ کو بڑا مطمئن اور سرشار بھی۔ وضعداری کا قدم قدم پر استعمال ہوتا رہا۔ سارے غلط کام باہر باہر۔ گھر میں بیوی تو [illegible] ہماری بلائیں لیں۔ بیوی تو ہماری معصوم زندگی کے جیسے گن گاتی ہیں۔ ہم بھی بیگم کے سامنے ان کے گن گاتے ہیں مگر بعض اوقات ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں جس کی وجہ سے بیوی

شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے وہ یہ کہ بیگم کی موجودگی اپنے احباب کے سامنے ہم ان ان صفات کی تعریف کرنے لگتے ہیں جو قطعاً ان میں نہیں ہوتیں۔ وہ بھری محفل میں ہم سے پوچھتی ہیں کہ آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔ بہرحال وضع داری کا تقاضا یہی ہے کہ بیوی کے روبرو ایسی باتیں نہ کی جائیں جن سے ہماری خوبصورت ازدواجی زندگی میں کوئی رخنہ پڑے اور ان کی نظر میں ہم اپنے دوستوں جیسے قرار پائیں۔

جیسے ہمارے ماں باپ کو ہمارے غلط کاموں کی خبر نہیں ہوتی تھی اسی طرح ہماری فطری اور اکتسابی وضعداری نے کبھی ہم سے کوئی ایسی غلطی نہیں کروائی جس کا علم ہماری بیگم کو ہوا ہو۔ ہماری ساری غلطیاں ان کے علم و عرفان سے پرے رہتی ہیں۔ ہم جب لفظاً غلطی استعمال کرتے ہیں تو ہمارے احباب اس لفظ کو ہمیشہ برے معنی نہ پہنائیں۔ ہمارے بہت سے اچھے کام بھی ہماری بیوی کی نظر میں برے اور غلط قرار پا سکتے ہیں۔ مثلاً اسی انشائیے کا لکھنا ہماری بیوی کی نظر میں ایک انتہائی مہمل اور وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ جہاں تک ہمارے انشائیوں کا تعلق ہے اس سے لطف اندوز ہونا اور ہنسنا دور کی بات ہے۔ ہمارے ہر انشائیے کے ہر فقرے سے ان کا خون کھولتا ہے اس لیے ہمارا ہر انشائیہ کہیں نہیں چھپنے کے بعد ہی ان کی نظر سے گزرتا ہے۔

بیوی بے چاری سے نبٹنا تو ایک معقول، اعتدال پسند اور شریف شوہر کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ شوہر کی وضعداری بیوی کو غصے سے آپے سے باہر کبھی نہیں ہونے دیتی۔ اسی وضعدارانہ رکھ رکھاؤ میں جب اکبر کا یہ مصرعہ صادق آجائے کہ:

جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتا ہے

وضع داری ہم پہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے خیر کسی کی ہنسی کو ہم روک تو نہیں سکتے۔ دوسروں کی ہنسی ہنسی میں ہماری ہونہار اولاد نصف النہار پہ پہنچ جاتی ہے۔ جوان اولاد کو اپنے ماں باپ کی ساری اچھی اور بری باتوں کا پتہ رہتا ہے۔ ماں باپ کے تعلق سے ان کی قیاس آرائیاں بھی اکثر و بیشتر نشانے پر بیٹھتی ہیں اس لیے جوان اولاد کے سامنے وضعدارانہ بہانہ سازی کرتے ہوئے بھی بڑے ہمت و حوصلہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ میر کا سوز اور غالب کی شوخی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ محمد حسین آزاد کی آبِ حیات والی مبالغہ گوئی اور گوپی چند نارنگ کا تنقیدی اسٹائل اپنانا پڑتا ہے۔

بیوی کے سامنے تو بڑے سے بڑا جھوٹ بھی کبھی گری اور کبھی تو بہت سکھ کر
ان کے شک و شبہ کو جو اکثر حقیقت پر مبنی ہوتا ہے لمحوں میں محبت میں تبدیل کر لیا
جا سکتا ہے لیکن جوان بیٹی کے سوال کا جواب سچ سچ ہی دینا پڑتا ہے۔ جوان بیٹی
کے سامنے باپ کو جھوٹ کہتے ہوئے پسینہ آ جاتا ہے۔ باپ کو پتہ رہتا ہے کہ اگر وہ
ایک جھوٹ اپنی بیٹی سے کہے تو کل وہ سو جھوٹ اپنے باپ کو کہہ سکتی ہے۔ زندگی کے
ہر دور میں ہماری نام نہاد آزادی خطرے میں رہی۔ بچپن میں نہ صرف والدین اور
اساتذہ بلکہ محلے کے سارے لوگ، رشتہ دار، پڑوسی، جان پہچان کے دکان دار، گھر کے
ملازمین، شکرام، تانگے اور رکشہ والوں کو بھی یہ حق تھا کہ ہمارے غلط تو غلط صحیح اعمال پر بھی
معترض ہوں۔ ہمارے والدین کے سراغرساں بنے رہیں۔ اس وقت سارے معاشرے
کی نظریں ہم پر لگی رہتی تھیں اس ماحول میں کوئی غلط کام کرنا آسان بات نہیں تھی۔ جان جوکھوں
میں ڈالتے ہوئے ہر وقت ایک نئے پل صراط سے گزرنا پڑتا تھا۔

ماں باپ کا دور حکمرانی ختم ہوا۔ بیوی نگرانِ اعلیٰ بن گئی۔ ان کا سلوک ہم سے
ایسے ہی رہا جیسے اسرائیل کا عربوں سے۔ عربوں کے پاس پیسہ ہے حکومت ہے مگر ہر ایک
کو پتہ ہے کہ کون کس سے ڈرتا ہے۔ شادی کیا ہوئی 'کیوں' 'کیسے' 'کب' اور 'کہاں' جیسے
سوالیہ الفاظ سے ہماری زندگی جنوبی آفریقہ کے کالوں جیسی ہو گئی۔ فلسفۂ ازدواج کی موشگافیوں
کو حل کرنے میں ہمارے سارے قویٰ مضمحل ہو گئے۔ اولاد بڑی ہوئی تو انگلستان کی
بادشاہت جیسا دستوری منصب جلیلہ ہمارے حصے میں آیا۔ ہماری ہر حرکت کو معقول
اور نا معقول، مناسب اور نامناسب کے ترازو میں تولا جانے لگا۔ خاندانی فلاح یوں
کہیئے کہ عوامی مفاد پر ہماری توجہ مرکوز کروا دی گئی۔ انگلستان کے عوام کی طرح یہ ہمارے
بچوں کی سعادت مندی ہے کہ ہماری زندگی کے ڈراونے سایوں کو دیکھتے ہوئے بھی
ان کی وضعداری اور پاسِ محبت ان کو مجبور کئے دیتی ہے کہ وہ اپنے حکمران یعنی
والدین کے رخِ زیبا ہی کی طرف نظریں رکھیں۔ وضعداری ہی ان کو بغاوت سے روکے ہوئے ہے۔
ماں باپ، بیوی، اولاد تک تو سب کچھ ٹھیک تھا مطلب جب کہ اولاد کی اولاد
ہو رہی ہے دل کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ نہ جانے پوتے اور نواسے ہمارے نامۂ اعمال کے

...ستقبل کیا پوچھ گچھ کریں گے۔

سوچتا ہوں کہ زندگی کے کس دور میں ہم آزاد رہے ہیں۔ زندگی کے کس دور ...ا ہمیں یک رنگی حاصل رہی۔ ہمیشہ ہماری سرگرمیوں پر کسی نہ کسی کی نظر رہی۔ فکر و عمل ...آزادی کی زندگی بھر تمنا ہی رہی۔ ہر ایک کی خاطر ہم نے اپنا چولا بدلا۔ اپنے آپ کو ...بش کرنے کے لیے ہم کچھ اور کرتے رہے۔ دوسروں کی خوشی کی خاطر دوسروں ...ذہنی، فکری اور عملی جامہ پہنتے رہے اور اتارتے رہے۔ ہماری وضعداری نے ...یشہ ہمارا احتساب کیا۔ دل کی بات زبان پر لانے سے منع کیا۔ ہر ناگوار سی ناگوار ...ت کو سنتے رہے۔ وضعداری نے زبان پر مہر لگادی۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

...ں شعر کو اپنانے کے لیے کن کن منافقانہ روش سے ہم کو گزرنا نہیں پڑا۔ اسی منافقانہ ...ویے کو زمانے نے وضعداری کا نام دیا۔ جس نے جس شدت سے منافقانہ زندگی ...زاری وہ اتنا ہی وضع دار کہلایا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری وضع داری ہمارے کام آ رہی ہے۔ ہم خود بھی ...خوش ہیں اور ہم سے ہماری دنیا بھی خوش ہے۔ یہاں دنیا سے مراد ہماری بیوی ہے۔

---

## اعلان بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند

فارم نمبر ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کا نام : رمن راج سکسینہ

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ادارۂ ادبیاتِ اردو ''ایوانِ اردو'' پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۸۲

نام اور پتہ مالک : ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۸۲

...ں، رمن راج سکسینہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۸۶ء (حیدرآباد) رمن راج سکسینہ (دستخط)

گوشۂ جیلانی بانو

عارفہ فرید

# جیلانی بانو اور ان کا فنِ افسانہ نگاری

جیلانی بانو کا شمار اردو کے ان جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے موضوع کے معاملہ میں حقیقت شناسی اور نکتہ آفرینی کا ثبوت دیا اور جو پٹی ہوئی راہوں کو اپنانے کی بجائے نئی راہوں پر چل رہے جن پر زندگی کے نئے نئے مسائل کا سراغ ملتا ہے، یہ فنکار اظہار کے معاملے میں بھی نئے تجربوں سے نہیں گھبراتے۔ اپنے فن کی پوری روایت ان کی نظر میں ہے انھوں نے اس کا اثر قبول کیا ہے اسے اپنے مزاجوں میں بسا لیا ہے اور اس کے اظہار کے نئے نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیان کو موثر بنانے کے لیے ادبیت اور شعریت کا سہارا بھی لیا ہے "ان کے فن کے اکثر وہ محاسن دکھائی دیتے ہیں جو اچھے افسانے کی تخلیق و تعمیر ہوتی ہے۔ انھوں نے موضوع کی تلاش اور مواد کی فراہمی میں پورے انہماک اور کاوش سے کام لیا ہے اور پورے فنی خلوص کے ساتھ صرف زندگی کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا ہے جس کا مشاہدہ اور مطالعہ انھوں نے اچھی طرح کیا ہے وہ صرف ایسے ہی کرداروں کی باتیں کرتے ہیں جو ان کے جانے پہچانے ہیں۔ یہی صورت فن اور اس کے لوازم کو برتنے کے معاملے میں ہے۔ انھیں فن کی روایتوں کا احترام بھی ہے لیکن ان میں بات کو نئے اسلوب بیان اور دلکش پیرایے میں کہنے کی لگن بھی ہے یہ ساری علامتیں افسانے کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہی اشارہ ہمیں جیلانی بانو کے افسانوں میں نظر آتا ہے

۱۹۴۷ء کے بعد اردو افسانہ کو جن افسانہ نگاروں نے آگے بڑھایا، ان میں جو پیش پیش ہیں وہ ایک ایسے دور کی ترجمانی کرتی ہیں جب کہ پرانی اخلاقی قدروں کی جڑیں

پرانے ہو چکے تھیں اور نئے نئے مسائل ان کی جگہ لے رہے تھے۔ جیلانی بانو نے بھی نئے مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور ان مسائل کو بھی اپنایا جو سماجی اور سیاسی ہیں لیکن پھر بھی وہ پرانے گوشے سے دور رہی ہیں۔ ان کے افسانوں میں فن کارانہ مہارت نظر آتی ہے۔ یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ فن کار کے جذبات میں خلوص اور شدت ہو اور یہی چیز انھیں ہم عصر خاتون افسانہ نگاروں میں ممتاز بنا دیتی ہے۔

جیلانی بانو کے افسانوں کے محرکات خارجی زندگی کے اہم واقعات بھی رہے ہیں زمانے کی اہم سیاسی اور سماجی تحریکوں نے انھیں متاثر کیا ہے اس طرح جیلانی بانو دوسری ترقی پسند خاتون افسانہ نگاروں کی بنائی ہوئی روایت کو توانائی عطا کی اور زندگی کے بدلتے ہوئے اقدار کا ساتھ دینے کے لیے مجبور کیا۔
انھوں نے زیادہ تر حیدرآباد کے متوسط طبقے کے گھرانوں میں پیش آنے والے واقعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

عام طور پر جیلانی بانو کے افسانوں کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے
پہلی قسم میں افسانوں کے وہ واقعات آتے ہیں جن پر رومانیت کی دبیز تہہ ہے ان میں ایک حد تک شدید داخلیت ہے، ساتھ ہی ان میں حد درجہ تلخیوں کی لہریں بھی پوشیدہ ہیں۔ جذباتی زندگی کی آرزوئیں اور تمنائیں بھی مدغم ہیں۔ خیالوں کے سہارے زندہ رہنے والے افراد بھی ہیں اور شوخ و شریر لڑکیوں کے ارمان کی دبی دبی سسکیاں بھی ملتی ہیں۔ اس قسم کے افسانوں میں "موم کی مریم"، "اس"، "بھنور اور چراغ"، "فصلِ گل جو یاد آئی پہاڑوں کے نیچے"، "ایک انار"، "ہمت"، "آگ اور پھول"، "روشنی کے مینار"، "ایمان کی سلامتی"، "ایک آرٹس"، "پیاسی"، "کہاں ہے منزل"، "راہِ تمنا"، "اسکوٹر والا"، "بے مصرف ہاتھ"، "کچھ لوگ کیتھی"، "آخری گلاب"، "ستیرا ہیرا" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں...

ان افسانوں میں "موم کی گڑیا" اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں جیلانی بانو نے ایک لڑکی "قدسیہ" کی زندگی کو پیش کیا ہے جو خاندانی روایت کو ترک کر کے اپنی پسند زندگی گزارنے کا بیڑا اٹھاتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر اسے اپنے بزرگوں،

رشتہ داروں اور دوسرے قرابت داروں سے نہ صرف مخالفت مول لینی پڑتی ہے بلکہ ان کی نفرت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اس کا غلطی صرف یہی تھی کہ اس نے ایجاب و قبول کی جگہ اپنی پسند کو ترجیح دی تھی لیکن بد قسمتی سے اسے ہر قدم پر حالات سے شکست کھانی پڑی۔ سب اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ کسی نے اس کی خوبیوں کو پرکھنے کی کوشش نہیں کی سبھی اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے مزید نشتر چلاتے۔ کسی نے اس کی روح کی گہرائی میں اترنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک بے سہارا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح خلا میں اڑتی رہی اور اڑتے اڑتے جب تھک گئی تو کسی نامعلوم جگہ پر گر پڑی، جہاں سے اسے کوئی اٹھا نہ سکا۔ اس لڑکی کو جاہل، "مغرور" بدصورت قرار دیا گیا لیکن برابر وہ لڑکی یہی کہتی رہی کہ: "جو میرے پاس ہے وہ راجہ کے محل میں نہیں ہے۔"

وہ یہ تصور کرتی رہی کہ اسے زندگی کی مکمل آزادی حاصل ہے وہ خود مختار ہے وہ جو چاہے کر سکتی ہے اسی بھرم میں وہ مختلف مردوں کا کھلونا ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسے راستے کا پڑا ہوا سستا مال سمجھ کر مختلف مردوں نے اس سے محبت کا ڈھونگ رچایا لیکن کوئی بھی اس کے خوابوں کی تعبیر نہ بن سکا۔ کسی نے اس کے زخموں پر مرہم نہ رکھا اور نہ کسی نے ہمدردی کے ساتھ اس کے آنسو پونچھے۔ سبھی اسے اپنے جذبات کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ حتیٰ کہ اس کے منہ بولے ماموں نے بھی اس کی زندگی کے چند قیمتی لمحے چرا لیے۔ اس طرح وہ لڑکی جو ایک مرد کی بزدلی کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی اور آخر دق کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔

اس طرح قدسیہ اپنی پلکوں پر خوابوں کا ایک سنہرا تاج محل لیے اپنی شریک حیات کی تلاش میں زندگی بھر حالات سے لڑتی رہی۔ یہ لڑکی جو جیلانی بانو کی زبان میں:

> "اس تنکے کی تلاش میں خوفناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھی جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیل کی گرمی سے پگھل سکتی تھی۔ کسی کی تیز نگاہوں سے سلگ سکتی تھی، اپنے چاروں طرف لپکتے ہوئے شعلوں میں گھری تھی۔"

متوسط طبقے کی لڑکیوں کی یہ کہانی عام ہے یہ ان تمام جذباتی لڑکیوں کی تمناؤں کی عکاسی کرتی ہے جو مروجہ تہذیبی اقدار اور سماجی بندھنوں سے آزاد ہو کر کھلی فضا

میں اپنے وجود کی اہمیت کو منوانا چاہتی ہیں اور اپنے شریکِ کار کی تلاش میں عجیب و غریب خواب دیکھتی ہیں لیکن حقائق کی سخت اور مضبوط چٹانوں سے جب وہ ٹکراتی ہیں تو ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے بلکہ ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اسی طرح قدسیہ کے بھی خواب حقیقت کی بے رحم چٹانوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔

"جذباتی لڑکی کے تخیل کی اڑان پہلی ہی کھائیوں میں گر کے
دم توڑ دیتی ہے"

مینا ایک ایسی لڑکی تھی جو اپنی پہلی محبت کی ناکامی پر اپنے محبوب کو ذلیل کر کے لیے یہ لکھا تھا

"بزدل تو یہ سمجھتا ہے اس طرح تو نے اپنی محبت کو رسوائی
سے بچا کر میری لاج رکھ لی۔ مگر ہماری محبت ابھی شروع ہی کہاں
ہوئی تھی۔ میری عزت پہلے ہی کون سے جھنڈے پر چڑھی
بیٹھی تھی۔ میں تجھے وہ دے بھی نہ سکی، جو میری زندگی کا آدرش
تھا، کاش میں تجھے اس بلندی پر پہنچا سکتی جہاں میرا بھی
ہاتھ نہ جاتا۔ اب میری روح اس وسیع سمندر میں ایک تنکے کی
تلاش کرتی پھرے گی۔"

تنکے کی اس تلاش میں قدسیہ جیسی سینکڑوں باغی نوجوان، شوخ اور کسی حد تک اپنے آپ کو بہادر تصور کرنے والی لڑکیاں سماجی پابندیوں سے بغاوت کرتی ہیں لیکن نتیجہ کے طور پر وہ مردوں کی ہوس پرستی کا نشانہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ قدسیہ بھی ایسی ہی متوسط طبقہ کی ہندوستانی لڑکیوں کی ترجمان کردار ہے جو گھریلو پابندیوں سے عاجز ہو کر اپنی دنیا آپ بنانا چاہتی ہیں مردوں کی بے رحمی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

"موم کی مریم" افسانہ میں مصنفہ نے عورت کو مرد کی ہوس پرستی کا شکار ہوتے ہوئے بتایا ہے۔ اس عورت کی بنیادی غلطی یہی تھی کہ وہ سماجی اصولوں اور قدروں کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے باغی اور خود سر [illegible] تنکے کی تلاش میں زندگی کے بیکراں سمندر میں غوطے کھاتے [illegible] جاتی ہے۔

اسی قسم کی جذباتی اور ظاہری اصولوں سے انحراف کرتا ہوا جیلانی بانو کا افسانہ "کلچر، اکیڈیمی" ہے جس میں انھوں نے ایک ایسی پڑھی لکھی قابل اور ذہین عورت کے

جذبات کی ترجمانی کی ہے جس کا جذباتی رشتہ ایک پالیٹکس کے کلچرل سے رہتا ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی نوک سے زیادہ حساس رشتہ ہے۔ یہ جذباتی لڑکی اوشا فلسفے میں ڈاکٹریٹ کرتی ہے وہ خود سر اور خود مختار تھی۔ اپنے فرسودہ رسموں اور غیر اخلاقی پابندیوں سے نفرت تھی وہ ذہین دانشوروں کی سوسائٹی میں رہنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ وہ اپنی شخصیت میں نسوانیت کو جگہ دینا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ نت نئے رنگوں کے قیمتی کپڑے پہنتی اور اس طرح اپنی نسوانیت کو جگہ دینا نہیں چاہتی تھی اور اس طرح اپنی نسوانیت کی اہمیت کو برقرار رکھنا چاہتی تھی بظاہر وہ اپنی ذہنی سطح کو عام عورتوں سے بلند تصور کرتی کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ عام عورتوں کی دماغ کی سطح بہت نیچی ہے۔ عورت صرف اپنے شوہر بچوں کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتی۔ اس لیے اوشا نے شادی نہیں کی تھی وہ شوہر کی اجارہ داری کے خلاف تھی۔

اوشا ایک بڑی مفکر ہونے کے باوجود مردوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ا[illegible] لباس استعمال کرتی جس سے وہ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اپنے بالوں کو سیٹ کرواتی اور اچھے سے اچھا میک اپ کرتی۔ گہرے رنگوں کی ساڑیاں پہن کر نت نئے خوشبوؤں کا استعمال کرتی جس کی وجہ سے باوجود تیس پینتیس برس کی معمولی شکل کی عورت ہونے کے اکثر مردوں کو اپنی طرف راغب کر لیا کرتی تھی۔ جس میں بلبیر، رام، گوپال وغیرہ سبھی شامل تھے۔ ان سب نے مل کر "کلچرل اکیڈمی" کی بنیاد رکھی جس کی سکریٹری اوشا تھی اور اس کا کاٹیج آفس بن گیا تھا۔

ہر مہینے اکیڈمی کا جلسہ ہوتا ہے جس میں شہر کے ادیبوں اور دانشوروں کو مدعو کیا جاتا ہے اس موقع پر اوشا کے تمام مرد ساتھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ا[illegible] اس کے حسب خواہش ہر کام کو سرانجام دیتے ہیں بظاہر وہ اوشا پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس کی ہر [illegible] تاجائز خواہشات کو بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر سکتے ہیں اوشا کے لیے ان سب کی یہ توجہ تسکین کا باعث ہو جاتی ہے اور وہ اس بناوٹی ماحول میں مسرور نظر آتی ہے لیکن جب اس کے سارے ساتھی اپنے گھریلو مصروفیات میں مشغول ہو کر اس کے وجود کو فراموش کر دیتے ہیں تو اوشا کے لیے ان کی یہ لا پر[illegible]

اس قدر تکلیف دہ ہو جاتی ہے کہ اسے اپنی زندگی سے نفرت ہو جاتی ہے اور اسے اس زندگی سے فرار حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ خودکشی تھا۔ اور وہ بغیر سوچے سمجھے اس راستہ کو اپنی زندگی کے نجات کا بہترین ذریعہ تصور کرتے ہوئے اس راہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔

اوشا ایک ایسی جذباتی عورت کا نفسیاتی کردار ہے جس نے بظاہر اپنے آپ کو نسوانیت کے اصولوں اور پابندیوں سے آزاد سمجھتے ہوئے اپنے وجود کی اہمیت کو منفرد طور پر منوانا چاہا حالانکہ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس تھا یہی شدید احساس اسے چین سے جینے نہیں دیتا اس کا یہ احساس پاگل پن کی حدوں میں داخل ہو جاتا جب وہ مختلف مردوں کو اپنے اشاروں پر ناچتے ہوئے دیکھتی لیکن جب اسے اپنے بھرم کے کھل جانے کا احساس ہوتا ہے تو وہ موت کی پناہ میں اپنی نجات محسوس کرتی ہے ~~اپنے~~ وجود کو خود اپنے ہاتھوں فنا کر دیتی ہے۔

جیلانی بانو کے موضوع کا دائرہ متوسط طبقے کی معاشرتی زندگی کے مسائل ہیں یہ اگرچہ حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے متوسط گھروں کی تصویریں پیش کرتی ہیں کیوں کہ ان کے مسائل بڑی حد تک مشترک ہیں لہٰذا وہ ان کرداروں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کی مفسر بھی بن جاتی ہیں اس لیے ان کے کردار زندہ اور جیتے جاگتے ہیں۔ ان میں خوابی اور خیالی دنیا میں مگن رہنے والے افراد نہیں ہیں۔ یہ نئے ہندوستان کے وہ کردار ہیں جو نئے ہندوستان کی ترجمانی کرتے ہیں ان میں وہ نوجوان بھی ہیں جو بیکاری کا شکار ہیں اور فاقہ کشی انھیں گھلا گھلا کر مار رہی ہے۔

جیلانی بانو کے کرداروں کا مطالعہ موجودہ تہذیبی اور سماجی زندگی کا مطالعہ ہے ان کے رشتوں کی بنیاد بھی بیسویں صدی کے ہندوستان کے معاشی، سماجی اور سیاسی اسباب پر ہے۔

جیلانی بانو کے افسانوں کی دوسری قسم سماجی و معاشرتی حقیقت نگاری کی ہے۔ رومانی حقیقت نگاری سے سماجی و معاشرتی حقیقت نگاری تک کی

مدت مختصر ہے لیکن جیلانی بانو نے اس مدت میں ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ ان کے وہ افسانے جو سماجی و معاشرتی حقیقت نگاری کے دائرہ میں آتے ہیں ان میں آئینہ، ڈریم لینڈ، بیچوں کی رائے، چھٹکارا، تلچھٹ، چوری کا مال، رات کے مسافر، پرایا گھر، ادّو، اور تماشہ وغیرہ شامل ہیں۔

ان افسانوں میں " آئینہ " اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں معاشرتی بدحالی کو پیش کیا گیا ہے۔ اسلم ایک دو سو روپے پانے والا کثیر اولاد شخص ہے جس کے بیمار بچہ کے لیے ڈاکٹر، موسمی کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اسلم کی بیوی فاطمہ کے پاس اتنی رقم نہیں کہ وہ بیمار بچے کے لیے موسمی خرید سکے۔ اسلم کی ماں گھر کے پرانے سامانوں کو بیچ کر گھر کے اخراجات کی تکمیل کرتی ہے لیکن آہستہ آہستہ گھر کے پرانے سامان بھی ختم ہو جاتے ہیں صرف ایک قد آدم آئینہ رہ جاتا ہے جسے فروخت کرنے فاطمہ مُصر تھی اس درمیان اسلم کی تنخواہ میں اضافہ ہو جاتا ہے اس طرح بچے کے لیے موسمی کا انتظام ہو جاتا ہے لیکن روز ایک موسمی کم ہو جاتی ہے۔ اسلم اور فاطمہ کا یہ خیال تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی اکرم موسمی اڑا لیا کرتا ہے۔ لیکن اکرم اس سے قطعی لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ آخر ایک رات اسلم نے فیصلہ کیا کہ وہ خود چور کا پتہ لگائے گا۔ جب رات ختم ہونے لگی تو اس نے آئینہ میں دیکھا کہ ایک ضعیف ہاتھ موسمی کی طرف بڑھا۔ دوسرے دن اسلم آئینہ اٹھا کر بازار جاتا ہے اور اسے فروخت کر دیتا ہے تاکہ اس کے بدلے دوماں کے لیے موسمی لا سکے۔

اس افسانہ میں جیلانی بانو نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان جب معاشی بدحالی کا شکار ہو جاتا ہے تو اسے اخلاقی قدروں کا احساس نہیں رہتا۔ بھوک، افلاس، مجبوری انسان کو اس قدر اخلاقی گراوٹ کا شکار بنا دیتی ہے کہ اسے اس گراوٹ سے نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

" آئینہ " افسانہ کی ماں کا کردار ایک ایسا کردار ہے جس نے زمانے میں کبھی ان چیزوں کی پرواہ نہ کی جو دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتی رہیں لیکن معاشی بدحالی اس کردار کے اخلاقی گراوٹ کا باعث بن کر اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے بیمار پوتے کی موسمی چرا کر کھالے۔ معاشی بشکل میں گرفتار نہ جانے کتنے کردار ہمارے

سماج میں موجود ہیں جو غیر شعوری طور پر اخلاقی قدروں کو اپنے قدموں تلے روندنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ انھیں اپنی زندگی کو سسک سسک کر گزارنا پڑتا۔ وہ اپنی زندگی کو اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھاتے ہوئے موت کی تلاش میں دربدر بھٹکتے پھرتے ہیں لیکن انھیں یہ راستہ نہیں ملتا۔

جیلانی بانو کے اس قسم کے افسانوں میں ایک افسانہ "اددو" ہے جس میں انھوں نے افلاس و بھوک کی تصویر کشی کی ہے۔ اددو ایک کمزور محنت کش لڑکا ہے جسے اچانک غیر یقینی طور پر ایک روپیہ سڑک پر پڑا ہوا مل جاتا ہے جسے پاکر وہ اپنے آپ کو بہت بلند تصور کرنے لگتا ہے اسے دنیا کی ہر چیز اپنے صاحب کی طرح حقیر اور قابلِ تسخیر نظر آتی ہے وہ اپنے وجود کو آسمان پر اڑتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ جیلانی بانو کے الفاظ میں:

"آج اددو بھی بازار میں یوں چل رہا تھا جیسے اس کی ٹانگیں دو بانس اوپر ہو گئی ہوں اور وہ نیچے کی غریب مخلوق کو روندتا ہوا گزر رہا ہو۔"

اددو اس روپیہ کے نوٹ کو اپنی مٹھی میں دبا کر اپنے آپ کو دنیا کا اہم ترین انسان تصور کرتا ہے اور اس روپیہ کے نوٹ کے ذریعہ وہ کائنات کو خریدنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ اس کے منہ میں نہ جانے کتنی لذیذ چیزوں کا ذائقہ گھل رہا تھا اور وہ دنیا کی ہر ذائقہ دار چیز کو خرید کر اس کا مزہ چکھنا چاہتا تھا لیکن اس روپیہ کو اپنی ذات پر خرچ کرنے میں اسے اس لیے پس و پیش ہے کہ مولوی صاحب کا واعظ ایک بازگشت کی طرح اس کی سماعت سے ٹکراتا رہتا ہے اور وہ کوشش کے باوجود اس روپیہ کو اپنی ذات پر خرچ کر سکتا ہے اور نہ اپنی معصوم بہن کی بچی کو دے کر خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ دن بھر اس روپیہ کے بوجھ کو اٹھایا ہوا نڈھال، تھکا ہوا، دوزخ کی آنچ میں سلگتا ہوا بھوکا پیاسا آہستہ آہستہ واپس اپنے مالک کے گھر لوٹ جاتا ہے اور بڑی ایمان داری کے ساتھ روپیہ اچھی بیگم صاحبہ کو واپس کر دیتا ہے لیکن اسے اپنی ایمان داری اور سچ کا انعام بیگم صاحبہ کے ایک تھپڑ کی شکل میں ملتا ہے اور وہ گھور کر کہتی ہیں:

"چوٹٹے! سچ سچ بتا۔ تو نے آج اور کتنے روپے چرا رکھے ہیں"

جن سے سارا دن گلچھرے اُڑاتا رہا ہے۔

جیلانی بانو کا یہ افسانہ محنت کش غریب طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے جن کی سخت ترین محنت کا معاوضہ گالیاں، مار اور ڈانٹ کے سوا کچھ نہیں۔ اقدو اس امید میں سخت ترین محنت کرتا ہے کہ اسے انعام میں چار آنے حاصل ہو جائیں جس سے وہ اپنی بہن کی بچی کے لیے کچھ خرید سکے جہاں چہرہ اپنے صاحب کی موٹر کو ہانپتے ہوئے اس امید میں ڈھکیلتا ہے کہ شاید صاحب اپنے حسب وعدہ چونی انعام میں دے دیں لیکن اکثر صاحب اپنے وعدہ کو فراموش کر جاتے اور اقدو ان کی اُڑتی ہوئی کار کو دیکھ کر رہ جاتا۔ اونچی سوسائٹی کے قدموں تلے دبا ہوا یہ محنت کش طبقہ کس قدر ہمدردی اور توجہ کا مستحق ہے اس حقیقت کی ترجمانی جیلانی بانو نے اس افسانہ کے ذریعہ کی ہے۔

جیلانی بانو کی یہ حقیقت نگاری پریم چند کی حقیقت نگاری سے قریبی رشتہ رکھتی ہے پریم چند نے آخر دور میں "کفن" لکھ کر جس حقیقت نگاری کو نقطۂ عروج پر پہنچایا تھا وہ ان کے مرنے کے بعد ختم نہیں ہو گیا بلکہ جیلانی بانو کے افسانوں میں ظاہر ہونے لگا۔

جیلانی بانو ایک بہتر معاشرے کے لیے قربانیاں چاہتی ہیں انھوں نے اس صداقت پر بھی غور کیا کہ اچھے اخلاقی اصول و ضابطے ہمارے سماج کے لیے ضروری ہیں۔ جب منافع خوری اور ذاتی مفاد پرستی ختم ہوگی تو بہتر سماج پیدا ہو سکے گا۔ انھوں نے اس حقیقت پر بھی غور کیا کہ موجودہ دور میں انسانی رشتہ کچے دھاگوں سے بھی کمزور ہو گیا ہے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کے تقاضے جو کبھی اخلاقی زندگی کے بنیادی اجزا تھے اب مفاد پرستی کی وجہ سے بھلا دیئے گئے ہیں۔ اونچے طبقے کی بنیاد صرف روپیہ کی ہوس اور استحصال پسندانہ پالیسی پر منحصر ہے اس امر کی وضاحت اپنے افسانہ "پرایا گھر" میں کی ہے۔ کس طرح اپنوں کی خود غرضی اور مفاد پرستی ایک شخص کو اپنوں میں پرایا اور اپنے گھر کو پرایا گھر محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے گھر والے رشتہ بھی اپنے مفاد کے لیے اس کے وجود کو اہمیت دیتے ہیں اس کی خاطر مدارات اس لیے کی جا رہی ہے کہ وہ ایک پنشن یافتہ

شخص ہے جس کی جائیداد اور بنک بیلنس بھی ہے جس کے حصول کے لیے اس کی بیوی اور
بیٹے میں سرد جنگ چل رہی ہے۔ جیلانی بانو نے بیوی اور بیٹے کی مفاد پرستی کو ان الفاظ
میں پیش کیا ہے۔ بیوی فریاد کرتی ہوئی کہتی ہے۔
" لوگو! ذرا اس آدمی کی حالت تو دیکھو۔ میں آج ہی ساری جائیداد اپنے نام کرا لوں گی۔"
" ٹھیک ہے ابا کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" امتیاز بھی کمرے سے نکل کر لڑائی
میں حصہ لے رہا تھا۔
" اچھا خبردار' جو انھیں چھوا ۔۔۔ " ممو ہاتھ نچا رہی تھی۔
" بڑے آئے ابا کی محبت کرنے والے۔ اپنے ساتھ انھیں لے کر سات سو کی پنشن
پر قبضہ کرنا چاہتے ہو' انھیں کوئی اس گھر سے نہیں لے کر جا سکتا۔ میرے چھوٹے چھوٹے
بچوں کا یہی تو اک سہارا ہے۔"

اس شخص کو صرف اپنی چھوٹی معصوم بچی سے سیدھی سادی سچی مخلص محبت ملتی ہے
جسے پا کر وہ اپنے سورج کی تلاش میں اس پرانے گھر سے راہ فرار اختیار کرتا ہے جس میں
اس کا وجود خود اس کے لیے اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔

جیلانی بانو نے بلاشبہ موجودہ دور کے ایک اہم مسئلہ کی نمائندگی کی ہے اور اس
حقیقت کی ترجمانی کی ہے کہ موجودہ دور میں انسانی رشتوں کی اہمیت مفقود ہو کر رہ گئی ہے
مفاد پرستی خونی اور جذباتی رشتوں پر بھی اپنا تسلط قائم کر چکی ہے۔

ان افسانوں کی روشنی میں اس حقیقت کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جیلانی
نو کا فکری میلان اشتراکی ہے۔ وہ موجودہ نظام زندگی کے بہیمانہ رواج کی دشمن ہیں
وجودہ طریق کار انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ زندگی سے جدوجہد کا عزم رکھتی
ہ اس لیے ان کے رومانوی افسانوں میں بھی زندگی سے فرار کی جھلک نہیں ملتی۔ ان کے
ردار خوابی نہیں ہیں۔ ان کے متوسط طبقے کا ماحول صرف زندگی کے تاریک لمحوں کی
اسی نہیں کرتا۔ وہ اپنے اندر رجائی طاقتوں کا وہ سمندر پوشیدہ رکھتی ہیں' جیلانی بانو
ے ذہن پر فرائیڈ کا اثر نہیں۔ وہ جنس کے دلدل میں بھی نہیں پھنستی ان کے فکر کی بنیاد
ریخ کی مادی صداقتیں اور زندگی کی حقیقت ہے' یہ انسان سے محبت کرنے کا فلسفہ
ہے بکھرے ہوئے رشتوں کو ملانے کا اصول ہے۔ رنگ' نسل' مذہب اور قومیت

کی تزئین ہیولوں سے آزادی کا فلسفہ ہے ارتقا اور فطرت کو قابو میں رکھنے کا فن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیلانی بانو کی فکر پر اداسیت اور مجہول رومانیت کی لکیریں نہیں ملتی۔ آزاد ہندوستان کے لکھنے والی افسانہ نگاروں میں وہ ایک انفرادی مقام رکھتی ہیں کیوں کہ ان کے افسانے بہترین تہذیبی شعور کے ساتھ تخلیق کیے گیے ہیں۔ جو ان کے فن کی مہارت کے مظہر ہیں۔

---

# بقیہ اُردُونامہ

مسٹر کے پرکاش راؤ میئر بلدیہ حیدرآباد مہمانِ خصوصی تھے۔ یم زاد گلانی، ساغر آعظمی، راحت اندوری، ست نام سنگھ خمار، سہیل احمد رضوی، قمر اقبال، امان اختر، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، علی جلیلی، امیر احمد خسرو، صلاح الدین نیر، خواجہ شوق، راشد آذر، نریندر لوتھر، ڈاکٹر تکم، ناصر کرنولی، رحمٰن جامی، اوم پرکاش نرمل، فیض الحسن خیال، علی الدین نوید، رئیس اختر، انجم قمر سوز اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کی۔

۲۳ مارچ: گولکنڈہ سوسائٹی کی طرف سے سالار جنگ میوزیم میں "قطب شاہی دور کی تہذیب" پر ایک سیمینار کو جسٹس سردار علی خاں، ڈاکٹر میر اکبر علی خاں، جناب معظم حسین اور ڈاکٹر ایم ایل تکم نے مخاطب کیا اور کہا کہ حیدرآباد کی مشترکہ ثقافتی تہذیب قطب شاہوں کی سوغات ہے جناب تراب رکنی معتمد سوسائٹی نے شکریہ ادا کیا۔

۲۹ مارچ: اردو سبھا کے زیر اہتمام "ذولسانی مشاعرہ" صاحبزادہ کلیم صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی، راز عابدی، تہپال سنگھ ورما اور امی چند ششی مہمانان خصوصی تھے۔ ہندی اردو کے شعرا نے کلام سنایا۔ راجہ لال راجہ اور منوہر لال بہار نے استقبالیہ خطاب کیا اور الطاف صمدانی نے نظامت کی۔

۳۰ مارچ: سنٹرل یونی ورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اردو کی طرف سے "اردو ترجمہ روایت اور فن" کے موضوع پر سیمینار ہوا۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف اور ڈاکٹر حسن الدین احمد مجلس صدارت میں تھے۔ پروفیسر سراج الدین اور جناب اعجاز قریشی ایڈیٹر بھارت نیوز مہمانان خصوصی تھے۔ مسز یعقوب میراں مجتہدی، مضطر مجاز، داؤد اشرف، اے کے فاطمی، ہاشم حسن سعید اور حسن فرخ نے سیمینار سے خطاب کیا۔

● ممتاز ادیبہ اور ہلدارہ سب رس کی دیرینہ رفیق محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۸۴ سال کی عمر میں رحلت کر گئیں۔ خدا بخشے

پروفیسر مغنی تبسم

# جیلانی بانو کی کہانی اَدّو۔ ایک مطالعہ

اچھے فن پارے کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد تکمیل کا ایک تشفی بخش احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ تسکین کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے ہم نے کسی سے کوئی توقع باندھی ہو اور وہ پوری ہو جائے یا جیسے کوئی اپنا وعدہ ایفا کرے۔ ایسی تخلیق کے بارے میں خیال ہمارے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا کہ یہ کچھ اور بھی ہو سکتی تھی' بلکہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ویسی ہی ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیئے تھا۔ ایسی ہی کچھ کیفیت جیلانی بانو کی کہانی "ادّو" میں پائی جاتی ہے۔ اس کہانی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ آغاز سے انجام تک یہ ایک خود مکتفی فن پارہ ہے۔ خود مکتفی اس مفہوم میں کہ وہ اپنا مقصود آپ ہے وہ اپنے وجود کے علاوہ کسی خیال' نظریے' تصور یا عقیدے کی ترسیل نہیں کرتی' اس کا کوئی متعین مفہوم نہیں' لیکن اسے مفاہیم پہنائے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک مکمل اور بھرپور علامت ہے۔

بظاہر یہ ایک سیدھی سادی کہانی ہے جس میں ایک غریب یتیم لڑکے ادّو کی زندگی کے ایک دن کی واردات پیش کی گئی ہے' ادّو خانگی ملازم ہے۔ صبح سے شام تک گھر کے کام کاج میں مصروف رہنا' اپنے مالکوں کی خدمت بجالانا' ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنا' اس کی زندگی کا معمول ہے نہ اس کے معاوضہ میں اسے دو وقت کا کھانا اور لباس مہیا ہو جاتا ہے۔ تنخواہ کے نام سے اس کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔ شاید اس کی ماں کچھ وصول کر لیتی ہو۔ ادّو نے تعلیم نہیں پائی۔ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتا۔ مالک کے بچوں کو مولوی صاحب جو مذہبی اور اخلاقی تعلیم دیتے تھے وہ دور بیٹھا اسے غور سے سنتا اور اپنے دل میں اتار لیتا۔ اس تعلیم نے اسے سچا اور ایماندار بنا دیا۔ وہ اپنی حالت پر ہر طرح سے قانع تھا اور خواہش

کو دبادیتا تھا، دوزخ کی سزا کا خوف اس پر ایسا طاری تھا کہ وہ چوری کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی ہر چھوٹی بڑی خواہش عید کے دن پر ٹال رکھی تھی۔ اُسے صاحب بیگم صاحب اور چھوٹے میاں انعام دیں گے تو ایک روپے کی رقم اس کے ہاتھ آ جائے گی ایک روپیہ ادو کے لیے بہت بڑی دولت تھی۔ وہ اس سے ہر چیز خرید سکتا تھا لیکن ادو کو روپے کے لیے عید کے دن کا انتظار کرنا نہیں پڑا۔ وہ ہر روز صاحب کی گاڑی ڈھکیلتا تھا صاحب نے خوش ہو کر اسے چونی دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ہر روز گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی وہ اپنا وعدہ بھول کر چلے جاتے۔ ایک دن انھیں وعدہ یاد آ گیا اور انھوں نے اسے پیسے دینے کے لیے پرس کھولا لیکن اس میں چونی نہیں تھی۔ چناں چہ اس روز بھی وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے چلے گئے لیکن ادو کی مایوسی بے پناہ مسرت سے اچانک بدل گئی۔ وہ کار دھکیل کر ہانپتا ہوا لوٹا تو اسے گیٹ کے روپے کا نوٹ زمین پر پڑا ہوا نظر آیا اور اس نے جھپٹ کر وہ نوٹ اٹھا لیا۔ ایسے واقعے سے ادو کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ روپیہ پا کر ادو ایک کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کشمکش بہت ہی پیچ در پیچ نوعیت کی ہے۔ ایک طرف اس کی ڈھیر ساری خواہشیں ہیں، ادو ان میں سے کسی خواہش کی تکمیل بھی کر سکتا ہے لیکن اس ایک روپے سے تمام خواہشوں کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس کے باوجود ادو کو اپنی خواہشوں کے مقابلے میں روپے کی کمی کا احساس نہیں ہوتا ایک روپیہ تو اس کے لیے بہت بڑی دولت ہے۔ وہ تسکین و تشفی کے بے پناہ امکانات اپنے اندر رکھتا ہے۔ ادو کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ اسے جس طرح چاہے خرچ کرے۔ بازار میں اپنی پسند کی ایک ایک چیز کو جسے وہ پہلے حرص نظر سے دیکھا کرتا تھا اب اس کی رسائی میں آ جاتی ہے۔ وہ ایک چیز کی طرف بڑھتا ہے، لے خریدنا چاہتا ہے لیکن پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ روپے کی وسیع امکانی قوت خرید کو وہ کسی ایک معمولی خواہش کی تکمیل میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا مناسب اور بہترین مصرف ہو۔ جو قناعت اس میں پہلے بے زری اور مذہبی خوف کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی وہ اب دولت مندی کی بے نیازی میں بدل جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اپنی ذاتی خواہشات کو ترک کر کے یہ روپیہ اپنی بہن کو لے جا کر دیدے۔ ایک بار وہ اپنی بہن سے ملنے کے لیے پانچ میل پیدل چل کر اس کی سسرال گیا تھا تو بہن کی ساس نے یہ طعنہ دیا تھا کہ ماموں کنگلا ملنے کے لیے ہے۔ یہ بات بہن کو بُری لگی اور اُس نے ادو کو وہاں

آپ نے منع کر دیا تھا۔ اب وہ روپیہ لے جا کر بہن کو دے گا تو وہ بہت خوش ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ بہن کی سسرال کا رخ کرتا ہے۔ روپے کے صرف کے انتخاب میں اددو ترک وطلب کی جس کشمکش سے گزرتا ہے اسے کہانی میں بڑی نفسیاتی ژرف بینی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن اددو کی کشمکش صرف اسی انتخاب تک محدود نہیں تھی۔ اس تمام عرصے میں رہ رہ کر یہ احساس اس کے دل میں ابھرتا رہا ہے کہ وہ روپیہ اس کا نہیں ہے۔ ویسے اس نے جان بوجھ کر چوری تو نہیں کی تھی اسے یہ روپیہ زمین پر پڑا ہوا مل گیا تھا اور وہ یہ جانتا بھی نہیں تھا کہ اس کا مالک کون ہے پھر بھی روپیہ اس کا اپنا تبھی ہوتا جب اسے کسی نے بخشش کے طور پر دیا ہوتا۔ محنت کے حق کے طور پر اس نے کبھی روپیہ پانے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اددو نے اگر چوری کی ہوتی تو کہانی میں اس کے کردار کی نفسیاتی کشمکش کی نوعیت مختلف ہوتی یہاں وہ کبھی نہایت معصومیت کے ساتھ اس روپے کو اپنا جائز ملک تصور کرتا ہے، اس کے صرف پر غور کرتا ہے اور کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ روپیہ چوری کا ہے اور اگر وہ اسے صرف میں لائے تو اس پر خدا کا عذاب نازل ہوگا۔ وہ اپنی خواہش سے مغلوب ہو کر چار آنے میں ایک موزہ خرید لیتا ہے اور فوراً یہ سوچ کر موزہ واپس کر دیتا ہے کہ باقی پیسوں میں سے اٹھنی اس کی ماں لے لے گی لیکن چوری کا عذاب تو صرف اسی کو ہوگا۔ مگر وہ بہن کے گھر تک پہنچ کر اس عذاب کے تصور سے الٹے پاؤں لوٹ آتا ہے اور پیاس کی شدت کے باوجود فنٹا پینے سے گریز کرتا ہے۔ جب وہ دیر گئے گھر کی طرف چلنے لگا تو اسے خطرے کا یہ احساس ہوا کہ بیگم صاحبہ کو اس کا پتہ چل گیا تو وہ اسے پولیس میں دے دیں گی اور وہ لوگوں کی نظروں میں بھی ذلیل ہو جائے گا۔ پھر اس نے سوچا کہ فوراً جا کر روپیہ بیگم صاحب کو دے دے تو وہ اس کی ایمانداری سے خوش ہوں گی اور وہ دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا۔ وہ روپیہ بیگم صاحب کو اس طرح دے دیتا ہے گویا وہ انھیں کی امانت ہو۔ ان کے گیٹ کے پاس پڑے ہوئے روپے کا مالک کون ہو سکتا ہے۔ بیگم صاحبہ بلا تحقیق روپیہ اس سے لے لیتی ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اددو نے روپیہ چرایا ہے اور روپیہ ان کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ اددو کو اپنی ایمانداری کا پھل بیگم صاحبہ کی طرف سے چوری کے الزام کی صورت میں ملتا ہے۔

پہلے اور سرسری مطالعے میں اددو کی یہ کہانی اپنے گہرے نفسیاتی تجزیے اور ڈرامائی

کشمکش سے ہمیں متاثر کرتی ہے تو کہانی کا انجام اَدّو کے کردار کے لیے ہماری ہمدردی کا خراج وصول کرتا ہے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کے خلاف غم و غصے کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ ہم اس کہانی کی نفسیاتی اور سماجی حقیقت نگاری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ کہانی ستر پچھتر برس پہلے لکھی جاتی تو شاید اس کا انجام مختلف ہوتا۔ اَدّو کو اس کی ایمانداری پہ کچھ انعام ضرور مل جاتا۔ بصورتِ دیگر کہانی غیر اخلاقی قرار پاتی۔ کہانی کا موجودہ انجام تو ایک طرح سے اخلاقی قدروں سے ہمارا اعتماد اٹھا دیتا اور بے ایمانی کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن آج کا قاری جو ادب میں حقیقت نگاری کا عادی ہو چکا ہے ، ان خطوط پر نہیں سوچے گا۔ ممکن ہے اس کہانی میں اسے ہمارے سماجی نظام کی خرابیوں کا عکس دکھائی دے جو واضح طور پر دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک وہ طبقہ جو محنت کا استحصال کرتا ہے اور دوسرا وہ جو اپنی محنت کے ثمر سے محروم ہے۔ ایک طبقے کی نمائندگی صاحب اور بیگم صاحب کرتی ہیں اور اَدّو دوسرے طبقے کی۔ اس نظام میں ساری اخلاقی اور مذہبی قدریں کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہیں۔ صاحب اور بیگم صاحبہ اَدّو سے مشقت لے کر اس کی محنت کے معاوضہ کو غصب کر لیتے ہیں لیکن انھیں کوئی چور نہیں سمجھتا جبکہ اَدّو کو اس کی ایمانداری کے باوصف نہ صرف چور ٹھہرایا جاتا ہے بلکہ سزا بھی دی جاتی ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے کہانی کی یہ تعبیر اس وقت قابلِ قبول ہوگی جب کہ کہانی میں سے وہ حصے حذف کر دیئے جائیں جہاں روپیہ پانے کے بعد اَدّو کی ذہنی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے کیوں کہ وہ اس سماجی مقصد کی ترسیل میں معاون نہیں ہوتے اور دوسری طرف اگر یہ صرف کرداری کہانی ہوتی تو اس کا اختتام وہیں پر ہو جاتا جہاں اَدّو اپنی بہن سے ملے بغیر گھر لوٹنے کا فیصلہ کر لیتا۔

یہ کہانی کردار کا مطالعہ یوں بھی نہیں ہے کہ اس میں اَدّو کی شخصیت کو متعارف کروانے اور اس کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کہیں نہیں کی گئی ہے۔ کہانی کا آغاز ایک نفسی کیفیت سے ہوتا ہے ، ایک ایسی کیفیت جس سے آپ ہم اکثر گذر چکے ہیں۔ پھر اس نفسی کیفیت کو اس طرح پھیلایا گیا اور اس میں اس طرح موڑ دیئے گئے ہیں کہ جیسے جیسے ہم کہانی پڑھتے جاتے ہیں ، اَدّو کی شخصیت ہمارے اپنے وجود میں تحلیل ہوتی محسوس ہوتی ہے [illegible] کرداروں [illegible] اور جذباتی تطبیق (IDENTIFICATION)

پیدا ہوجاتی ہے۔ ادو کی واردات ہماری اپنی واردات نظر آنے لگتی ہے۔ اس تخلیقی عمل کے ساتھ ادو کی کرداری حیثیت باقی نہیں رہتی وہ ایک علامت بن جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ادو کی تمام واردات، اس کی نفسیاتی کشمکش، یہاں تک کہ کہانی کا انجام بھی علامتی رنگ اختیار کر جاتا ہے۔ اب یہ کہانی ہر قاری کے لیے ایک نئے مفہوم کی حامل ہو جائے گی اس کی اپنی کہانی بن جائے گی۔

فن پارہ علامتی حیثیت میں محض آئینہ نہیں ہوتا، اس کی اپنی ایک پہچان ہوتی ہے وہ ایک منفرد تجربہ ہوتا ہے جس سے خود فن کار تخلیقی عمل کے دوران گزرتا ہے۔ اس کہانی کا بنیادی تجربہ نہایت پیچیدہ ہے، اسے الفاظ کی گرفت میں لانے کے لیے تو اسی کہانی کو دہرانا ہوگا۔ البتہ اس کی ہیئتِ ترکیبی کے بارے میں کچھ اشارے کیے جا سکتے ہیں۔ اس تجربہ کی تہ میں قدروں کے مسخ ہونے کا ایک شدید احساس کارفرما نظر آتا ہے آدم علی خاں کا ادو بن جانا، اس انسانی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جو موجودہ دور میں ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ قدروں کی شکست و ریخت کے نتیجے میں رونما ہوئی ہے۔ اس عصری حسیت کے ساتھ کہانی کے تجربے میں فرد اور سماج کے ان رشتوں کا عرفان بھی شامل ہے جو قدروں کی تخلیق کے ضامن رہے ہیں۔ یہ کہانی جو بظاہر اخلاقی تصورات اور مذہبی ایقانات کو رد کرتی دکھائی دیتی ہے، حقیقت میں گہرا مذہبی اور اخلاقی حسیت کی حامل ہے جس کا ثبوت وہ کیفیتِ حزن ہے جس سے ہم کہانی کے انجام پر دوچار ہوتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر ادو ایک سوالیہ نشان بن کر خود ہم کو بھی سراپا استفسار بنا دیتا ہے۔ ○


جیلانی بانو

بند ھوا مزدوروں کے مسائل پر لکھا گیا اہم ناول

# بارشِ سنگ

مجلد گرد پوش۔ ضخامت: ۲۵۰ قیمت: /۴۰ روپے

ناشر: اردو مرکز ۸/۱۲۸ معظم پورہ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

جیلانی بانو

# اَدّو

آج اَدّو اچانک بہت بڑا اور سب سے اہم بن گیا تھا۔
جیسے پتھر اپنوں سے کٹ کر خدا بن جاتا ہے۔

اَدّو کو بھی آج دنیا کی ہر چیز حقیر بلکہ قابلِ تسخیر نظر آ رہی تھی کیونکہ آج وہ اپنے آپ کو صاحب کی طرح اونچا محسوس کر رہا تھا۔ آج اس کی جیب میں ایک روپیہ تھا۔ پرے پرے کا ایک روپیہ اسی لیے تو جیب کی طرف سے وہ ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز اپنے آپ بغیر کسی ڈور کے سہارے سے آسمان پر کیسے اڑتا ہے۔ صاحب کی موٹر کیسے زن سے چل نکلتی ہے اور سرکس میں پہلوان کیسے ہاتھی کو اپنے سینے پر کھڑا کر لیتا ہے۔ "یہ سب پیسے کا کس بل ہے میاں"۔ اس کا چچا مستان ٹھیک کہتا تھا۔

اسی وجہ سے آج اَدّو بھی بازار میں یوں چل رہا تھا، جیسے اس کی ٹانگیں دو بانس اوپر ہو گئی ہوں اور وہ نیچے کی غریب مخلوق کو روندتا ہوا گذر رہا ہو۔

فٹ پاتھ کے ہر خوانچہ فروش سے اس نے پوچھا۔

"گاجریں کتنے میں کیلو دو گے؟"

"سیتا پھل روپے کے کتنے دو گے؟"

"ایک روپے والی آئس کریم ہے؟"

ان سب چیزوں کے نام پوچھ کر اس کے دل میں ایسی ٹھنڈک ہو گئی جیسے اس نے ایک روپے والی آئس کریم کا پورا گلاس کھا لیا ہو۔ اکثر جب وہ بیگم صاحب کے ساتھ بازار جاتا تھا تو اسے سخت تعجب ہوتا کہ اتنے سنترے، آئس کریم، چاٹ اور مٹھائیاں بک رہی ہیں مگر پرس میں روپے رکھنے کے باوجود بیگم صاحبہ کا دل کیوں کیوں نہیں چاہتا کہ نئی چیزیں

یں۔ وہ بھی ایک روپے دنیا کا ہر ذائقہ چکھ سکتا ہے۔ ہر چیز خرید سکتا ہے' پھر بے اعتباری
کرے؟ پہلے وہ بھی تمام ندیدے بچوں کی طرح سوچا کرتا تھا کہ کہیں سے ایک روپیہ مل
سے تو منٹ بھر میں کھا پی ڈالے گا۔
مگر دولت انسان کو بردباری بھی سکھا دیتی ہے۔ اس لیے روپیہ جیب میں تھا تو بڑا
تی سا ہو گیا تھا۔
روز کی طرح آج بھی بیگم صاحب نے لات مار کر اٹھایا تو ادو کو کیا معلوم تھا کہ آج کا
ج اس کی قسمت بدلنے والا ہے۔ یہ سب جھوٹ نہ بولنے کا نتیجہ تھا۔ مولوی صاحب کے
پر اس نے کبھی جھوٹ نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ اپنے دل سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی چوری
سے گا۔ جب کبھی اس کا دل کسی چیز کے لیے للچاتا تھا تو وہ دھڑکتے دل سے کلام پاک نیم
پارہ اٹھا کر چوم لیتا۔ بس فوراً سکون مل جاتا۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جنت کے
ازے چوری نہ کرنے والوں کے لیے کھلے رہیں گے۔ وہ جنھوں نے چوری نہیں
۔ جھوٹ نہیں بولے۔ ادو کے پسینے اور میل میں ڈوبے ہوئے کپڑوں سے اچانک
ت الفردوس کے عطر کی خوشبو جھانک آنے لگتی۔ یہ دنیا تو صرف فانی ہے۔ جو بھی
یفیں ہیں پل بھر میں ختم ہو جائیں گی اور پھر نیک دل انسانوں کے لیے فرشتے جنت کے دروازے
ا دیں گے۔ جب صدیق اور شفیق مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو ادو
بیٹھا مولوی صاحب کی ساری باتیں اپنے دل میں اتار لیتا تھا۔ حالاں کہ صدیق اور شفیق کو
صاحب کی باتیں یاد رہتیں نہ سبق۔ کتنی بار خوانچے میں رکھے ہوئے پھلوں نے اسے
ما کیا۔ میز پر رکھی ہوئی مٹھائیوں نے اُسے بلایا۔ بیگم صاحب کے پاندان سے اٹھنی چونی
تو اس نے جھاڑو دیتے وقت پل اٹھائی جیسے جلتا ہوا انگارہ چھو لیا ہو۔ بھلا ایک چونی
طر دوزخ کا عذاب کون مول لے گا۔
رات کو جب تھکن کے مارے نیند نہ آتی تھی تو وہ سوچتا۔ عید کب آئے گی!
کے دن صاحب ایک اٹھنی ضرور دے دیں گے۔ بیگم صاحبہ تو چونی سے زیادہ کبھی
دیتیں۔ شاید چھوٹے میاں بھی ایک ... دیں ... روپیہ ہو جائے گا۔
آسنے کی آئس کریم ... پیسے کے چنے۔ چار آنے کا شربت۔ ارے نہیں اتنا
رچنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ روپیہ میں آپا کی منی کو دے آؤں گا۔ آپا بیچاری کسی طرح

میں کتنی دبلی ہو گئی ہے! ایک بار وہ پانچ میل پیدل چل کر آپا کے گھر گیا تھا تو آپا اسے دیکھ کر بالکل خوش نہ ہوئی۔ ایک کونے میں لے جا کر بولی۔

"اودو تو یہاں مت آیا کر۔ میری ساس طعنے دیتی ہے کہ ماموں کیا لایا ہے منا کے لیے؟ بس تو اب کی عید پر منی کو ایک روپیہ دے آؤں گا۔ آپا خوش ہو جائے گی مگر روپے کی بھنک کان میں پڑتے ہی اماں سر پر کھڑی ہو جاتی ہے' بہت رونے دھونے پر شاید دس پیسے دے دے۔

بہت دن ہو گئے صاحب نے کہا تھا کہ اودو کو ایک چونی دیں گے۔ کیوں کہ وہ روز صبح ان کی کار کو آدھا میل تک دھکا دیتا تھا۔ پھر کار کے اسٹارٹ ہوتے ہی وہ زن سے چلے جاتے اور چونی کی بات دوسرے دن پر ٹل جاتی تھی۔

آج بھی جب وہ صاحب کی کار کو ڈھکیلتے میں ہانپ رہا تھا تو سوچا کہ آج چونی کی بات کیا صاحب کو یاد دلا دوں! مگر صاحب کو شاید خود ہی یاد آ گیا۔ انھوں نے پرس نکالا اور ایک چونی ڈھونڈی۔ نہ ملی تو پرس بند کر کے پھر جیب میں رکھا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ لیتے میلے ہاتھوں کو دباتے ہیں اودو ہانپنے لگا۔ روز کار ڈھکیلنے سے اس کے سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ گیٹ کی طرف مڑتے ہی اس کی نظر زمین پر گئی اور وہ تیزی سے ادھر جھپٹا اس کی مٹھی میں ایک روپے کا کرارا نوٹ تھا۔ پکے پنج کا نوٹ۔ خوف اور خوشی کے مارے وہ کانپنے لگا۔ روپے کا نوٹ اتنا وزنی تھا کہ وہ روپے سمیت ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا۔ جن کے پاس بہت سے روپے ہوتے ہیں وہ جانے کیسے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اودو نے بڑے دکھ سے سوچا۔ اب صاحب کی کار چوراہے سے مڑ چکی تھی اور کھلے ہوئے گیٹ کے باہر کوئی نہ تھا۔

روپیہ ہاتھ میں آتے ہی اودو اندیشوں اور خطروں میں گھر گیا۔ وہ ایک روپے کی دولت سمیٹے اکیلا تھا اور ساری دنیا لٹیروں سے بھری ہوئی تھی۔ بوجھل پیروں کو گھسیٹتا ہوا وہ آہستہ آہستہ بازار کی سمت جانے لگا اور پھر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر غور سے روپے کو دیکھنے لگا۔ اسے دبا دبا کر تہہ کیا۔ ایک کاغذ میں لپیٹا اور احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ اب اس میں ایک دولت مند انسان کی سوجھ بوجھ آ چکی تھی۔ اب اس کے منہ میں نہ جانے کتنی چیزوں کا ذائقہ گھلا، اچھا اور خوب [illegible] کہ وہ [illegible] پھیلا رہی تھی۔

چاؤش کی دکان پر ایک لڑکی ناریل خرید رہی تھی۔

مجھے بھی ایک روپے کا ناریل دے دو۔ مگر گاہکوں کی بھیڑ میں چاؤش نے اُس کی بات نہیں سُنی۔ اچھا ہی ہوا۔ اگر وہ اس روپے کا ناریل کھا لیتا تو قیامت کے دن اللہ میاں اس کے ہاتھوں پر انگارے رکھیں گے۔ انگارے کی جلن سے گھبرا کے اس نے ہاتھ کھینچا تو روپیہ نیچے گر گیا۔ جلدی سے اٹھا کر اس نے پھر ایک بار نوٹ کو غور سے دیکھا۔ روپے تین شیروں کی تصویر بنی تھی جیسے وہ پہرہ دے رہے ہوں کہ اس روپے کو کوئی بے ایمانی سے چرا نہ لے۔

پاس سے ایک آدمی گذرا تو اس نے بڑے غور سے ادّو کو دیکھا۔ جیسے پہچان لیا ہو کہ وہ چور ہے۔ کہیں پولیس کو اطلاع نہ دے دے۔ ہتھکڑی پہن کر تھانے جانا پڑے گا۔ وہ خوف سے لرزنے لگا۔

اللہ میاں مجھے بچا لے۔ میرے مولا بلا لو مدینے مجھے۔ مگر چوری کر کے مدینے جائیے گا بے شرم۔ لعنت ہے تجھ پر۔ ادّو کے بچے۔ یہ لو۔ یہ تو گھر والی گلی آ گئی۔ اماں پوچھے گی روپیہ کہاں سے آیا۔ جھوٹ بولنا پڑے گا۔ چوری اور جھوٹ؟ خوف کے مارے وہ لرزنے لگا۔

لو۔ گیارہ بج گئے۔ بیگم صاحب چلا رہی ہوں گی کہ آج ادّو کہاں مر گیا۔ گوشت ترکاری کون لائے گا! جھاڑو کون دے گا۔ کپڑے کون دھوئے گا۔ بچوں کا ٹفن لے کر اسکول کون جائے گا۔ وہ یوں سرپٹ بھاگا جیسے بیگم صاحب کی آواز سُن لی ہو۔ لے کر اچھا تھا صاف نام بگاڑ دیا۔ اس کا نام تو آدم علی خاں تھا مگر انسانوں نے آدم کے نام کی جس طرح تذلیل کی ہے ادّو بھی اس سے نہ بچ سکا۔ اس کے نام کے بھی سارے پھول پتے جھڑ گئے اور وہ نرا ٹھنٹھ ادّو رہ گیا۔ اب میں یہ روپیہ آپا کی منّی کو دے آؤں۔ آپا خوش ہو جائے گی۔ ممکن ہے دال چاول بھی کھلا دے۔ اب تو بھوک لگ رہی ہے۔ آدھا دن گذر گیا۔ آج ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ مگر آپا کی سسرال پانچ میل دُور تھی۔ پاؤں دکھ جائیں گے۔

پھر بھی وہ چلتا رہا۔ منی کو روپیہ [illegible] رہے تھے۔ ابھی اس روپے کی چپل خرید لوں۔ پُرانی چپلیں موچی ایک روپے میں دے دیتا ہے۔ مگر پھر آئس کریم کیسے کھاؤں گا ــــ؟

پھر بھی وہ چلتا رہا۔ منّی کو روپیہ دینے کی خوشی میں۔ گرم سڑک پر پاؤں جل رہے تھے۔ اس روپے کی چپل خرید لوں۔ پرانی چپلیں موچی ایک روپے میں دے دیتا ہے تو پھر آئس کریم کیسے کھاؤں گا ـــــ؟

ایک ٹھیلے میں پکے پکے موز بک رہے تھے۔ بہت دنوں سے اس کا جی چاہ رہا تھا موز کھانے کو۔ جلدی سے اس نے ایک موز خرید لیا۔ پھر جب ٹھیلے والے نے ایک اٹھنی اور ایک چونی واپس کی تو ادّو کا دل دھک سے ہو گیا۔ لو۔ روپیہ ختم۔ صرف ایک اٹھنی اور ایک چونی رہ گئی ـــ "نہیں چاہیئے مجھے موز" اس نے جلدی سے موز ٹھیلے میں رکھ دیا اور اپنا روپیہ مٹھی میں دبا لیا۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا ایمان بچ گیا۔ اگر موز کھا لیتا تو اٹھنی اماں چھین لیتی اور قیامت کے دن کوئی ماں اپنے بچوں کو نہیں پہچانے گی۔ ہر شخص کے گناہوں کا بوجھ اس کی گردن پر ہوگا۔ اماں بھی اٹھنی کے چاول پکا کر پکالے گی اور دوزخ کے سانپ بچھو مجھے کاٹیں گے۔

اب آپا کا گھر سامنے نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھی منّی کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھی ـــ

منّی کو سامنے دیکھ کر وہ خوشی کے مارے دوڑنے لگا۔

مگر روپیہ منّی کو دے کر بھی تو دوزخ کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔

وہ ٹھہر گیا۔ پیاس اور بھوک کے مارے حلق خشک ہو رہا تھا۔ سامنے ہوٹل کے اوپر بہت بڑی فنٹا کی بوتل بنی تھی جس میں سے میٹھے ٹھنڈے شربت کی دھار ٹپک رہی تھی۔ کتنا مزہ آئے گا یہ شربت پی کر۔ ادّو نے مٹھی میں دبا ہوا روپیہ غور سے دیکھا۔ مگر وہ روپیہ آگ بن گیا جس میں دوزخ کے شعلے اس کی طرف لپک رہے تھے۔

نڈھال۔ تھکا ہوا۔ دوزخ کی آنچ میں سلگتا ہوا بھوکا پیاسا ادّو آہستہ آہستہ لوٹنے لگا۔ آپا اور منّی سے ملے بغیر۔

"ارے او ادّو کے بچے۔ آج صبح سے کہاں غائب ہے تو تیری بیگم صاحب خفا ہو رہی ہیں۔" پڑوس کی ماما نے اسے دیکھ کر پکارا۔ گھبرا کے روپیہ جیب میں ڈالنے لگا تو قریب آ گئی ـــ "کیا تو بنگلے سے کچھ چرا کے بھاگا ہے آج؟" ماما تشویش بھری اور ازراہ استفسار اسے دیکھنے لگی۔ "نہیں تو میں چوری کیوں کروں گا" اس نے ماما کو ٹال دیا۔

آنسو ڈبڈبا کر تھمنے کو تیار نہیں ہوے۔ کہیں بیگم صاب کو بھی معلوم ہو گیا کہ وہ روپیہ چُرا کے بھاگا ہے تو وہ پولیس کو بلالیں گی۔ لوگ اسے چور چور پکاریں گے۔ سوچا یہ جاکر روپیہ بیگم صاب کو دے دے گا۔ بیگم صاب خوش ہو جائیں گی۔ سارے محلے میں اس کی ایمانداری کے چرچے ہوں گے۔ محلے کے دوسرے نوکروں کو اس کی مثالیں دی جائیں گی۔ اور پھر جنت کے دروازے اس کے سامنے کھلنے لگے۔ مرے مرے قدموں سے وہ پھاٹک میں داخل ہوا۔ اس کی آمد کی اطلاع گھر میں پہنچادی گئی تھی اور سارے محلے کی لونڈیاں بیگم صاب کی عدالت میں اس کے مقدمے کا فیصلہ سننے کو اکٹھی ہو چکی تھیں۔

"صبح گیٹ کے پاس پڑا ملا تھا" میل اور پسینے میں بھیگا ہوا روپیہ اس نے بیگم صاحب کے سامنے رکھا۔ وہ ورانڈے میں کرسی پر لیٹی اخبار دیکھ رہی تھیں۔ اخبار رکھ کر اس نے ادو کو گھورا اور دھم سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار کے بولیں:

"چھٹے! سچ سچ بتا، تو نے آج اور کتنے روپے چرائے ہیں جن سے سارا دن گلچھرے اڑاتا رہا ہے ۔۔۔؟"


## ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| مقدمہ تاریخ دکن | پروفیسر مجید صدیقی | ۱۰ روپے |
| حیدرآباد | ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ | ۲ ،، |
| یوروپ جنگ سے پہلے | پروفیسر ہارون خان شروانی | ۵ روپے |
| تاریخ سیاسیات | پروفیسر مجید صدیقی | ۵ ،، |
| مسلمان شاہی خاندان (ترجمہ) | عبدالرحمٰن خان | ۱۰ ،، |
| ریاض مختاریہ (تاریخ خاندان سالار جنگ) | دانش | ۱۵ ،، |
| حیدرآباد کے بڑے لوگ | غلام پنجتن شمشاد | ۶ ،، |
| برق و آشیاں (شاعری) | سعید شہیدی | ۵ ،، |
| جنوبی ہند میں رباعی گوئی (تذکرہ) | صاحب حیدرآبادی | ۳۵ ،، |
| سیر گولکنڈہ (افسانے) | ڈاکٹر زور | ۳ ،، |

ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر، ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ (۴۸۲ ۔۔ ۵)

وقار خلیل

# اُردو نامہ

## اُردو کی علمی ادبی و تہذیبی خبریں

۸ر فروری: مجلس انتظامی ادارۂ ادبیات اردو کا اجلاس جناب محامد علی عباسی صدر ادارہ کی صدارت میں بمقام "ایوان اردو" منعقد ہوا۔ ۳۲ ویں مرحوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کو قطعیت دی گئی اور انتظامی امور زیر بحث آئے۔ اجلاس میں اراکین مسرز عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، پروفیسر مغنی تبسم، سراج الدین احمد، محمد منظور احمد، ڈاکٹر یم یل نگم اور بلقیس علاء الدین نے شرکت کی۔ مسز رومن راج سکینہ معتمد عمومی نے شکریہ ادا کیا۔

● عثمانیہ لٹریری سرکل اور بزم عرفان کا ماہانہ طرحی مشاعرہ فرید متین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ روحی قادری اور نظیر علی عدیل مہمانان خصوصی تھے۔

● محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ سلطانہ شرف الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ بشریٰ عبدالواحد نے شاذ کی غزل پر مضمون اور ثمر جمال نے افسانہ سنایا۔ خواتین شعراء نے آخر میں کلام سُنا کر داد پائی۔ محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے نظامت کی۔

۱۰ر فروری: سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے زیر اہتمام جناب بھارت چند کھنہ کی صدارت میں محفل شعر منعقد ہوئی۔ سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، ڈاکٹر یم یل نگم، ادم پرکاش نرمل، حسینی سعد، صلاح الدین نیر، محمد منظور احمد، رئیس اختر، علی الدین نوید، فیض الحسن خیال، خیر الزماں خیر کے علاوہ مظفر النساء ناز اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

● نمائش کلب میں طنز و مزاح کا مشاعرہ جناب علی صائب میاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر کے علاوہ حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، اسماعیل ظریف، سر پٹ حیدرآبادی، معین امر بمبو، رؤف رحیم، بھاٹ اور منور علی مختصر نے کلام سنا کر داد پائی۔

● روزنامہ "سیاست" کے زیر اہتمام دو کتابیں "شاعری کے کرشمے" اور "داستان حیدرآباد" شائع ہوئیں۔ موخر الذکر کتاب میں حیدرآباد کے کلچر اور محلوں کے تاریخی پس منظر پر معلوماتی مضامین

شامل ہیں جو پہلے روزنامہ سیاست میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں

۱۲ر فروری: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے زیر اہتمام "دانشوری اور اردو مخطوطات" کے موضوع پر منعقدہ سمینار میں حیدرآباد سے ڈاکٹر انور معظم، محترمہ جیلانی بانو، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر افضل الدین اقبال اور ڈاکٹر سید رحمت علی نے نمائندگی کی۔

۱۲ر فروری: سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کی طالبہ مس نورالنساء تسکین (ایم اے) کے کونسلیٹ ہونے کی مسرت میں خیر مقدمی تقریب ڈاکٹر مجاور حسین رضوی کارگزار صدر شعبہ اردو کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اساتذہ اور طلبہ و طالبات نے مس تسکین کو مبارکباد پیش کی۔ مس تسکین ان دنوں سنٹرل یونیورسٹی سے شاذ تمکنت پر ایم فل کے لیے ریسرچ کر رہی ہیں وہ ملک الشعراء حضرت اوج یعقوبی مرحوم کی دختر ہیں۔

۲۲ر فروری: اردو گھر میں حضرت جوش ملیح آبادی کی چوتھی برسی کے موقع پر یادِ جوش کا اجلاس ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر یو پی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اختر حسن مددگار معتمد ریاستی اردو اکیڈیمی، خیرات ندیم، غوث یار خاں اور صابر کمال نے حضرت جوش کو خراج عقیدت ادا کیا۔

○ مولانا ابوالکلام آزاد کی ۲۸ ویں برسی کے موقع پر قومی یکجہتی کے موضوع پر دو روزہ سمینار کا ریاستی گورنر مسز کمود بین جوشی نے افتتاح کیا۔ جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے نے صدارت کی۔ ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ جناب کے یم خاں، علی احمد خسرو اور ڈاکٹر خلیق انجم کی صدارتوں میں ممتاز دانشوروں نے مولانا آزاد اور قومی یگانگت پر مقالے سنائے۔

۲۴ر فروری: اردو مجلس کا ادبی اجلاس ڈاکٹر حسن الدین احمد کی صدارت میں منعقد ہوا اردو شاعری میں جدید رجحانات پر جناب علی احمد جلیلی اور ہندی شاعری پر مسٹر نیپال سنگھ درما نے مضامین سنائے۔ آخر میں شعرا نے کلام پیش کیا۔ صلاح الدین نیر نے نظامت کی۔

○ مرتضیٰ موسوی کے مجموعۂ کلام "قلب سلیم" کی اردو گھر میں جناب اختر زیدی نے رسم اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، سعید شہیدی، راحت عزمی، شاہد حیدری اور مقصود جاوید نے سلیم کی شاعری پر اظہار خیال کیا اور مبارکباد پیش کی۔

۲۴ر فروری: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے زیر اہتمام دلی میں منعقدہ ایشیائی سمینار میں ڈاکٹر جلیل نے ادارہ کے مخطوطات پر

مقالہ سنایا۔ جس کی صدارت پاکستان کے پروفیسر ابواللیث صدیقی نے کی۔

**یکم مارچ ۱۹۸۶ء:**

ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام دو روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ کے ۲۴ ویں سالانہ افتتاحی اجلاس کا گنبد محمد قلی واقع گولکنڈہ پر ہزاروں افراد کی موجودگی میں محترمہ کمود بین جوشی گورنر آندھرا پردیش نے افتتاح کیا اور مسٹر جی نارائن راؤ اسپیکر اسمبلی نے صدارت کی۔ گورنر صاحبہ نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد نیز دکن میں قومی یکجہتی کی عظیم روایات کے علمبردار محمد قلی قطب شاہ کی یاد اور کارناموں کو زبردست خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے ریاستی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ اس عوامی اور تہذیبی تقریب کے بھرپور انعقاد کے سلسلے میں ملک کے مشہور ادارہ کو بھرپور تعاون اور گرانٹ جاری کرے۔

جلسہ کا آغاز قومی ترانہ اور محمد قلی کی مناجات "مرا شہر لوگاں سے معمور کر" سے ہوا جسے فائن آرٹس اکیڈمی کے فن کاروں اطہر خاں، رکن الدین اور چھایا النا نے سنایا۔ مسٹر رمن راج سکسینہ معتمد عمومی ادارہ ادبیات اردو نے خیرمقدمی خطاب کیا۔ صدر ادارہ نے گورنر سے استدعائے افتتاح کی۔ مسٹر گرو ناتھ پرشاد سکسینہ نائب صدر ریاستی اردو اکیڈمی نے حیدرآبادی کلچر اور محمد قلی قطب شاہ پر مخاطب کیا۔ جناب امیر احمد خسرو نے محمد قلی پر نظم سنا کر داد پائی۔ فائن آرٹس اکیڈمی کے فن کاروں رام دیو، رکن الدین، ستیش کار، خان اطہر اور اوشا جینتی نے محمد قلی اور مخدوم و سعید شہیدی کا کلام پیش کر کے سماں باندھا۔ پروفیسر مغنی تبسم شریک معتمد ادارہ نے شکریہ ادا کیا۔ آخر میں عزیز احمد خاں وارثی اور ان کے ساتھیوں نے قوالی پیش کی۔ اس موقع پر ریاستی محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے اردو ماہنامہ آندھرا پردیش جس میں گوشۂ محمد قلی کے تحت مضامین نثر و نظم شامل تھے، مسٹر عبدالمجیب خاں ایڈیٹر نے گورنر اور صدر کی نذر کیا۔

افتتاحی اجلاس سے قبل ادیبوں اور شاعروں کا اجتماعی ظہرانہ (پاٹ لک) اور گنبد محمد قلی پر سالانہ عوامی مشاعرہ جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ معتمد مشاعرہ بشیر وارثی کے علاوہ علی جلیلی، وقار خلیل، محمد منظور احمد، سرمست لاہوتی، اکبر یوسفی، صادق نقوی، فاروق عارفی اور دیگر شعرا نے کلام سنایا۔

٥ بزم طنز و مزاح کے

محل پر مشاعرہ کا ریاستی گورنر کرشن کانت جوشی نے افتتاح کیا جناب سید کشر شاہ نے صدارت کی۔ اس مشاعرہ کی آمدنی حسینی علم گرلس اسکول لائبریری کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا۔

۲ر مارچ: یوم محمد قلی قطب شاہ کا ادبی اجلاس "حیدرآباد دیدہ و شنیدہ" کے زیر عنوان پروفیسر نارائن کرن ریڈی ڈائرکٹر آف انسٹی ٹیوٹ کرسپانڈنس کورس عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے مہمان خصوصی تھے نصف صدی قبل کی حیدرآبادی تہذیب، علمی سرگرمیوں اور معاشی، سماجی نیز دفتری امور سے متعلق فاضل اہل قلم اور دانشوروں نے خطاب کیا۔ جن میں ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی، نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر، جسٹس ایکبوٹے

پروفیسر کرن ریڈی، محترمہ گیتا بیگم، ڈاکٹر مسعود علی بیگ، ڈاکٹر دھرمیندر پرشاد، جناب علی قادری اور ڈاکٹر رحیمونہ بانو شامل ہیں۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

اسی شب "ایوانِ اردو" میں مشاعرہ جناب الحاج مرزا شکور بیگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، بانو طاہرہ سعید، محمد منظور احمد، وقار خلیل، بشیر وارثی، راشد آذر، صلاح الدین نیر، علاء الدین نیر، رئیس اختر، صادق نقوی، کنول پرشاد کنول، فیض الحسن خیال، قاسم موسوی، مظفر النساء ناز، عزیز النساء صبا، سلیم رضوی اور ضمیر النساء ضمیر نے کلام سنایا جناب صادق نقوی نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۴ر مارچ: مکیش میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام جناب اختر حسن مددگار معتمد ریاستی اردو اکیڈیمی کی صدارت میں جناب میر محمد علی خاں مکیش ۳۶ برس بعد "یاد مکیش" کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس پروفیسر مغنی تبسم نے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کے تناظر میں مکیش مرحوم، ذہانتِ فکر اور شاعری کو خراج عقیدت ادا کیا۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کاروں نے کلام مکیش سنا کر داد پائی۔ جناب رشید قریشی نے پُراثر خاکہ سنایا۔ جناب عزیز قیسی اور جناب یوسف ناظم نے بھی مخاطب کیا (اور فرزندِ مکیش بھتیجا فہیم بھی مخاطب ہوئے۔

۶ر مارچ: اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے کے موضوع پر ڈاکٹر عنوان چشتی صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں توسیعی لیکچر دیا۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے صدارت کی اور

پروفیسر یوسف سرمست نے
نظامت کی۔

۷ مارچ: حیدرآباد لٹریری
فورم کے اجلاس میں ڈاکٹر
بیگ احساس نے ۱۹۸۵ء میں
اردو افسانہ کے زیر عنوان
مقالہ سنایا۔ قدیر زماں،
ڈاکٹر یوسف کمال، مغنی ظہیر،
یوسف اعظمی، غیاث صدیقی
نے بحث میں حصہ لیا۔ جناب
مظہر الزماں نے صدارت کی۔

۸ مارچ: انجمن ترقی اردو
آندھرا پردیش کا دو روزہ
سالانہ اجتماع 'اردو ہال' میں
منعقد ہوا۔ مسز کمود بین جوشی
ریاستی گورنر نے افتتاح کیا۔
ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر
ریاستی انجمن نے صدارت کی
اور کلیدی خطبہ پڑھا۔ ڈاکٹر
راج بہادر گوڑ کے علاوہ
مندوبین اور اساتذہ نے
مخاطب کیا۔ ملک کے اتحاد اور
قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے
اردو زبان کی ترویج و اشاعت
کو ناگزیر قرار دیا گیا اور
حکومت کی معاندانہ پالیسی پر
احتجاج کیا۔ اسی جلسہ میں
پروفیسر حبیب الرحمٰن سابق
صدر انجمن کی علالت کے پیش نظر
ان کی عدم موجودگی پر ان کی
دیرینہ و گرانقدر خدمات کی
ستائش کی گئی اور صحت کی دعا
بھی۔

● انجمن اساتذہ آندھرا پردیش
کے اجلاس میں مقررین نے
مرکزی نئی پالیسی کو غیر جمہوری
اور رجعت پسندانہ قرار دیتے
ہوئے اردو کے تحفظ اور تعلیم
کی ذمہ داری ہر شہری پر عائد
کی۔ ڈاکٹر گوڑ، ڈاکٹر حسینی شاہد
سری نواس لاہوٹی اور اضلاع
کے مندوب اساتذہ نے مخاطب
کیا۔

● شنکر جی میموریل ہند پاک
مشاعرہ میں قتیل شفائی، سحاب
قزلباش، مجاز بارہ بنکوی، ندا
فاضلی، کمار پاشی، زبیر رضوی،
عزیز قیسی، منور رانا، شگفتہ شبنم
کے علاوہ امیر احمد خسرو، علی احمد
جلیلی، خیرات ندیم، صلاح الدین
نیر، خواجہ شوق، رکھی باقر
اور ڈاکٹر بہل نظم نے
کلام سنایا۔ گورنر مسز کمود بین
جوشی مہمان خصوصی تھیں۔
اور مسٹر جی نارائن راؤ اسپیکر
نے صدارت کی۔ جسٹس قرار
علی خاں نے سووینیر کی رسم
اجرا انجام دی۔

۹ مارچ: محفل خواتین کا
ادبی و شعری اجلاس محترمہ
خورشید حمید پاشاہ کی
صدارت میں ہوا۔ محترمہ نگہت
اور محترمہ عابدہ رحمانہ نے
افسانے سنائے اور بانو طاہرہ
سعید، عظمت عبدالقیوم،
مظفر النساء ناز، تسنیم نیازی اور
عصمت عظیم نے کلام پیش کیا۔
محترمہ فاطمہ عالم علی نے نظامت
کی اور شکریہ ادا کیا۔

● جنوبی ہند میں اردو کا
موقف کے موضوع پر ڈاکٹر
راج بہادر گوڑ کی صدارت
میں سمینار منعقد ہوا۔ ڈاکٹر
اخلاق الرحمٰن قدوائی چانسلر
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے

افتتاحی خطاب کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی (بمبئی)، پروفیسر عابد صفی (مدراس) ڈاکٹر عبدالاحد (بنگلور) وہاب عندلیب (گلبرگہ) اور ذاکرہ بیگم (مدراس) نے حصہ لیا۔

۱۰ر مارچ: شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی صدر شعبۂ اردو بمبئی یونی ورسٹی نے "دکھنی اور مراٹھی کے لسانی رشتے" کے زیرعنوان توسیعی لکچر دیا۔

۱۱ر مارچ: جناب حمیدالدین محمود نے اردو کے تعلیمی اور صحافتی مسائل پر عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو مخاطب کیا۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف مہمانِ خصوصی تھے۔

• ریاستی اردو اکیڈیمی نے اقبال عالمی سمینار، جشن شاہ سراج اور سلطان العلوم لٹریری سرکل کے کل ہند مشاعرہ کے لیے رقمی اعانت منظور کی۔

• کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے وفد نے جناب جلیل پاشاہ کی قیادت میں ریاستی گورنر مسز کمود بین جوشی سے ملاقات کی اور ریاست میں اردو مسائل کی یکسوئی کے تعلق سے عرض داشت پیش کی۔

۱۲ر مارچ: سلطان العلوم لٹریری سرکل کی طرف سے حضور نظام میر عثمان علی خان مرحوم کی ولادت صدی تقاریب کا کل ہند مشاعرہ سے آغاز ہوا۔ جناب تجمل حسین نے صدارت کی جب کہ مسٹر خلیل الرحمٰن ڈائرکٹر ریاستی اردو اکیڈیمی مہمانِ خصوصی تھے۔ حضرت خمار بارہ بنکوی، افتخار امام ایڈیٹر شاعر بمبئی، مہہ جبین نجم، عزیز بلگامی، کنول پرشاد کنول، وقار خلیل، تاج مہجور، رضا وصفی، محب کوثر، غیاث صدیقی، اوم پرکاش نرمل، رؤف خیر، غیاث متین، اختر واجدی، راجہ لال راجہ اور ذاکر گوڈر شاہی نے کلام سنایا اعجاز فرخ نے نظامت کی۔

۱۳ر ڈاکٹر فضل امام صدر شعبہ اردو راجستھان یونی ورسٹی نے جامعہ عثمانیہ میں "جوش شاعر شباب و انقلاب" کے موضوع پر توسیعی لکچر دیا۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے صدارت اور پروفیسر یوسف سرمست نے نظامت کی۔

۱۵ر مارچ: حیدرآباد لٹریری فورم کی محفل شعر پروفیسر مغنی تبسم صدر حلقہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ حلقہ کی طرف سے جدید لہجے کے سخنور جناب افتخار امام ایڈیٹر شاعر بمبئی کا خیر مقدم کیا گیا۔ مسز تبسم، افتخار امام، غیاث متین، رؤف خیر، مضطر مجاز، رضا وصفی، یوسف اعظمی، غیاث صدیقی، یا فطاہرہ سعید، بشارت، اثر غوری، علی ظہیر، یوسف کمال، ذکی بلگرامی، ستار صدیقی رحمت یوسف زئی اور مظہر مہدی نے کلام سنایا۔

۲۲ر مارچ: گولکنڈہ فیسٹول کا دوسرا کل ہند مشاعرہ جناب سید مکرم شاہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ باقی صفحہ ۳۱ پر دیکھیے

# ادارہ ادبیات اردو



بہ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

سن اجراء ۱۹۳۸ء ——— فون : ۳۸۴۶۶

Dr. Zakir Husain Lib.
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

# سب رس

جلد ( ۴۹ ) ——— شمارہ ( ۵ ) مئی ۱۹۸۶

: مغنی تبسم

: محمد منظور احمد

: وقار خلیل

مجلس مشاورت :

صدر: حامد علی عباسی     نائب صدر: ہاشم علی اختر

معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

اراکان :

ابد علی خاں ○ پروفیسر گوپی چند نارنگ ○ محمد اکبر الدین صدیقی ○ رحمن راج سکسینہ ○ پروفیسر سراج الدین ○ محمد منظور احمد

فی پرچہ : ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ ۳۰ روپے ۔ کتب خانوں سے ۳۵ روپے

| بیرونی ملکوں سے | ہوائی ڈاک سے | بحری ڈاک سے |
|---|---|---|
| مشرق وسطی | ۱۵ ڈالر | ۶ ڈالر |
| امریکہ | ۲۰ ڈالر | ۷ ڈالر |
| پاکستان، برما، سیلون | ۱۰ ڈالر | ۳ ڈالر |
| انگلستان | ۸ پونڈ | ۳½ پونڈ |

خط و کتابت کا پتہ : ادارۂ ادبیات اردو " ایوان اردو " پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد ۔ ۸۲

ن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر دفتر سب رس پنجہ گٹہ روڈ
حیدرآباد ۸۲ سے شائع کرایا۔

# ترتیب




## ادارۂ ادبیاتِ اردو کی چند مطبوعات

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ | نذرِ محمد قلی قطب شاہ | ۱۲ | روپے |
| ۲۔ " " " | معانی سخن | ۵ | روپے |
| ۳۔ " " " | ادبی تحریریں | ۶؍ | روپے |
| ۴۔ " " " | سیرِ گولکنڈہ | ۳ | روپے |
| ۵۔ " " " | تاریخِ ادبِ اردو | ۵۰ | روپے |
| ۶۔ پروفیسر مجید صدیقی | مقدمہ تاریخِ دکن | ۱۰ | روپے |
| ۷۔ " " " | تاریخِ سیاسیات | ۵ | روپے |
| ۸۔ عبدالرحمٰن خاں | مسلمانی شاہی خاندان (ترجمہ) | ۴۰ | روپے |
| ۹۔ دانش | ریاضِ مختاریہ (تاریخِ خاندانِ سالارجنگ) | ۱۵ | روپے |
| ۱۰۔ غلام پنجتن شمشاد | حیدرآباد کے بڑے لوگ | ۶ | روپے |
| ۱۱۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ | حیدرآباد | ۴ | روپے |
| ۱۲۔ شہیدی | برقِ آشیاں (شاعری) | ۵ | روپے |

کا پتہ: سب رس کتاب گھر، ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد (۵۰۰۰۸۲)

ڈاکٹر گیان چند

# کلامِ اقبال کے دو قدیم مخطوطے

سید عبدالواحد معینی باقیاتِ اقبال طبع اول ۱۹۵۲ء کے مقدمے میں لکھتے ہیں: "بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے اکثر عقیدت مندانِ اقبال کا یہ دستور تھا کہ جب علامہ مرحوم کا کلام کسی رسالے میں شائع ہوتا تو اس کو جمع کر لیتے۔ علامہ کا بیشتر کلام مخزن اور زمیندار میں شائع ہوتا تھا مگر کبھی کبھی پنجاب کے دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوتا تھا۔ غرضکہ اس کلام کا جمع کرنا آسان کام نہ تھا مگر دلدادگانِ اقبال ہمیشہ تلاش میں رہتے تھے اور اکثر اصحاب کے پاس بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے ہی کلامِ اقبال کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ اس میں سے ایک شیخ عبدالحمید صاحب ایم۔ اے، علی گڑھ میں طالب علم تھے۔ ان کے پاس علامہ مرحوم کے کلام کا ایک نایاب مجموعہ تھا۔۔۔ ۔۔۔ دوسرے صاحب مولوی عبدالرزاق حیدرآبادی ہیں۔ ان کو علامہ کے کلام سے عشق تھا۔ عبدالرزاق صاحب نے بعد میں اپنا مجموعہ کلیاتِ اقبال کے نام سے شائع کر دیا۔"

راقم الحروف نے جولائی ۱۹۰۸ء تک کے اردو کلامِ اقبال کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا ہے اور اس کی بنیاد علی گڑھ کے ایک طالب علم اور حیدرآباد کے ایک قدردانِ اقبال کے قلمی مجموعوں پر رکھی ہے۔ مجھے یہ عبدالصمد خاں صاحب سے ملے۔ ان کا حیدرآباد میں اردو نوادرات کا بے نظیر کتب خانہ تھا۔ ۱۹۸۵ء میں یہ حیدرآباد سے کلکتے چلے گئے۔ انھوں نے کئی سال پہلے مجھے انور خاں کا مرتبہ قلمی کلامِ اقبال دیا جس کی وجہ سے میں نے کلامِ اقبال کی تحقیق کی ٹھانی۔ انھوں نے جنوری ۱۹۶۸ء میں ایک اور مخطوطہ دیا جو انھوں نے عماد الملک سید حسین بلگرامی کے ذخیرے سے خریدا۔ ان دونوں مخطوطوں کا بڑا حصہ درا کی اشاعت کا ہے۔ ان میں اقبال کا منسوخ کلام بکثرت ہے۔ ان میں بانگِ درا کی جو نظمیں اور غزلیں ہیں ان کا قدیم متن ہے یعنی ایک طرف ان میں منسوخ اشعار شامل ہیں دوسری طرف بانگِ درا کے متداول اشعار میں سے بعض کا قدیم متن دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ مرتبین نے رسالوں سے کلام جمع کیا ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں اپنے ماخذ کی نشاندہی کی ہے، بیشتر صورتوں میں نہیں کی۔ عمادالملک نے رسالوں کے شمارے کا حوالہ دینے پر زیادہ توجہ کی ہے

ان مجموعوں میں بانگِ درا کے بعد کسی اردو مجموعے کی باستثنائے ساقی نامہ و بالِ جبریل
یک بھی چیز نہیں۔ ذیل میں ان دونوں مجموعوں کا تفصیلی تعارف پیش کیا جائے گا۔

## کلامِ اقبال

یہ چھوٹے کتابی سائز ٢٠×٣٠ / ١٦ میں ہے۔ اوپر گلابی رنگ کا موٹا کاغذ ہے جس پر کاتب نے جلی خط میں غلام اقبال' لکھا ہے۔ دوسرے ورق پر درمیان میں 'راقم محمد عمر اقبل' لکھا ہے یہ کاتب کا نام ہے جس نے اگلے صفحے پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے نیچے یوں لکھا ہے۔

کلامِ اقبال

٣٠ راکتوبر ١٩٢٤ء

محمد انور خاں

طالب العلم

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ

پھر چند سادہ اوراق کے بعد محمد انور خاں نے کلام نقل کیا ہے۔ یہ نہ بہت خوش خط ہیں نہ بدخط۔ نسخے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ص ٢٠١ پر ختم ہو جاتا ہے، دوسرا اس کے آگے ہے اور اس پر نئے سرے سے صفحات کے ڈالے گئے ہیں۔ آخر میں فہرستِ عنوانات مع نمبر صفحہ کے دی ہوئی ہے

حصۂ دوم کے صفحہ ٤٢ تک کا کلام بانگِ درا کی اشاعت سے قبل کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ص ٤٢، ٤١، پر منسوخ کلام ہے۔ ٣٩ پر بانگِ درا کے متداول کلام میں منسوخ اشعار بھی موجود ہیں۔ ص ٤٣ پر ہمایوں جنوری سے اور ص ٤٤ پر نیرنگِ خیال دسمبر ٢ [illegible] سے نقل کیا گیا ہے۔ گویا جلد دوم کا ص ٤١ ایک حدِ فصل ہے۔ کے آخر میں دو غزلیں رسالہ 'آج کل' سے نقل ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ 'آج کل' میں ٤٤ ١٩ء میں شائع ہوئیں۔ یہ مرتب کے خط ہی میں ہیں۔ اس طرح بیاض کی تکمیل ١٩٤٤ء میں ہوی۔

اس مجموعے میں ذیل کی چیزیں ایسی ہیں جو ابھی تک باقیات کے کسی مجموعے میں نہیں ملتیں۔

١۔ حصۂ اول ص ٣١-٤٠ پر نظم قطرۂ اشک

۲ حصۂ دوم ص ۳۹ پر غزل کا یہ شعر

آنسوؤں کی سبحہ گردانی سے ہے پیری میں کام ؎ صبح کے دامن میں شبنم کے سوا کچھ بھی نہیں

حصۂ دوم ص ۴۲ پر نظم 'عورت'

مخطوطے سے کچھ نئی باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ غزل ع انجمن آرائی کر، پر عنوان سحر حلال' دیا ہے اور غزل' زیرلبی رہی'، کا عنوان 'تقاضائے جنوں' ہے۔

۲۔ غزل ع چمک تیری . . . . شرارے میں'، پر عنوان' رموز توحید' دیا ہے۔

۳۔ غزل ع زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں' پر عنوان رموز ہستی دیا ہے۔

۴۔ منسوخ نظم 'غریبوں کا دنیا میں اللہ والی' نیرنگ خیال دسمبر ۲۷ء سے نقل کی ہے۔

۵۔ ساقی نامہ (بال جبریل) کے چار شعر 'عشق کی آگ' کے عنوان سے رسالہ فردوس دسمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے

۶۔ ساقی نامے کے چار شعر 'زندگی' کے عنوان سے ہمایوں جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئے۔

۷۔ حصۂ دوم ص ۴۶ تا ۵۱ پر تین فارسی نظمیں ہیں جو ۳، ۷، ۱۰ فروری ۱۹۲۹ء کے انقلاب میں شائع ہوئیں۔

۸۔ ص ۸۳ پر ایک فارسی قطعہ ہے جس کی تاریخ ۲۴ جون ۳۵ء دی ہے اور جس کے بارے میں نوٹ ہے کہ اسے علامہ نے مسدس حالی کے صدی ایڈیشن کے لیے لکھا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں صدی ایڈیشن کیا معنی۔ یہ مسدس حالی کی نہیں ولادت حالی کی صدی ہے۔ حالی نے خود اپنی تاریخ پیدائش تقریباً ۱۲۵۳ھ م ۱۸۳۷ء لکھی ہے۔ ۱۹۳۵ء برابر ہے ۵۴-۱۳۵۳ھ کے گویا اس سال ہجری سنہ کے حساب سے حالی کی ولادت کو سو سال ہو رہے تھے۔

۹۔ بانگ درا ص ۳۱۷ پر ایک غزل کا مطلع ہے۔

جس کے دم سے دلّی و لاہور ہم پہلو ہوئے ؎ آہ اے اقبال، وہ بلبل بھی اب خاموش ہے

مخطوطے میں اس شعر کے بارے میں صراحت ہے کہ یہ آزاد (محمد حسین) مرحوم کے بارے میں ہے۔ آزاد کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ یہی اس غزل کی تاریخ ہونی چاہیے۔ یوسف سلیم چشتی نے شرح بانگ درا ص ۵۳۲ پر جو لکھا ہے کہ اس میں مرزا ارشد گورگانی کی طرف اشارہ ہے صحیح نہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ یہ غزل بانگ کے حصۂ سوم بعد ۱۹۰۸ء میں شامل ہے۔

۱۰۔ متعدد ظریفانہ نظموں پر عنوان دیئے ہیں جو فہرست مشمولات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ذیل میں نسخے کے مشمولات درج کیے جاتے ہیں۔ ان میں جو نظمیں یا غزلیں اقبال نے مجموعوں میں شامل نہ کیں ان کے پہلے منسوخ کا 'م' لکھ دیا جائے گا۔ میں نے فارسی کلام کا مطالعہ نہیں کیا، اس لیے میں فارسی چیزوں جو تعداد میں بہت کم ہیں، کے بارے میں طے نہیں کرسکتا کہ وہ منسوخ ہیں یا متداول۔ فہرست میں چھوٹے بریکٹ ( ) کے معنی ہیں کہ یہ نسخے میں ہے، میں اپنی صراحت بڑے بریکٹ [ ] میں درج کروں گا۔

| | صفحہ | | |
|---|---|---|---|
| ماہِ نو | ۹۰ | رات اور شاعر (ایک دلآویز مکالمہ) | ؛ |
| عبدالقادر کے نام | ۹۲ | م۔ دربارِ بہاولپور | |
| گلِ پژمردہ | ۹۳ | تقاضائے جنوں [بانگ کی غزل : زیرلبی ہی] | ۵ |
| غزل صحرا بھی چھوڑ دے | ۹۴ | شمع | ۱۰ |
| غرّۂ شوال یا ہلالِ عید | ۹۴ | قطعہ [بانگ میں عنوان 'نصیحت'] | ۱۰ |
| غزل... تماشا کرے کوئی | ۹۶ | لامکاں کا مکاں [بانگ میں 'سلیمیٰ'] | ۱۴ |
| نوا را تلخ تری زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی | ۹۷ | فلسفۂ غم | ۱۴ |
| [بانگ میں عنوان 'عرفی'] | | معراج کی رات [بانگ میں شبِ معراج] | ۱۶ |
| غزل آشیانے کے لیے | ۹۷ | م۔ غزل تم نے آغازِ محبت میں یہ سوچا ہوگا | ۱۷ |
| سحرِ حلال | | غزل اے بادِ صبا..... دنیا بھی گئی | ۱۷ |
| [بانگ میں غزل : انجمن آرائی کر] | ۹۸ | م۔ غزل دل کی بستی عجیب بستی ہے | ۱۸ |
| ۱۔ شام [ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے، کا بند' | ۹۹ | م۔ مفلسی [ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے' کا بند] | ۱۸ |
| مجموعے میں اس کے بعد ص ۱۰۰ پر عنوان ضمیمۂ کلام | | فارسی۔ ہندوستان کی نذر | ۱۹ |
| اقبال دیا ہے جس میں تین صفحوں پر مختلف نظموں | | (رسول اللہ کے دربار میں) | |
| کے بقیہ اشعار بغیر کسی عنوان کے دیے ہیں ۔] | | م۔ فارسی تقسیم ازل | ۲۰ |
| خطِ منظوم' کے بقیہ ۱۳ اشعار | ۱۰۰ | [ایہ پیچ میدانی .... شراب ناب درد] | |
| 'صبح کا ستارہ' کے بقیہ اشعار | ۱۰۰ | نظم سرگذشت آدم کے ۱۴ اشعر مکرر بغیر کسی عنوان کے | ۲۰ |
| 'کنجِ عزلت' (ایک آرزو) کے بقیہ اشعار | ۱۰۱ | م۔ وید کے ایک منتر کا ترجمہ | ۲۱ |
| نالۂ فراق' کا ایک بند | ۱۰۲ | دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں | ۲۲ |
| اس کے آگے پانچ سادہ صفحات ہیں۔ پھر | | [بانگ میں عنوان 'مسلم'] | |
| عنوان ہے، 'کلامِ اقبال ۱۲ء' اور نئے سرے سے | | م۔ برگِ گل | ۲۳ |
| صفحات کے نمبر ایک سے شروع ہیں۔ | | (بر مزارِ مقدس حضرت خواجہ نظام الدین اولیا) | |

صفحہ

ٹانک ۷۱ کلہ گو ہے خروش [ظریفانہ] ۸۳

غزل عجب واعظ کی دیں داری ہے یارب ۷۱ قطعہ اے لالۂ صحرا کہ خزاں دید بیفسرد ۸۳

کفر و اسلام (تضمین بر شعر میرزا رضی دانش) ۷۲ (۲۴ جون ۱۹۳۵ء)

غزل نہ دیوانہ وار دیکھ ۷۲ یہ قطعہ علامہ اقبال مرحوم نے مسدس حالی صدی ایڈیشن

مسلمان اور تعلیم جدید کے لیے لکھا تھا۔

(تضمین بر شعر ملک قمی) ۷۳ م فارسی۔ لسان العصر اکبر مرحوم

غزل دم کے سوا کچھ بھی نہیں [مکرر] ۷۳ م غزل۔ کیا مزہ بلبل کو آیا شیوۂ بیدار کا ۸۵

پھولوں کی شہزادی ۷۴ [آخر میں نوٹ ہے]

تضمین بر شعر صائب ۷۵ ماہ نومبر ۱۹۴۳ء زبان دہلی (بتوسط آج کل)

جرأتِ انفعال [ظریفانہ۔ وہ مس بولی] ۷۵ (۱۹ سال کی عمر بتلمذ حضرت داغ)

مذاہب ۷۶ محمد بشیر الحق دسنوی بہاری ہنفنٹر پولس آفس (بہار)

(تضمین بر شعر میرزا بیدل) م غزل جان دے کہ تمہیں جینے کی دعا دیتے ہیں۔

جنگ یرموک کا ایک واقعہ ۷۷ ماہ نومبر ۱۹۴۳ء زبان دہلی (بتوسطِ آج کل)

غزل۔۔ سبر پیرہن نہیں ہے ۷۸ پھر چند سادہ صفحات کے بعد ص ۹۲ پر عنوان ہے

غزل۔۔ فریب گوشش ہے ۷۹ ضمیمہ ملا (حصہ دوم)

[مقطع میں آزاد مرحوم کا ذکر] اور نظم 'برگِ گل' کے ۱۰ اشعار ہیں پھر تین سادہ صفحات کے

غزل ... اقبال غزل خواں ہو ۷۹ بعد فہرست مضامین ہے جو دو کالموں کے چار صفحوں پر ہے

[دلیل مردوفا۔ ظریفانہ۔ بانگ ص ۳۳۰] ۸۰ اور مرتب کے باریک قلم سے ہے۔

س کا حال ہے [ظریفانہ] ۸۰ یہ سا مخطوطہ سیاہ روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔

محاورہ میں شتر و گاؤ [ظریفانہ] ۸۰

---

بیاض

یہ رجسٹر کے سائز پہ ہے جس کی جلد کا چمڑا بہت کچھ چاک ہو گیا ہے۔ کاغذ کا رنگ ہلکا بادامی ہو گیا ہے۔ کاغذ

اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ ورق احتیاط سے نہ پلٹا جائے تو پھٹ جاتا ہے۔ صمد صاحب نے عماد الملک سید حسن بلگرامی کے کتب خانے کی کچھ کتابیں اور مخطوطات خریدے ان میں غالب کے کلام کا مخطوطہ بھی ہے جو عماد الملک کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے صمد کا کہنا ہے کہ اقبال کی بیاض کا خط بھی وہی ہے یعنی یہ بھی عماد الملک کے خط میں ہے۔

اس کے اندر کے صفحے پر نیلی پنسل سے بیاض لکھا ہے۔ اس کے بعد اقبال کے منسوخ دو غزلہ 'اہلِ درد' کی دوسری غزل ہے۔ ع صبر ایوب وفا خو، جزوِ جانِ اہلِ درد

اگلے صفحے پر کسی کی نہایت خوش گوار نظم ہے ع وہی تان پھر سنا دے مرے خوش نوا پپیہے

اس کے پیچھے نظم 'ہمارا دیس' (ترانہ ہندی) ہے جس کا ماخذ مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء ہے۔ پھر پانچ صفحات میں حالی، اکبر، ظفر، تپش اور رزمی کا کلام ہے۔ پھر پنسل سے صفحے کے نیچے پنسل سے اقبال کی منسوخ نظم 'غریبوں کا دنیا میں اللہ والی' درج ہے۔ اس کا ماخذ دیا ہے۔

مطبوعہ نیرنگِ خیال سالنامہ ۲۸ء

• قلمی کلام میں اسے نیرنگ خیال دسمبر ۲۷ء سے ماخوذ کیا ہے۔ باقیاتِ اقبال طبع سوم ص ۵۳۹ پر اسے ۱۹۲۷ء سے متعلق قرار دیا ہے۔ پنسل سے لکھی یہ نظم اس بیاض کا سب سے بعد کا اندراج ہے۔

ان ابتدائی صفحات پر نمبر شمار نہیں۔ ان کے بعد دو صفحات میں فہرست مشمولات ہے۔ پہلے بائیں صفحے پر لکھا ہے۔

مجموعہ

کلام اقبال

اس کے بعد پہلے اسی صفحے پر اور بعد میں دائیں ہاتھ کے صفحے پر فہرستِ مشمولات بے ترتیبی، بدسلیقگی اور عجیب گڈمڈ سے دیا ہے۔ اس کے آگے کے صفحے پر نمبر شمار ایک درج ہے اور اس کے بعد کلامِ اقبال درج ہے۔ صفحہ ۱۱۱ کے بعد دو ورق علٰحدہ ہیں۔ یہ غلط مقام پر رکھے ہیں۔ ان پر نمبر شمار بھی نہیں۔ ان چار صفحات میں جو شیرازہ بند ہیں نمبر نہیں دیے۔ ان کے آگے ص ۱۱۲ الکھ کر ص ۱۷۷ تک کلام نقل ہے۔ پھر دو صفحات سادہ ہیں اور آخری ورق پر بغیر عنوان کے قصیدہ در مدح بہادر شاہ درج ہے جس پر بیاض ختم ہو جاتی ہے۔

ص ۱۵۷ پر اقبال کی منسوخ نظم 'فلاحِ قوم' درج ہے۔ یہاں تک بیاض سیاہی سے لکھی گئی ہے اس کے بعد

ئے ہے نظم 'ایثارِ صدیق' اور 'طلوعِ اسلام' ہیں۔ اگلے پر پھر سیاہی استعمال کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ص ۱۵۰
پہلے کا کلام بانگ درا کی اشاعت سے قبل لکھا گیا۔ اس کے بعد 'ایثارِ صدیق' اور آگے کی جملہ نظمیں، دو ایک
ساتھ، بانگِ درا سے نقل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس نسخے میں کوئی ایسا شعر نہیں جو باقیات کے دوسرے مجموعوں
یا ہو لیکن اس سے کئی مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

- بانگِ درا کی نظم 'مسلم'، مجموعہ معارفِ ملت میں بھی شائع ہوئی۔
- بانگ کی نظم 'دریوزۂ خلافت' کا پرانا عنوان 'پولٹیکل گداگری' تھا۔
۴ - خضرِ راہ کے آخری بند کا نقشِ اوّل دیا ہے جو اور کہیں نظر نہیں آیا۔
۲۲ - 'خطاب بہ جوانانِ اسلام' کا عنوان 'پیامِ اقبال' دیا ہے۔
ع نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی، رسالہ خطیب مئی ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔
ب درا کی نظم میں اور تو ع نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا ..... کا عنوان 'ترانہ اقبال' دیا ہے۔
ظریفانہ نظموں کے عنوان دیے ہیں جو فہرست مشمولات میں ملاحظہ ہوں۔
۴ - گورستانِ شاہی کی شانِ نزول سے متعلق ایک نوٹ ہے۔
۵۰ - بانگ درا کی نظم 'اسیری' کا عنوان 'شہباز و شاہیں' دیا ہے۔
۵۲ - فارسی نظم بحضور تاجدارِ دکن کے سلسلے میں ایک نوٹ ہے جو رزاق کے کلیاتِ اقبال میں بھی نہیں۔
۷۶ ع بجلی کی زد میں آتے ہیں پہلے وہی طیور، کا عنوان 'فلسفۂ زندگی' دیا ہے۔
۷۷ نظم خضرِ راہ سے پہلے ابوظفر صاحب کا نوٹ ہے کہ "نظم حمایت اسلام کے جلسے میں سن کر لکھی گئی ہے۔
مگر نظم ابھی نامکمل ہے اور ڈاکٹر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ بعد از تکمیل نظم بہت جلد چھاپ دی جائے گی۔
...... ان کے حافظہ وذہانت کا کمال یہ ہے کہ یہ نظم زبانی پڑھی گئی اور ابھی اور بھی پڑھی جاتی لیکن بوجہ علالت
صاحب اس سے زیادہ نہ پڑھ سکے۔"

اس سے دو باتیں ظاہر ہوئیں۔ اول تو یہ کہ اقبال ابھی اس نظم میں اور اضافہ کرنا چاہتے تھے، دوسرے یہ کہ
نے جہاں تک تصنیف کر لی تھی، جلسے میں اتنی بھی نہ سنا سکے۔ لیکن بیاض میں نظم بالکل اتنی ہی ہے جتنی بانگِ درا

میں ملتی ہے۔ گویا شاعر کے مسودات میں اس کے مزید بند موجود ہوں گے۔ نظم کو اور آگے بڑھانے کا ان کا ارادہ تشنۂ تکمیل

۱۳ ص ۸۵۔ زمینوں میں ملکیتوں والی غزل 'صوفی' (پنڈی بہاء الدین کا رسالہ) میں شائع ہوئی جہاں اس کا عنوان "تشنۂ ماہ و کامیابی" ہے

۱۴۔ ص ۸۸۔ بانگ درا کی نظم 'پھول' معارفِ ملت سے لی جہاں اس کا عنوان "گل" ہے۔

۱۵۔ ص ۹۱۔ غزل 'دیدار یار ہوگا' کے بارے میں نوٹ ہے کہ معارفِ ملت جلد اول میں اس کا عنوان "مژدہ" ہے جبکہ ص ۲۲ پر اس کا عنوان 'نوید اقبال' دیا ہے۔

۱۶۔ ص ۹۴۔ بانگ کی نظم "عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں" کا عنوان ہلالِ عید ۱۳۲۸ھ دیا ہے۔ اس سے نظم کی تاریخ بھی معلوم ہوگئی۔ رزاق کی کلیاتِ اقبال میں اس کا عنوان 'شالامار باغ' ہے۔

۱۷۔ ص ۹۵ نظم سلیمی قدیم عنوان 'لامکاں کا مکاں' کے ساتھ درج ہے اور اسے رسالہ نظام المشائخ رجب ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) سے لیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے ہماری زبان یکم مئی ۱۹۸۰ء ص ۲ پر لکھا ہے کہ یہ غالباً پہلی بار رسالہ صوفی فروری ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔

۱۸۔ ص ۱۰۲ بانگ کی نظم آفتاب کا قدیم عنوان "آفتابِ حقیقت" دیا ہے۔

۱۹۔ ص ۱۰۳۔ نظم جگنو کے ساتھ پنسل سے نوٹ ہے کہ اقبال سہیل کی نظم اور الیاس برنی کی کتابیں دیکھیے۔

۲۰۔ ص ۱۰۶ 'دردِ عشق' العصر مارچ ۱۹۱۳ء سے نقل کی ہے۔

۲۱۔ ص ۱۰۸ 'زہد اور رندی' کے ساتھ پنسل سے نوٹ ہے کہ یہ قطعہ حالی کے ایک قطعہ کو جو اسی زمین میں ہے، دیکھ کر لکھا گیا ہے مجھے دیوانِ حالی میں اس زمین کا قطعہ نہ ملا۔

۲۲ ص ۱۱۰۔ 'اکبری اقبال' کے عنوان کی نظموں سے متعلق خواجہ حسن نظامی کا سوا صفحے کا طویل نوٹ ہے جس کے بعد فضل الٰہی مرغوب رقم کا نوٹ ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اقبال نے اس رنگ کی ایک نظم کا عنوان مذاعاً "رگڑا" رکھا تھا۔

۲۳ ص ۱۱۱ سے قدرے آگے بغیر نمبر کے ایک صفحے پر اقبال کی مقبولیت کے بارے میں چار نکاتی نوٹ ہے جن میں سے پہلے میں لکھا ہے کہ اقبال کا کلام ترکی اخبار تصویرِ افکار، جو قسطنطنیہ سے نکلتا ہے اکثر ترجمہ کر کے شائع کرتا ہے۔ ترجمہ پہلے فارسی میں اور بعد فارسی سے ترکی زبان میں ہوتا ہے۔ تیسرے نکتے میں بتایا ہے کہ اقبال دل ہی دل میں نظم کہتے یا مکمل کرنے کے بعد "جو پرزہ ہاتھ آگیا اسی پر لکھ دیتے ہیں۔ بہت بے پروا ہیں۔ کبھی پرچے محفوظ رکھتے ہیں۔ کبھی کہیں

پھینک دیتے ہیں۔ کبھی کسی کو دے دیتے ہیں۔"

۔ص ۱۳۸ 'ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے' کا پہلا بند 'ہلالِ عید' کے عنوان سے مخزن دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔

۔ص ۱۴۱۔ جلیان والا باغ' والے منسوخ قطعے سے پہلے نوٹ ہے کہ اقبال سے جلیان والا باغ کی یادگار قائم کرنے کے لیے چندہ مانگا گیا۔ انھوں نے مالی امداد کے بجائے دو شعر چندہ مانگنے والوں کی نذر کیے۔

۔ص ۱۶۱ 'بنائے قومیت' والی منسوخ رباعی رسالہ صوفی مئی ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔

ص ۱۷۷ نظم 'ایک خط کے جواب میں' کی تاریخ مارچ ۱۹۲۴ء دی ہے۔

ذیل میں فہرستِ مشمولات پہلے مخطوطے کے انداز ہی سے درج کی جاتی ہے۔ یعنی منسوخ چیزوں کے قبل 'م' لکھ دیا جائے گا اور میری صراحت بڑے بریکٹ [ ] میں ہوگی۔

## فہرست مشمولات

طفلِ شیرخوار

آفتابِ حقیقت [ بانگ: آفتاب]

م صدائے لیگ

جگنو [ ماخذ مخزن دسمبر ۱۹۰۴ء پنسل سے
نوٹ ہے: اقبال سہیل کی نظم اور الیاس برنی
کی کتاب دیکھو]

شمع و شاعر

دردِ عشق [ ماخذ العصر مارچ ۱۹۱۳ء]

فارسی حکایت سلطان مراد و معمارے از خجند
[ ایڈیٹر کا نوٹ ہے کہ حضرت اقبال نے لکھا ہے کہ
یہ نظم مثنوی اسرارِ خودی کے حصۂ دوم سے ماخوذ ہے
جو ابھی طبع نہیں ہوا]

زہد اور رندی
[ پنسل سے نوٹ ہے کہ یہ قطعہ حالی کے ایک قطعہ
کو، جو اسی زمین میں ہے دیکھ کر لکھا گیا ہے۔
مجھے دیوانِ حالی میں اس زمین کا قطعہ نہیں ملا]

م دنیا [ یتیم کا خطاب ہلال عید سے، کا بند]
ص ۱۱۰ پر خواجہ حسن نظامی کا ایک طویل نثری نوٹ
ہے "اکبری اقبال" کے بارے میں۔ اس کے ص ۱۱۱
پر "اکبری اقبال" کے عنوان سے ایک اور نثری نوٹ ہے
فضل الٰہی مرغوب رقم کا۔

۱۰۱ میں اور تو
۱۰۲ ص ۱۱۱ کے آگے چار صفحے علیحدہ سے رکھے ہیں جو ۱۱۱ کے سلسلے
۱۰۳ میں نہیں۔ ان میں پہلے صفحے پر نظم 'ایک آرزو' کے قدیم متن
۱۰۴ کے آخری چار شعر ہیں جس کے معنی ہیں کہ بقیہ اشعار
ان سے پہلے کے ورق پر درج رہے ہوں گے۔ واضح ہو کہ
یہ نظم ص ۶۰-۵۹ پر مکمل درج ہے۔ آگے کے دس صفحات پر
۱۰۵ نمبر شمار نہیں۔ ان کے بعد نمبر ۱۱۲ درج ہے۔
۱۰۶ غزل... تنہائی ہوا [ ص ۴۲ پر بھی ہے]
۱۰۷ سید کی لوحِ تربت
غزل... جدا کیونکر ہوا
غزل... کرشمہ دکھائیں ہم
پیامِ عشق [ نیاز ہو جا]
۱۰۸ جزیرۂ سسلی
آگے کے صفحے پر اقبال کی مقبولیت کے بارے میں
چار نکاتی نثری نوٹ ہے۔
ساقی
۱۰۹ تہذیب حاضرہ [ بانگ: تہذیب حاضر]
فارسی کے دو اشعار [ یہ عید اور بعید کا ایہام]
حسن و عشق
.... کی گود میں بلی دیکھ کر
تضمین بر شعر انیسی شاملو
فارسی غزل ہمہ وقت ناز کردن

| | | | |
|---|---|---|---|
| تضمین بر شعر صائب | | فارسی۔ نظارۂ ڈل کشمیر | ۱۳۶ |
| تضمین بر شعر ابوطالب کلیم | | فارسی غزل۔ تجربے دہم زمانے | ۱۳۶ |
| کفر و اسلام (تضمین بر شعر میر رضی دانش) | | انسان اور بزم قدرت | ۱۳۷ |
| نانک | | نالۂ فراق | ۱۳۸ |
| م۔ فریاد امت | ۱۱۲ | صدائے درد | ۱۳۹ |
| تصویر درد | ۱۱۹ | م۔ ماتم پسر | ۱۴۰ |
| اکبری اقبال (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۸) | ۱۲۷ | م۔ جلیان والا باغ | ۱۴۱ |
| م۔ دستور تھا کہ ہوتا تھا [ظریفانہ] | ۴۷ | فارسی۔ راز حیات [دو شعر] | ۱۴۱ |
| واعظ ہیں تنگ دست | ۱۲۷ | معراج کی رات [بانگ: شب معراج] | ۱۴۲ |
| فارسی۔ وفاداران سہ قسم | ۱۲۷ | غزل۔ نوائے زیر لبی لائی | ۱۴۲ |
| نظم فاطمہ کے بقیہ اشعار | ۱۲۷ | فارسی۔ الملک اللہ | ۱۴۲ |
| م۔ ہلال عید [ماخذ مخزن دسمبر ۱۹۰۴ء۔ ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے، کا بند] | ۱۲۸ | م۔ شمس العلما [بحث مسلم کی ... ظریفانہ] | ۱۴۲ |
| | | م۔ نکتہ دیکھیے چلتی ہے مشرق | ۱۴۲ |
| صبح کا ستارہ [ماخذ مخزن دسمبر ۱۹۰۴ء] | ۱۲۸ | م۔ غزل... یاد سحر کی صورت [ماخذ مخزن ۱۹۰۳ء] | ۱۴۲ |
| رام | ۱۲۹ | | |
| التجائے مسافر [سوا صفحات پر طویل نثری نوٹ۔ ماخذ مخزن اکتوبر ۱۹۰۵ء۔ منسوخ اشعار کو پنسل سے کاٹ لیا] | ۱۳۰ | م۔ مفلسی [ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے، کا بند] | ۱۴۳ |
| | | شفاخانۂ حجاز | ۱۴۳ |
| | | کنج تنہائی [بانگ: نالۂ فراق] | ۱۴۳ |
| بچہ اور شمع [ماخذ مخزن ستمبر ۱۹۰۵] | ۱۳۳ | خفتگان خاک سے استفسار | ۱۴۴ |
| گل رنگیں | ۱۳۴ | م۔ دین و دنیا [نوٹ ہے کہ اس نظم کے بقیہ اشعار ص ۱۵۰۔ ۱۴۹ پر ہیں] | |
| پھول | | | |
| فارسی۔ کلام اقبال [بنام ماگردید] | ۱۳۶ | ابر کہسار [نوٹ ہے کہ اس نظم کے ابتدائی اشعار | [illegible] |

| | | | |
|---|---|---|---|
| وصال | ۱۷۰ | چاند اور تارے | ۱۷۴ |
| کوشش ناتمام | ۱۷۰ | بزم انجم | ۱۷۴ |
| سیر فلک | ۱۷۱ | ایک مکالمہ | ۱۷۵ |
| اختر صبح [مکرّر] | ۱۷۱ | فردوس میں ایک مکالمہ | ۱۷۵ |
| انسان [قدرت کا عجیب یہ ستم ہے] | ۱۷۱ | جنگ یرموک کا ایک واقعہ | ۱۷۵ |
| انسان [منظر چمنستاں کے] | ۱۷۱ | پھولوں کی شہزادی | ۱۷۶ |
| موٹر | ۱۷۱ | تعلیم اور اس کے نتائج | ۱۷۶ |
| ساقی | ۱۷۱ | مسلمان اور تعلیم جدید | ۱۷۶ |
| عشرت امروز | ۱۷۲ | ایک خط کے جواب میں | ۱۷۷ |
| تنہائی [مکرّر] | ۱۷۲ | مارچ ۱۹۲۴ء | |
| قرب سلطان | ۱۷۲ | م قصیدہ [دربار بہاولپور ۔ ماخذ | ۱۷۸ |
| محاصرۂ ادرنہ | ۱۷۳ | مخزن ستمبر ۱۹۰۳ء دراصل | |
| مذہب [اپنی ملّت پر ۔ مکرّر] | ۱۷۳ | نومبر ۱۹۰۳ء ہونا چاہیے] | |
| مذہب (تضمین برشعر میرزا بیدل) | ۱۷۳ | دو فرد اقبال میرے نامہ ... شکست | ۱۷۹ |
| شبلی وحالی | ۱۷۳ | اثر تیرے ... لاہور تک پہنچا | ۱۷۹ |
| چاند [بانگ حصّہ سوم] | ۱۷۴ | | |

---

اس جائزے سے عنوانات کے بارے میں کئی باتیں سامنے آتی ہیں ۔

۱ ۔ اقبال نے رسالوں سے مجموعوں تک کے سفر میں اپنی بعض نظموں کے عنوانات کئی بار بدلے ہیں ۔

۲ ۔ اکبری رنگ کی مختصر ظریفانہ نظموں میں عبدالرزاق کی کلیات اقبال ، نانگ درا اور باقیات اقبال میں کہیں عنوان نہیں لیکن ان دونوں قلمی مجموعوں میں بیشتر میں عنوانات ہیں معلوم نہیں یہ رسالوں کے ایڈیٹروں نے دیے یا خود علامہ

۳ ۔ انور خاں کی بیاض میں چار اور عمادالملک کی بیاض میں دو غزلوں پر عنوانات دیئے ہیں ۔ یہاں بھی یہ واضح نہیں کہ

رسالوں کے مدیروں کی حرکت ہے یا خود شاعر نے ایسا کیا۔ باقیاتِ اقبال طبع سوم میں پانچ منسوخ غزلیں عنوانی نظموں کی بزم میں در آتی ہیں۔

نجانے اہلِ درد کی زمین کی دو غزلیں اہلِ درد کے عنوان سے نظموں میں دی ہیں۔ یہ تقلید ہے سرودِ رفتہ کی رزاقی کے کلیات کی غزل ع نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر۔ پر نعت عنوان دے کر نظموں جہانِ اقبال اور تبرکاتِ اقبال کی حسبِ ذیل دو غزلیں باقیاتِ اقبال میں عنوان دار نظمیں ہیں۔

نورِ توحید سے گر قوتِ بیدار ہے تو — خطاب بہ مسلم

چشمِ باطل پہ عیاں جوہرِ ایماں کر دے — جوہرِ ایمان

جب ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالرزاق کی کلیاتِ اقبال کی تین غزلیں بانگِ درا میں نظم بن گئی ہیں تو گمان ہوتا کہ غزلوں پر عنوان دے کر نظم سازی کا عمل خود شاعر ہی کا مرہونِ منت ہے۔ قلبِ ماہیت والی چیزیں یہ ہیں۔

۱۔ سن اے طلبگارِ دردِ پہلو، میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا — پیامِ عشق

۲۔ نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے — سرگذشتِ آدم

۳۔ کیونکر نہ وہ جہان کو پیغامِ بزم راز دے — اصلاح کے بعد 'پیام'

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے یہاں نظم اور غزل کی حدودِ فاصل منہدم ہوتی دکھائی دے رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ بالِ جبریل کی ابتدائی غزلوں پر نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔

(00)

---

باقی "تصور قومی یک جہتی اور جوش ملیح آبادی" صفحہ ۴۴ سے آگے

سہانے لمحے سمیٹ کر سو گئے۔ ان کے لحد کی خاک کا ہندوستان ہی کی جانب رخ ہے (اقوام) فضا میں آج بھی آزادی، انقلاب اور شباب کے نغمے جب بکھرتے ہیں تو ہمیں جوش کو فراموش کر دینا ناممکن ہی محسوس ہوتا ہے!

---

برش پرسی

# پروفیسر سروری اور "کشمیر میں اردو"

## (ایک مطالعہ)

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کی عمر بھی کوئی سو سوا سو سال کے آس پاس ہوگی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے جس کا عہدِ حکومت ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۷ء تک صرف دس برس رہا، ریاست جموں وکشمیر کی حکومت قایم کی اور سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر دہلی اور لاہور کے درباروں کے ساتھ ریاست کے تعلقات استوار کیے۔ اس زمانہ میں بھی وسائلِ معاش کی تلاش میں بہت سے مقامی لوگ ریاست سے باہر آنے جانے لگے اس باہمی اختلاط سے سیلانیوں اور تاجر پیشہ لوگوں کو مروجہ اردو سے جان کاری حاصل ہوی۔ چنانچہ اس کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ء – ۱۸۸۵ء) کا عہد اردو کی شروعات کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ مہاراجہ نے اپنے دربار میں عالموں اور فاضلوں کو جمع کیا یہ اگرچہ فارسی کے عالم تھے لیکن اردو زبان بولتے اور لکھتے تھے۔ ان میں دیوان کرپا رام کا نام خاص طور پر اہم ہے۔ جو علاوہ فارسی زبان میں دست رس رکھنے کے اردو زبان کا مزاج شناس تھا۔ اسی زمانے میں کئی سرکاری رپورٹیں اردو میں قلم بند ہونے لگیں اور اردو نثر و نظم کے لیے میدان ہموار ہوا۔ اس زمانے میں "بدیا بلاس" پریس کا قیام اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے فعال ثابت ہوا۔ جہاں سے "بدیا بلاس" نام کا سرکاری پرچہ شائع ہونے لگا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں پنڈت ہرگوپال کول خستہ جو کشمیری الاصل تھے، عرصہ دراز تک پنجاب میں رہائش کے بعد کشمیر لوٹے۔ خستہ، علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور پنجاب کے سررشتہ تعلیم کے

ڈائرکٹر کرنل ہالرائیڈ کی کارکردگیوں سے واقف تھے۔ وہ پنجاب میں رہنے کے سبب اُردو زبان وادب کے بدلتے ہوئے مزاج سے روشناس ہو چکے تھے۔ ریاست جموں کشمیر میں لوٹتے ہی وہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور اُردو کی خدمت گزاری میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد جب مہاراجہ پرتاپ سنگھ (۱۸۸۵ء۔۱۹۲۵ء) گدّی نشین ہوا تو وقت کہیں سے کہیں پہنچ چکا تھا۔ چناں چہ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر مہاراجہ نے ۱۸۸۹ء میں اردو کو سرکاری زبان کے طور پر قبول کرلیا۔ اس کا اور ریاستوں کے علاوہ علمی اور ادبی سطح پر بڑا فائدہ ہوا۔ ریاست کے باصلاحیت لوگ اس زبان کے توسّط سے ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی میں اپنا شاندار رول ادا کرنے لگے۔ اس زمانے سے لے کر آج تک برابر یہاں کے لوگوں نے اس زبان کو اپنی مادری زبان کی طرح سینچا اور اپنی علاقائی زبانوں یعنی کشمیری، ڈوگری اور لداخی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ چاہا ہے کہ اس زبان کی ترقی ہو کہ یہی ریاست جموّں وکشمیر میں رابطے کی زبان ہے اور اس کی بدولت یہاں کے لوگ ریاست کی کلچرل اکائیوں کے ثقافتی رشتے کو فروغ دے سکتے ہیں۔

ان سب حقایق کے باوصف جن کا ذکر ہو چکا ہے، شعر ونثر کے ساتھ ساتھ شروع کے برسوں میں تحقیق اور تنقید کے کارناموں کی تلاش بے سود ہے کہ اس میدان میں زبردست کدوکاوش، فکر ونظر کی گہرائی اور محققانہ دیدہ ریزی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں محمد الدّین فوقؔ، محمد عمر نور الٰہی، ڈاکٹر سید مسعود درما، عبدالاحد آزاد وغیرہ صرف چند نام ہیں جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، ان لوگوں نے اس صدی کے پہلے نصف میں اپنے کارنامے پیش کیے۔ اس فہرست میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کا نام ایک، اہم اضافہ ہے، جنھوں نے "کشمیر میں اردو" کے تعلق سے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے اسی سرزمین میں دفن ہوئے خوش گشتہ ہی اہم خزانوں کا پتہ لگایا اور بڑے سلیقے سے ان پر پڑی ہوئی دھول کو ہٹا کر سلسلے وار سجا کے محفوظ کرلیا۔ اس اعتبار سے سروری صاحب مرحوم کی یہ تصنیف جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اردو ادب پر ایک احسان سے کم نہیں ہے

اتنا ہی نہیں بلکہ کشمیر اور کشمیریات کا کوئی بھی سنجیدہ قاری اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

عبدالقادر سروری مرحوم برصغیر کے ان معتبر محققین اور ناقدین میں سے تھے جن کی زندگی کا ہر پل اردو علم و ادب کی خدمت گذاری میں صرف ہوا۔ ان کے اہم کارناموں میں دنیائے افسانہ (۱۹۲۷ء)، جدید اردو شاعری (۱۹۲۹ء)، کردار اور افسانہ (۱۹۳۵ء)، دنیا کے شاہکار افسانے (۱۹۳۴ء)، پھول بن (۱۹۳۹ء)، سراج سخن (۱۹۳۹ء) کلیاتِ سراج (۱۹۴۰ء)، اردو مثنوی کا ارتقاء (۱۹۴۰ء)، سراج اور اس کی شاعری (۱۹۴۱ء) زبان اور علمِ زبان (۱۹۵۶ء)، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ (۱۹۶۸ء)، کشمیر میں اردو (تین جلدوں میں ۱۹۸۱ء ــ ۱۹۸۴ء) اہم ہیں، جو ایک زمانے سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے بعض موضوعات پر ان کا کام بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا ہے جن پر سوچنے اور کام کرنے کی راہیں انھوں نے کھول دیں۔ کشمیر میں اپنے سات سال کے قیام کے دوران انھوں نے کشمیر کے تعلق سے کئی کارنامے انجام دیے۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، دو بھائی دو ادیب، تین جلدوں پر مشتمل "کشمیر میں اردو" ان کی دیدہ ریزی، لگن اور محققانہ جگر کاری پر دال ہیں۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ "کشمیر میں اردو" ہے۔

"کشمیر میں اردو" (حصہ اول) پس منظر کے طور پر لکھی گئی ہے۔ یہ حصہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں طبعی، سماجی، تہذیبی اور تاریخی پس منظر کے طور پر دو باب ملتے ہیں۔ اس کے بعد کشمیر میں مختلف زبانوں کے ادبیات کے ارتقا اور ان کے اہم کارناموں کا مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی، ڈوگری، پنجابی اور گوجری زبانیں شامل ہیں۔ عنوان کے اعتبار سے اس حصے میں براہِ راست اردو سے متعلق کوئی مواد نہیں ملتا۔ اس لیے اس حصے کا عنوان "تاریخِ ادبیاتِ کشمیر" ہونا چاہیے تھا جیسا کہ ابتدا میں سروری صاحب کا ارادہ تھا۔ اس طرح سے سروری صاحب کے قارئین کا اس جلد سے مایوسی قابلِ فہم ہے کہ اس میں کشمیر میں اردو کی تاریخ سے متعلق کوئی مواد نہیں ــــ لیکن چوں کہ یہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا نام کشمیر میں اردو ہے لہٰذا اس جلد کو لازمی طور پر اسی صورت میں قبول کرنا ہوگا۔ کتاب کے فاضل مرتب محمد یوسف ٹینگ

حرفِ آغاز میں رقم طراز ہیں:

"یہ جلد اصلی موضوع کے پس منظر کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے مطالعے سے کشمیر میں اردو کی نشو ونما کے سلسلے میں تہذیبی اور لسانی تناظر ذہن میں آتا ہے۔ دوادر جلدیں اس افسانے کا تکملہ ہیں اور وہاں زیادہ تفصیل اور گہرائی سے خامہ فرسائی کی گئی ہے۔"

اس رائے کے پیشِ نظر یہ جلد گوارا ہے۔ سروری صاحب نے جس محنت سے اس جلد کے لیے اپنا مواد اکٹھا کیا ہے وہ مستحسن ہے اور پس منظر کے طور پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ غنیمت ہے۔ اگرچہ یہ ابواب تشنہ ہیں لیکن چوں کہ یہ کتاب کا بنیادی موضوع نہیں ہے اس لیے اس پر اظہارِ خیال کی گنجائش نہیں۔ کتاب کے مسودے کو ترتیب دینے اور حواشی میں اضافہ کام محمد یوسف ٹینگ نے بطرزِ احسن کیا ہے۔ حواشی میں واقعاتی غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جس سے کتاب کی وقعت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے اور یہ تصنیف زیادہ معتبر ہو گئی ہے۔ ٹینگ صاحب نے حرفِ آغاز میں علاوہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے سروری صاحب کے اصل مسوّدے کے متن کو چھیڑے بغیر صرف واقعاتی غلطیوں کو حاشیوں کی صورت میں پیش کیا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے لیکن کئی جگہوں پر ایسا نہیں ہوا ہے۔ مثلاً "کشمیری زبان و ادب" کے باب میں بعض ایسے نام گنوائے گئے ہیں یا بعض ایسے کارناموں کا ذکر ہوا ہے جو سروری صاحب کے انتقال کے بعد منظرِ عام پر آئے ان کا ذکر حواشی میں کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا ہے حالاں کہ ایسا ہونا چاہیے تھا اس سے واقعاتی سطح پر کوئی نقصان نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہی ہوا ہے لیکن سروری صاحب کے اصل مسوّدے میں یقیناً تصرف ہوا ہے جس کا اعتراف کرنا لازمی تھا۔

ریاستی کلچرل اکادمی نے اچھی کتابت اور طباعت سے کتاب کو مزین کیا ہے۔

کتاب کی دوسری جلد میں ریاست میں اردو کے ابتدائی آثار سے نیے عہد تک مواد کو سمیٹا گیا ہے۔ سروری صاحب کی تصنیف کا یہ حصّہ جیساکہ اس کے فاضل مرتب محمد یوسف ٹینگ نے شروع میں لکھا ہے "تنقید سے زیادہ تاریخ اور تذکرہ ہے۔ یہ جلد

پہلی جلد کے مقابلے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس میں بعض پہلوؤں پر تفصیلی مباحث ملتے ہیں۔ سروری صاحب ماضی کے دھندلکوں میں ایک دیدہ ور کی طرح دور تک چلے گئے ہیں اور تاریکیوں میں ٹٹول ٹٹول کر راستہ کھوجتے رہے ہیں اور کتنے ہی لعل و جواہر سے اپنی جھولی بھرتے ہیں لیکن اس قیمتی سرمائے کی ترتیب میں بعض اوقات عدم توازن کا احساس ہوتا ہے۔ کئی جگہوں پر معمولی سی معمولی بات کو اس قدر طول دیا ہے کہ دامنِ صبر تار تار ہوتا ہے بعض مقامات پر تفصیل نہ ہونے کے برابر ہے اور سروری صاحب کے بیان میں ایک لڑکھڑاہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ کئی جگہوں پر واقعاتی غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں اور کہیں کہیں بیانات میں تضاد نظر آتا ہے۔
مثال کے طور پر ایک جگہ پریم ناتھ پردیسی کا فرضی نام علامہ صدیقی سانبوی بتاتے ہیں اور دوسری جگہوں پر یہ نام دینا ناتھ دلگیر کو دیتے ہیں۔ نند لال بے غرض کے رتن ناتھ سرشار کے تتبع میں لکھے ہوئے ناول " تازیانۂ عبرت " کو ان کا مجموعۂ کلام قرار دیتے ہیں۔ صاحبزادہ محمد عمر نوراللہ کے ناٹک ساگر اور ان کے ڈراموں پر صفحوں کے کے صفحے سیاہ کرتے ہیں لیکن ان کے اہم کارنامے امانت کی " اندر سبھا " کا کوئی ذکر نہیں کرتے جسے پہلی بار مرتبین نے سینوں اور ایکٹوں میں تقسیم کیا ہے اور حواشی اور مقدمے کے ساتھ ایک نئی صورت دی تھی۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانے پر بات کرتے ہیں تو پریم ناتھ پردیسی کے سر پر اولیت کا تاج رکھ دیتے ہیں اور چراغ حسن حسرت کو بھول جاتے ہیں۔ جن کا افسانوی مجموعہ "کیلے کا چھلکا" اور دیگر افسانے" بہت پہلے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔ افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہیں تو صرف اس دور کے چند افسانہ نگاروں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جن کا مواد انھوں نے مارتنڈ کی فائیلوں سے لیا تھا۔ جموں کو یکسر نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ اس دور کے اُبھرنے والے اہم افسانہ نگار پریم ناتھ در کا بھی ذکر نہیں کرتے۔ ان کے یہاں اسی دور کے دوسرے اہم افسانہ نگاروں مثلاً گلزار احمد فدا، کوثر سیمابی، اخگر عسکری، کیف اسرائیلی، عبدالعزیز نظامی وغیرہ کا کوئی ذکر بھی نہیں ملتا جو اس صدی کے چوتھے دہے میں افسانوی ادب کے میدان میں اہم کارنامے انجام دے رہے تھے۔ ناول نگاری پر آتے ہیں تو صرف نرسنگھ داس نرگس کی پاربتی کا ذکر کرتے ہیں۔ بسمل کے ناول "پلوتی"

کوئی ذکر کہیں پر نظر نہیں آتا۔ وہ مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (یا سید حیشور در سا؟) تصنیف "آریائی زبانیں" کا بھی کوئی ذکر نہیں کرتے۔ ان کے یہاں قدرت اللہ اور ابو سعید قریشی کا ذکر بھی نہیں ملتا جو اس دور کے آس پاس کشمیر سے باہر اردو خدمت گزاری میں مصروف تھے۔ اس کے بجائے وہ مضمون نگاروں میں متھرا داس مہارانی اور ریاست کے کئی قایدین کا ذکر اردو نثر کی ترویج اور اشاعت کے ضمن میں کرتے ہیں جن کا تحریری سطح پر اردو نثر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اخبارات کے کالموں سے جو کچھ ان کو دستیاب ہوا وہ بلا کسی تخصیص کے کتاب میں درج کرتے رہے۔ سروری صاحب کی تصنیف کی اس جلد میں سنین بھی تعین نہیں ملتا۔ یہ بات حتمی طور پر معلوم نہیں ہو پاتی کہ جس دور کی وہ بات کر رہے وہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ادبا اور شعرا کا ذکر پہلے ہونا چاہیے تھا وہ کتاب کے آخر میں آگئے ہیں۔

اس کتاب کی تیسری جلد آزادی اور آزادی کے بعد چھٹے دہے تک کی ادبی کارگزاریوں، ادیبوں، شاعروں اور اردو کے خدمت گزاروں کا احاطہ کرتی ہے۔ سروری صاحب نے بڑی محنت اور محققانہ کد و کاوش سے کئی کارناموں کو سامنے لایا۔ لیکن یہاں بھی ان سے کئی مقامات پر چوک ہوئی ہے۔ انھوں نے ہر اس تحریر کو ادب سمجھا ہے جو انھیں کسی اخبار یا پرچے میں ملی ہے، چاہے وہ کسی سیاسی لیڈر کی کوئی تقریر ہے جس کی رپورٹ کسی مقامی اخبار میں چھپی ہے یا کسی سرکاری افسر کی طرف سے شائع ہوئی کوئی محکمانہ رپورٹ۔ اس کی طرف کتاب کے ترتیب کار نے مناسب طور پر اشارہ کیا ہے۔

لیکن ان معمولی خامیوں کے باوجود اس تصنیف کی افادیت مسلم ہے۔ اس تصنیف کی ترتیب اور تدوین کے دوران راقم السطور کو بھی بر اعظم کے اس معتبر محقق کے ساتھ جگہ جگہ گھومنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ راقم نے انھیں ایک تشنہ لب کی طرح پا پیادہ گلی گلی گھومتے اور برس ہا برس کی پرانی دیمک خوردہ اخبارات کی فائلیں چھانتے بزرگ باکمالوں یا ان کے لواحقین سے ملتے دیکھا ہے۔ انھوں نے جس طرح زمانے کے

سفاک ہاتھوں میں پامال اور ریزہ ریزہ جواہر پاروں کو اکٹھا کیا اور ان پر سے ناقدری کی دھول ہٹا کر شفاف آئینہ خانے میں سجا دیا وہ ان پر ختم ہے۔ انھوں نے ایک سچے مخلص اور دیانت دار محقق کی طرح اپنے منصب کو نبھایا اور اس ڈھلتی ہوی عمر میں پورے محققانہ شعور اور فکر و نظر کی وسعت کے ساتھ اس اہم فریضے کو انجام دیا۔ وہ اس تصنیف کی جلد سے جلد تکمیل کرنا چاہتے تھے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ ان کے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے غالباً انھوں نے مسودے پر نظر ثانی بھی نہ کی اور کتاب کی تکمیل کے ساتھ ہی ان کا انتقال ہوا۔ سروری صاحب کی خواہش تھی کہ وہ کتاب کی تصحیح ساتھ ساتھ کرتے جائیں جس کی طرف ٹینگ صاحب نے یوں اشارہ کیا ہے:

> " سروری صاحب اس کتاب کی تکمیل کے بعد بھی اپنی جستجو اور آرزو کے ہاتھوں ایک سچے محقق کی طرح ناصبور تھے اور اس میں برا برا اضافے اور درستی کا عمل جاری رکھے ہوے تھے۔ اس کے پیچھے یہی جذبہ تھا کہ آخر وقت تک وہ تازہ بہ تازہ معلومات اور استفادے کے نتائج متن میں پیوست کر سکیں۔"

لیکن موت نے ان کو فرصت نہیں دی۔ بہرکیف سروری صاحب نے اُردو ادب پر ایک احسان ضرور کیا ہے کہ ایسے نایاب دفینے کو زمانے کی دست برد سے محفوظ کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو کی بلکہ کشمیر کی بھی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی ہے۔ کتاب کے آغاز میں محمد یوسف ٹینگ کا بصیرت افروز مقدمہ اپنا ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس سے بہت سی دشواریاں دور ہو جاتی ہیں۔ حواشی قابلِ قدر ہیں جن سے کتاب کے وقار اور اعتبار میں اضافہ ہوا ہے۔

بارہ سو صفحات پر تین جلدوں میں پھیلی ہوی کشمیر میں اردو کی یہ داستان دیدہ زیب کتابت اور طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آگئی ہے۔ یہ تصنیف بلاشبہ ہمارے ادبیات میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کی کلچرل اکادمی نے ایسی گراں قدر کتاب شائع کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کشمیر میں اُردو کے حوالے سے جب بھی کوئی کام ہوگا اس کتاب کے صفحات پر بکھری ہوی بے شمار قیمتی معلومات سے روشنی ملتی رہے گی۔ ❊

پروفیسر گوپی چند نارنگ

# تنہائی کی شاعرہ

صدیقہ شبنم کا تعلق حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے ہے۔ ایک عرصے سے وہ لندن میں مقیم ہیں، عبدا
کی بیگم ہیں (جن کی کتاب "انگلستان میں" علمی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے) اور دانش گاہِ عثمانیہ کے
اور شاعر پروفیسر مغنی تبسم کی ہمشیرہ ہیں۔ گویا ابتدائی ماحول بھی اُردو کا ملا اور سسرال میں بھی اُردو کا چرچا
ملا تو وہ بھی اردو کا ادیب اور شاعر، چنانچہ اگر وہ شعر نہ کہتیں تو تعجب کی بات تھی۔ لیکن وہ اس طرح کی رسمی شا
جس طرح کی خواتین شعرا سے آئے دن مشاعروں میں واسطہ پڑتا ہے۔ صدیقہ شبنم کے لیے شعر گوئی اظہارِ ذات
جس کے بغیر شخصیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ فکر و اظہار کی باریکیوں کو وہ خوب سمجھتی ہیں اور جو کچھ کہتی ہیں سنجیدگی او
سے کہتی ہیں۔ "تنہائی" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے —— یہ ایک ایسی شاعرہ کا کلام ہے جس نے لفظوں
نور کاڑھنے میں ایک عمر صرف کی ہے، اور زیادہ تر اشعار چوں کہ اُردو کے سوادِ اعظم سے باہر رہ کر کہے گئے ہیں
اور دوری کی وہ تڑپ ہے جو جوانی کے احساس اور مغرب کے بے مہر معاشروں کی دین ہے۔ یہاں کی رنگینیوں کو
ہیں۔ ان کے باطن کی آواز اسے دشتِ اضطراب سے تعبیر کرتی ہے۔ ایسے بے روح خرابے میں جہاں پتھر کا
اور پتھر کا جہاں ہو، کسی کو صدا دینا خود کو فریب میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے:

پتھر کے ہیں انسان، یہ پتھر کا جہاں ہے
اب ایسے خرابے میں بھلا کس کو صدا دیں

---

دہر کی رنگینیوں پہ دام کا دھوکا ہوا
مجھ کو اپنی ہر سحر پہ شام کا دھوکا ہوا

اس دشتِ اضطراب کی تنہائیاں نہ پوچھ ۱
ڈھونڈھے سے بھی ملا نہ کوئی آ د می مجھے

تبسم کا شعری مزاج ظاہری صورتِ حال کے بیان پر قناعت نہیں کرتا۔ ان کی ذہنی اُفتاد کچھ اس نوع کی ہے کہ دنیا ...سے پرے دیکھنا چاہتی ہیں۔ کارخانۂ قدرت کا سب سے بڑا رمز محبت ہے۔ ان کی شاعری انسانی رشتوں اور محبت ...ٹے بٹے حال بنتی ہے، سطحی رومانی اظہار نہیں کرتی بلکہ رشتوں اور جبر کی نوعیت پر غور کرتی ہے اور احساس کی تازہ سطح کو چھونا چاہتی ہیں۔ انسان کی فطرت میں یک گونہ تضاد ہے جو رشتوں میں ربط کا باعث بھی بنتا ہے اور تناؤ بھی ...بنتا ہے۔ یہ ربط و تضاد مٹی کی محبت میں بھی گرفتار کرتا ہے اور سمندر کے بلاوے میں بھی کشش پیدا کرتا ہے۔ ہر تعمیر میں ...ن کی صورت مضمر ہے۔ تمنا پیدا ہی اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی تمام و کمال تکمیل نہ ہو۔ وہ آرزو ہی کیا جو پوری ہو جائے ...ن درد کے سایوں میں گھرا ہوا ہے جو ہر موڑ پر تمنا کی صلیبیں اُٹھائے سامنے آجاتے ہیں۔ ایسے میں زندگی کا تقاضا ہے ہر لمحۂ گریزاں سے آبِ حیات اخذ کیا جائے۔

ٹوٹ کر اندر سے بکھرے اور پھر جل تھل ہوئے
ہم بچھڑ کر تجھ سے اتنا روئے کہ یا دل ہوئے

---

رشتۂ درد کا احساس دلاتا ہے مجھے
یاد آتا ہے تو پہروں وہ رلاتا ہے مجھے
یہ بھی سچ ہے کہ ہے مٹی سے محبت مجھ کو
اور کہیں دور سے دریا بھی بلاتا ہے مجھے

---

ہاتھوں میں تمنا کی صلیبوں کو اٹھائے
ہر شام چلے آتے ہیں یہ درد کے سائے

---

وقت کم ہے کچھ کہو پھر اَن کہا رہ جائے گا
زندگی بھر دل میں ورنہ وسوسہ رہ جائے گا

اس کوشش کی ایک جہت وہ بالیدگی ہے جو سچی لگن اور وابستگی کا حاصل ہے۔ ان اشعار کی کیفیت ملاحظہ ہو۔

نفرت بھی اسی کی ہے محبت بھی اُسی کی
سوغات ہے یہ درد کی دولت بھی اُسی کی
یہ لمحہ بھی اس لمحے کی مہلت بھی اُسی کی
جو دید سے محروم وہ ساعت بھی اُسی کی
جس درد کے صحرا کا یہ منظر ہو نظر میں
درپیش ہے اک عمر مسافت بھی اُسی کی
بے چہرہ ہوئے آج مگر کس سے شکایت
آئینہ اسی کا ہے تو حیرت بھی اُسی کی

جذبات و احساسات کا یہ ترفّع کہیں کہیں پورے حقائقِ انسانی پر محیط ہو جاتا ہے۔ صدیقہ شبنم سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، ان کے فکری احساس نے جہاں اشعار کو دھار دے دی ہے، کلام کا لطف و اثر بڑھ گیا ہے۔ تخیّل کی ایک جست میں انسان چاہتا ہے کہ وہ آرزو گہہ حدود و عرصہ گہہ ذات سے گزر جائے اور ہو سکے تو دور بہت دور خلاؤں میں بکھر جائے، لیکن منزل معلوم نہیں اور مستقبل امید موہوم کے کچے تاگے سے جڑا ہوا ہے۔ شاعر حیرت زدہ ہے کہ بے نام منزلوں کی تلاش میں صدیاں صرف ہو گئیں لیکن سفر ابھی ناتمام ہے۔ اس طرح آئینہ خانۂ قدرت میں جو نقش ابھرتا ہے وہ نقشِ حیرت کی طرح ہے جہاں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔

صدیقہ شبنم کی شاعری میں جذبہ و احساس کی ارضیت اور فکر کی صلابت اور سنجیدگی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے سلیقے سے زبان کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کہا ہے۔ جس میں تاثیر بھی ہے اور دل کشی بھی۔ میں ان کے پہلے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر انھیں مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اپنے شعری سفر میں وہ کسی سمجھوتے کو راہ نہ دیں گی۔

۵۵۰

## صدیقہ شبنم

طے یہ پایا ہے کہ اب دھیان نہ گھر میں رکھنا
ہے جو درپیش سفر پاؤں سفر میں رکھنا

کوئی بھٹکا ہوا راہی کبھی آجائے یہاں
اک دیا جلتا ہوا شام سے گھر میں رکھنا

خواب تعبیر کے صحرا میں بھٹک جاتے ہیں
تم نہ خوابوں کو دعاؤں کے اثر میں رکھنا

ایک رت اور بھی آئے گی جدائی کی یہاں
چند اشکوں کو ابھی دیدۂ تر میں رکھنا

دوست سب کے تھے جو انجان سفر پر نکلے
تم جو چاہو تو یہ سرخی بھی خبر میں رکھنا

★

حدود و عرصۂ گہرِ ذات سے گذر جائیں
خلا میں دُور نہ بہت دور تک بکھر جائیں

ہزار نغمے سرِ راہِ غم ابھر جائیں
تمہاری یاد کے لمحے جدھر جدھر جائیں

چلو کہ وقت کے چبھتے ہوئے اندھیروں سے
سحر کا، پیار کی خوشبو کا ذکر کر جائیں

کبھی گذر نہ ہو شاید تو اجنبی کی طرح
تمہارے شہر سے چپ چاپ ہی گذر جائیں

تلاشِ منزلِ خوشبو کی راہ میں شبنم
نہ جانے کتنی بہاروں کے خواب مر جائیں

★

## صدیقہ شبنم

ہونٹوں پہ ہنسی ایک علامت کی طرح ہے
آنکھوں میں نمی رنگِ طبیعت کی طرح ہے

گفتار کا انداز حلاوت کی طرح ہے
اس شخص کی ہر بات محبت کی طرح ہے

یہ آئینہ خانہ ہے عجب شیشہ گرو! یاں
جو نقش ابھر جائے وہ حیرت کی طرح ہے

برسوں سے یہاں ساتھ مرا اور تمہارا
جینے کے لیے ایک ضرورت کی طرح ہے

مدت سے مرے دل میں کھٹکتی ہے جو شبنم
کچھ بات تو ہے جو کہ اذیت کی طرح ہے

○

تابندہ لگا ہوں میں نئے غم کی ضیا سے
پھر وقت کی آنکھوں میں نیا خواب سجا ہے

ہر دم جو مرے ساتھ ہے، یہ کون ہے کیا ہے
مدت سے مری ذات کے اندر جو بسا ہے

تنہائی میں اکثر مجھے محسوس ہوا ہے
جیسے کوئی پیچھے سے مجھے دیکھ رہا ہے

وہ لمحۂ شاداب سپردہ جو ملا تھا
دل اس کی مسرت ابھی جھوم رہا ہے

اک منزلِ موہوم کی امید میں شبنم
اس دور کا انسان خلاؤں میں گھرا ہے

○

غیاث اقبال

# تصورِ قومی یک جہتی اور جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی کے ہاں قومی یک جہتی کا مفہوم اور اس کی جہتوں کی ماہیت کافی گنجلک نوعیت رکھتی ہے اس لیے کہ ادیب انسان کے ظاہر سے زیادہ اس کے اندرون کو اپنا میدانِ عمل بناتا ہے اور اس سے انسانی اذہان کا کشش جہتی ہونا ثابت ہے۔

جوش کی SPLIT PERSONALITY "ایک ہے آگ اور ایک ہے پانی" کی عملی تاویل اور سرشت کا اظہار کرتی ہے۔ ایک ساعتِ منتظرِ انقلاب کی للکار کا شب خون مارتی ہے تو دوسری ساعتِ طویل شباب اور اس سے منسلک لوازمات اور فرحت بخش کیفیتوں کا ماحول بنا دیتی ہے جو ان کے تصورِ قومی یک جہتی کے عناصرِ ترکیبی کے ارتکاز اور ان کی تحدید میں موانعات کے موجود ہونے کا سا منظر پیش کرتی ہے مگر ان کی نظموں کے عنوانات اور موضوعات کے مزاج کی تہہ میں جو المیہ سطح موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے' اس کی بازیافت ہی ان کے قصرِ ذہنی اور اس سے متصل قومی یک جہتی کے تصور کو وا کرنے کی کلید ہے۔ یہ ذہنی تناظر ہی اس مقالے کی بنیاد ہے۔

لفظ "یک جہتی" سے بذاتِ خود ایک متحرک سی کیفیت متبادر ہوتی ہے اور تحریک یا حرکت کا "مرکزِ ثقل" نصب العین" ہے جو حرکت کی جہتوں کا تعین کرتا ہے۔ آندرے مالرو کا یہ کہنا سچ ہے کہ "انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا تعین عمل سے ہوتا چاہیے اور عمل کا پیمانہ افادہ نہیں بلکہ "نصب العین" کی بلندی ہے۔ ظاہر ہے کہ نصب العین اقدارِ معاشرہ کی بنیادوں پر اُستوار ہوتا ہے اور معاشرے کی قدروں تک سب سے اہم ترین قدر جوں کہ انفرادی اور اجتماعی آزادی کا حصول ہے' ادیب اور

شاعر اس آزادی کے پیغامبر ہوتے ہیں۔ چناں چہ جوشؔ کے ذہنی ارتقا کی نوعیت اور اُن کا ذہنی سماج اس تناظر کے ہیولے میں ترتیب پاتا ہے۔

"انقلاب" ہو کہ "شباب" ایک بنیادی کیفیتِ ذہن کے نہ صرف دو رُخ ہیں بلکہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ مُطلق "انقلاب" انسانی وجود کے مغائر ہے جب کہ مطلق شباب ذہنی قلاشی کا پرتو۔ انسانی ذہن کی یہ دو کیفیتیں جب تک توازنِ اندرون قائم نہ کر سکیں گی، انسانی معاشرہ صحت مند سے مُبرّیٰ ہو گا جس میں ادب یا فنونِ لطیفہ عنقا ہوں گے۔ پھر جوشؔ نے شباب انقلاب کو ایک سی اہمیت دی ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ شباب ذہنی قوت کا نقطۂ عروج ہے یا عمل کی تمہید۔ جب کہ انقلاب اس قوت سے وقوع میں آنے والا ردِ عمل۔ یہ ایک ایسا ردِ عمل ہے جو یک جہتی کی راہ میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل بھی تلاش کرتا ہے۔

یک جہتی کا تصور سیاسی مسائل تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ انسانی زندگی کی وُسعتوں کے پیشِ نظر بہ ہر لمحہ یکجہت ہو جانے اور قوت و حیات کی تفہیم کے نہ صرف استحصال بلکہ ابدی مفاد کی تخلیق کرتا ہے۔ نفسیاتی، معاشرتی، معاشی، لسانی اور تہذیبی اعتبار سے بھی یک جہتی کے مسائل ہیں۔ رواداری، تحمل، وسیع القلبی کو اپنانا اور منطقی استدلال کو جذباتی محرکات سے دُور رکھنا یہ ایسی باتیں ہیں، جو ان مسائل پر سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

جس طرح طنز و مزاح کے باب میں تلخیوں کا بیان تقلیب سے کیا جاتا ہے اسی طرح شباب کا جذبہ بھی انقلاب کے لیے انسانی ذہن کو متحمل بنانے کا ذریعہ بلکہ انقلاب کو خوش آمدید کہنے کا سلیقہ ہے۔ چناں چہ انقلاب لانے کے لیے شباب یعنی قوتِ ارادی اور ایک گونہ بے خودی کی ضرورت ہے اور جوشؔ شباب انقلاب کا ہی فلسفہ ادب ہے جو انھیں ایک بٹی ہوئی شخصیت کی طرح پیش کرتا ہے۔ حقیقت میں ان کی ادبی شخصیت منظم ہے اور ان کی شاعری کا لہجہ ایک تنظیم ہی کا مرقع ہے۔ دراصل جوشؔ کے ہاں "شباب" ایک ماندگی کا وقفہ جس کے بعد فردِ انقلاب کی کیفیتوں سے مکمل طور پر منسلک ہو سکتا ہے۔ ان چند

...بضات کی روشنی میں جوش کے قومی یک جہتی کے تصور کی تفہیم ممکن ہے۔

جوش کے ہاں عمومی طور پر یک جہتی سے اور مخصوصی طور پر قومی یک جہتی جس قدر اُنس تھا اس کا اظہار ان کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مثلاً یہ ...ں ملاحظہ فرمایئے :

بے ربط ہے اہلِ بمبئی کا کردار　　ہم رشتۂ بمبئی ہے پیوستہ یسار!
رہتے تو ہیں ایک گھر میں لیکن اس طرح　　آپس میں ہوں جس طرح غزل کے اشعار

شاید یہی وجہ تھی جس کی بنا پر جوش کو غزل کی صنف غیر فطری محسوس ہوئی اور ...الدین سلیم کے "قہقہوں کے بعد" تو انھیں نظموں کی جانب نخلستان نظر آیا' ...کا تذکرہ انھوں نے "روحِ ادب" کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔

چناں چہ ان کے ارتقاءِ ذہنی کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جوش کو ابتدا ہی ...ایک مسلسل آہنگ اور ربط و ضبط کی تلاش رہی ہے جو بذاتِ خود قوت و حیات ...بطِ باہم سے ہمکنار کرنے کا سلیقہ ہے اور یکجہت ہو جانے کے جذبے کو سربلند ...نے کا عزم۔ شاعرِ انقلاب نے 'کتب خانہ' میں بھی اپنی یک جہتی کے جذبے کی ...ش جاری رکھی ہے اور اس کی نظریں یک جہتی کے عناصر کی متلاشی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

تجھ میں ذکر و فکر کے بیت الصنم موجود ہیں
آگہی کے دَہر، حکمت کے حرم محفوظ ہیں
مطربانِ زندگی کے زیر و بم محفوظ ہیں
کاروانِ رفتہ کے نقشِ قدم محفوظ ہیں

جس میں ہر ملت کی موسیقی ہے، تو وہ ساز ہے
تیری خاموشی زباں، تیرا سکوت آواز ہے

اے بباطن بے نہایت، اے بظاہر مختصر
کاشفِ حرف و حکایت، کعبۂ علم و ہنر
اے حریمِ اہلِ دل، اے قبلۂ اہلِ نظر
اے خموش افسانہ خواں، اے بے زباں پیغام بر

وقت کا ہر گوشہ روشن ہے ترے دربار میں

ہر نفس اک رجزِ اکبر ہے تیری سرکار میں

(سموم و صبا ص ۲۳-۲۲)

ہندوستان کی سیاسی بیداری اور سیاسی آزادی کے حصول کے کوششیں زوروں پر تھیں مگر دو قومی نظریہ کی اچانک نمود نے ہندوستان محاذِ آزادی کو طبقوں میں بانٹ دیا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ ذہن رکھنے والے افراد کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ دو قومی نظریہ تفصیلات کے قطع نظر یہ حقیقت ثابت ہو چکی تھی کہ یہ نظریہ زور پکڑ چکا ہے کسی بھی صورت تحلیل ہونے سے رہ جائے گا۔ اب اسلئے پاؤں چلا نہیں جا اس کے پیشِ نظر ہندوستان کی سیاسی بیدار ذہنی کا نصب العین تو آزادی حصول تھا اور یہ سراب کی سی کیفیت اپنا رہا تھا۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جوش سیاسی آدمی نہیں تھے۔ بایں ہمہ وہ سیاسی ملکی مسائل سے بے نیاز بھی نہیں تھے۔ وہ اپنی افتادِ طبع کے باعث سیاسی امور دلچسپی رکھتے تھے اور تحریکِ آزادی سے ان کی وابستگی صرف جلسوں کی شرکت اور سیاسی شخصیتوں سے دوستی کی حد تک ہے۔ لیکن فکری اعتبار سے وہ تحریک سے قریب رہے۔

جوش نے مختلف الخیالی کو ختم کرنے اور مفاہمت کا جذبہ بیدار کرنے کی جو کوششیں کیں، اس کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا تھا جس کا "وقت کی آواز" (۱۹۴۵ء) انھوں نے مفصل ذکر کیا ہے۔ اس نظم میں جوش نے ہندوستان کو ماں روپ اور تصور دیا ہے جو اپنے بیٹے بیٹیوں کو آواز دے رہی ہے کہ وقت کی آواز پر کان دھرو اور متحد ہو جاؤ۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ تاریخی جبر کے آگے افراد کے عزائم اور ان کی مستقل مزاجی کے قدم بوجھل ہو جاتے ہیں۔ فرد کے سنبھلنے تک وقت کی قوتیں کربِ انتظار کی متحمل نہیں ہوتیں۔ "وقت آواز" نظم کے چند بند ملاحظہ فرمایئے:

کچھ کہہ رہی ہے مادرِ ہندوستاں، خموش

ماں کے قریب آؤ اگر تم سپوت ہو

میرے تو ہیں تین چمکتے ہوئے نگیں  اک کانگریس کہ ہے وہ پلوٹھی کی نازنین
اور لیگ اس کی پیٹ کی بچی قمر جبیں  اور کمیونسٹ ہے مرا فرزندِ نکتہ بیں

مادرِ ہند کانگریس سے کہتی ہے :

تو کوستی ہے بھائی کو اور وہ بھی بے سبب،
خود سوچ کیا ملے گا تجھے اس کو کوس کے  تو نے بڑا کیا ہے جسے پال پوس کے
کیوں ہیں ترے نقوشِ محبت مٹے ہوئے  بہنوں کی چاہ کے تو ہیں ڈنکے پٹے ہوئے

و میٹھے لہجے میں شفقت سے کہتی ہے :

ہو جائے پھر ملاپ بہن اور بھائی میں  اٹھ اور راکھی باندھ دے اس کی کلائی میں
کہتی نہیں کہ لعل و گہر اس کو بخش دے  جو گھر وہ مانگتی ہے وہ گھر اس کو بخش دے
جس سے کہ دیدے لال ہیں اور منہ طباق ہے  ایسے نگوڑے وصل سے بہتر فراق ہے
تو میری چاہتی ہے تو یہ میری بات مان  ہوتا ہے جڑ فساد کی مشترکہ خاندان
تو چاہتی ہے دونوں کا ہو ایک ہی مکان  وہ سونا جائے بھاڑ میں جس سے کہ ٹوٹیں کان
ہو گی جدا تو ہوگا مزے سے نباہ بھی  نکلے گی تم میں اس سے محبت کی راہ بھی
اچھی نہیں ہے دیکھو یہ آپس کی دشمنی،  چھوٹی بہن ہے تیری قیامت کی کھلکھلی
وہ بات کر کہ مجھ کو ملے قید سے نجات  اس پیر بوڑھے چونڈے کی عزت ہے تیرے ہات
دل اس کا دور یار کہیں چاک ہو نہ جائے  دھڑکا ہے یہ کہ لاکھ کا گھر خاک ہو نہ جائے

لیگ سے خطاب کرتی ہے :

ٹوٹے دلوں کو مہر محبت سے جوڑ دے  دشمن کا جو رفیق ہو اس کو جھنجھوڑ دے

اس لجاجت اور منت و سماجت بھرے الفاظ کی توجیہہ کرتے ہوئے مادرِ ہند کہتی ہے :

جاری رہیں گی یونہی جو ہر آن دھمکیاں  الجھی یوں ہی رہے گی جو تا قوس سے اذاں
قینچی کی طرح چلتی رہے گی اگر زباں  کرتی رہیں گی سیدھی فرنگی کی جوتیاں
مر کر بھی زندہ درگور ہو جائے گی  گردن کا طوق پاؤں کی بیڑی نہ جائے گی

کمیونسٹوں سے مجھے یہی توقع ہے کہ وہ مادرِ ہند کی بات مان جائیں گے :

میری تو تو ہی سیف ہے تو ہی میرا قلم  تو سب سے بڑھ کے عقل میں ہے فن میں سب سے کم

بہنیں اگر نہیں تو نہ ہوں مائلِ کرم ! بہنوں کی جھڑکیوں پہ بگڑتے نہیں ہیں بھائی
اپنی دُلھن کو پنجۂ لنکا سے دے نجات اٹھ اور اٹھ کے پھونک دے راون کی کائنات
آنکھوں میں آگ رُخ پہ ہو آہن شکن ثبات اور ہو زباں پہ نعرۂ یا قوت و حیات
بیٹا وہ رَن پڑے کہ زمیں کانپنے لگے کیسی زمیں' چرخِ بریں کانپنے لگے

جوش کا تجزیہ یہی رہا تھا کہ تہذیب اور ثقافت کی بنیادوں پر دو قومی نظریہ کافی حقیقت پسندانہ ہو چلا تھا اور دو بڑی قومیں آپس میں مِل جُل کر رہنے کے باوجود آپس کی مختلف الخیالی فروغ پا تی رہی تھی۔ دونوں قوموں کی روش ایک تھی مگر جوش کے لفظوں میں "چال" جُدا دی تھی۔ دونوں کا مائکا تو ایک تھا مگر سسرال جُدا گانہ۔ اسی لیے کہتے ہیں :

ہو ایک ہی روش پہ مگر چال اور ہے
گو مائیکا تو ایک ہے سسرال اور ہے

ان کا یقین تھا کہ :

ہر بُعد موڑتا ہے عداوت کی دھار کو دھو دیتا ہے فراق دلوں کے غبار کو

نصب العین "آزادی" کے حصول کے لیے مائیکے اور سسرال کی یہ تفریق ہی تاریخی جبریت کا مقتضا تھی۔ ادب کبھی بھی مایوسی کا پیغام بر نہیں رہا ہے۔ چناں چہ جوش کی امید تھی کہ جب آزادی مِل جائے گی تو آپس کی خاندانی رنجشوں کا مِل بیٹھ کر ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ انسانوں کا حافظہ اس سلسلے میں کافی روادار ہے کہ محبت اور اخوّت یاد رہ جاتی ہے اور مصائب یا تفرقہ حتی الامکان فراموش کر دیے جاتے ہیں جس کا انھوں نے اپنی رباعی میں تذکرہ کیا ہے :-

پھر لطف کی چادریں سروں پر تن جائیں
پھر خیر سے یک جان دو قالب بن جائیں
ہم تم روٹھے رہیں گے آخر کب تک!
کیا عمر کا اعتبار' آ دَ من جائیں

اس طرح لب و گلو کے درمیان کی راہِ دراز کو مختصر کیا جاسکتا ہے۔ جوش ہی کا ایک شعر اس کی تشریح کرتا ہے:

دبنے نہ دے گمان سے ہرگز یقین کو
اُٹھ؛ قوتِ حیات سے بھر دے زمین کو

حصول آزادی کے بعد بھی شاعرِ انقلاب کا تصورِ قومی یک جہتی ماند نہیں پڑ جاتا ہے اس لیے کہ قومی یک جہتی کا نصب العین صرف سیاسی آزادی نہیں تھا بلکہ وسیع تر انسانی قدروں کے پنپنے کے مواقع فراہم کیے جانے کا خواب بھی تھا جس میں فرد بشمول معاشرہ خوشحال زندگی گذار سکے۔ جب جوش دیکھتے ہیں کہ آزادی کی سچی خوشی کا تصور پائمال ہوتا جارہا ہے تو ان کا قلم احتجاج کرتا ہے وہ نعرۂ "ہندو مسلم اتحاد" کا جائزہ بڑے شدید اور سخت الفاظ میں لیتا ہے۔ ان کی یہ نظمیں جن میں حیدرِ کرار کے حق گو ہونے کا تصور ہے اور لنکا کو خاکستر کر دینے کی دعوت ہے، مذہبی و تاریخی روایات سے ماخوذ ان اقدار کی حمایت ہے جو ظلم اور جارحیت کو ختم کرنے پر ایمان رکھتی تھیں۔

اپنی نثری کاوشوں میں بھی انھوں نے اسی طرح قومی یک جہتی کے فروغ کے لیے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہر وہ تاثر یا عقیدہ جو دلوں میں رنجشیں پیدا کر دے اس کے خلاف اُنھوں نے زہر اگلا ہے۔ چاہے وہ مذہبی لوگوں کی کوتاہ ذہنی ہو یا عقیدوں کی غلط تاویل۔ "کلیم" کے صفحات میں جوش نے ایسے انسان دشمن عناصر کی مخالفت کی ہے اور سخت لفظوں میں ان کی مذمت کی ہے:

"اے ہندوؤ اور اے مسلمانو! اے بھارت ماتا کے سپوتو! تمہارے آئے دن کی خانہ جنگیوں نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ تمہارے دیر و حرم اور ناقوس و اذاں کے جھگڑوں نے مجھے کفِ در دہان اور آتش بجان بنا دیا ہے میں تو دیوانہ وار خود اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہوں۔ خدا کے لیے بتاؤ، میں نرم لہجہ کہاں سے لاؤں۔"
(اشارات ص ۹۹)

ایک جگہ اشارات میں یہ پیغام دے رہے ہیں:

"دیکھو اے ہندوؤ اور مسلمانو! اب بھی وقت باقی ہے۔ اب بھی زہر پورا نہیں چڑھا ہے۔ اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے اور اب بھی سویرا ہے۔ آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو جاؤ کہ سائنس کا کوئی آلہ تمھیں ایک دوسرے سے جُدا نہ کر سکے! اور دنیا کی کوئی ضرب تمھیں محبت کے بہتے ہوئے پاک دھارے کو نہ پھاڑ سکے۔" (اشارات ص۱۰۹)

نیز یہ کہتے ہوئے انھوں نے آواز دی ہے:

"اے مورکھ ہندوؤ، اے ناداں مسلمانو! کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم نے جو تفریق کی چھٹیاں اپنے اپنے ہاتھوں پر چپکا رکھی ہیں، انھیں چھڑا کر جیبوں میں رکھ اور اپنی فرضی اور جھوٹی قرابت داریوں کو اس مقدس و عظیم قرابت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دو، جو حقیقی اور فطری ہے۔" (اشارات ص۱۰۶)

اُردو کے مزاج پر انھوں نے جو کچھ کہا وہ حقیقت ہے اور یہ بیان کسی سند کا محتاج نہیں، ملاحظہ فرمایئے:

"میں ہندوستان کے تمام باشندوں سے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی! بہ بانگِ بلند یہ عرض کروں گا کہ ہندو مسلم اتحاد کی قدیم یادگار یعنی اُردو کو زندہ اور باقی رکھنا ہے۔ یہ ان کا سب سے بڑا قومی فریضہ ہے اور اگر خدا نہ خواستہ اردو کو فنا کر دیا گیا تو آج جو میں کہہ رہا ہوں، اُسے سُن لیں، یاد رکھیں، بلکہ گرہ میں باندھ لیں کہ پھر اس زمین میں ہندو مسلم اتحاد کا خواب کبھی نہ دیکھا جا سکے گا۔" (اشارات ص۱۵۴)

"یادوں کی برات" میں ان کی ملاقاتوں کا تذکرہ اور اس کا لہجہ، اور ان کے وہ تاثر جو اس میں شامل ہیں، یہی ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ وہ جسمانی طور پر اپنے وطن سے دُور تھے مگر رُوح کی بے چینی انھیں بے قرار اور زار و قطار کر دیتی تھی۔ یہ لیح آباد کے "قصرِ لحد" کی جانب مائل کر دیتی تھی جس مٹی سے کہ ان کا خمیر ڈھلا تھا۔ مادی منفعت سے زیادہ وہ اپنی تہذیب اور زبان کی حفاظت نیز اپنے بچوں کا ان دیکھا مستقبل انھیں ہجرت میں بظاہر روشن نظر آ رہا تھا مگر ان کی یہ مرادِ اندیشی انھیں وہاں مایوس اور "اگنی کنڈ" کے علاوہ اور کچھ تاثر نہ دے سکی! وہ اپنے سینے میں یادوں کے

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

فردوس حیدر

# شہر پناہ

اس وسیع و عریض میدان میں آج مسرتیں پھوٹ رہی ہیں۔ یہ میدان جو برسوں سے تنہا، خالی اور بے سر و سامان تھا آج جھونپڑیوں سے بھرا پھلدار پیڑ کی مانند زندگی کی بھرپور علامت بنا ہوا تھا۔ جھونپڑیوں کے اندر اور باہر روشنی ہے۔ قہقہے ہیں۔ شور ہے اور گہما گہمی ہے۔

جھونپڑیوں کی قطاروں سے دُور میدان کے ایک کنارے پر جہاں ایک کچی پکی سڑک شہر کی طرف جاتی ہے ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ ہے اور اسی پیڑ کے نیچے ایک دراز زلفوں والا باریش شخص گلے میں کشکول ڈالے عالم استغراق میں بیٹھا ہے۔

میں آہستہ آہستہ اپنے وجود کو کھینچتی ہوی برگد کے پیڑ کی طرف بڑھی۔ میں تمام تر خوشیاں، قہقہے اور شور اپنے اندر بھر لینا چاہتی تھی کہ میں بھی اس میدان کی طرح تنہائی کی اذیت سے دوچار تھی۔

میں نے غور سے برگد کے پیڑ کو دیکھا جس کی جڑیں پاتال کی گہرائیوں تک پھیلی ہوی تھیں۔ اس کے تنے پر میرا نام کھدا تھا اور اس کے ساتھ میری کئی سہیلیوں کے نام بھی تھے اور ان سب کے چاہنے والوں کے نام اور اس کا نام بھی، جو میری آرزوؤں کا مرکز، میری تمناؤں کی میراث تھا۔ میرے ہونٹوں کی پتوار اور میرے ابرو کا اشارہ تھا۔ میں ان سب ناموں کو دیکھ رہی تھی اور پکار رہی تھی۔ میں ان کو چھونا چاہتی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کے ساتھ مل کر زندگی بتانا چاہتی تھی۔ "جو بیت گیا کب لوٹ کے آیا، جو بچھڑ گیا اسے کس نے دوبارہ دیکھا ہے۔" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا اور مجھے جھونپڑیوں کے پیچھے دیواریں اُبھرتی

ہوئی نظر آئیں ـــ

اُبھرتی ہوئی دیواریں ایک بڑی حویلی میں تبدیل ہو گئیں اور اس حویلی کے اندر کئی جانے پہچانے چہرے ـــ ظلم ڈھاتے ہوئے اور ظلم سہتے ہوئے حاکم و محکوم۔ ظالم اور مظلوم بیک وقت کئی چہرے میرے سامنے گڈمڈ ہونے لگے میں ان سب میں کہیں کھو گئی۔

"تم کون ہو؟" کسی نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں کون ہوں؟ میں اپنی شناخت کھو چکی ہوں ورنہ یہ سوال تو آج تک مجھ سے کسی نے نہ کیا تھا۔" میں نے سوچا اور اپنے اندر کانپ کر رہ گئی۔

"یہ زمین جس پر آج یہ قافلہ ٹھہرا ہوا ہے یہ میں ہوں اور وہ برگد کا پیڑ جس پر رہنے والوں کے نام کھدے ہوئے ہیں وہ بھی میں ہوں، یہ ہی میری شناخت ہے۔" میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا مگر فوراً ہی ٹھٹھک کر رہ گئی کہ میرے چاروں طرف تضحیک آمیز قہقہے تھے اور میرا تمسخر اڑایا جا رہا تھا۔ لوگ میرے ارد گرد جمع ہوتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے۔

"اپنی تصدیق کے لیے کوئی گواہ لاؤ۔" مجمع میں سے کسی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں اپنی تصدیق آپ ہوں۔ میں خود یہاں موجود ہوں کیا یہ کافی نہیں۔"

"نہیں۔ نہیں نہیں۔" لوگوں کا شور بلند ہوا۔

میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کانوں میں انگلیاں پرو دیں۔ اسی نفرت سے اور نفی کے اسی شور سے ایک بار میری حویلی جل کر چٹیل میدان میں تبدیل ہو گئی تھی۔ چاہنے والوں کا ایک دوسرے پر اعتماد اٹھ گیا تھا۔ جانے پہچانے چہرے اپنی شناخت کھو بیٹھے۔ چاروں طرف نفرت تھی اور آگ کا دریا تھا۔

کئی برس پہلے اسی طرح زرد پژمردہ اور مایوس چہرے یہاں پناہ لینے آئے تھے اسی طرح امدادی کیمپ لگائے گئے تھے۔ اسی طرح چولہے جلا کر دیگیں چڑھائی گئی تھیں۔ اس وقت برگد کا یہ پیڑ میری حویلی کے اندر تھا اور حویلی کی دیواریں تحفظ کی ضمانت تھیں۔ امن آشتی کی علامت تھیں۔ حویلی کے جھگڑے حویلی کے اندر ہی نمٹا لیے جاتے تھے۔ پھر قافلے کی عورتیں بھی حویلی کے اندر کام کرنے لگیں اور مرد گاؤں والوں کے ساتھ کھیتوں کو سنوارنے لگے اور برگد کا پیڑ دائی بنا بچوں کے ساتھ مٹی کھیلتا رہا۔ حویلی اور قافلے والوں کے بچو

کوئی تخصیص نہ تھی۔ سب ایک تھے۔ اندر اور باہر سب کچھ ایک تھا۔ مسرت کے اس گہوارے میں بچے پلتے رہے۔ بڑھتے رہے اور جوان ہوتے رہے اور برگد کے تنے پر اپنے چاہنے والوں کے نام لکھ کر عہد و پیمان کرتے رہے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ کسی نے نفرت کا بیج لاکر کھیتوں میں بو دیا اور جب فصل تیار ہوئی تو طرف چاروں طرف نفرت ہی نفرت تھی۔ کئی بزرگوں نے غیروں سے مانگے ہوئے اس بیج کی فصل کو اکھاڑ پھینکنا چاہا۔ مگر نوجوانوں نے بزرگوں کے ہاتھ کاٹ دیئے۔

"یہ فصل ہمارے جسم ہماری روح کو بھسم کر دے گی۔ ہم تباہ ہو جائیں گے' برباد ہو جائیں گے" بزرگوں نے چیخ چیخ کر سمجھانا چاہا مگر ان کی زبانیں کاٹ دی گئیں۔

فصل کٹتی رہی اور لوگوں کے گھروں میں پہنچتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام گھروں میں نفرت ہی نفرت بھر گئی۔ اندر اور باہر۔ کھیتوں میں اور گھروں میں نفرت کی آگ پھیل گئی۔ سب کچھ بھسم ہو گیا۔ خالی چٹیل میدان میں برگد کا پیڑ اپنے تنے پر چاہنے والوں کے مٹے مٹے سے نشان لیے تنہا رہ گیا۔

اور میں اپنے اندر چاہتوں کا سمندر لیے چاہنے والوں کے انتظار میں اس میدان میں کھڑی ہوں کہ اس میدان میں میری جوانی، میری شوخیاں' میری شرارتیں' میری خوشیاں میری تمنائیں سب دفن ہیں۔ کبھی مجھے یہ میدان ماں کی آغوش کی طرح شفیق لگتا ہے اور کبھی یہ میدان تپتے صحراؤں کی طرح اجنبی اور کٹھور لگتا ہے۔ کبھی یہ ماضی کے دھندلے واقعات کی طرح بھولا بسرا لگتا ہے اور کبھی تنہا چھوڑ کر منہ موڑ کر جانے والا دوست لگتا ہے۔

اس میدان میں میری اپنی بنائی ہوئی چھوٹی بڑی قبریں ہیں' ایک گوشے میں میرا بچپن دفن ہے جہاں سے کچی کلیوں جیسی واہمہ خوشبو اٹھتی رہتی ہے اور ایک گوشے میں میری جوانی کی قبر ہے جہاں سے شعلہ خواہشیں اور گل رنگ امنگیں امنڈ رہی ہیں کہیں دھندلا یوسیوں کی یلغار ہے تو کہیں شوخیوں شرارتوں کا مرقد ہے۔ کہیں دم توڑتی ہوئی مسکراہٹوں کی یلغار اور کہیں خجل نظروں کا جھکا جھکا سا طواف ہے۔

ان قبروں پر شہیدوں کے مزاروں کی طرح نہ دعائیں ہیں' نہ قندیلیں ہیں نہ چڑھاوے ہیں نہ منتیں' پھر بھی یہ قبریں ہیں۔ یہاں عود و عنبر کی خوشبو نہیں' مگر سانسوں کی خوشبو ہے

میری آنکھوں کی قندیلیں ہیں۔ میرے آنسوؤں کے چڑھاوے ہیں۔

"دیکھو تم جو نہیں دیکھ سکتے، میری آنکھوں سے دیکھو۔ تم جو نہیں سُن سکتے، میرے کانوں سے سنو اور مجھے تاریخ کے اس باب میں شامل کرلو، جہاں زمین اپنے چاہنے والوں کے انتظار میں بوڑھی ہوجاتی ہے مگر اپنی آنکھیں انتظار کی راہ میں بچھائے رکھتی ہے۔"

میں بولتی رہی اور لوگ مبہوت کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔

پھر میں نے دیکھا برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا دراز زلفوں والا میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ ہم دونوں برگد کے پیڑ کے قریب ایک دوسرے کے آمنے سامنے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

"تم ... تم بہروپیے ہو۔" آواز میرے حلق میں اٹک گئی۔

"سائیں بابا تم ہی سچ بتاؤ کہ سچ کیا ہے؟" ہجوم میں سے کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

سائیں بابا نے آنکھیں بند کیں اور زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ پھر آنکھیں کھول کر میری طرف گھورنے لگا۔

"تم ہم میں سے نہیں ہو۔ تم وہی ہو جو ایک بار پہلے بھی کہیں باہر سے نفرت کا بیج لاکر ہمارے کھیتوں میں ڈال گئے تھے۔ میں تمہیں پہچان چکی ہوں۔" میں چیخنے لگی۔

"اس درخت پر لکھے سب نام مٹادو۔" سائیں بابا ہجوم سے مخاطب ہوا۔

"برگد کے درخت پر لکھے ہوئے نام ہمارے جیتوں کے ہیں۔ یہ نام ہماری تاریخ ہیں، ہمارا ورثہ ہیں تم ایسا نہیں کرسکتے۔" میں اپنے دونوں بازو پھیلائے درخت کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"یہ ہی تو میں چاہتا ہوں۔ یہ نام جو میرے جیتوں کے نہیں، جو میری تاریخ نہیں، یہاں نہیں رہیں گے اور یہ نام تیرے اپنے آدمی ہی مٹائیں گے۔ وہ سب آدمی جن کے بزرگوں اور جیتوں کے نام یہاں درج ہیں آج اپنے ہاتھوں ان ناموں کے نشان ختم کریں گے۔ میں صرف ان کو ہدایت دوں گا۔" وہ اپنی جھولی میں سے سکّے نکال کر ہجوم کی طرف پھینکتے ہوا بولا۔

"دیکھتے کیا ہو۔ سارے نام مٹادو۔"

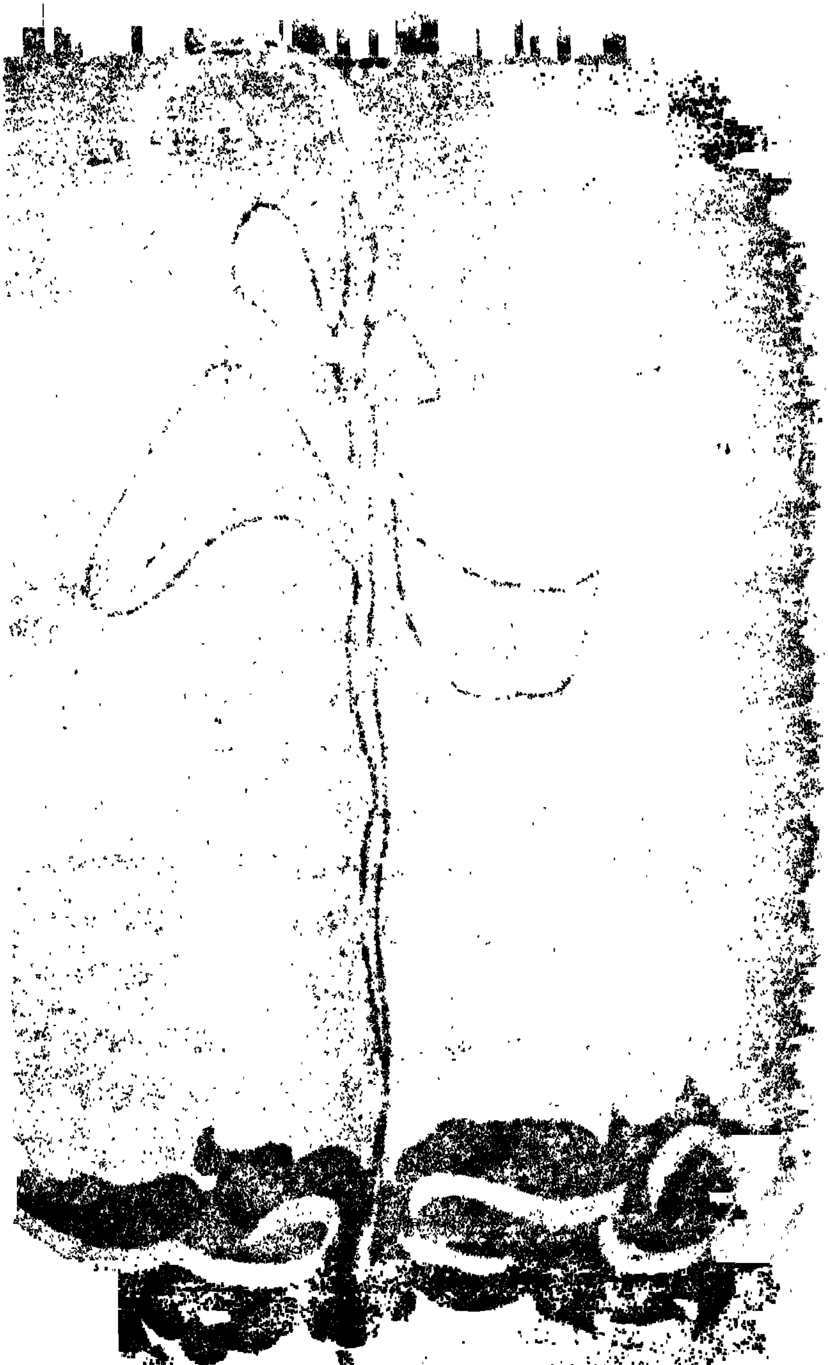
ہجوم تیزی سے درخت کی طرف بڑھا اور درخت کے تنے سے سارے نام مٹاد اور برگد کا پیڑ شور کے ساتھ گر پڑا۔ اس کی پتیوں، شاخوں، تنے اور جڑوں سے اور بارود کی بُو نکل کر سارے میں پھیل گئی۔ ⁂

# ادارہ ادبیات اردو

23 SEP 1986



Dr. Zakir Husain Library
J. M. I. New Delhi



• بیادگار ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم

سن اجرا ۱۹۳۸ء
جلد: ۴۹ شمارہ ۶
فون: ۳۸۴۴۹

# سب رس
حیدرآباد

مجلسِ مشاورت:
صدر: حامد علی عباسی
نائب صدر: ہاشم علی اختر
معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

• ارکان: عابد علی خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ، محمد اکبر الدین صدیقی
رمن راج سکسینہ، پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد

مدیر اعزازی: مغنی تبسم شریک مدیر: محمد منظور احمد معاون مدیر: وقار خلیل

جون سنہ ۱۹۸۶ء

قیمت فی پرچہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے • زرِ سالانہ: ۲۰ روپے • کتب خانوں سے: ۲۵ روپے
بذریعہ رجسٹری: ۴۵ روپے • بیرونی ملکوں سے: ہوائی ڈاک سے • بحری ڈاک سے

| | ہوائی ڈاک سے | بحری ڈاک سے |
|---|---|---|
| مشرقِ وسطیٰ | ۱۵ ڈالر | ۶ ڈالر |
| امریکہ | ۲۰ ڈالر | ۷ ڈالر |
| پاکستان، برما، سیلون | ۱۰ ڈالر | ۴ ڈالر |
| انگلستان | ۸ پونڈ | ۲½ پونڈ |

• رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر
حیدرآباد۔ ۴۸۲ سے شائع کیا۔
خط و کتابت کا پتہ: ادارۂ ادبیاتِ اردو،
ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۴۸۲۔

## ترتیب

# پہلی بات

کھرا ادب اور آرٹ وہ ہے جو مستند ہو۔ یہ وصف زندگی کی گہری بصیرت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا اور اس بصیرت کو حاصل کرنے کے لیے موجودہ حقیقت کا داخلی شعور ضروری ہے۔ یعنی حقیقت کوئی جامد تصور نہیں ہے' دنیا میں انسانی صورت حال کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس بدلتی ہوئی حقیقت کی خارجی شناخت اور ادراک کے جو پیمانے سائنس اور علوم فراہم کرتے ہیں وہ محدود ہیں' غیر شخصی اور غیر انسانی' بن کر سیاسی مفادات اور معاشی استحصال کی خدمت انجام دینے لگتے ہیں۔ حقیقت کے داخلی شعور اور رومانیت میں فرق ہے۔ رومانی فن کار حقیقت سے آنکھیں چراتا ہے اور ماضی کی قدروں کے جامد تصور کے طفلانہ کھیل سے جی بہلاتا ہے۔

جدید دور کی زندگی میں مقصد اور ذریعے کی دوئی کا تصور کچھ اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ ذرائع کی حرمت باقی نہیں رہی۔ اس رجحان نے انسانی وقار کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔ سماج میں انسان کے باہم فطری رشتے باقی نہیں رہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کے لیے محض شے کی حیثیت رکھتا ہے جس کو وہ اپنے مقاصد کے حصول کا آلہ بناتا ہے۔ انسان کے لیے اس کا کام تشفی بخش نہیں رہا بلکہ وہ صرف حصولِ دولت کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ آج کے سماج میں فن کار کا کام بھی بکاؤ مال بن گیا ہے۔ فن کار اور فن کے درمیان مغائرت بڑھتی جا رہی ہے۔ مستند اور باشعور فن کار اس مغائرت پر قابو پانے کی جد و جہد کرتا ہے اور کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ مارکس کے الفاظ میں " یہ صحیح ہے کہ ادیب کو زندہ رہنے اور لکھنے کے لیے گزر بسر کا ذریعہ اختیار کرنا ہوتا ہے لیکن اسے نہیں چاہیے کہ وہ گزر بسر کرنے کے لیے جیے اور لکھے۔ سچا ادیب اپنے فن کو ذریعہ نہیں بناتا' اس کا فن بجائے خود مقصد ہوتا ہے "۔

مغنی تبسم

پروفیسر گیان چند جین

# یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

بزرگوں نے کہا: "گرما گرم آیندو روند کا بازار ہے۔"

اخبار کے دفتر میں جب روٹری مشین چلتی ہے تو اس میں سے کاغذ کا ایک آبشار بہتا ہے جس میں سے اخبار ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، دوڑتے نکلتے آتے ہیں۔ یہی کیفیت جہانِ گزراں کی ہے جہاں ایک چل چلاؤ لگا ہوا ہے۔ لوگ تیزی سے یابہ فنا کی طرف بھاگ رہے ہیں اور باہر نکل رہے ہیں:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے (اقبال)

ان جانے والوں میں سست گام بوڑھے بھی ہیں، جوان بھی اور بعض اوقات تیز دوڑنے والے اطفال بھی۔ افسوس کہ راہ میں کیو، کا رواج نہیں کہ جس ترتیب سے آئے ہیں، اس ترتیب سے جائیں۔ بہت سے من چلے بیتاب پاکیو توڑ کر اپنی باری سے پہلے ہی کھسک جاتے ہیں۔ گزرنے والوں میں میرے اعزا بھی ہیں، دوست بھی، ساتھی پروفیسر بھی، بزرگ بھی خورد بھی:

یوں دوستاں کے ہجر سوں داغاں ہیں سینے پر دلی
صحرا کے دامن کے اوپر جیوں، نقش پائے رہرواں

میرے سینے پر بھی اسی طرح کے سینکڑوں نقش مرتسم ہیں۔ یہ کبھی نہیں مٹنے کے۔ میں ان کے نقش گروں سے کہتا ہوں: رفتید ولے نہ از دل ما

اس ارژنگ عزیزاں میں سے ایسے چند نقوش آپ کے سامنے جھلکاتا ہوں، جن کے نقاش اردو کا دم بھرتے تھے، جن کے دھندلاتے خد و خال کو آپ بھی پہچانتے ہیں۔

سب سے پہلے مجھے حمیدیہ کالج بھوپال کے دو ساتھیوں کا خیال آتا ہے، جن سے دلی ارادت کا

ساتھ تھا۔ شعبۂ اردو میں میرے ساتھ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی تھے۔ بھوپال میں اردو پر تحقیق کر گئے! انھیں استادی موسیقی میں دخل تھا۔ شعبے میں باہر سے جب بھی کوئی بڑا آدمی آتا وہ ہمیشہ اپنے گھر پر دعوتِ طعام دیتے اور اس میں شعبے کے جملہ ساتھیوں کو مدعو کرتے۔ ان کی یہ ادا یاد رہے گی کہ طعام سے پہلے یا بعد میں ہمیشہ ستار پر کوئی راگ بجاتے وہ میرے بھوپال چھوڑنے کے چند سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن شعبۂ عربی کے عبدا عبید احمد تو میرے دیکھتے ہی دیکھتے جاتے رہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۳ء کو اعلان ہوا کہ انھیں صدرِ جمہوریہ کا فاضل عربی کا اعزاز ملا ہے۔ اعزاز کیا ملا پروانۂ مرگ ملا۔ سند حاصل کرنے سے پہلے ہی انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ہم یہ سب دیکھتے ہیں پھر بھی انعام و اعزاز پر دندانِ حرص تیز کرتے ہیں۔ میں نے مرحوم کی یادوں کو ایک مضمون میں اور اس مضمون کو اپنے مجموعے 'تحریریں' میں اسیر کیا ہے

اب چند مشاہیر کی بات سنیے :

حمیدیہ کالج بھوپال، وکرم یونی ورسٹی اجین سے ملحق تھا۔ میں بھوپال میں رہتے ہوئے وکرم یونی ورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کا صدر تھا۔ ۱۹۵۶ء کی بات ہوگی پروفیسر عبدالقادر سروری بھوپال آئے۔ میں نے ان کا نام نامی سنا تھا۔ ان کی کتابیں بھی پڑھی تھیں لیکن انھیں دیکھا نہ تھا۔ وہ مجھ سے ایک نسل بڑے تھے۔ جب وہ لیکچرار ہو گئے تھے میں نے الف، ب بھی شروع نہ کی تھی۔ وہ کسی کی میت میں میرے گھر پر مجھ سے ملنے آئے۔ میں ان کی رنگت دیکھ کر سمجھا کہ کوئی سبرامنیم قسم کے مدراسی ہوں گے۔ جب انھیں اردو بولتے پایا اور جب مجھے بتایا گیا کہ یہ پروفیسر عبدالقادر سروری ہیں تو یقین نہ آیا کہ اتنا بزرگ عالم بہ نفسِ نفیس آکر مجھ نوسکھیے سے ملے۔ زہے نصیب۔

عمر اور علم کے اس تفاوت کے باوجود انھوں نے مجھے خوردی سے اٹھا کر برابری کا اور پھر دوستی کا درجہ دیا۔ حالاں کہ مجھ کمترین نے کبھی خود کو ان کے مساوی نہ سمجھا۔ آخر تک خطوط میں ان کو 'محترمی' سے خطاب کرتا رہا لیکن صحبتوں میں بے تکلفی آگئی تھی۔ انھوں نے بارہا مجھے عثمانیہ یونی ورسٹی کی کمیٹیوں میں بلایا۔ ہمیشہ اسٹیشن پر آکر میری پذیرائی کرتے، 'دولت خانے پر ٹھہراتے' تواضعات کرتے اور بہ نفسِ نفیس اسٹیشن پر آکر وداع کرتے۔ انھیں کی بدولت عثمانیہ کے شعبۂ اردو کے اساتذہ اور شہر کے دوسرے علماء سے تعارف ہوا

معاصرین کا علم اور ان کی رقابتیں دیکھیں۔ حیدرآباد کی علمی اور ادبی فضا کا جو گہرا تاثر قائم ہوا تھا وہ آج بھی برقرار ہے۔

انھوں نے حد کر دی کہ ۱۹۵۹ء میں میسور یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر کی سلیکشن کمیٹی میں رکھوا دیا۔ میں اس وقت تک پوسٹ گریجویٹ کالج میں پروفیسر تھا جو برابر ہوتا ہے۔ یونی ورسٹی ریڈر کے۔ سروری صاحب کی معیت میں پسنجر گاڑی سے بنگلور اور پھر میسور کا سفر کیا۔ یہی صورت واپسی میں رہی۔ یاد نہیں سروری صاحب کی ہمراہی میں کتنے سفر کیے ہیں۔ کتنی بار حیدرآباد اور سری نگر میں ان کی میزبانی سے استفادہ کیا ہے وہ بھی بھوپال اور جموں میں بارہا میرے پاس ٹھہرے۔ انھوں نے کئی بار مجھے کالج سے نکال کر یونی ورسٹی میں پروفیسر کرانے کی کوشش کی۔ آخر بہ مصداق مدعی سست گواہ چست انھوں نے مجھے جموں یونی ورسٹی میں پروفیسری پر فائز کرا کے دم لیا۔ جموں رہ کر ان سے ملنے کے مواقع اور زیادہ ملے۔ سری نگر میں ان کے دولت کدے پر اور زیادہ قیام کیا۔

وہ کتنا زیادہ کام کرتے تھے! اردو کے سب سے سینیئر پروفیسر تھے اس کے باوجود ان میں کتنی انکساری تھی۔ حیدرآباد میں رہتے ہوئے انھوں نے انجمن اساتذۂ اردو جامعاتِ ہند کی بنیاد ڈالی۔ حیدرآباد میں میں نے خود دیکھا ہے کہ انجمن کے پہلے اجلاس کے لیے دعوت نامے لفافوں میں رکھ کر، فرش پر رکھ کر وہ خود ٹکٹ چپکا رہے تھے۔ اردو کے تمام پروفیسروں میں وہ میرے سب سے قریبی دوست تھے۔ نسلوں کا فرق مٹ گیا تھا۔ وہ ۱۹۷۱ء میں یکایک آخری سفر پر چل دیے۔ اب جب کہ میں حیدرآباد میں بحیثیت پروفیسر آ گیا ہوں، سوچتا ہوں کہ وہ بھی یہاں ہوتے تو زندگی کتنا لطف دے جاتی، کتنی بار آور ہوتی۔

شمالی ہند کے بزرگوں میں متعدد حضرات کی یاد آتی ہے۔ میرا تاثر ہے کہ اردو کے قدیم ادیبوں میں مولانا حالی اور میرے معاصرین میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی شریف ترین انسان تھے۔ کتنے جید عالم تھے عرشی صاحب۔ کہا جاتا ہے کہ علم میں بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو دماغ میں چڑھ کر تکبر کا رنگ لے لیتا ہے لیکن مولانا عرشی اس سے بالا تر تھے۔ ان کا رہن سہن قصبوں کے متوسط افراد کی طرح سادہ تھا۔ نسلاً پٹھان ہونے کے باوجود

وہ مزاجاً اس قدر مرنجاں مرنج، منکسر، شریف النفس، فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت تھے کہ ان کی شرافت کی قسم کھائی جا سکتی تھی، ان کے دامن پر نماز پڑھی جا سکتی تھی۔ ان کی قدمبوسی سے سربلندی حاصل ہوتی تھی۔ ان کی زبان سے کبھی کسی کے خلاف ایک جملہ ایک لفظ نہ سُنا۔ مجھ ناہنجار نے نسخۂ عرشی پر معترضانہ لیکن عقیدت مندانہ تبصرہ لکھا۔ انھوں نے میرے علمی اختلافات پر کبھی ناگواری کا اظہار نہ کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عالم زیادہ تھے کہ شریف زیادہ۔ مجھے ان سے ملنے کے کتنے کم موقعے ملے ہیں کم از کم ایک بار ان کے دولت خانے پر ٹھہرنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ کبھی فرصت میں رہنا ملتا تو ان سے مخطوطوں کے کاغذ اور روشنائی کی شناخت کا فن سیکھتا۔

دوسری طرف پروفیسر مسعود حسن رضوی تھے۔ ان کی شان ہی دوسری تھی۔ چوٹی کے محقق لیکن ہمیشہ دلچسپ اور دلکش انداز میں لکھنے والے۔ ان کی بود و باش کی طرح گفتگو بھی نستعلیق تھی۔ ۱۹۴۶ء کے آغاز میں ان سے نیاز حاصل ہوا اور تب سے آخر حیات تک مجھ پر نگاہِ لطف کا ایک اٹوٹ سلسلہ جاری رہا۔ ان کے حضور میں بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمالہ کی تلی میں یا اودیار (مدراس) کے عظیم ترین برگد کے سائے میں بیٹھے ہوں۔ صرف ایک بار ۴۶ء میں انھوں نے ایک معاصر پروفیسر پر تلخ تبصرہ کیا تھا۔ اس کے بعد وہ دن اور آخری دن انھوں نے کسی کے خلاف لگائی بجھائی سے سروکار نہیں رکھا۔ ادبی سیاست، یونیورسٹیوں کے تقررات جیسے موضوعات سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کوئی ان کی جناب میں ان ہلکے موضوعات کو چھیڑنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ ان کے پاس دو چار گھنٹے بیٹھیے اور علم کے یم ذخار سے حسبِ دلخواہ اپنے دامن میں موتی سمیٹ لیجیے۔ اردو زبان کا لطف انھیں کو سننے میں ملتا تھا۔ وہ کیا گئے لکھنؤ کا معلم اول اٹھ گیا۔ شہر سائیں سائیں کرتا ہے۔ اب لکھنؤ جا کر کس کے ادبستان میں جائیں۔ کہاں گئے وہ بزرگ!

میرے استاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایک باغ و بہار شخص تھے۔ ان کا طالب علمانہ کیریر نہایت خراب تھا۔ چھے سات بار کی کوشش میں ہائی اسکول پاس کیا۔ آگے بھی اسی طرح گذشتنے دار طریقے سے ایم اے کیا۔ اس کیریر کے آدمی کو کیوں کر لیکچرار مقرر کیا جائے لیکن انھوں نے کیریر کو معیارِ انتخاب بنانے کے اصول کو کھوٹا ثابت کر دیا۔ وہ لیکچرار ہوئے تو

اس پوسٹ کو زیب دیا۔ نقاد کی حیثیت سے ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ ریڈر ہوئے تو ریڈری کو زیب دیا اور پروفیسر ہوئے تو اس اعلیٰ منصب کے جملہ پیمانوں پر پورے اترے۔ وہ مجھے میرے زمانۂ طالب علمی ہی سے پسند کرتے تھے۔ میں مدرس ہوا تو ان کی عنایات اور بھی بڑھ گئیں۔ جموں میں پروفیسر ہونے کے بعد میں الہ آباد میں ان سے ملا تو ان کی کمر خمیدہ ہو چکی تھی۔ مجھے ان میں والدانہ سایہ نظر آیا۔

۱۹۷۵ء میں الہ آباد کی اردو پروفیسری کے لیے ان کی نگاہِ انتخاب مجھ پر پڑی۔ میں اپنے سے سینیر دو اساتذہ کے احتراماً وہاں کی امیدواری کو تیار نہ تھا۔ مجھے پیغام ملا کہ استاذِ محترم کی خواہش ہے کہ میں درخواست دوں۔ میں خاموش رہا۔ جب وہ سینیر اسٹیج سے ہٹ گئے تو میں نے عرضی داغ دی اور ۱۹۷۶ء میں میں الہ آباد پہنچ گیا۔ میرے زمانۂ قیام میں وہ الہ آباد میں ہوتے تو مجھے کتنی طمانیت ہوتی۔ میں الہ آباد چھوڑ کر حیدرآباد نہ آتا۔ لیکن خواہشیں اسپ ہوتیں تو مجھ جیسے فقیر انھیں دوڑاتے پھرتے۔ میرے مخلص، میرے بہی خواہ استاد۔!

یہ پرانے بزرگ تھے۔ ان کے اور اپنے بیچ کی نسل کے علما میں احتشام حسین مرحوم کا ذکر کروں گا۔ کتنے بڑے نقاد، کتنے بڑے عالم! مشرق ہی نہیں مغرب کے جدید ادب سے بھی کما حقہ، واقف۔ میری کتابِ زندگی کا سب سے شرم ناک واقعہ یہی رہے گا کہ میں ۱۹۶۱ء میں الہ آباد کی اردو پروفیسری کے لیے ان کے مقابل امیدوار ہوا۔ بس پیچھے ہٹنا چاہتا تھا لیکن دو سب سے سینیر ماہرین نے مجھے سختی سے روک دیا اور درخواست واپس نہ لینے دی۔ ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کے اور میرے علم کا کیا مقابلہ۔ چراغِ فسردہ کجا، شمعِ آفتاب کجا؟ — بس انٹرویو میں گیا۔ روسیاہی مول لی۔ عرقِ ندامت میں غرقاب ہو گیا، لیکن احتشام صاحب کی یہ سیر چشمی تھی کہ دو ایک سال بعد انھوں نے مجھے انجمنِ ترقی اردو ہند کی مجلسِ عام کے انتخاب کے لیے نامزد کیا اور میں حیاتی رکن منتخب ہو گیا۔ ان کے ظرف کا یہ عالم تھا کہ میرے انتخاب کے بعد انھوں نے مجھے لکھا بھی نہیں۔ مجھے 'ہماری زبان' سے معلوم ہوا۔ اس وقت تک میں یہ بھی نہ جانتا تھا کہ انجمن کی مجلسِ عام کیا ہوتی ہے اور اس کے رکن کس طریقے سے چنے جاتے ہیں۔

میرے کچھ ایسے معتقدات ہیں جن پر میں اٹل ہوں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یونی ورسٹیوں کی اردو پروفیسری کے لیے قدیم بزرگوں میں سید مسعود حسن رضوی اور رشید احمد صدیقی مثالی تھے اور جدید روشن دماغ پروفیسروں میں احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور۔ ان کے بعد بھی ڈاکٹر مسعود حسین خان کی طرح کئی ایسے پروفیسر ہوئے ہیں جو ہر طرح سے اس منصب کے شایاں ہیں۔ مجھے سردست دوسروں سے سروکار نہیں۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پروفیسری پر مقرر ہونے سے کئی سال پہلے سے احتشام صاحب اس عہدے کے لائق تھے۔

ان کی شرافت، سادگی، خاکساری گرویدہ کرلیتی تھی۔ اتنا علم، اتنی فروتنی، اتنی ادا۔ میں ہزار نالائق سہی وہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ بارہا بھوپال میں میرے مہمان رہے۔ گجرال کمیٹی میں بارہا سفر و حضر میں ان کا ساتھ رہا۔ ایسی شخصیت تھی ان کی کہ انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔

بزرگوں اور نیم بزرگوں کے بعد اپنی نسل کے ایک شخص پر یہ ذکر ختم کرتا ہوں۔ ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم الہ آباد یونی ورسٹی میں بحیثیت طالب علم مجھ سے دو سال سینیر تھے۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کے بارے میں رائے قائم کرلی تھی کہ وہ ایسے اہل طالب علم ہیں جو قدیم اور جدید (اس دور کے جدید) دونوں قسم کے ادب پر نظر رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے اوائل میں جناب مسعود حسن رضوی کے کتب خانے سے استفادہ کرنے گیا۔ مسیح صاحب نے مجھے تعارفی اور سفارشی چٹھی لکھ دی جس کی وجہ سے مسعود صاحب کے کتب خانے اور الطاف کا در ہمیشہ کے لیے مجھ پر کھل گیا۔

مسیح الزماں ۱۹۴۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں لیکچرر ہوگئے اور ایک دلدل میں پھنس گئے۔ کہیں باہر مقدر آزمائی نہیں کی۔ بیس پچیس سال تک وہاں لیکچرر رہے حالاں کہ ان کے خردوں کے بڑے بڑے پروفیسر ہوگئے۔ آخر وہ بنارس جا کر ریڈر ہوئے۔ میرے اور ان کے دونوں کے لیے شرم کی بات ہے کہ میں ان کی سلیکشن کمیٹی میں تھا۔ بعد میں وہ الہ آباد آگئے اور وہاں ریڈر ہوگئے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں الہ آباد میں ان کا پروفیسر ہونا یقینی تھا۔ میں پہلے سے پروفیسر تھا۔ مجھے الہ آباد میں پروفیسر ہونے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ اپنے استاد ڈاکٹر رفیق حسین اور محبِ صادق ڈاکٹر مسیح الزماں کے سبب وہاں کی پروفیسری

کے لیے درخواست دینے کو تیار نہ تھا۔ جب ڈاکٹر رفیق حسین ریٹائر ہو گئے اور آہ، آہ مسیح الزماں مرگِ مفاجات کا شکار ہو گئے تبھی میں نے الہ آباد کا ارادہ کیا۔ مسیح الزماں جوانا مرگ تھے، دولتِ مستعجل تھے۔

ایک بار ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے مجھ سے مسیح الزماں کے بارے میں کہا۔

"میں اس شخص کی علمیت کا بہت قائل ہوں"۔ یہی میری رائے تھی ان کے بارے میں۔ وہ میرے مخلص دوست تھے۔ ان سے کبھی ناچاقی نہیں ہوئی۔ ان سے مسلسل خط و کتابت رہتی تھی۔ الہ آباد میں بحیثیت پروفیسر قیام کے دوران میں سوچا کرتا تھا کہ اگر مسیح الزماں بھی الہ آباد میں ہوتے تو کیا کیا صحبتیں رہتیں لیکن یہ ممکن ہی نہ تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں الہ آباد میں نہ ہوتا۔ کاش وہ مزید زندہ رہتے، الہ آباد میں پروفیسر ہو جاتے۔ میں جموں رہنے پر قناعت کرتا۔ بعد میں جہاں مقدر ہوتا کھسک جاتا لیکن باوجودِ استحقاق مسیح الزماں کی لوحِ تقدیر میں پروفیسری نہ لکھی تھی اور انھیں یہ کہتے اٹھ جانا پڑا۔

"حیف جاں دادیم و بہ مقصدِ خود نہ رسیدیم"
(آسمان اور زمین دونوں نے کیسے کیسے علما کو کھا لیا)

یادوں کے پردے پر مرحومین کا ایک کارواں گزر رہا ہے۔ کس کس کی جھلک دکھاؤں! کس کس کا ماتم کروں؟ یہیں پر اس حکایتِ جاں گداز کو قطع کر دیتا ہوں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے      آج وہ، کل ہماری باری ہے

اردو کا ایک نہایت معروف، نہایت سادہ لیکن بہت عظیم شعر ہے۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں      سامان سو برس کا ہے، کل کی خبر نہیں

دوسرے مصرعے میں کیسی آفاقی و دوامی صداقت پیش کی گئی ہے۔ ساری منصوبہ بندی ساری تجارت، تمام اہتمام، تگ و تاز، جملہ ریشہ دوانیوں کے سامنے ان کی حقیقت پوست کندہ کر کے پھینک دی ہے۔ بعض حضرات 'کل' کی جگہ 'پل' پڑھتے ہیں۔ ایسا ہو تو معنوی اعتبار سے وہ بھی درست ہے۔ کون جانتا ہے کہ آیندہ لمحے میں کیا گزرنے والا ہے۔ راقم الحروف نے بھی کہا تھا:

ہر لمحہ وقتِ غیر یقینی ہے دوستو!      لاعلمیوں کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم

صدرِ پاکستان نے کسی بیرونی رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ان کا ارادہ ۱۹۹۰ء

تک محدود رہنے کا ہے۔ میں اسے آسمان پر تھوکنے کے مترادف جانتا ہوں۔ انھیں مندرجہ بالا شعر کا دوسرا مصرع سنایا جائے۔

انھیں بھر کیوں انگشت اٹھاؤں۔ میں شیخِ فانی عمر کی اس منزل میں منصوبے بنا رہا ہوں کہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد فلاں شہر میں مکان تعمیر کروں گا۔ حالاں کہ کہاوت تنبیہہ کرتی ہے: " ناگھر تیرا، ناگھر میرا، چڑیا رین بسیرا۔"

هر که آمد عمارتِ نو ساخت رفت و منزل به دیگرے پرداخت

نظیر اکبرآبادی اردو کا جینئس ہے اس نے کئی عظیم لافانی نظموں میں کئی رمتے جوگی کی طرح زندگی کی سچائیاں، ننگی سچائیاں، کڑوی سچائیاں، سیدھے سادے سامنے کے لفظوں میں انڈیل دی ہیں۔ انھیں میں سے ایک ہے۔

" قزاقِ اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ "

مجھے اس نقارے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ یہ روز روز کے کا پرلیشن، یہ اعضاء کی شکنی، اس نقارے کی ضربیں نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہ غیبی آوازیں قریب تر ہوتی جا رہی ہیں لیکن اللہ رے غفلت کہ میں انھیں سن کر بھی نہیں سنتا۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی ہیں۔ غفلت نے بہلاوا دے رکھا ہے کہ قزاقِ اجل دور ہے مجھے اُچکنے میں کئی سال لگ جائیں گے۔

ٹھیک ہے میاں غافل! اس نیم ہوشی، نیم عقلی میں زندگی جیے جاؤ، جو آگے چلے گئے ہیں ان کی یادیں سونت سونت کر سینے سے لگائے رکھو۔ فراق نے کہا تھا:

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی یاروں نے اتنی دور بسائی ہیں بستیاں

تم سمجھ رہے ہو کہ یہ بستیاں بہت دور ہیں۔ کیا واقعی؟ تم خود انھیں کے پاس جا کر بستی بسانے والے ہو۔ فاصلہ ایک گام ہی تو بچا ہے۔ ٭٭٭

صفحہ ۲ کا بقیہ:

---

جو بچوں پر یا بچوں کے بارے میں ہیں یا جن میں بچوں کا ذکر آیا ہے ان میں ریڈیو اور کاغذ کی ناؤ اتنی بار پڑھی اور سنی جا چکی ہیں کہ ان کا اعادہ ضروری نہیں، بعد کی نظموں میں جنہ برسے اور بچے اور دشمن خصوصی توجہ کی مستحق ہیں ــــ ان کے علاوہ دلکشی اس بزم کی، یہ زرد بچے "اس روز" بچوں کا جلوس اور سرکس کا گھوڑا (جو اگرچہ بظاہر بچوں کے بارے میں نہیں ہے) ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر مانوس فضا میں مسرت یا درد یا رنج کا اظہار کرنے کے لیے بچوں کی بات کرتا ہے اور اس طرح زندگی سے اپنے بنیادی اشتغال کو مستحکم کرتا ہے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ بچوں نے جس جس طرح بلراج کومل کو INSPIRE کیا ہے، [illegible]

# غزلیں

غالب عرفان

دار پر کوئی بھی تیار نہیں
سچ مرے شہر کا معیار نہیں

مجھ کو ملتا ہے یقیں وہم کے بعد
آدمی ہوں کوئی اوتار نہیں

جب سے صحراؤں کو خواہش ہے مری
میرا گھر میرا طلب گار نہیں

کل جہاں ساز کو آواز ملی
اب وہاں تار ہے جھنکار نہیں

کس قدر تیز تھی آوارہ ہوا
اب کسی سر پہ بھی دستار نہیں

مرحلہ قدروں کے ٹکراؤ کا ہے
مسئلہ وقت کا معیار نہیں

ہر قوی جسم ہے خائف مجھ سے
گو قلم ساتھ ہے تلوار نہیں

ذہن یکجا بھی وہاں ہوں تو کیا
دل جہاں مظہر کردار نہیں

تیز رو وقت ہے عرفانؔ نظر
زندگی کی کوئی رفتار نہیں

شجاع خاور

جسم کی قید سے بندوں کو رہائی دے گا
بندگی بھائی اس کو، تو خدائی دے گا

جا شب ہجر تجھے دے دیے دونوں آنسو
کون اس طرح سے برسوں کی کمائی دے گا

ایک دن ہم ترے لہجے میں کریں گے باتیں
اور تو دیرینہ تعلق کی دہائی دے گا

اپنے آنگن میں کڑی دھوپ ہے مایوسی کی
چاند اب غیر کے آنگن میں دکھائی دے گا

ایسے ماحول میں خاموشی ہی بہتر ہے شجاعؔ
اتنے الزام ہیں کس کس کی صفائی دے گا

ذکی بلگرامی

# غزلیں

کپاسی جسم کے اندر جدا سا اور بھی تھا
ہمارے سرد ڈھانچے میں گرم خون بھی تھا
گلوں کی سیج پہ بے خواب ہو گئیں آنکھیں
پھٹی چٹائی پہ راحت بھی تھی سکون بھی تھا
اتر رہا تھا چھتوں پر عذاب بارش کا
مکان کیسے نہ گرتا کہ بے ستون بھی تھا
میں اس کو پرسۂ آشوبِ ذات کیا دیتا
یہی عذاب میرے اپنے اندرون بھی تھا
ہم اپنے قتل کا کس کس سے خوں بہا مانگیں
ہمارے قتل میں شامل ہمارا خون بھی تھا

بکھر کے رہ گئے گھر کے شناخت نامے ذکیؔ
ہمارے گھر کی رفاقت میں کچھ جنون بھی تھا

رنجش تو جس قدر بھی ہے تنہائیوں سے ہے
میری لڑائی خود مری پرچھائیوں سے ہے
ہم ساکنانِ گیتیِ پست و حقیر کو!
کیا کیا امید عرش کی اونچائیوں سے ہے
مجھ کو ہزار جھوٹ گوارا ہیں جسم کے
نفرت مگر لباس کی سچائیوں سے ہے
تیری لڑائیاں تو ترے دشمنوں سے تھیں
میرا مقابلہ تو مرے بھائیوں سے ہے

پگڑی سنبھالیے گا ذکیؔ بلگرامی آپ
زور آزمائی آپ کی رسوائیوں سے ہے

نصیر پرواز

# غزل

اپنے ہی اصولوں کے حصاروں میں کھڑے ہیں
ٹوٹے ہوئے نادیدہ سہاروں میں کھڑے ہیں

ہم پھول کی خوشبو سے بھی ہو جاتے ہیں زخمی
جذبات کے حساس دیاروں میں کھڑے ہیں

اُن کو بھی ذرا دھوپ کی آغوش عطا کر
سائے جو ابھی راہ گذاروں میں کھڑے ہیں

کچھ بیٹھ کے سوچیں تو ملے ساعتِ تسکیں
سب ٹوٹے ہوئے درد کے ماروں میں کھڑے ہیں

ہنسنے نہیں دیتی ہمیں سنجیدہ مزاجی
ہم جسم بچائے ہوئے دھاروں میں کھڑے ہیں

مٹھی میں دبائے ہوئے بے نام سی خواہش
اب گاؤں بھی شہروں کی قطاروں میں کھڑے ہیں

بس اپنے سوا کچھ بھی نہیں آرزو باہر
سب لوگ یہاں اپنے نظاروں میں کھڑے ہیں

تہذیب کے کاندھوں پہ ٹکائے ہوئے سر کو
بکھرے ہوئے حالات کی غاروں میں کھڑے ہیں

کس گل سے ملیں کونسی خوشبو کو دُعا دیں
حیران و پریشان بہاروں میں کھڑے ہیں

ممکن ہے کبھی خاکِ رفاقت کو بھی ترسیں
جو خواب ابھی چاند ستاروں میں کھڑے ہیں

گھر لوٹیں گے اس بھیڑ سے تنہائیاں لے کر
پرواز ابھی اپنے ہی یاروں میں کھڑے ہیں

سید امتیاز الدین

# غزل

(مرحوم بھائی شاذ تمکنت کی یاد میں)

درد کے خواب کی تعبیر، دوا ہو جائے
یہ دعا تھی مرے بھائی کو شفا ہو جائے
اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں لئے واپس پل جائے
وہ جو اچھا ہو تو ہم سب کا مسیحا ہو جائے
جنبشِ خامہ سے الفاظ کا جادو بولے
محفلِ شعر میں پھر نغمہ ترا ہو جائے
لیکن ایسا نہ ہوا، کیوں نہ ہوا کون بتائے
پوچھنے جائیں تو درد اور سوا ہو جائے
بے سبب روٹھا تو اس طرح سے روٹھا جیسے
طفلِ معصوم بزرگوں سے خفا ہو جائے
اُس نے کیا سوچ کے پیمانِ وفا باندھا تھا
جس نے یہ چاہا کہ چھلکے سے جدا ہو جائے
باتیں یاد آئیں جو اس کی کبھی ہنس لیں رو لیں
دل دُکھے لوگوں کو یوں صبر عطا ہو جائے

روز و شب فاصلۂ وقت بڑھا دیتے ہیں
کاش یہ وقت بھی ٹھہرا ہوا دریا ہو جائے

عشرت دھولپوری

# غزل

آنکھوں کو تیز روشنیوں سے بچا ر
سورج کے سامنے نہ کبھی آئینہ ر
آسائشوں کی بھیڑ میں کھو جائے گی میار
ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی حادثہ رکھ
تم اپنی آستین میں کب تک چھپاؤ گے
میرے ہی واسطے ہے تو خنجر کھلا رکھ
جب اپنے گھر میں پھوس کا چھپر ہو دو
رُخ پر نہ آندھیوں کے جلا کر دیا رکھ
دشتِ جنوں سے آئے ہیں کچھ لوگ شہر م
شیشہ گرو تم اپنی دکانیں سجا رکھو
میرا ہی خونِ دل ہے پیالوں میں ساقیو!
لو آؤ میرے لب پہ مرا ذائقہ رکھو

خالی سپاٹ چہروں سے بے چہرگی بھلی
عشرت دیارِ سنگ میں آئینہ کیا رکھو

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

# اقبال اور تصوّف

علامہ اقبال کی شاعری میں "نظریہ تصوّف" کا ارتقار تلاش کرنے سے قبل لفظ "تصوّف" کے متعلق ایک آدھ بات کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ کثرتِ استعمال سے اب اس مقام تک آپہنچا ہے جہاں اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ :

یہ ہے وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

عصرِ حاضر اپنی مادّی ترقیوں کے باعث "تصوف" کے ان گہرے معانی سے قریب قریب ناآشنا ہو چکا ہے۔ جن کی تابانی سے ایک زمانے تک ہندوستان، ایران اور وسطِ ایشیا کی روح جگمگاتی رہی۔ آج لفظ "تصوّف" کے لغوی معنی ڈھونڈے جاتے ہیں۔ اس لفظ کا مخرج تلاش کیا جاتا ہے۔ بحثیں کی جاتی ہیں کہ یہ "صفا" سے ہے یا "صف" سے یا "صوف" سے جسے پہننے والا ابتدا میں صوفی کہلاتا تھا۔ حالانکہ ہم اگر ذرا شرح و بیاں سے گزر جائیں اور رومی اور حافظ سے لے کر نظیری تک کے کلام کو ایک نظر دیکھ لیں تو شاید "تصوف" کا بحث طلب لفظ اپنی تابانی کے ساتھ ایک کھُلی کتاب بن کر ہمارے سامنے آجائے ورنہ جہاں تک اس جہانِ معنی کو تشریح و توضیح کا جامہ پہنانے کا تعلق ہے، ممکن ہے بحث کرنے والے کسی ایک نتیجے پر نہ پہنچ سکیں کیوں کہ رومی کی وارداتِ قلبی حافظ کی وارداتِ قلبی تو نہیں ہوسکتیں۔ بنیادی بات تو تصوف کی روح تک پہنچنے کی ہے۔ صوفی کا جذبۂ تلاش و جستجو اور اس تلاش میں اس کی کامرانی بشر کے ادراک کی گرفت سے باہر ہے)۔ یہ بات الگ ہے کہ ہم اس نتیجے پر بھی ادراک ہی کی بدولت پہنچتے ہیں۔ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے اور ہستیِ مطلق

سے وصال کے لیے صوفی لباسِ مجاز برقرار نہیں رکھ سکتا۔ صوفی کا راستہ ایک کٹھن راہ ہے اور ہمارا ادراک اور احساس اسے پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے۔ قرۃ العین طاہرہ نے اس کیفیتِ فراق کو بڑے ساحرانہ انداز سے اپنے چند اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو　　شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
از پئے دیدنِ رُخت ہمچو صبا فتادہ ام　　خانہ بخانہ در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو
در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا　　صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

ظاہر ہے کہ فراق و وصال کی یہ کیفیت مجازی فراق و وصال سے مختلف ہے اور چوں کہ یہ روحانی تعلق عام ادراک و فہم کی حدود میں نہیں آتا اس لیے تصوف کو ہر قسم مجذوبانہ حرکتوں سے منسوب کیا جاتا ہے اور صوفی کو غیر متوازن اور بے عمل کے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ تصوف کا ایک اپنا جہانِ معنی ہے۔ اس جہانِ معنی کو ہم اپنے دنیاوی پیمانے سے نہیں ناپ سکتے۔ مولانا رومؒ، خواجہ حافظؒ، حضرت امیر خسروؒ، خواجہ میر دردؒ، جامیؒ، عطارؒ اور رابندر ناتھ ٹیگور کے افکار عالیہ کی عظمت سے کسے انکار ہے اور یہ سب کچھ متصوفانہ خیالات کا پرتو نہیں تو اور کیا ہے۔ اقبال کا شمار اردو یا فارسی کے صوفی شعرا میں نہیں کیا جاتا لیکن یہ کہنا بھی بہت مشکل ہوگا کہ اقبال تصوف سے اپنا دامن بچا کر نکل گئے ہیں بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ اقبال کا کلام ایک صوفی شاعر کا کلام نہ ہوتے ہوئے بھی تصوف کی کیفیت اور سرشاری سے لبریز ہے تو غلط نہ ہوگا۔

اقبال کے یہاں لفظ "اسلام" اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس معنی میں استعمال نہیں ہوا کہ جس میں آج کی سیاست اسے استعمال کر رہی ہے۔ اقبال کے سارے کلام میں اسلام سے مراد امن و سلامتی اور صالح ذوقِ جہد و عمل کی تلقین ہے اور یہی سبب ہے کہ جہاں آپ نے شری شنکر، شیخ اکبر اور خواجہ حافظ کے خیالات کو غیر اسلامی کہا ہے وہاں سری کرشن اور راما نج کے افکار کو غیر اسلامی نہیں کہا بلکہ ان افکار کی تائید کی ہے اور انھیں برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے۔

اصل میں اقبال نے اپنے دور میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت پر غور کیا تو اس

نتیجے پر پہنچے کہ حقیقتوں سے فرار کی تعلیم نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو فنا کردیا ہے اور نتیجتہً مسلمانوں کے دین و ادب سے ہوئے رہبانی آنا شروع ہوگئی ہے۔ یہ فرار اور گریز کی تعلیم کہاں سے آئی۔ قرآن حکیم تو انسان کو عملِ صالح کی تعلیم دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم تصوف کے اس بظاہر دلکش لیکن بباطن خطرناک رستے سے آئی ہے جو ادبیات، فنونِ لطیفہ اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر مسلط ہوچکا ہے۔

علامہ اقبال کا سفرِ جادۂ تصوف چالیس برس کا ایک طویل سفر ہے۔ اس روحانی سفر کی ابتدا اس مقام سے ہوتی ہے جسے تصوف کی اصطلاح میں "وحدۃ الوجود" کہا جاتا ہے۔ "وحدۃ الوجود" کا نظریہ ایک طرح سے بعض نظریات کا ردِ عمل ہے۔ وہ نظریات ہیں شرک یا کثرت پرستی اور کثرتِ جوہر ایک جانب اور مذہبِ فطرت دوسری فطرت، شرک یا کثرت پرستی یا اصنام پرستی کے نظریہ کے مطابق متعدد خداؤں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے جو فطرت کے متعدد شعبوں کے مالک و نگراں تصور کیے جاتے ہیں۔ نظریہ "وحدۃ الوجود" ایک خدا کی ہستی کو تسلیم کرتا ہے اور یہیں سے "ہمہ اوست" اور "ہمہ از اوست" کے نظریات چلتے ہیں۔ کثرتِ جوہر کا نظریہ دنیا کی بنیادی وحدت کی نفی کرتا ہے اور قطعی اشیا کے اجتماع کو حقیقت کا نام دیتا ہے۔ "وحدۃ الوجود" کثرتِ افراد و اشیا کی "حقیقت" کی نفی کرتا ہے اور ایک ذاتِ مطلق کا تصور پیش کرتا ہے۔ جہاں کثرتِ جوہر، وحدت کو کثرت پر قربان کرتا ہے وہاں وحدۃ الوجود کثرتِ جوہر کو وحدت کی بھٹی میں جلا دیتا ہے۔ دینِ فطرت کے مطابق خدا کی ہستی دنیائے زمان و مکاں سے کہیں آگے ہے۔ چناں چہ خدا کو لامحدود اور غیر فانی اور دنیا کو محدود اور فانی تسلیم کیا گیا ہے۔ وحدۃ الوجود کا تصور دوسری حد و د تک پہنچتا ہے یعنی یہ کہ خدا حدودِ زماں و مکاں سے کہیں باہر نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہے خدا ہے اور خدا ہی سب کچھ ہے۔ اور خدا اور کائنات دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا ایک حقیقت ہے اور کائنات اس کا ایک غیر حقیقی پرتو، کائنات کی اپنی حقیقت نہیں ہے۔ اس کی حقیقت خدا ہی کی حقیقت ہے۔ اس کی حقیقت محض ایک پرتو یا بعض کے نزدیک وہم و طلسم ہے۔

نظریہ وحدۃ الوجود اقبال کی شاعری کے صوفیانہ لب و لہجہ کی پہلی منزل ہے۔ وہ منزل جہاں تک ابھی مثنوی "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کا گذر نہیں ہوا اور اقبال نے اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کی تفریق نہیں کی۔ ابتدا میں یہ کیفیت ہمیں کلامِ اقبال میں جگہ جگہ نظر آتی ہے ــــ

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو     آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں    (منزل)

---

ہمچو نے از نیستانِ خود" حکایت می کنم     بشنو اے گل از جدائی یا شکایت می کنم    (گل پژمردہ)

---

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا     گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں     کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے     کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے    (زہد اور رندی)

---

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے     انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ     نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی     جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے    (جگنو)

---

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی     میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ     میں اس مے خانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں    (تصویرِ درد)

---

منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں     اے شمع میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ     بامِ حرم بھی طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں     کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
ہاں آشنائے لب نہ ہو رازِ کہن کہیں     پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں    (شمع)

سفرِ یورپ کے دوران میں علامہ اقبال نے ایرانی فلسفہ اور تصوف کا مطالعہ کیا

والسیہ پر "ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی اس میں آپ نے تصوف کے موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں آپ لکھتے ہیں:

" تصوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹفک طریقے سے بحث کی ہے اور ان حالات و شرائط کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو اس قسم کے واقعے کو معرضِ ظہور میں لے آتے ہیں لہٰذا اس خیال کے برخلاف جو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف ان مختلف عقلی و اخلاقی قوتوں کے باہمی عمل و اثر کا لازمی نتیجہ ہے جو ایک خوابیدہ روح کو بیدار کر کے زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین کی طرف اس کی راہ نمائی کرتی ہیں "۔

یہ کتاب ۱۹۰۹ء میں لکھی گئی تھی اور اس کے بعد جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے وحدۃ الوجود کے موضوع پر علامہ اقبال نے بالکل خاموشی اختیار کر لی اور اگر کچھ لکھا تو وہی جس کا ذکر "مثنوی اسرار و رموز" کے تذکرے میں آچکا ہے۔

تقریباً بارہ برس کے بعد علامہ اقبال کے خیالات میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہوئی وہ تبدیلی یہ تھی کہ آپ ان صوفی مصنفین کی طرح جن کا ذکر آپ نے اپنی کتاب "ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا" میں کیا ہے خود وحدۃ الوجود کی قرآنی تعبیر کے قائل ہو گئے چنانچہ "اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی" کے بعد جو کتابیں شائع ہوئیں وہ اس بادۂ معرفت کے چھلکتے ہوئے پیمانے ہیں۔ اس کیفیت کو بعض نقادوں نے تضاد کا نام دیا ہے۔ حالاں کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں تضاد کی کوئی بات ہی نہیں۔ ایک بالغ نظر مفکر کی تحقیق و تلاش اور جستجو کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

مثنوی "گلشنِ رازِ جدید" "زبورِ عجم" ہی کا حصہ ہے۔ اس میں وحدۃ الوجود کا فلسفہ ایک خاص انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ "گلشنِ رازِ جدید" علامہ اقبال نے شیخ محمود شبستری کی کتاب "گلشنِ راز" کے جواب میں لکھی ہے۔ شیخ محمود تبریز کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں شبستر کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے والد عبد الکریم بن یحییٰ سے جو ایک جید عالم اور صاحبِ باطن شخص تھے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ علم و فضل کے مراحل طے کرنے کے بعد آپ نے اپنے وطن شبستر میں اقامت اختیار کی اور تمام عمر

درس و تدریس میں بسر کرنے کے بعد ۷۲۰ھ میں وفات پائی۔ تاریخِ پیدائش ساتویں صدی ہجری بیان کی جاتی ہے۔

شیخ محمود کی تصنیف "گلشنِ راز" کو تصوف کی دنیا میں بڑا مقام حاصل ہے اور یہ صوفیا حضرات کے نزدیک بڑی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ۷۱۷ھ میں ہرات کے ایک علم دوست بزرگ میر حسن ابن حسن میر سادات حسینی نے خراسان سے ۱۷ سوال علمائے تبریز کی خدمت میں بھیجے اور ان سے ان سوالات کے جواب لکھنے کی درخواست کی۔ شیخ محمود نے ایک ہی نشست میں ان سوالات کے جوابات لکھوا دیئے۔ بدقسمتی سے ان سترہ سوالوں میں سے دو گردشِ زمانہ سے تلف ہو چکے ہیں۔ چناں چہ مطبوعہ نسخوں میں صرف پندرہ سوال ہی ملتے ہیں۔ "گلشنِ راز" کو شاعرانہ اعتبار سے بہت اونچا رتبہ حاصل نہیں لیکن دنیائے ادب میں یہ کتاب بڑی قدر و منزلت کی حامل ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے "گلشنِ راز" کو جواب کیوں لکھا۔ ہرات کے میر حسن صاحب کے سوالات فلسفیانہ نوعیت کے ہیں۔ اقبال جب کہ ۱۹۲۲ء کے بعد سے پھر وحدۃ الوجود کے نظریئے کے قائل ہو گئے تھے اس لیے اس نظریئے کی اشاعت کے لیے انھیں یہ ایک بہت عمدہ ذریعہ نظر آیا کہ وہ ان سوالات کا جواب نظریۂ وحدۃ الوجود کی روشنی میں دیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک زمانے تک اقبال شنکر آچاریہ اور شیخ اکبر کی تعلیم وحدۃ الوجود کو ایک ہی سمجھتے رہے اور دونوں کو غیر اسلامی کہتے رہے لیکن جب ان پر یہ حقیقت منکشف ہوی کہ شیخ موصوف اور شنکر آچاریہ اس نکتے پر تو متفق ہیں کہ حقیقی معنے میں صرف حق تعالیٰ ہی موجود ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور شیخ اکبر نے قرآن اور حدیث ہی کو اپنے نظامِ فکر کا ماخذ بنایا ہے تو انھوں نے شیخ اکبر کے نظریئے کی شدید مخالفت ترک کر دی لیکن ایک بنیادی فرق شیخ اکبر اور علامہ اقبال کی تعلیم میں آخر تک رہا اور وہ فرق عقیدے کا نہیں بلکہ طریق کار کا ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی انائے مطلق کو اصل قرار دے کر انائے مقید کو اس کی شان قرار دیتے ہیں لیکن اقبال انائے مطلق کے عوض انائے مقید کو اپنی فکر کا اساسی بناتے ہیں۔ یعنی وہ خودی سے

خدا تک پہنچتے ہیں۔

غلامِ ہمّت آں خود پرستم ۔ کہ از نورِ خودی بیند خدا را
اگر زیری ز خودگیری زبر شو ۔ خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

یہ ہے علامہ اقبال کے نظریۂ تصوّف کا ایک مختصر سا جائزہ جس کی جھلک ان کی تصانیف کے آئینے میں دیکھ کر اس مقالے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ اقبال کا کلام ایک بحرِ بیکراں ہے جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ ممکن نہیں۔ ایک تو کلامِ اقبال کا سمندر و پھر اس میں تصوّف کی موجیں۔ مجھے اس بحرِ معانی کے ساحل پر پہنچ کر ہر لمحہ اپنی بے مائگی اور کم حوصلگی کا احساس رہا۔ اس پانی میں غوّاصی کے لیے جو عزم و ہمت درکار ہے مجھ ایسے نو آموز کا دامنِ دل اس سے خالی ہے۔ ہاں میں نے اس بحرِ مواج کے ساحل پر بیٹھ کر جو خذف چینی کی ہے اسے بڑے خلوص سے بطورِ ارمغان سامعین کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ (طویل مقالہ سے اقتباس)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن مدیر "معارف" لکھتے ہیں :

"... آپ اقبال کو جس رنگ میں پیش کر رہے ہیں اس سے اب وہ نئے اقبال کی صورت میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ یوں تو آپ کی ہر تحریر کو ضرور پڑھتا ہوں جہاں بھی نظر آتی ہے مگر اقبال پر آپ کی تحریروں کو خاص طور سے پڑھتا ہوں اور ان سے استفادہ کرتا ہوں۔ موجودہ دور میں بہت کم ایسے شاعر ہیں جو اچھے مقالہ نگار اور مصنّف بھی ہوتے ہیں لیکن آپ نے ایک استثنائی مثال پیش کی ہے۔ آپ کی نثر میں کبھی کبھی وہی شعریت پاتا ہوں جو آپ کی غزلوں اور نظموں میں ہوتی ہے شعریت سے زیادہ کبھی کبھی آپ جو اپنی وقتِ نظری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں اس سے تو غیر شعوری طور پر پھڑک اٹھتا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ کے قلم کا اعجاز اور آپ کی شاعری کا سحر برابر قائم رہے ..." (ایک خط کا اقتباس)

جگن ناتھ آزاد
کی نئی تصنیف

**اقبال اور مغربی مفکرین**

ناشر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،
جامعہ نگر،
نئی دہلی ۔ ۲۵

شمس الرحمٰن فاروقی

# بلراج کومل

بلراج کومل کے اسلوب کی امتیازی صفت بیان کرنا آسان نہیں ہے کیوں کہ ان کے یہاں کوئی غیر شعوری MANNERISM نہیں پائی جاتی لیکن پھر انھیں بھی محض شاعری کا فیض کہنا غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ کومل کے یہاں فیض کا سا نرم انفعالی لہجہ نہیں ہے اور نہ ان کا اسلوب فیض کی طرح غیر معمولی استعاروں سے بھرا ہوا ہے لیکن ان کے یہاں وہی شائستگی اور تہذیب یافتگی ہے جو فیض کا خاصہ ہے۔ تاثر اور رویہ کے اعتبار سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن جس طرح فیض اکثر غیر درست لفظ کو درست لفظ پر اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ غیر درست لفظ اپنے گرد و پیش کے غنائی ماحول سے ہم آہنگ ہے" اسی طرح بلراج کومل "غیر نفیس" کھردری زبان سے پرہیز کرتے ہیں "میری نظمیں" سے "رشتۂ دل" اور "رشتۂ دل" سے "سفر مدام سفر" میں بالترتیب دس اور پانچ برسوں کا فصل ہے لیکن نرم و نفیس زبان بہ مقابلہ زور آور اور بلند آہنگ زبان کا استعمال تینوں مجموعوں میں مشترک ہے۔ جیسا کہ سفر مدام سفر کی ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ان مجموعوں سے منتخب کی گئی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ بلراج کومل کے اسلوب میں تفصیلات کی جگہ نہیں ہے۔ تفصیلات اکثر غیر نفیس طرز اظہار کو راہ دیتی ہیں لیکن بلراج کومل تفصیلات کے انہی پہلوؤں کو اٹھاتے ہیں جو نظم کی داخلی فضا کے لیے ضروری ہوں۔ چوں کہ وہ خارجی تفصیل پر اعتماد نہیں کرتے اس لیے ان کے بیانیہ فقرے (جن کی تعداد عام شاعروں کے بہ نسبت ان کے یہاں زیادہ ہے) موضوع کے ظاہری خد و خال کو واضح کرنے کے

بجائے ان کے باطنی تناؤ کا اظہار کرتے ہیں۔

ابر آلودہ ہے سارا آسماں
جھینگروں کا شور و غل
یوں نہ سو جاؤ، گھڑی بھر کے لیے باتیں کرو (لذتِ قرب)

---

جوہڑوں کی تیز بدبو، مچھلیوں، جسموں سے اتری کسیل پر
پل رہی ہے زندگی کی داستاں (ناریل کے پیڑ)

---

کنستروں، غلیظ خالی بوتلوں کے درمیاں
سحر ہوئی تو ہم نحیف دھوپ سر پہ اوڑھ کر
کثیف تھا وہ خواب جس کی دلدلوں میں کھو گئے (سائے کے ناخن)

---

کہ ایک تھی
سپید، صرف ایک، اس کے پہلوؤں، جبین اور پشت پر
صلیب کے نشان تھے (ایمبولینس)

---

اس کو فلم، اخبار، ریڈیو، پوسٹر، ہدایت، کی
ذہن کو نوچتی ہوئی انگلیوں نے
فردا کے خون میں تیرتے مصائب سے باخبر کر دیا تھا
(——— بچے اور خون)
تعفن تیرگی امراض قتل و خوں کمنڈر چیخیں (گزرتے لوگ)

ان، اور ان کی طرح اور مصرعوں میں جس لینڈ اسکیپ کا بیان کیا گیا ہے وہ فرضی نہیں ہے لیکن اس کی اصل جگہ شاعر کے ذہن اور قاری کے ذہن میں ہے۔ ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ نظم کے مرکزی تصور کو کوئی پس منظر یا پیش منظر دیا جائے بلکہ یہ تفصیلات

خود موضوع میں اس طرح ضم ہیں کہ موضوع انھیں منور کرتا ہے۔

بنیادی حیثیت سے بلراج کومل تنہائی یا ہجر یا وصل کے شاعر نہیں ہیں۔ وہ احتجاج کے شاعر کے بھی نہیں ہیں۔ احتجاج اختر الایمان اور عمیق حنفی کے یہاں (اول الذکر کے یہاں نسبتاً کم اور موخر الذکر کے یہاں نسبتاً زیادہ) ملتا ہے۔ بلراج کومل سوالیہ نشان کے شاعر ہیں۔ ان کی طربیہ نظمیں بھی ایک سوال چھوڑ جاتی ہیں۔

مگر اک حسین قہقہہ کھل گیا صبح دم جب چمن میں
نہ جانے میں کس سمت سے
تیرے آنگن میں پھر لوٹ آیا (ایک نظم)

---

وہ ایک تھی
ہزار صورتوں میں میرے سامنے
طلوع جب ہوئی تو میرا آسمان بن گئی (ایک عورت)

وہ ایک عورت کیوں اور کس طرح ہزار صورتوں میں طلوع ہو کر آسمان بن گئی نظم کے مثبت بیان میں جو ہزاروں سوال پوشیدہ ہیں ان کو ڈھونڈے بغیر نظم کی معنویت پوری نہیں ہوتی۔ کومل کی کمزور نظمیں وہی ہیں جو کسی مستقل بیان پر ختم ہوتی ہیں۔ کمزور اس معنی میں کہ اپنے تمام ارتکاز کے باوجود ان میں وہ ماورائی کرید نہیں رہتی، جو سوالیہ نظموں کے ساتھ ساتھ ذہن میں در آتی ہیں۔ مستقل بیان والی نظمیں اسی لیے کم بھی ہیں کہ ان کا مزاج کومل کے شاعرانہ مزاج سے متناقض ہے۔ مثلاً:

ہمیں ہر فاصلے کی سرحدوں سے پار جانا ہے
ہمیں ہر انتہا کا ساتھ آخر تک نبھانا ہے (ایک نظم ص ۱۲)

---

حادثہ دوسرا نہیں ہوگا (حادثہ)
تمہارے زخم ہوں گے مندمل تو موت سے ہوں گے (پردۂ تصویر)

کے مقابلے میں یہ ٹکڑے رکھیے:

ہم اجنبی تھے شہر میں، ہمارا کون تھا وہاں

قطار در قطار سامنے تھے ان انگنت مکاں
مگر ہمارے سر پہ چنگھاڑتا رہا تمام شب مہیب آسماں (سلسلۂ ناخن)

---

زمین میری کون ہے' ؟
چمکتا' نیلگوں' حسین آسمان کون ہے ؟
جو برگِ گل میں دھیرے دھیرے جذب ہو
رہی ہے دھوپ زرد دھوپ کیوں مجھے
عزیز ہے ؟ (ڈرگ اسٹور)

---

دسمبر پوچھتا ہے اب
کہاں منزل ؟ کہاں منزل ؟ (دسمبر کی آواز)
آخرِ شب وہ کون آیا تھا ؟
سرخ سورج کا زہر ہاتھوں سے
کس نے آکر مجھے پلایا تھا ؟ (سرخ سورج کا شہر)
شجر کے سائے کے پاس کیسی صدائیں گونجیں
کہ میری آنکھیں بھی کھل گئیں (بیداری تک)
سنو اے قافلے والو — زباں کھولو
کہاں ہوگی سحر — بولو (سفر)

اس بنیادی سوالیہ نشان کی علامتی حیثیت دوہری ہے۔ ایک طرف تو یہ سوال خود اپنے کے بارے میں ہے اور دوسری طرف کائنات کے ان مظاہر کے بارے میں جنھیں ار کی زبان میں ABSURD کہا جا سکتا ہے۔ بلراج کومل ABSURD کو قبول نہیں کرتے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ ان کی حیثیت INQUIRER کی ہے لیکن یہ تفتیش ٹ سانڈر کی طرح نہیں انجام دیتے۔ ان کا شعری نظام کسی دور سے آنے والے کا نہیں بلکہ ایک مانوس انسان کا نظام ہے اور اس کی خاص پہچان ان کی وہ نظمیں ہیں

(سلسلہ صفحہ پر)

حمید الماس

# بیس مختصر نظمیں

۱

صبح سے وہ چن رہی تھی مختلف رنگوں کے پھول
اس نے گلدستہ بنا کر میرے بیٹے کو دیا
جو مرے پیچھے کھڑا تھا باادب

۲

میرے نقشِ پا نہیں ہیں اس کشادہ راہ پر
دور ہا ہے جس کی ویرانی پہ
آزردہ اُفق

۳

رات اور دن کی زبانیں
ایک ہیں
صرف اس کے رنگ ہیں بدلے ہوئے

۴

تم اگر سرگوشیوں میں
بات کرتیں تو یقیناً تھام لیتا
رات سے اپنے تیز رو خوابوں کو میں

۵

زعم کرتی ہیں نئی نسلیں ہمیشہ
ان سے پہلے
کس سے تسخیرِ جہانِ نو ہوئی

۶

سب کے سب ہیں عقل کے پیچھے
کوئی ہنستا ہی نہیں
دل کی صدا

۷

کہہ رہا ہے
ہو گئی تھیں مشتعل سچائیاں
وہ بھی شاید عقل سے معذور ہے

۸

لامکاں اُجلے پرندوں کے تعاقب
نظر آتی ہیں مجھ کو دور تک
اُڑتی ہوئی پرچھائیاں

۹

لمحہ لمحہ
یوں بدلتی جا رہی ہیں ساری قد
مضطرب ہے آرزو

۱۰

کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے
میرے قدموں سے زمیں روشن
یہ سنا تو وہ تو پاؤں کی تھکن

۱۱

ـلیے منڈلا رہے ہیں
طرف سے باز
تلے ستارہ بھی کہیں

۱۲

س طرح جائے گی گھر سے
رگی
ـ دریچے بند ہیں

۱۳

شگفتہ پھول کی پتی پہ رہتی ہے ہمیشہ
ع دم سورج کو
ق کی تلاش

۱۴

ـ بھی خود کو
ھونڈنے لگتا ہوں سطحِ آب پر
رف تیرے شگفتہ جسم ہی کا عکس ملتا ہے مجھے

۱۵

ـں کے درمیاں
گیا سب کچھ مگر
گی میری انا

۱۶

سویرے دیکھتا ہوں
نے گھر کی خشک دیواروں کو میں
شگی مقسوم ہے

۱۷

آج خوابوں سے یہ سمجھوتہ ہوا
ان سے پھر بچ کر رہوں میں
رات بھر

۱۸

صرف اُس کے نقشِ پا
ملتے ہیں
بیڑ مردہ دھنک کے آس پاس

۱۹

آنکھ سے
ٹپکا جو انگاروں پہ اشک
چاند کے دامن میں سورج چھُپ گیا

۲۰

جس پہ میں بیٹھا ہوا ہوں
وہ مری مسند نہیں
قوسِ قزح کا عکس ہے

کاوش بدری

# نذرِ شاذ تمکنت

دکن میں شاذ سے دلی میں زیب غوری سے
ہوئی تھی میری ملاقات آخری امسال
تھی زیرِ غور ابھی ایک کی جدائی ہی
اسی سے صحنِ تصور میں تھا عجب بھونچال
پھر اطلاع ملی دوسرا بھی روٹھ گیا
میں سوچتا ہوں کہ فن کا مزاج داں ہے کون؟
رگِ فنونِ لطیفہ کا راز داں ہے کون!
دیارِ ہند میں گنتی کے لوگ تھے دو چار
پھر ان کے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
مگر یہ شاذ بھی کس تمکنت سے روٹھ گیا

وہ قتل بھی تو نہیں تھا وہ خودکشی بھی نہ تھی
وہ موت بھی تو نہیں تھی وہ زندگی بھی نہ تھی
اس انتقال کو کس نام سے کریں موسوم
ہزار بار وہ مرتا تھا روز مثل جنید
ہم ایسے فرد کو مردوں میں کیوں شمار کریں
شمار اس کا ہے زندہ دلوں میں یاروں میں
مقام اس کا پراگندہ طبع لوگوں میں!
خود اپنی صحتِ کلی کا تھا خیال کہاں

زبان وسعتِ لفظی عزیز تھی اسے
غزل کی آنکھ سے بس دیکھتا تھا وہ نی
وہ گوشِ نظم سے سنتا تھا وعظِ عف
برت رہا تھا ادب کو وہ میکشی ک
رہ خیال کو معشوق کی گلی کی ط
کہ قربِ علم بھی لگتا تھا فاصلے کی
برت رہا تھا وہ مکتب کو میکدے کی
ورق ورق کو پڑھاتا تھا فلسفے کی
ادیب و شاہد و مخدوم و وجد و جاو
کبھی تصوفِ امجد سے ' خوند میری
موازنہ تیرا کر کر کے تھک سا جاتا

بدن کو چادرِ فکرِ رسا نے ڈھانپ
رگوں میں آتشِ سیال سرد ہو نہ
وفورِ تشنہ و بیتابیِ سکون کے بعد
میسر ہے آج تجھ کو سکون بے تا
نصیب آج ہے صہبائے ما سوا تجھ
سمجھ میں آ گئی ہے نیرنگیِ خدا تجھ

کہاں کی تشنہ دہانی کدھر کی تشنہ لبی
میسر آج ہے تجھ کو بلا کی بے خوابی
بجھا چکی ہے بالآخر یہ اذنِ حسنِ ازل
چراغِ تشنہ لبی کو ہوا سے سیرابی
دھرا ہوا ہے فقط زادِ راہ بر لبِ جو
وفورِ تشنہ دہانی دلیلِ عشرِ قابی
شانِ شکن تری کروٹ گواہ ہے اے شاد
دکھا گئی ہے کئی خواب تیری بے خوابی

نہ مہر و ماہ نہ تاروں کے التفات سے ہے
جو رنگ و نور ہے مانوس لفظیات سے ہے
ترے دفاع میں کیا فلسفی و کیا نقاد !
لڑائی مول لی میں نے وحید اختر سے
یہ داستاں سُنے کوئی راشد آذر سے
گناہ گار را سلامت رہے گناہ ترا
ترا گناہ نمازِ ریا سے بہتر تھا
کثیف سجدوں سے افضل تھی میکشی تیری
حریص ذکر سے بالا تھی بیخودی تیری
اسی سے پردۂ شعر و سخن معطر تھا
اسی سے خامۂ حرف و نوا منور تھا

جس اہتمام سے کی تو نے شاعری تا عمر
اس اہتمام سے آنسو بہا نہیں سکتا
جس احتیاط سے الفاظ کو سجایا تھا
اس احتیاط سے کوئی سجا نہیں سکتا

اک ایک مصرعِ تر گویا سلکِ لعل و گوہر
نہ مل سکے گا بدل تیرے خانوادے کو
ملے گا شعبۂ اردو کو لکچرر کوئی !
یتیم کوئی نہ ہوگا اسیر کوئی نہیں !
ترے مزاج کا روشن ضمیر کوئی نہیں
چمن میں ہوگا نہ پھر ایسا دیدہ ور پیدا
دکن میں ہوگا نہ پھر ایسا با ہنر پیدا

وطن میں اب صفِ اوّل کے لوگ کتنے ہیں
در آئے ہیں صفِ سوم کے لوگ اوّل میں
کہیں بھی دوسری صف کا پتہ نہیں چلتا !!

جانے والے تجھے کب دیکھ سکوں بارِ دگر
روشنی آنکھ کی بہہ جائے گی آنسو بن کر

•

رو رہا ہوں کہ ترے ساتھ ہنسا تھا برسوں
ہنس رہا ہوں کہ کوئی دیکھ نہ لے دیدۂ تر

•

میں نے ہر رات یہی سورج کے آنسو پونچھے
منہ دکھانا بھی ہے دنیا کو بہ ہنگام سحر

•

کرشن چندر

(گاہے گاہے باز خواں)

# غالیچہ

اب تو یہ غالیچہ پرانا ہو چکا لیکن آج سے دو سال پہلے جب میں نے اسے حضرت گنج میں ایک دکان سے خریدا تھا اس وقت یہ غالیچہ بالکل معصوم تھا۔ اس کی جلد معصوم تھی، اس کی مسکراہٹ معصوم تھی۔ اس کا ہر رنگ معصوم تھا، اب نہیں، دو سال پہلے۔ اب تو اس میں زہر گھل گیا ہے، اس کا ایک ایک تار مسموم اور متعفن ہو چکا ہے۔ رنگ ماند پڑ گیا ہے، تبسم میں آنسوؤں کی جھلک ہے اور جلد میں کسی آتشک زدہ مریض کی طرح جا بجا گڑھے پڑ گئے ہیں پہلے یہ غالیچہ معصوم تھا، اب قنوطی ہے۔ زہر قند ہنسی ہنستا ہے اور اس طرح سانس لیتا ہے، جیسے کائنات کا سارا کوڑا کرکٹ اس نے اپنے سینے میں چھپا لیا ہو۔

اس غالیچے کا قد نو فٹ ہے، چوڑائی میں پانچ فٹ، بس جتنی ایک اوسط درجے کے پلنگ کی چوڑائی ہوتی ہے، کنارا چوکور بادامی ہے اور ڈیڑھ انچ تک گہرا ہے، اس کے بعد اصل غالیچہ شروع ہوتا ہے۔ یہ رنگ غالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے اور دو فٹ کی لمبائی میں ہے، گویا ۲×۵ فٹ کی مستطیل سرخ رنگ کی ایک جھیل بن گئی ہے، لیکن اس جھیل میں بھی سرخ رنگ کی جھلکیاں، کئی رنگوں کے تماشے دکھاتی ہیں۔ گہرا سرخ، گلابی، ہلکا قرمزی اور سرخ جیسے گندہ خون ہوتا ہے۔ لیٹتے وقت غالیچے کے اس حصے پر میں ہمیشہ اپنا سر رکھتا ہوں اور مجھے ہر بار احساس ہوتا ہے کہ میرے سر میں جونکیں لگی ہیں اور میرا گندہ خون چوس رہی ہیں۔

پھر اس خونی مستطیل کے نیچے پانچ اور مستطیلیں ہیں، جن کے الگ الگ رنگ ہیں۔ یہ مستطیلیں غالیچے کی پوری چوڑائی میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس طرح کہ آخری مستطیل پر

غالیچے کی لمبائی بھی ختم ہو جاتی ہے اور دری کی کور شروع ہوتی ہے ... خونی مستطیل کے بالکل نیچے تین چھوٹی چھوٹی مستطیلیں ہیں، پہلی سپید اور سیاہ رنگ کی شطرنجی ہے اور دوسری سپید اور نیلے رنگ کی، تیسری بلو بلیک اور خاکی رنگ کی، یہ شطرنجیاں دور سے بالکل چیچک کے داغوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں اور قریب سے دیکھنے پر بھی ان کے حسن میں زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ نیلام شدہ پرانے گرم کوٹوں کی جلد کی طرح میلی میلی اور بدنما نظر آتی ہے۔ پہلی مستطیل اگر خون کی جھیل ہے تو یہ تین چھوٹی چھوٹی مستطیلیں مجموعی طور پر پیپ کی جھیل کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ ان کے سپید، کالے، پیلے، بلو بلیک رنگ پیپ کی جھیل میں گڈ مڈ ہوتے نظر آتے ہیں، اس جھیل میں میرے شانے، میرا دل اور میرے پھیپھڑے پسلیوں کے قفس میں دھرے رہتے ہیں۔

چوتھی مستطیل کا رنگ پیلا ہے اور یا پچریں کا سبز ہے لیکن ایسا سبز ہے جیسے گہرے سمندر کا ہوتا ہے ایسا سبز نہیں جس طرح موسم بہار کا ہوتا ہے یہ ایک خطرناک رنگ ہے اسے دیکھ کر شارک مچھلیوں کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ڈوبتے ہوئے جہازرانوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور اچھلتی ہوئی طوفانی، دیو ہیکل لہروں کی گونج اور گرج رعشہ پیدا کرتی ہے اور یہ پیلا اور مٹیالا رنگ تو منحوس ہے، یہ رنگ زعفران کی طرح، بسنت کی طرح پیلا نہیں یہ رنگ مٹی کی طرح پیلا ہے، تپ دق کے مریض کی طرح پیلا ہے، پہلے گناہ کی طرح زرد ہے ایک ایسا زرد رنگ جس میں شاید اک ہلکا سا احساس ندامت بھی شامل ہے، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مستطیل بار بار کہہ رہی ہو، میں کیوں ہوں، میں کیوں ہوں..

جہاں میں اپنا احساس رکھتا ہوں، اس کے دائیں کونے میں نیلے اور پیلے رنگ کے دس خطوط وحدانی بنے ہوئے ہیں اور جہاں میں اپنے پاؤں پسار کے سوتا ہوں وہاں گیارہ خطوط وحدانی ہیں، یہ پیلے اور فیروزی رنگ کے ہیں، غالیچے کے وسط میں چھ خطوط وحدانی سرخ و سپید رنگ میں ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گہرا سیاہ نقطہ ہے۔ جب میں غالیچے پر لیٹ جاتا ہوں، تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر سے پاؤں تک کسی نے مجھے ان خطوط وحدانی کی بانہوں میں جکڑ لیا ہے۔ مجھے صلیب پر لٹکا کر میرے میرے دل میں ایک گہرے سیاہ رنگ کی میخ ٹھونک دی ہے، چاروں طرف گندہ خون ہے

پیپ ہے اور سبز رنگ کا سمندر ہے ، جو شارک مچھلیوں اور سمندری جانور پائیوں سے معمور ہے ، شاید مسیح کو بھی صلیب پر اتنی ایذا نہ پہنچی ہوگی ، جتنی مجھے اس غالیچے پر لیٹتے وقت حاصل ہوتی ہے لیکن ایذا پرستی تو انسان کا شیوہ ہے اسی لیے تو یہ غالیچہ میں اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا نہ اس کی موجودگی میں مجھے کوئی اور غالیچہ خریدنے کی جرأت ہوتی ہے ، میرے پاس یہی ایک غالیچہ ہے اور میرا خیال ہے کہ مرتے دم تک یہی ایک غالیچہ رہے گا۔

اس غالیچے کو دراصل ایک خاتون خریدنا چاہتی تھی ، حضرت گنج میں ایک دکان کے اندر وہ اسے کھلوا کر دیکھ رہی تھی کہ میری نگاہوں نے اسے پسند کر لیا اور وہ خاتون کچھ فیصلہ نہ کر سکی اور اسے وہیں چھوڑ کر اپنے بلاوز کے لیے ریشمی کپڑے خریدنے لگی۔

میں نے منیجر سے کہا۔" یہ غالیچہ میں خریدنا چاہتا ہوں "

"مس روپ وتی ....." وہ خاتون کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

" شاید ... اسے پسند کر چکی ہیں۔ شاید ! — ٹھہریے میں ان سے پوچھتا ہوں۔

روپ وتی بولی۔ " غالیچہ — برا نہیں ! "

" برا نہیں ؟ کیا مطلب ہے آپ کا " میں نے بھڑک کر کہا " ایسا غالیچہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہوگا۔ دانتے کے تخیل نے بھی ایسا نقشہ تیار نہ کیا ہوگا۔ یہ غالیچہ ہسپتال کی گندی بالشی کی طرح حسین ہے ، امراضِ خبیثہ کی طرح روح پرور ہے ، یہ آگ اور پیپ کا دریا حاتم طائی کی یاد دلاتا ہے۔ قدیم اطالوی راہب مصوروں کے شاہکاروں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ غالیچہ نہیں ہے ، تاریخ ہے ، انسان کی روح کی ! "

وہ مسکرائی ، دانت بے حد سفید تھے ، لیکن ذرا ٹیڑھے میڑھے اور ایک دوسرے سے بہت قریب۔ پھر بھی وہ مسکراہٹ اچھی معلوم ہوئی ، کہنے لگی۔

" کیا آپ کبھی اٹلی گئے ہیں ؟ "

میں نے کہا۔ " اٹلی کہاں ! میں تو کبھی حضرت گنج کے اس پار نہیں گیا عمر گزری ہے اسی ویرانے میں ! یہ پان کی دکان اور سامنے وہ کافی ہاؤس "

منیجر نے اب تعارف کرانا مناسب سمجھا۔ بولا۔ " آپ آرٹسٹ ہیں۔ کاغذ پر تصویر کھینچتے ہیں۔ یہ مس روپ وتی ہیں۔ یہاں لڑکیوں کے کالج میں پرنسپل ہو کر آئی

ہیں ابھی انگلینڈ سے تعلیم حاصل کر کے یہاں . . . ''
وہ بولی : "چلیے تو یہ غالیچہ آپ ہی لے لیجیے ' مجھے تو خاص پسند نہیں "۔
" آپ کا بڑا احسان ہے "۔ میں نے غالیچے کی قیمت ادا کرتے ہوئے کہا۔
' کیا آپ میرے ساتھ ـــ کافی پینا گوارا کریں گی ' چلیے نادر الکافی ہاؤس تک '
ارِ خاطر ' یعنی ـــ ''
' شکریہ ـ مگر میں ذرا یہ بلاؤز دیکھ لوں "۔ وہ پھر مسکرائی۔
مسکراہٹ بھی بھلی معلوم ہوئی۔ ذہین بیضوی چہرے کا رنگ زرد تھا۔
ا رنگ پر لبوں کی ہلکی سی سُرخی اک عجیب رسیلا تموج سا پیدا کر رہی تھی۔ بلاوز کا کپڑا
ر جب وہ میرے ساتھ چلنے لگی تو لڑکھڑا گئی۔ میں نے بانہہ سے پکڑ کر سہارا دیا اور
" کیا بات ہے۔ کیا آپ ہمیشہ لڑکھڑا کر چلتی ہیں ؟ "
وہ بولی " نہیں تو . . . " میں نے غور سے دیکھا۔ پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔
" زخم ہے ؟ " میں نے پوچھا۔
' ہاں ـ انگوٹھے کا ناخن بڑھ گیا تھا۔ جلد کے اندر . . . جہاز کا سرجن بالکل
ا تھا . . . . ' اس نے ماتھے پر ساری کا پلو سرکایا اور جب وہ پہلی بار مڑی تو میں
یکھا اس کے بالوں میں گردن کے قریب دائیں طرف گلاب کے زرد پھول لگے ہوئے
پھر جب وہ مڑی تو ماتھے کا قم قم درخشاں نظر آیا۔ اس سے پہلے کیوں یہ قم قم
قدر خوبصورت نہ تھا۔

کافی ہاؤس میں بیٹھ کر معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت تھی ' کچھ تو کافی ہاؤس میں روشنی
نظام ایسا ہے کہ مرد بد صورت نظر آتے ہیں ' عورتیں حسین تر ' پھر ـــ ہاں ـــ
تھا ' ورنہ یہ لوگ بار بار مُڑ کر کیوں دیکھتے تھے ' عورتیں تیز نگاہ سے کیوں گھورتی
' بیرے اتنی جلدی میز پر کیوں آ جاتے تھے۔
وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ " دیکھو بیرا ' تھوڑا سا گرم دودھ اور گرم پانی ایک الگ
لیے میں "۔
" گرم پانی تو ـــ " بیرے نے رک کر کہا۔

"تھوڑا سا گرم پانی بس!" وہ پھر مسکرائی ــــ اور بیرا سر سے لے کر پاؤں تک پگھل گیا، جیسے اس کا سارا بدن شیشے کا بنا ہو۔ میں اسے پگھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور اس کے سارے جسم کو پگھلاتی ہوئی چلی گئی۔ یہ نگاہ کیا ہے؟ یہ تجلی کیسی ہے؟ کیا یہ کافی ہاؤس کی بجلیوں کا شعبدہ تو نہیں؟

"اور بیرا ــــ انڈے کے سینڈوچ!" وہ پھر بولی۔

بیرے نے واپس آکر کہا۔ "جی انڈے کے سینڈوچ تو ختم ہو گئے۔"

"تھوڑے سے بھی نہیں؟" اس کی بڑی بڑی معصوم زخمی سی آنکھیں اور بھی کھلی ہوئی معلوم ہوئیں، بس لاچار! "ایک پلیٹ بھی نہیں۔؟"

سینڈوچ بھی مل گئے۔

"نہیں بل میں ادا کروں گی۔"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں مرد ہوں۔"

وہ ہنسی، "بہت پرانی بات ہے۔" اور اس نے بل ادا کر دیا۔

گھر پر نوکر کو غالیچہ پسند نہ آیا، ان دنوں ایک تنک مزاج شاعر مہمان تھا جو آزاد بحر میں نظمیں لکھا کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور پانچ وقت نماز ادا کرتا تھا۔ اُسے بھی غالیچہ پسند نہ آیا۔ میں نے پوچھا تو بس 'ہوں' کر کے رہ گیا، وہ نظمیں جتنی لمبی لکھتا تھا، باتیں اسی نسبت سے کم کرتا تھا۔

"'ہوں' کا کیا مطلب ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "کچھ تو کہو ان رنگوں کا تناسب۔"

"ہوں۔"

"روپا اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُس سڑے بسے شاعر سے کہنے لگی، "اپنی تازہ نظم سناؤ ... تمہیں معلوم ہے آج کل اسپنڈر اور آڈن، علامیت کے حق میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔"

"ہوں۔" وہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر غرّایا۔

میں نے روپا سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہے؟ کیا ان لوگوں نے تمہیں اپنی نظمیں سنائی تھیں ــــ"

"نہیں — لیکن مجھے جو نے بتایا تھا"

"کون؟ جو؟"

"جو براؤن، نام نہیں سنا ہے کیا؟ آجکل آکسفورڈ کا محبوب ترین شاعر ہے
ہندوستان میں ابھی اس کا کلام نہیں پہنچا، لندن میں مجھ پر عاشق ہو گیا تھا" وہ کچھ عجیب،
بے باک، کچھ شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ کہنے لگی اور رما تھے کا قمقمہ یاقوت کی طرح دمکنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "تمہاری زندگی فتوحات سے پُر معلوم ہوتی ہے"

"نہیں" اس نے آہ بھر کر کہا۔ اس طرح کہ میرا جی چاہا اسے گلے سے لگا لوں۔

"ہوں" شاعر بولا۔

روپ مسکرا کر بولی۔ "تمہارا شاعر بہت باتونی ہے . . . سنو . . تمہیں ایک نظم سناتی ہوں"

"میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا" تم شاعر بھی ہو؟"

"نہیں۔ یہ نظم میری والدہ نے کہی تھی"

"ٹھہرو۔ مجھے یہ غالیچہ بچھا لینے دو"

غالیچہ بچھ گیا اور نظم روپ نے گا کر سنائی، بنگالی نظم تھی، اداس، محزوں، شب
تاریک کی جلی ہوئی، شمع کی طرح خوبصورت تھی، آواز شعلے کی طرح لرزاں، تاثر شراب کی طرح
آگئیں، بنگالی دوشیزائیں قطار اندر قطار، گھڑے اٹھائے ہوئے گھاٹ کی طرف
رہی تھیں، سمندر کی سبز لہریں اچھل رہی تھیں۔ شو جی کا ڈمرو بج رہا تھا۔ پاربتی رقص
رہی تھیں، برف گر رہی تھیں . . . . . . اب فضا خاموش تھی اور روپ کی آنکھوں میں آنسو
تھے . . . آنسو رخساروں سے ڈھلک کر غالیچے پر پڑے اور وہ سرخ مستطیل جیسے
ایک شعلہ بن گئی۔

"تمہیں جو براؤن سے عشق نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

روپ نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ بولی۔ "مجھے جس لڑکے سے عشق تھا اسے
لندن ہی میں تپ دق ہو گیا تھا۔ وہ جہاز پر میرے ساتھ آ رہا تھا، لیکن راستے ہی میں اس
کی موت ہو گئی، عدن سے پرے بحیرۂ سرخ میں!"

"بحیرۂ سرخ" میں نے سوچا اور غالیچے کی طرح مستطیل بحیرۂ سرخ بن گئی اور اس کے
گہرے پانیوں میں مجھے ایک زرد زرد کھانستا ہوا چہرہ نظر آیا اور پھر بھنور میں غائب ہو گیا

محوِ خوابیدہ ہے ۔ محوِ خواب کروپ کا محبوب، سُرخ سمندر کے پانیوں میں اور روپ کے آنسو میرے غالیچے پر گر رہے ہیں۔

"ہوں" شاعر نے کہا اور میں نے ایک کتاب اس کے سر پر دے ماری۔

روپ آنسوؤں میں مسکرادی، بعض اوقات آنسو رونے سے آنسو پینا زیادہ اندوہناک معلوم ہوتا ہے!

روپ!

کیسی عجیب سی لڑکی تھی وہ، لندن میں شاعر جو براؤن اسے محبت کرتا تھا اور لکھنؤ میں حضرت گنج کا یہ آوارہ مزاج غریب آرٹسٹ اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ زہر ہے، وہ کس طرح اس پیالے کو پی گیا، یاسیت، نامرادی، بے بسی، عشق کا جواب ہمیشہ عشق کیوں نہیں ہوتا؟ یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے اور دوسرے کے دل میں برف کی سل بن جاتی ہے، جو محرومِ تمنا کو آنسو رلاتی ہے اور جانِ تمنا کے لبوں پر تبسم ریز سایہ بھی نہیں لاسکتی۔

میں نے غالیچے کو تھپکتے ہوئے پوچھا۔

غالیچے نے کہا۔ میں صلیب ہوں، میں دکھ اور درد جانتا ہوں، دکھ اور درد کی دوا نہیں جانتا!

اور روپ نے کہا۔ یہ قسمت ہے۔ قسمت تمہیں غالیچہ خریدنے کے لیے وہاں لے گئی، قسمت نے تمہیں مجھ سے روشناس ہونے کا موقعہ دیا، اب یہ تمہاری قسمت ہے کہ مجھے تم سے وہ محبت نہ ہوسکی، ہزار کوشش کرنے پر بھی یہ رفاقت محبت میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ یہ قسمت نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر کہنے لگی "شاعر اپنے شعر سناؤ"

چند روز کے بعد اس نے یکایک مجھ سے کہا۔ "مجھے تمہارے شاعر سے محبت ہوگئی ہے"

"جھوٹ ۔۔۔ اس چغد سے ۔۔۔"

"اس کی آنکھیں دیکھیں تم نے" وہ آہ بھر کر بولی "جیسے مسیح دار پر لٹکا ہوا کتنا اندوہ ہے ان میں۔"

میں نے کہا۔ "اگر تم کہو تو میں اپنی آنکھیں اندھی کرلوں۔"
شاید میری تلخی اسے ناگوار گزری۔ سنجیدہ رو ہو کر بولی۔ "کیا کروں۔"
"ہاں دل ہی تو ہے" میں نے طنزاً کہا۔
"ہوں" شاعر بولا۔

جس روز وہ دونوں رخصت ہوئے میں نے گھر پر ایک چھوٹی سی دعوت دی۔
ے ڈھلکے کی سیاہ ساری پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل گہرا تھا۔ ریشمی چوڑیوں
ے بھی سیاہ تھا، ہر روز اسے دیکھ کر اجیالے کا، سورج کا، چاند کا، چاند کی کرن کا،
کا احساس ہوتا تھا ــــ نہ جانے آج اسے دیکھ دیکھ کر کیوں تاریکی کا احساس ہو رہا
کیوں وہ اس اپنی مکمل کامرانی کے لمحوں میں بھی مجسّم یاس و غم کی تصویر دکھائی دیتی
یا یہ غریب آرٹسٹ کے دل کا اندھیرا تو نہیں تھا۔ کیا یہ اس کے برش کی تاریکی تو
! آج میں نے اس سے وہی گیت سننے کی تمنا کی تھی جو اس نے پہلے روز گایا
. . . مجھے یاد ہے گانے کے بعد وہ ناچی بھی تھی۔ میں اس کے پاؤں دیکھتا
دھندلے دھندلے تاریک سے پاؤں جن میں حنا کی سرخ لکیر بجلی کی طرح چمک چمک
، اس تاریکی میں صرف یہاں روشنی تھی۔ وہ ناچتی رہی اور میں اس تاریکی میں
لکیر کا ناچ دیکھتا رہا اور جب ناچ بھی بند ہو گیا تو میں نے وہ پاؤں اٹھا کر اپنے سینے
رکھ لیے، کیوں یہ پاؤں آج تک اس سینے میں محفوظ ہیں . . . کیا اس اہرام میں
ان کے سوائے اور کسی کے لیے جگہ نہیں؟

جب وہ چلی گئی تو میں پھر غالیچے پہ آ بیٹھا، زرد گلاب کی اک کلی اس کے جوڑے
نکل کر غالیچے پر پڑی رہ گئی تھی . . . . میرے دل میں شاید اب روپ کی کوئی یاد
نہیں، صرف یہ دو پاؤں ہیں اور اک یہ گلاب کی زرد کلی . . . . کیسی تصویر ہے یہ؟
تر ہو کر بھی میں نے شاید ایسی عجیب تصویر اس سے پہلے کبھی نہ بنائی تھی . . . پھر!

میں غالیچے سے پوچھتا ہوں۔
غالیچہ کہتا ہے: "میں تو صلیب ہوں، صلیب موت بخشتی ہے، اسے زندگی کی ترتیب
ب، تواتر سے آگاہی نہیں . . . . . . .
اچھا اسے بھی جانے دو۔ جو ہوا سو ہوا، اگر زندگی میں قبر ہی کا مزا لینا ہے تو کیوں نہ

اسے آرام سے حاصل کیا جائے، اگر شہد میں زہر ہی ملا کے پینا ہے تو کیوں نہ خالص زہر پیا جائے، اگر معصومیت برقرار نہیں رہ سکتی تو کیوں نہ گہری معصیت کی آغوش میں پناہ لی جائے۔ آؤ، اپنے دل میں ضمیر کی جو اک ہلکی سی شمع رہ گئی ہے اسے بھی خموش کر دیں اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں گناہ کے پھیلتے ہوئے درد کو دیکھیں اور زندگی کا منہ چڑائیں اور قہقہے لگائیں۔ محبت نہ سہی، بوالہوسی سہی۔

آرٹسٹ نے اک اور لڑکی سے آشنائی کی، وہ بنک میں ملازم تھی، اس کا نام تھا آشا لیکن صورت پہ بالکل نراشا برستی تھی، ایسی بھولی لڑکی تھی۔
کتیا کی طرح ساتھ ساتھ لگی پھرتی تھی، بے چاری، آرٹسٹ کو شاید اس پر رحم آنے لگا تھا، وہ اس کے ساتھ شفقت برتنے لگا، اک مربیانہ، پدرانہ انداز کے ساتھ اب وہ اسے ہر جگہ لیے لیے پھرتا۔ لوگ طنزاً اس کے انتخاب کی داد دیتے اور وہ بظاہر بڑے خلوص سے داد قبول کرتا، کوئی کہتا، بڑی بدصورت ہے وہ، تم نے کیا سوچ کر... تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتا، گھنٹوں اس کی خوبصورتی کا تجزیہ کرتا، کوئلے سے اس نے آشا کی تصویر بنائی تھی اور اپنے اسٹوڈیو میں ہر کس وناکس کو وہ یہ تصویر دکھاتا تھا، وہ اپنے زخم دکھا رہا تھا دیکھو... دیکھو... دیکھو.... مجھے تمہاری کیا پرواہ ہے.... میں اپنی روح کا آپ مالک ہوں۔
زہر خند... کوئلے!

لیکن وہ جو کبھی حضرت گنج کے اس پار نہ گیا تھا۔ اب وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا۔ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے وہ ہزاروں الٹے سیدھے خواب دیکھنے لگتا، رہگذر کے ہر پتھر پر اسے کسی کے پیروں کے دھندلے دھندلے سائے کانپتے ہوئے معلوم ہوتے، کافی کی پیالی کے ہر سانس میں وہ اس کے گرم سانس کا لمس محسوس کرتا اور برقی شمعدانوں کے براق اجالے میں اسے ہزاروں قم قم بوسے دکھائی دیتے، یہ ہنسی؟ وہ مڑ کر دیکھتا، کہاں سے آئی تھی، لیکن یہ تو وہی کشمیری پالتو مینا اپنے پنجرے میں چہک رہی تھی، بلبل قفس کی تیلیاں توڑ کر پرواز کر گئی تھی اور وہ ابھی تک کیوں حضرت گنج کے ویرانے میں مقید تھا... کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ وہ حنائی لکیر بار بار بجلی کی طرح چمک کر اس سے بار بار پوچھ رہی تھی!

اب جب کہ وہ شہر چھوڑ کر جا رہا تھا اس نے اپنے سب دوستوں کو اس ویک لڑکی کو
اکی سب سہیلیوں کو آخری دعوت دی تھی اور جب دعوت کے بعد سب لوگ چلے
تھے تو ویک لڑکی حیران و پریشان اسی غالیچے پر بیٹھی رہی تھی اور پھر یکایک اس کے
سے لگ کر رو پڑی تھی' یہ گرم گرم آنسو جو اس کے سینے میں برف کے پھول بنے
ہے تھے، عشق کا جواب عشق کیوں نہیں ہوتا' یہ کیسی آگ ہے جو ایک کو جلاتی ہے
دوسرے کے دل میں برف کی سِل بن جاتی ہے۔

ایک لڑکی غالیچے پر لیٹی تھی' بازو اوپر کے خطوطِ وحدانی کے بیچ میں تھے۔ پاؤں
کے خطوط وحدانی میں' غالیچے نے چپکے سے اس کے دل میں اک سیاہ میخ ٹھونک
اہرام کے لیے ایک اور ممی تیار ہو گئی' لیکن وہاں جگہ کہاں تھی' سینے میں اب بھی
.و پاؤں ناچ رہے تھے . . . . اور وہی گلاب کی اک زرد کلی!

میں نے غالیچے سے پوچھا "یہ کیسا کھیل ہے؟ میں کس کا منہ چڑا رہا ہوں' یہ زخم کس
ے؟ یہ لڑکی کیوں رو رہی ہے' اگر یہ سب قسمت ہے' تو پھر یہ کاوشِ پیہم کیا ہے
دبھی زندہ کر دینے پر تلی ہوئی ہے"

غالیچے نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں۔ میں تو ایک صلیب ہوں جو دل میں سیاہ
نکلتی ہے' سپید روشنی نہیں لاتی' جو قسمت کا انجام دکھاتی ہے' اس کا آغاز و شباب نہیں!
تجھے جلا کر خاک نہ کر ڈالوں!

اس نئے شہر میں!
چار آدمی غالیچے پر تاش کھیل رہے ہیں۔
دو ایکٹر
دو تجار
اور جو تماشا دکھا رہا ہے وہ آرٹسٹ ہے!

تاش کھیلتے کھیلتے ایکٹر اور تجار لڑنا شروع کرتے ہیں۔ ہاتھا پائی کی نوبت آتی ہے
چا جاتا ہے' کیوں کہ ایک چال میں ایک تجار غلطی سے یا جان بوجھ کر آٹھ آنے زیادہ
'' میرا گریباں تار تار ہو چکا ہے' کیوں کہ جو آدمی لڑائی رفع کرنا چاہتا ہے' وہی

سب سے زیادہ پیتا ہے ۔

پھر میں سوچتا ہوں ، اس بدمزگی کو دور کرنے کا کیا طریقہ ہے ۔ بذلہ سنجی ؟ ناممکن ! گراموفون ؟ واہیات ! چائے ؟ لعنت ! شراب ؟ سبحان اللہ !

سب لوگ شراب پی رہے ہیں ، آرٹسٹ کی آنکھیں سرخ ہیں ، ہمیشہ ہنستے اور خوش رہنے والا خوش شکل ایکٹر ہمیشہ چپ رہنے والے قبول صورت ایکٹر سے کہہ رہا ہے ۔ " محبت ؟ محبت ؟ سالا تو محبت کیا جانے ، ابھی کالج کا لونڈا ہے تو ... ایں ... محبت کا نشہ مجھ سے پوچھ ... سالی یہ شراب بھی بالکل تلخ نہیں ہے .... رانی کو دیکھا ہے تو نے ؟ "

" رانی ۱۹۴۴ء کی بہترین ایکٹرس ہے نا " میں نے پوچھا ۔

" جی ہاں وہ ... وہی .... سالا تو کیا جانے .... وہ میری محبوبہ ہے ... کیسے ؟ ایں ! میں نے اس کے لیے اپنے ماں باپ کی گالیاں کھائیں .... کئی لڑائیاں لڑیں رقیبوں سے .... اپنا گھربار چھوڑ دیا ... یہ انگوٹھی شاٹ دیکھتے ہو ، یہ قمیص کے بٹن ، یہ کف بٹن ، یہ سب سونے کے ہیں ، شالے تو کیا جانے ..... یہ سب اس نے دیئے ہیں .... تحفے .... مگر میں اس سے شادی نہیں کروں گا ۔ کبھی نہیں کروں گا ۔ " اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔

" کیوں ؟ "

وہ مجھے چاہتی ہے ، پر وہ مجھ سے بہت امیر ہے .... وہ چاہتی ہے کہ مجھ سے شادی کرے ، پر میں مرجاؤں گا ، اس سے بیاہ نہیں کروں گا ۔ "

" تمہیں اس سے محبت نہیں ؟ " ایک تجار نے پوچھا ۔

ایکٹر نے مٹھیاں بھینچ کر کہا ۔ " میں جو ہوں وہی رہوں گا ، میں اس سے محبت کرتا ہوں ، لیکن اس کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا ۔ میں اس کی محبت چاہتا ہوں ، دولت نہیں ، اوخ ! " ایکٹر نے زور سے غالیچے پر ہاتھ مار کر کہا ـــــ اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا ۔

" شراب دے حرامزادے " وہ اپنے خالی گلاس کو ٹٹول رہا تھا ۔

" میں نے کہا " رانی ! ارے بھئی آج ہی تو میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ رانی نے ایک امریکن سے شادی کر لی "

یلیٹ نے آہستہ سے شراب کا گلاس غالیچے پر لنڈھا دیا۔ اس کی انگلیاں گلاس کی سطح پر
جم گئیں۔ کانچ اس کی انگلیوں کو زخمی کرتا ہوا ریزہ ریزہ ہوگیا۔
وہ رندھے ہوئے گلے سے کہنے لگا۔ "یہ غلط ہے، بالکل غلط ہے۔"
ارشٹ نے میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھا۔
یلیٹ کا چہرہ! ...... وہ غالیچے پر دونوں انگلیاں ٹیکے میری طرف دیکھ رہا تھا
ہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کا چہرہ گھٹتا جا رہا تھا۔ ممی کے خد و خال ابھر رہے تھے
یہ غلط ہے! بالکل غلط ہے۔" وہ پھر چیخا۔ پھر ایک دم خاموش ہوگیا۔ دوسرا ایکٹر
اس میں شراب انڈیلنے لگا۔ وہ اب بھی خاموش تھا لیکن پہلا ایکٹر غالیچے سے
سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے غالیچے پر قے کر دی ..... مجھے غالیچے کا رنگ
معلوم ہوا۔ سرخ سے سپید و زرد جیسے یہ غالیچہ نہ ہو زندگی کا کفن ہو۔
رانی! رانی!! رانی!!!
صبح میں نے غالیچہ دھلوایا اور صاف کرا کے پھر کمرے میں رکھا کہ میری محبوبہ کمرے
مل ہوی۔ یہ میری نئے شہر کی محبوبہ تھی۔ یہاں آ کر آرشٹ نے پھر عشق کر لیا تھا،
تا کس قدر مشکل ہے لیکن جب عشق ہو جائے، اس کے بعد عشق کرنا کس قدر
ہو جاتا ہے! ہے نا! مردود بولتے کیوں نہیں ہو، جواب دو! میری محبوبہ کے
موٹے تھے، رخسار بھی موٹے، جسم بھی موٹا، ہنسی بھی موٹی، عقل بھی موٹی،
یت نہ تھی، اک دوہرا تہرا غالیچہ تھی، آج اس نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں بنا ڈالی
ران میں چنبیلی کے پھول سجائے تھے۔
وہ غالیچے پر آ کر بیٹھ گئی۔
میں نے اس کی بلائیں لے کر کہا: "آج تو تم قلوقطرہ کو بھی مات کر رہی ہو!"
"کلوپترا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"مصر کی ملکہ تھی۔"
"مصر؟"
"ہاں مصر! وہ ملک جہاں مرنے کے بعد اہرام تیار ہوتے ہیں اور مردوں کی ممیاں
جاتی ہیں ... خدا کرے تمہاری موت بھی قلوپطرہ کی طرح ہو۔"

"ہائے کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا ہوا تھا اُسے ...."

"سانپ نے ڈسا اور مر گئی تھی!"

وہ اک ہلکی سی چیخ مار کر میرے قریب آگئی۔ "ڈراتے ہو مجھے؟" اس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ پھر وہ ہنسی، اپنی موٹی بھدی ہنسی، جیسے بھینس جگالی کر رہی ہو .... پھر اس نے اپنے ہونٹ میرے آگے بڑھا دیے، جیسے کوئی فیاض جاٹ کسی اجنبی شہری کو گنا چوسنے کو دے دے۔

میں نے گنا چوستے ہوئے کہا۔ "یہ غالیچہ جیتا ایک بار ہے لیکن مرتا جا رہا ہے ...
.... آہ .... یہ موت بار بار کیوں آتی ہے .... اب آ بھی جائے آخری موت۔"

"آج تم کیوں بار بار موت کا ذکر کر رہے ہو؟" وہ منمنائی۔

"کچھ نہیں تم نہیں سمجھوگی۔" میں نے کہا۔ "ہاں یہ تو بتاؤ آج تمہارے تازہ لبوں سے، رخساروں سے، آنکھوں سے، بالوں سے، یہ کیسی لطیف خوشبو نکل رہی ہے؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "آج ممو پرے کا خوشبودار تیل لگایا ہے۔"

میں نے غالیچے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا، اس کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔ بے چارہ ایک بار پھر مر رہا تھا، اس کی جانکنی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی، میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

سیدھا اسٹیشن پہنچ گیا، ارادہ تھا، جی بھر کر بیئر پیوں گا، نہ صرف اپنے گردوں کو بلکہ اپنی روح کو بھی جلاب دوں گا تاکہ یہ سارا کوڑا کرکٹ بہ جائے، نکل جائے، طبیعت ہلکی ہو جائے۔

اسٹیشن پر بیئر سے پہلے روپ مل گئی۔

"ارے؟ تم کہاں؟"

"جوناگڑھ گئی تھی پہاڑ پر؟"

"اور شاعر؟"

وہ کھانس کر کہنے لگی۔ "اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔"

"چھوڑ دیا ہے؟ کیوں؟"

"مجھے تپ دق ہے، جوناگڑھ سینی ٹوریم میں گئی تھی نا!"

اس کی نگاہوں میں سبز رنگ کا سمندر تھا اور اک زرد زرد نحیف چہرہ بھنور میں

وسطے کھل رہا تھا۔ پھر وہ چہرہ بھی غائب ہو گیا، اب شاعر کا سڑا بُسا بشرہ لہروں میں تیرنے
، شاعر کا چہرہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ "ہاں"۔
میں نے کہا۔ "کہاں ہے وہ حرامزدہ؟"
"جانے دو۔" وہ محزون انداز میں کہنے لگی۔ "اسے گالی نہ دو، مجھے اس سے ابھی
سے محبت ہے"۔
"لیکن"۔
"ہاں"۔ وہ بولی۔ "اس لیکن کے بعد بھی — اب میں اپنے گھر جا رہی ہوں، میکے،
آرام سے مروں گی"۔
"نہیں نہیں"۔ میں نے سختی سے کہا۔ "اب میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ زندگی نے
ہمیں مجھ سے چھین لیا، اب موت کے دروازے تک ہم دونوں اکٹھے چلیں گے اور اگر اس
دنیا کے بعد کوئی دوسری دنیا ہے تو شاید؟"
وہ ہنسی، وہی جیالی ہنسی، وہی صندلی چہرہ — وہی دمکتا ہوا قمقم۔
میں نے اس کی باتہہ پکڑ کر کہا۔ "گھر چلو —— روپ! جیتے جی تم نے مجھے اپنے ساتھ
نہ رہنے دیا۔ اب موت کے چند لمحے تو بخش دو"۔
وہ مسکرائی۔ بولی۔ "تم نہیں جانتے؟ محبت زندگی میں اور موت میں بھی یکساں
سلوک کرتی ہے!"
گاڑی نے سیٹی دی۔
وہ بولی۔ "مجھے امید نہ تھی کہ کبھی ملو گے! افسوس ہے کہ میں یہاں رُک نہیں سکتی،
ہاں یہ کتاب تمہیں دے سکتی ہوں، اس کی نظمیں"۔
گارڈ نے جھنڈی دکھائی۔
وہ اپنے ڈبے کی طرف چل دی، میں اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ سکا۔ میری
آنکھیں پھر اس کے پاؤں پر گڑ گئیں، وہ پاؤں چلتے گئے، چلتے گئے . . .
اور جاتے ہوئے بھی گویا قریب آتے گئے، بالکل میرے سینے پر آ گئے، اور میں نے
انہیں اٹھا کر اپنے سینے کے اندر چھپا لیا۔
میں نے نگاہ اٹھائی — گاڑی جا چکی تھی۔

محبوبہ ابھی تک میری راہ دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ "کہاں چلے گئے تھے؟"

میں چپ ہو رہا۔

"یہ کون سی کتاب ہے؟"

"لمحے کی۔"

"کیا؟"

"ایک شاعر کی نظمیں ہیں۔"

"مجھے سناؤ، کیا کہتا ہے یہ؟"

میں نے کتاب کھولی، پندرھواں صفحہ آنکھوں کے سامنے آیا۔ آہستہ سے پڑھنا شروع کیا "اے خدا تو نے زندگی اپنی مرضی کے مطابق دی۔ اب موت تو میری مرضی کے مطابق بخش دے تجھ سے اور کچھ نہیں چاہتا ہوں خداوندا!"

"پھر موت!" وہ بولی۔ "برا شگون ہے۔ اس نے کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر الگ کر دی اور اپنے لب میری طرف بڑھا دیئے۔ غالیچہ اُبل رہا تھا۔ بالکل آگ تھا۔ شعلوں کا دریا پیپ کا سمندر، زہر گھولتا ہوا گرم چشمہ، میں نے اس سے پوچھا "تم صلیب ہو، تم نے آدمی کے بیٹے کو مسیحا بنا دیا۔ بتاؤ مجھے کیا بناؤ گے؟"

غالیچے نے کہا۔ "جو تم خود بن چکے ہو، اک اہرام ـــ اک کھوکھلا اہرام جس کے سینے میں ممیاں دفن ہیں۔"

میں نے اپنی محبوبہ سے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے، اس غالیچے کو جلا کر خاک کر ڈالوں۔"

وہ بولی۔ "ہاں! پرانا تو ہو گیا ہے۔"

"لیکن!" میں نے رک کر افسردہ لہجے میں کہا۔ "میرے پاس تو یہی ایک غالیچہ ہے اور یہی ایک زندگی ہے نہ اسے بدل سکتا ہوں نہ اُسے ۔ ۔ ۔ ۔ !!!"

یہ کہہ کر آرٹسٹ گنگنانے لگا۔ ❁ ❁

پریل: ادارۂ فکرونظر
بلاس میں ڈاکٹر غیاث
جہاں دار افسر نے ادبی
پر اظہار خیال کیا۔
میں غیاث، روحی
ز غوری، انور سلیم،
، جہاں دار افسر، فرید
بلال راجہ، جیلانی بیگ
غب فاروقی اور
داسمعیل ظریف نے
—
یل: دیارِ ادب
سے محترمہ انجم قمرسوز
رالدین قمر کے مشترکہ
سوزِ قمر کی رسم اجرا
دق علی سابق گورنر
کے ہاتھوں عمل میں
ب ملک شاہد نے صدارت
فیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر
محمد، ڈاکٹر یم این نگم
یلی اور صلاح الدین نیر
در قمر کی شاعری پر
یا اور مبارک باد دی
یں سوز، قمر سعید
علی جلیلی، امیر احمد خسرو

وقار خلیل

# اُردونامہ

(حیدرآباد کی علمی ادبی و تہذیبی خبریں)

کنول پرشاد کنول، مغنی تبسم، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، محمد منظور احمد رئیس اختر، فیض الحسن خیال، نگم عظمت، عبدالقیوم، منظفر الغفار تاز اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔

۵ر اپریل: مسٹر انجنی کمار گوئل کے مجموعہ کلام "کاسۂ نظر" کی رسم اجرا مسٹر امین فاروق ریاستی وزیر اوقاف نے انجام دی۔ مسٹر ننگروناتھ پرشاد سکسینہ نائب صدر اردو اکیڈمی، جناب محمد منظور احمد اور ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے گوئل کی شاعری پر مخاطب کیا۔

۹ر اپریل: اترپردیش اردو اکیڈمی کی طرف سے حیدرآباد کے ممتاز طنز و مزاح نویس ادیب مسٹر نریندر لوتھر (آئی اے ایس) کو ان کی کتاب "الف تماشا" پر ڈیڑھ ہزار روپے کا ادبی انعام دیا گیا ادارہ سب رس موصوف کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

۱۰ر اپریل: ریاستی اردو اکیڈمی نے ۸۳ء تا ۸۵ء کی (۵۵) ریاستی اردو مطبوعات کو ادبی انعام کا مستحق قرار دیا ہے مگر کتابوں اور مصنفوں کے ناموں کا اعلان نہیں کیا ہے۔

۱۱ر اپریل: مرکزِ ادب کی ماہانہ شعری نشست میں صدر مشاعرہ ماہر حیدرآبادی، اکبر یوسفی، عظیم حیدرآبادی، مومن خاں شوق، شاغل ادیب، اقبال ہاشمی، منیر الزماں منیر، ابوالفاروق شعور، وقار جعفری اور عمر رضا نے کلام سنایا۔

۱۲ر اپریل: مایہ ناز حیدرآبادی ادیبہ اور سماجی مصلح سکینہ بیگم مرحومہ کو ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے ایوانِ اردو میں منعقدہ جلسۂ تعزیت میں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ جناب حامد علی عباسی

صدر ادارہ نے صدارت کی اور قرارداد تعزیت پیش کی جس میں سکینہ بیگم مرحومہ کی ادارہ سب رس اور ادارہ کے شعبۂ خواتین و اطفال سے دیرینہ وابستگی اور حیدرآباد کی تہذیب میں ادب و تہذیب کا ذوق پیدا کرنے میں ان کی مساعی جمیلہ کا ذکر تھا۔ پروفیسر فضل الرحمن سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر ہاشم امیر علی سابق پرنسپل زرعی کالج، مسز رمن راج سکینہ محمود معتمد عمومی ادارہ، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ جناب راشد آذر، وقار خلیل، محترمہ اختر حبیب نے محترمہ سکینہ بیگم کو خراج ادا کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم شریک معتمد ادارہ نے اس موقع پر بتایا کہ سب رس کی طرف سے محترمہ سکینہ بیگم کی خدمات اور یاد کو خصوصی شمارہ کے ذریعہ خراج ادا کیا جائے گا۔

• ادارۂ فکر و نظر کا ماہانہ ادبی و تہذیبی اجلاس جناب تاج مہجور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اختر وامپوری اور راغب قاروقی نے حضرت صفی اورنگ آبادی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مشاعرہ میں شعراء نے کلام سنایا۔

• محفل خواتین کے ماہانہ اجلاس میں فریدہ زین، انیس قیوم فیاض، اور نائلہ خاتون نے کہانیاں پیش کیں اور خواتین شعراء نے غزل سرائی کی۔ محترمہ انجم قرسوز نے اجلاس کی صدارت کی۔

۱۵ اپریل: ڈاکٹر شیام سنگھ ششی ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈیویژن دہلی نے حیدرآباد جرنلسٹس اسوسی ایشن کے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ پبلی کیشنز ڈیویژن اپنی نئی اسکیم یک خاردی ملین کے تحت بشمول اردو تمام زبانوں میں 'ایک روپیے میں ایک کتاب' کی اشاعت عمل میں آئے گی۔ اس موقع پر پروفیسر سیدہ جعفر صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی نے اردو کے تعلق سے مختلف تجاویز پیش کیں۔

۱۸ اپریل: چار روزہ عالمی اقبال سمینار کا افتتاحی اجلاس جنا[ب] مظفر الدین برقی گورنر ہریانہ [کی] صدارت میں منعقد ہوا۔ مرکز[ی] وزیر تجارت مسٹر پی شیو شنکر اور ریاستی چیف منسٹر مسٹر چ[ینا] ریڈی کے علاوہ سابق گو[رنر] اتر پردیش ڈاکٹر بی گوپال [ریڈی] نے نمائش اقبالیات کا افتتاح کیا اور علامہ اقبال کو زبردست خراج ادا کیا۔ جناب عابد [علی] خاں صدر نشین استقبالیہ کمیٹی کے بعد اقبال شناس ماہر[ین] جناب برقی اور مرحوم پروف[یسر] عالم خوندمیری کو نظام اقبا[ل] ایوارڈ پیش کئے گئے۔ چیف [منسٹر] نے خصوصی اقبال لفافہ کی ر[سم] اجرا انجام دی اور کہا کہ علامہ اقبال کی خصوصی یادگار کے قیا[م] میں حکومت بھرپور تعاون کرے گی۔ جناب برقی نے کلیدی خطبہ ارشاد فرمایا۔ جناب کریم رضا نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے افتتاحی اج[لاس] کی نظامت کی جناب شاہ[د] خاں معتمد استقبالیہ نے شکریہ ادا کیا۔

کی گلپوشی کی۔

اس شب ہندپاک مشاعرہ میں مسرز اطہر راز (لندن)، عقیل شگفائی، حمایت علی شاعر، سلطانہ مہر، مجیب خیر آبادی (پاکستان)، مجروح سلطان پوری، جگن ناتھ آزاد، اختر سعید، ست نام سنگھ خمار، والی آسی، منور رعنا، بیگم ممتاز مرزا، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، عزیز قیسی، خواجہ شوق، صلاح الدین نیر اور ڈاکٹر تلمیذ نے کلام سنایا۔ ملک زادہ منظور احمد نے نظامت کی۔ جناب مظفر برنی اور مسٹر شیو شنکر نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت میں شرکت کی۔

۱۹ راپریل : حیدرآباد لٹریری فورم، فیض لٹریری فورم اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ایک خوشگوار اجلاس میں پاکستانی سخنور جناب حمایت علی شاعر کے مجموعہ کلام "حرف حرف روشنی" کی رسمِ اجرا صدرِ جلسہ مسٹر شیو شنکر کے ہاتھوں سابق صدر شعبۂ انگریزی عثمانیہ یونیورسٹی کے ہاتھوں انجام پائی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر مغنی تبسم، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر انور معظم نے شاعر کی سخنوری پر اظہارِ خیال کیا اور مبارکباد پیش کی۔ جناب غیاث متین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۲۰ راپریل : عالمی اقبال سیمینار کے چھ اجلاس کو تین دن تک نامور اقبال شناس دانشوروں نے مخاطب کیا، جن میں پروفیسر غلام رضا تبریزی (اوتبرالو یونیورسٹی) اور نیامیکس (سوویت یونین)، ڈاکٹر جمال الدین (مصر)، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر تارا چند رستوگی، ڈاکٹر عمر کمال، پروفیسر معین الدین عقیل، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر انور معظم، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر سید سراج الدین، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر یوسف سرمست، ممنون حسن خان، ظہیر الدین احمد، ضیاء شکیل اور یوسف اعظمی قابلِ ذکر ہیں۔

• ریاستی اُردو اکیڈیمی نے عالمی اقبال سیمینار کے مندوبین کا اپنے دفتر میں خیر مقدم کیا۔ جناب اکرام جاوید صدر مجلسِ عاملہ اکیڈیمی نے صدارت کی۔ جناب خلیل الرحمٰن ڈائرکٹر اکیڈیمی نے سرگرمیوں سے واقف کرایا اور مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ محفلِ شعر میں حمایت علی شاعر، جگن ناتھ آزاد، عزیز قیسی، ملک زادہ منظور احمد، طالب خوندمیری، اختر حسن اور مرزا فائق ترکانی نے کلام سنایا۔ یوسف اعظمی نے نظامت کی۔

۲۱ راپریل : اردو اسوسی ایشن ساؤتھ سنٹرل ریلوے کا ادبی و شعری اجلاس جگن ناتھ آزاد کی صدارت میں ہوا۔ مہمانانِ اور یوسف ترکی نے شکریہ

تخلیقات پیش کیں، علی جلیلی، مضطر مجاز، رومی قادری، شمیم نصرتی، رؤف خیر، علی الدین نوید، محسن جلگانوی، اقبال ہاشمی، فکری بدایونی، شاغل ادیب اور ثریا جبیں نے کلام سنایا۔

۲۴ر اپریل: شعبۂ اردو حیدرآباد یونی ورسٹی کے زیر اہتمام دکنی ادب پر سیمینار منعقد ہوا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی (بمبئی) نے پہلے سیشن کی صدارت کی۔ پروفیسر مغنی تبسم مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے کلیدی خطبہ پڑھا۔ پروفیسر ہاشم علی (میسور) اور ڈاکٹر رشید موسوی نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر محمد انورالدین نے نظامت کی۔ سیمینار کا دوسرا سیشن پروفیسر سیدہ جعفر کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر ہاشم علی مہمانِ خصوصی تھے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے مقالہ پیش کیا۔

• ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی یونی ورسٹی) اور پنجاب یونی ورسٹی کے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے مختلف شعبوں کا ایوانِ اردو میں معائنہ کیا اور بانیٔ ادارہ پروفیسر زورؔ مرحوم کی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

• فیض میموریل انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے نامور ترقی پسند دانشور و صحافی سبطِ حسن (متوفی ۲۰ر اپریل ۱۹۸۵ء دہلی) کو جلسۂ تعزیت میں خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شیو کے کمار، پروفیسر مغنی تبسم، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، جناب حمایت علی شاعر، ڈاکٹر ست نارائن اور جناب قدیر زماں نے سبط حسن مرحوم کی خدمات اور یادوں کے تناظر میں مخاطب کیا۔

۲۳ر اپریل: سید سبط حسن مرحوم کو مختلف تعزیتی جلسوں میں ترقی پسند مصنّفین حیدرآباد، ادارۂ فکر و نظر، ادارۂ تنظیم اردو اور عوامی ادبی سوسائٹی کی طرف سے خراج ادا کیا گیا۔

• شعبۂ اردو حیدرآباد یونی ورسٹی کے زیر اہتمام 'ذرائع ابلاغ کے لیے اردو تحریریں' کے موضوع پر سمینار ڈاکٹر مجاور حسین رضوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم وزیٹنگ پروفیسر مہمان خصوصی رہے۔ جناب جلیس آل انڈیا ریڈیو، ڈاکٹر یوسف کمال، جناب امتیاز تاج (T.V.) اور ڈاکٹر بیگ احساس نے مخاطب کیا۔

۲۷ر اپریل: اردو مجلس کا ماہانہ اجلاس ڈاکٹر صفدر رضا بیگ کی صدارت میں ہوا۔ جلیس نے "سبط حسن: فن اور شخصیت" پر مقالہ سنایا۔ صدر جلسہ نے سراج اورنگ آبادی پر مخاطب کیا۔ محفل شعر میں ڈاکٹر صفدر، صلاح الدین نیر، (معتمد اردو مجلس) منیر الزماں منیر، منان منظور اور انور ہاشمی نے کلام سنایا۔

13 OCT 1986

7

به یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

سن اجرا ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

# ماہنامہ سب رس حیدرآباد


جلد (۴۹) جولائی ۱۹۸۶ء شمارہ (۷)



مدیر اعزازی : مغنی تبسم

شریک مدیر : منظور احمد

معاون مدیر : وقار خلیل

مجلس مشاورت :

صدر : محمد حامد علی عباسی

نائب صدر : ہاشم علی اختر

معتمد : پروفیسر مغنی تبسم

ارکان :

عابد علی خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ

محمد اکبر الدین صدیقی، رمن راج سکسینہ،

پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد



قیمت فی پرچہ ۲ روپے ۵۰ سالانہ ۳۰ روپے کتب خانوں کیلیے ۳۵ روپے

بیرونی ملکوں سے :

| ہوائی ڈاک سے | | بحری ڈاک سے |
|---|---|---|
| مشرق وسطیٰ | ۱۵ ڈالر | ۶ ڈالر |
| امریکہ | ۲۰ ڈالر | ۷ ڈالر |
| پاکستان، برما، سیلون | ۱۰ ڈالر | ۲ ڈالر |
| انگلستان | ۸ پونڈ | ۳ پونڈ |

مکاتبت کا پتہ : ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲

راج سکسینہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپوا کر دفتر سب رس ... حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲ سے شائع کیا۔

# اپنی بات

ادھر چند برسوں سے ہندوستان میں اردو تحریک خلفشار کا شکار ہو چکی ہے۔ تحریک میں مرکزیت باقی نہیں رہی ہے۔ مختلف جماعتیں اور تنظیمیں جداگانہ نقاطِ نظر رکھتی ہیں۔ جس کی وجہ سے متضاد قسم کے مطالبات ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے آگے رکھے جاتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں الگ اردو کے مسئلہ کا استحصال کر رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکزی انجمن ترقی اردو ایک فعال رہنمایانہ کردار ادا کرتے ہوئے اردو کے تمام بہی خواہوں کو ایک مرکز پہ مجتمع کرے۔ ہمارا خیال ہے کہ سہ لسانی فارمولے پر سب کو متحد الخیال ہونا چاہیے۔ یو پی کے سوا تمام ریاستوں میں اردو کے ایک جیسے مسائل ہیں ان میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ مناسب نہیں دستوری اور قانونی تحفظات اور ان پر عاجلانہ عمل آوری کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔

یو پی میں اردو کا جائز حق یہ ہے کہ اسے دوسری سرکاری زبان بنایا جائے۔ اس مطالبے کی تکمیل میں جو دشواریاں حائل ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اگر خیر سگالی کا جذبہ ہو تو اردو اور ہندی ایک دوسرے کی معاون زبانیں بن سکتی ہیں۔ اس کے لیے ہندی کے سنجیدہ اور بے تعصب دانشوروں اور ادیبوں سے خوشگوار ماحول میں بات چیت کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو کا نصاب تعلیم ایسا بنایا جائے کہ بچے اردو کے ساتھ لازمی طور پر ہندی بھی سیکھیں۔ اس کے فائدے بھی پہنچیں گے۔ اس کے جواب میں ہندی والے بھی (بالخصوص یو۔پی میں) اردو کو ہندی کے ساتھ شریکِ نصاب کریں تو ہندی اور اردو والوں کے حق میں یہ بات مفید ہوگی اور ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے فروغ پانے کی راہ آسان ہو جائے گی۔

مغنی تبسم

## ترتیب

★

(آں جہانی) پروفیسر سری رام شرما

# علی نامہ

دکنی کے مشہور شاعر نصرتی کی تین تصانیف ملتی ہیں۔ (۱) گلشن عشق (۲) علی نامہ (۳) تاریخ اسکندری۔ ان کے علاوہ متعدد قصیدے، غزلیں اور رباعیات بھی دستیاب ہوئی ہیں۔

بحیثیت شاعر نصرتی اپنی زندگی میں ہی شہرت پاچکا تھا۔ بعد کے شعرانے اسے نہایت احترام کے ساتھ یاد کیا ہے۔ ہاشمی نے لکھا ہے۔

دیکھیں گے جتنے شاعراں تھے تمام ‌ ‌ ‌ ‌ اُن میں رہے نصرتی جیوں امام

نصرتی کی نظر سے عادل شاہی خاندان کے تین تاجداروں کے دور سے گذرے۔ محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ء۔۱۶۵۷ء) علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۷ء ۔ ۱۶۷۲ء) اور سکندر عادل شاہ (۱۶۷۲ - ۱۶۸۶ء) علی نامہ ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۶ء میں لکھی گئی تصنیف ہے۔

لکھا ختم کا میں جس جو یو کراس ‌ ‌ ‌ ‌ ہزار ایک سو ستر پو تھے چھے برس

علی عادل شاہ کو اس کے دور حکومت میں چھوٹی موٹی کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ خاص طور پر دور حکومت کے اولین سات برس لڑائیوں میں گزرے۔ جے سنگھ کے ساتھ اس کی سب سے بڑی جنگ ہوی۔ جے سنگھ کے ساتھ لڑنے کے بعد سات برس تک علی عادل شاہ نے اطمینان کے ساتھ حکومت کی۔ نصرتی نے اس زمانے کے کسی واقعہ کا ذکر اپنی تصنیف میں نہیں کیا۔ درحقیقت شاعر کا مقصد جنگوں اور فتوحات کا بیان تھا۔ جیسا کہ فردوسی نے "شاہنامہ" میں ایران کے سپوتوں کی بہادری کا بیان کیا ہے۔ نصرتی نے شروع میں ہی لکھا ہے۔

حمد اول ہے خدا کا کہ جنے روز ازل ‌ ‌ ‌ ‌ دیا ہے ہمت مرداں کوں جو توفیق سوں بل

رکھیا اس سے فتح کے نامے کا علی نامہ "نانوں" ‌ ‌ ‌ ‌ جس کا ہر رزمیہ رستم کے گلے کا ہیکل

نصرتی اپنے سرپرست علی عادل شاہ کے جاہ وحشمت کو اپنے اور بیجاپوری عوام کے لیے بھی باعث فخر تصور کرتا ہے علی نامہ اسی احساس کی غمازی کرتا ہے۔ وہ کسی ایک شخص کی فتح کی داستان نہیں ہے بلکہ تمام بیجاپور کے عوام کی داستان فتح تھی علی نامے کا شاعر چارن یا بھاٹ نہیں ہے۔ وہ حب الوطن قومی شاعر کے روپ میں منظر پہ آیا۔ اس نے "علی نامہ" کو فتح نامہ کہا۔

کہ میں فتح نامہ لکھیا ہوں سو آج ؎ نہ اکثر کیا بات مضمون باج

نصرتی عظیم شاعر ہے وہ مناظر اور واقعات کی من و عن عکاسی کرتا ہے۔ فتح کی وجہ سے وہ جھوم اٹھتا ہے پھر بھی اس نے حقائق سے منہ نہیں موڑا۔ اور "نہ اکثر کیا بات مضمون باج" کو پورا کر دکھایا۔

بیجاپور کے دشمنوں کے لیے نصرتی کی نفرت فطری ہے لیکن اس نفرت کی وجہ اس نے دشمن کے سپاہیوں کو ہمیشہ گری ہوئی نظر سے اور اپنے سپاہیوں کو ہمیشہ اونچی نظر سے نہیں دیکھا اسی لیے اس نے اپنے رزمیے کو تاریخ کا نام دیا ہے۔

کیا جیوں او تاریخ لکھنی شروع ؎ ہوا فیضِ حق نطق کے جانب رجوع

اس تاریخ کو بنیاد بنا کر نصرتی کی دلہن بیل منڈوے چڑھی"

کیا میں بچن بیل کوں یوں بڑی ؎ بڑی سو فلک کاچ منڈوا چڑی

تاریخ اور فنِ شعر کا ایسا عمدہ امتزاج عہد وسطیٰ کے ادب میں کمیاب ہے۔ نصرتی نے ایک مورخ کی حیثیت سے واقعات جمع کیے اور شاعر کی حیثیت سے ان واقعات کے پیچھے کام کرنے والے جذبات کو محسوس کیا۔ بیجاپور کی داستان فتح میں بیجاپور کے شہریوں کی جسمانی اور ذہنی قوت کا اظہار ہوا ہے۔

نوراللہ ابن قاضی سید محمد علی الحسنی بیجاپوری نے اپنی تصنیف "تاریخ عادل شاہی" میں اس واقعہ کو بطور تاریخ لکھا ہے۔ "تاریخ عادل شاہی" اور "علی نامہ" کا موازنہ کرتے ہوئے، دیوی سنگھ چوہان نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ "مورخ نوراللہ اور نصرتی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تاریخی پس منظر کو نصرتی نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اس گہرائی تک نوراللہ نہیں پہنچ سکا۔ مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا نصرتی کو اندازہ ہے"۔

علی نامہ کا ہیرو یا مرکزی کردار علی عادل شاہ ثانی بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین، دور اندیش اور شعرا کا سرپرست تھا علوم و فنون کی رغبت اسے ورثے میں ملی تھی۔ علی عادل شاہ اعلیٰ مرتبہ کا شاعر تھا نصرتی نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

ترے شعر نے شاعراں کوں لاہے نور ؎ مضامیں معانی کے گردوں کا سور

علی عادل شاہ ثانی صرف ادب دوست حکمراں ہی نہیں تھا بلکہ وہ بہادر بھی تھا۔ اس کے نام سے ہی دشمنوں کی جان نکل جاتی تھی

علی عادل شاہ کی تلوار کا مارا مرت سے بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ علی کی بہادری کا بیان کرتے وقت نصرتی نے ہندوستانی ادبیات میں مروجہ بے شمار آکیتوں کا استعمال کیا ہے۔

غضب ہوں توں تک جھانک دیکھے پاتال　　ڈھلے ڈھاک سوں شیش واثق کی کھال

ماخذ (۱) علی نامہ کی شروعات طویل تمہید سے ہوتی ہے تمہید سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ پوری مثنوی رزمیہ ہے۔ نصرتی نے شیعہ شاعروں کی طرح حمد کے بعد نعت خوانی کی ہے۔ پھر حضرت علیؓ اور بارہ اماموں کی مدح لکھی ہے۔ دیگر خلفاء کے متعلق اس نے کچھ نہیں لکھا۔ بارہ اماموں کے بعد علی عادل شاہ ثانی کی مدح کی ہے۔ جس کی وجہ سے پورا رکنا خوش ہے۔

"جسے ہے شاہ عادل سبھی میں ولی　　علی اسم سلطان محمد بلی"

"دکن نت ہے اس خنجر نے باغ باغ　　کر تیں گھر ہے تج سا کر شب چراغ"

نصرتی پوری مثنوی میں ویر رس کا بیان کرنے جا رہا ہے، لہٰذا وہ تمہید میں ہی محسوس کرتا ہے اللہ نے جانداروں کو حفاظت کے لیے ہتھیار دیے ہیں۔ اس بیان کے ذریعے نصرتی عوام کے دل میں آزادی کے لیے لڑنے مرنے کا احساس بھر دیتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اعلان کرنا چاہتا ہے کہ آزادی کے تحفظ کے لیے عادل شاہ نے مغلوں کے خلاف ہتیار بدست ہو کر فرض کو پورا کیا۔ حفاظت کا جذبہ سبھی جگہ موجود ہے شاعر خدا کی عظمت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

"توں سرجیا ہے جی شی بزرگی کے کاج"　　کیا نیں بڑا تا مسل کوئی ہتیار باج

"فلک کوں جو تاریاں کے جوشن دیا　　علم سوں چندنی کے روشن دیا"

"دیا تس کھرگ سورسا تاب دار　　سورج کوں دیا خنجر ان آب دار"

"سمندر میں موجاں ہتیاراں کی فوج　　جواہر کے ہتیار پانی کی موج"

علی نامہ میں بیان کردہ واقعہ کو مختصراً یہاں دیا جا رہا ہے۔ جس سے یہ پتہ چل سکے کہ نصرتی نے تاریخ کا کس حد تک فائدہ اٹھایا ہے اور تاریخی واقعات کو پیش کرنے کا اس کا ڈھنگ کیا ہے۔ مثنوی کی ابتداء محمد عادل شاہ کے انتقال سے ہوتی ہے علی عادل شاہ ثانی کے تخت نشین ہوتے ہی۔ بیجاپور کے سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ دشمنوں نے سر اٹھایا۔ محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ء ۔ ۱۶۵۶ء) کے دور حکومت میں ہی شیواجی نے اثر بڑھانا شروع کیا تھا۔ شیواجی کی وجہ سے دکن میں انتشار پیدا ہوا۔ شیواجی کے لیے نصرتی کی نفرت کی وجہ یہ ہے کہ وہ بیجاپور کے خلاف کام کر رہا تھا۔ شیواجی

جس موقع سے فائدہ اٹھایا، اسے نصرتی نے ٹھیک طرح سے سمجھا

دکن ہور مغلاں کے درمیاں ⁂ وطن دھر کوہستان میں غاده نہاں

جیسے ہی علی تخت نشین ہوا شیواجی نے فوراً بیجاپور کے پنالہ قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

دغا سوں نچہ ایک چور مارگ تے چڑ ⁂ کیا قبض جا کر پنالے کا گڑ

سدّی جوہر نے پنالہ قلعہ کا گھیرا ڈالا ۔ ۲۵ر فروری ۱۶۶۰ء کو شیواجی پنالہ سے وشال گڑھ گیا ۔ سدی جوہر نے اس کا پیچھا کیا لیکن کامیابی نہیں ملی ۔ مغلوں کی مدد سے ۱۶ر جنوری ۱۶۶۶ء کو شیواجی نے پنالہ پر اچانک حملہ کیا لیکن بیجاپوری سپاہیوں نے اسے ہرا دیا۔

اس فتح کے ساتھ علی نامہ شروع ہوتا ہے۔ پنالہ فتح کی تاریخ نصرتی نے لکھی ۔

وہیں یوں فتح کی تاریخ نصرتی بولیا ⁂ علی نے پل میں پنالہ لیے صلابت سوں

"پنالہ لیے" سے ۱۰۷۰ھ م ۱۶۶۰ء نکلتا ہے ۔ علی کی پہلی فتح سے نصرتی زیادہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس وقت شیواجی کی طاقت کتنی تھی ؟ شاعر کہتا ہے ، علی کسی بڑی طاقت سے مقابلہ کرے بعض ہی اس وقت طاقت ور مانے جاتے ہیں ۔ نصرتی مغلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

نہ کرنا جیوں شرزہ ، خرگوش سات ⁂ کہ ان مارنا مست ہاتھی پہ بات

شیواجی کے پیچھے وقت ضائع کرنا بے کار ہے ۔

لگ اس کے پیچھے جیب جو دن سارنا ⁂ کہ جیوں کھود ڈونگر چوہا مارنا

پنالہ قلعہ حاصل کرنے کے بعد علی نے تورگل کے قلعے پر حملہ کیا ۔ یہاں کے قلعہ دار جوہر صلابت خاں نے بغاوت کی تھی ۔ علی نے اس کی سرکوبی کی ۔ علی کی یہ دوسری فتح تھی ۔

ملناڈ کے راجہ نے بغاوت کی علی نے فوج بھیج کر اس بغاوت کو دبا دیا ۔ یہ علی کی تیسری فتح تھی ۔

کچھ دن خاموش رہ کر شیواجی نے پھر اپنی کوششیں جاری رکھیں ۔ اس مرتبہ شیواجی نے مغلوں کو تختہ مشق بنایا۔ مغلوں کی طرف سے شائستہ خاں دکن کا صوبہ دار بن کر آیا۔ اس نے ۱۶۶۰ء میں شیواجی کا پونا شہر لے لیا۔ شیواجی کا بچپن جس گھر میں بیتا تھا شائستہ خاں اسی گھر میں رہنے لگا ۔ شائستہ خاں کا معاون جسونت سنگھ دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ سینہ گڑھ کے راستے پر پڑاؤ ڈالا ہوا تھا ۔ ایک رات شیواجی چار سو سپاہیوں

کے ساتھ چھپ کر شائستہ خاں کے ڈیرے کی طرف چلا۔ راستے میں اس نے بتایا "ہم شاہی فوج کے سپاہی ہیں۔" آدھی رات کو شائستہ خاں کے یہاں پہنچا۔ رمضان کا چھٹا دن تھا۔ شائستہ خاں ہتیار بھی نہیں اٹھایا پایا تھا کہ شیواجی کی تلوار سے اس کی ایک انگلی کٹ گئی۔ اس کا بیٹا مارا گیا۔

نصرتی نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔۔۔

کہ شائستہ خاں تب سہیلیاں میں تھا	کرت بار سکھ خوش رنگیلیاں میں تھا
جو تھے گھر کے چوندھر نگہباں کتے	ہریک ٹھار انگے بن کے مدیاں کتے
سوتا تھا تو تس نیند جاتے اُچٹ	اُچھایا کر ڈگ آپ اَت موں پہ سٹ
نہ اس کوں مقابل پہ آنے دیا	نہ ہتیار پر ہات بھانے دیا
لگیا کھپ کے جلد واراں پہ وار	لگے گھاؤ پر گھاؤ سب تن منجھار

یہاں سے آگے تاریخ اور علی نامہ میں تھوڑا سا فرق آتا ہے۔ جسونت سنگھ شائستہ خاں کے جائے مقام سے کچھ دور اپنی چھاؤنی میں تھا لیکن اس نے شیواجی کا پیچھا نہیں کیا۔ شائستہ خاں کے بعد شہزادہ معظم دکن کا صوبہ دار بنا اور اورنگ آباد میں رہنے لگا۔ جسونت سنگھ پونا میں رہا۔ جسونت سنگھ چھ مہینے تک کونڈانا گھیرے رہا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ 28 مئی ۱۶۶۴ء کو وہ صوبہ دار کے پاس اورنگ آباد لوٹ گیا۔

نصرتی نے علی نامہ میں لکھا ہے، شائستہ خاں کے لوٹنے پر اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو شیواجی سے لڑنے کے لیے بھیجا۔ جسونت سنگھ بیجاپور کے دشمن کا سپہ سالار تھا، پھر بھی نصرتی نے اس کی بہادری کے متعلق واجبی رویہ اختیار کیا ہے

جسونت سنگھ اس پہاڑی علاقے میں پہنچا بھی نہیں تھا جہاں شیواجی موجود تھا۔ اسی بیچ شیواجی نے سورت نگر لوٹ لیا۔ نصرتی علی عادل شاہ کا فتح نامہ لکھنے بیٹھا ہے، پھر بھی اس نے شیواجی کے حرکات و سکنات کو منصفانہ نظر سے دیکھا ہے، ورنہ شائستہ خاں اور جسونت سنگھ کے ساتھ شیواجی کی جنگ اور شیواجی کی سورت کی مہم کا حوالہ علی نامہ میں جگہ نہیں پاسکتا۔

جس وقت شیواجی نے سورت شہر پہ حملہ کیا، وہاں انگریز اور ڈچ تاجر رہتے تھے۔ یورپی تاجر

سمندری راستے سے آنے والا سامان یہیں اُتارتے تھے اور یہاں کا سامان سمندری راستے سے درآمد
اس طرح سے سورت ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ تجارت کے علاوہ عازمین حج بھی یہیں سے سوار ہوتے تھے۔
کا قلعہ تاپتی کے جنوبی ساحل پر سمندر سے بارہ میل دور تھا۔ پورا شہر چار میل کے گھیرے میں بسا تھا
پانچ جنوری ۱۶۶۴ء کو صبح سورت میں خبر پھیلی کہ شیواجی کی فوج آرہی ہے اتنے میں اطلاع ملی شیواجی شہر سے
دور ہے۔ قلعہ دار عنایت خاں بھاگ گیا۔ ۶ جنوری ۱۶۶۴ء کو شیواجی سورت نگر کے قریب آیا۔
برہان پور ۔ دروازے کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ شیواجی نے وہاں کے گورنر اور حاجی سید بیگ، بہارجی بو
حاجی قاسم (تینوں سورت کے ممتاز تاجر) کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اس سے ملیں۔ جواب نہ ملنے
سپاہی شہر میں گھس گئے۔ گھر دکان لوٹ کر آگ لگانے لگے۔ چہارشنبہ سے جمعہ تک لوٹ چلتی رہی
کو لوٹ سے ایک کروڑ روپئے بہت سا سونا اور جواہرات وغیرہ ملے۔ یہ روپیہ شیواجی کے بہت
اس روپے سے شیواجی نے اپنے قلعوں کو سدھارا، ہتھیار خریدے اور سپاہیوں کی نئی بھرتی کی۔
سورت کا بیان اس طرح کیا ہے:

رہیں بحر و خشکی کے تجار جاں ؎ ملے بست عالم میں جو نیں سو دہاں
اک اک کو نچہ لک شہر معمور اچھے ؎ ہر اک گھر میں کئی گنج بھر پور اچھے
لیوے ہندنت فیض اس تے نول ؎ کہ جیوں ابر کوں آب دریا تے بل

سورت کی لوٹ کا ذکر نصرتی نے اس طرح کیا ہے:

مغل کو لگا کھیل میں واں ادھر ؎ بندر پر اپے اوٹھ کو دوڑیا ادھر
انکھیاں کھول دیکھے نہ لک تل میں ڈانپ ؎ بھرے گنج پر جلکے بیٹھا ہو سانپ

سورت کی لوٹ کے بعد کہانی علی عادل شاہ کے پاس پہنچتی ہے۔ سورت کی لوٹ سے اورنگ زیب کو
بڑا غصہ آیا۔ عازمین حج کو اس سے تکلیف پہنچی تھی۔ اورنگ زیب غضب ناک ہوگیا۔

اس مرتبہ اورنگ زیب نے علی عادل شاہ کو مددگار سمجھا۔ اس کا خیال تھا:

نہ برسے علی کا جو تیغ اس پہ نیر ؎ سلگتی یو: اگ آئے دہلی کی دھیر

اس بیان سے نصرتی نے دونوں پلڑے برابر کر دیئے۔ پہلے علی عادل شاہ ثانی نے شیواجی کے خلا

ساتھ دیا، پھر شیواجی علی کی مخالفت میں مغلوں کا ساتھی بن گیا۔ دکن میں شیواجی اور علی باری باری سے پھوٹ کا شکار رہے۔

اورنگ زیب نے جے سنگھ کو سپہ سالار بنا کر دکن میں بھیجا۔ علی نے دربار میں شیواجی کے خلاف لڑنے کے لیے پان کا بیڑا رکھا۔ خواص خاں نے بیڑہ چبایا۔ اس نے سوچا جب تک مغل فوج آئے شیواجی کی تباہی بیجاپور کے لیے موافق ہوگی:۔۔

کہ میں کھا دیا ہوں علی کا نمک ؎ مغل آئے لگ یہاں مجھے کیا اٹک
کہ باغی کی مجلس و ساقی نا رہے ؎ مغل آتے لگ دور باقی نہ رہے

خواص خاں گھاٹ اُتر آیا۔ شیواجی نے مغلوں سے لڑنے کے لیے جو فوج جمع کی تھی راتوں رات اسے لے چل پڑا:

رین کالے اس چور نے آسرا ؎ چلیا خان پر فوج کا بند پھرا

دونوں فوجوں میں رات کے وقت جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں شیواجی شکست کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ شیواجی کی ہار سے اورنگ زیب کو فکر ہوئی۔ شیواجی ایک اونچے قلعے میں قیام پذیر ہوا۔ جے سنگھ نے وہ قلعہ گھیر لیا۔ مغلوں کے متعلق نصرتی کا خیال تھا:۔۔

مغل آرسی گڑھ کوں لٹ پٹ رہا ؎ قرار اس کوں لیتا چ کر گھٹ ہوا
کمک کیں تے نئیں آن ہاری اگر ؎ رہے بیٹھ خوش جان خالہ کا گھر

شیواجی مغلوں سے لڑنا مناسب نہیں سمجھا داخلی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچی:۔

کہیا گھر تے بہت دھو بلا ٹالتا ؎ نہ جپ گھر بہا بر اپس جالتا
منڈ ما سا گوانا بھلا سب کے ٹھار ؎ کہ باپچیا تو یک سر منڈا سے ہزار
مغل سوں توں میں سخت کیتا ہوں کھوڑ ؎ کہ لے گڑ مجے جپ نہیں گے چھوڑ

شیواجی نے حکمت عملی سے کام لیا۔ جے سنگھ سے کہا:

کہ گر آج تم تیغ پکڑتے ہیں ہات ؎ تو کرتا ہوں اک کام اس دھات سات

تم اتنی بڑی فوج لے کر خالی ہاتھ کیوں جاتے ہو؟ بیجاپور پر قبضہ کیوں نہیں کرتے۔ اس طرح شیواجی نے مغلوں کو

کے خلاف کھڑا کر دیا۔ شیواجی اور جے سنگھ کی دوستی کی وجہ نصرتی نے یہ بتائی ہے کہ وہ دونوں ہندو تھے۔

کہ تھا اہل میں اس سوں ہم جنس نیٹ ⁂ منگیا رکھنے کا فرنے کا فر کی پیٹ

اور آخر میں نصرتی مارے غصّہ کے دونوں کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔

شیوا ہور جے سنگھ جیوں یک ہوئے ⁂ یکس یک کے جیوں پیر بے شک ہوئے

کیے اختیار اونہ کرنے کے کام ⁂ یو دو بد عہد ہور او نمک بد حرام

بیجاپور کے سپاہی تیار ہوگئے۔ بیجاپور نے ایک قلعہ خالی کر دیا۔ شرزہ خاں اوّل بیجاپور کا سپہ سالار اعلیٰ تھا جس نے مغلوں کے ساتھ جنگ میں اپریل ۱۶۶۶ء کو اس کا انتقال ہوا۔

ایک طرف سے شرزہ خاں اوّل اور دوسری طرف سے عبدالرحیم بہلول خاں نے مغل فوج پر حملہ کیا۔ اسی وقت گولکنڈہ کے قطب شاہ نے بیجاپور کی مدد کے لیے فوج بھیجی۔ ایک موقعہ ایسا آیا جب کہ مغلوں کی فوج بیجاپور کی فوج کے قریب پہنچ گئی —

شرزہ خاں اور خواص خاں دونوں نے حملہ کیا۔۔۔

دونوں بات کر دم دماتے چلے ⁂ انگے ڈاٹتے ہور ڈٹاتے چلے

لڑتے لڑتے شرزہ خاں مر گیا۔ علی عادل شاہ ثانی نے شرزہ کی جگہ اس کے دو بیٹوں کو دی۔ آخر میں مغل فوج ایسی بھاگی کہ۔۔۔

چلے کھا کے اس دن تو ایسی شکست ⁂ لگے ملک دہلی تلک یک ہو است

بیجاپور کے سپاہیوں نے۔۔۔

نہ آب ان کو میداں میں پینے دیے ⁂ سراب ان پہ جمنا کا پانی کیے

علی نامہ مثنوی جذبۂ حب الوطنی پر مبنی ہے۔ علی عادل شاہ کے سپاہی اپنے حکمران پر بے حد ایقان رکھتے تھے۔ مادر وطن سے ان کا لگاؤ غیر معمولی تھا۔ نصرتی کا علی نامہ اسی جذبہ کا اظہار ہے۔ عہد وسطیٰ کے ادب میں زمینِ وطن کے لیے اتنی محبت کا اظہار شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے کیا۔ یہ علی عادل شاہ محض حکمراں نہیں رہا بلکہ بیجاپور کی زندگی بن گیا۔ اسی طرح کی تنظیم قومی جذبے کے بغیر ناممکن ہے۔ نصرتی نے اسی قومیت کو الفاظ میں یوں ڈھالا ہے۔۔۔

دکن شخص ہے جس بیجاپور تن　٭　جوں انسان ہیں ہور علی شاہ جیوں

حُبّ الوطن لفظ کا استعمال بھی عہدِ وسطیٰ میں ممکن ہے کہ پہلی بار نصرتی نے ہی کیا ہے۔ بیجاپور کے عوام کی حبّ الوطنی وقتی نہیں بلکہ وہ آبا و اجداد کی میراث تھی۔۔۔

لیکے جس ہو میراث حبّ الوطن　٭　اپنے جیو سے گھر کو رکھنا جتن

حبّ الوطنی ہی وہ جذبہ ہے جو عوام کو ایک لڑی میں پروتا ہے۔ یک جہتی ہی کسی فوج کو قابلِ رشک بناتی ہے۔ سپاہیوں کی تعداد سے کوئی فوج بڑی نہیں بنتی۔ نصرتی نے اس صداقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

نہ یک دل سپاہ تس بزرگی ہے جھوٹ　٭　بڑا او ہے نئیں جس کے لشکر میں پھوٹ

نصرتی کا دکن صرف خطۂ زمین نہیں ہے، ایک مکمل شخص ہے۔ اسے دکن کے سپاہیوں پر ناز ہے۔

نہ لیکن دکن کے جوان سور ہیں　٭　ہوا چڑھ کے لڑنے میں مشہور ہیں

دکنی سپاہی کو چلتا دیکھ کر نصرتی کہتا ہے:

چلے رنج پھول دکنی دلاور جواں

دکن کی فوج میں مختلف نسلوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے سپاہی ہیں ان میں دلی کے پٹھان بھی ہیں۔

پٹھاناں جو دہلی کے ہیں نام دار　٭　مغل کے لہو کے ہیں پیاسے اپار

اس شعر میں نصرتی نے پٹھانوں اور مغلوں کی قدیم رقابت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عرب، ایران اور افغانستان سے آئے سپاہیوں کے ساتھ نصرتی نے ان مراٹھا سپاہیوں کا ذکر کیا ہے جو اس وقت بیجاپور کی فوج میں تھے۔ نصرتی نے مراٹھا سپاہیوں کو مسلمان سپاہیوں سے کم نہیں مانا۔ نصرتی یہ بھی جانتا ہے کہ مراٹھوں میں بھی بے شمار فرقے ہوتے ہیں۔۔۔

مراٹھے کتی ذات دکھنی دھات کے　٭　لمبے پاؤں لے کے لمبے ہات کے

سم ہال دجگ تھاپ وجادو پا نوار　٭　اند لکار و تلکار دستے با لکار

منہ ہنستے کھرارے و کھنڈا کلے　٭　سندھی پا لگہے نم کلے بھو نسلے

علی نامہ میں حبّ الوطنی کے بعد شجاعت کے بیان پر زور دیا گیا ہے۔ درحقیقت اعلیٰ درجہ کی حبّ الوطنی کا حقیقی بہادری میں نمایاں ہوتی ہے۔ کوئی فوج صرف تنخواہ، لوٹ مار کی چھوٹ یا ظلم کی خواہش سے ہی عظیم نہیں

بن سکتی جب جذبۂ حب الوطنی جگی. بہادری میں بدلتی ہے تب ہی معمولی سے معمولی سپاہی بہادر بنتا ہے بہادری کا بیان کرتے وقت نصرتی نے صنعتوں سے ہی کام نہیں لیا بلکہ ایک سپاہی کے ناطے وہ بھی میدانِ جنگ میں رہا . . . . . . . . . . وہ سپاہی کو عقیدت سے دیکھتا تھا سپاہی کو جو قوم احترام کی نظر سے دیکھتی اس قوم میں کوئی بہادر پیدا نہیں ہوتا:.

سمجھتا جو ہے مرد سپاہی کی قدر ؛؛ سپاہی جو سمجھے سپاہی کی قدر
سپاہی کے ہم ٹیک د ؟ ، کوں مان دیں ؛؛ سپاہی کوں صف میں اول پان دیں
سپاہی تے ہیں باوشاہی کو زور ؛؛ دکھے صف کی خوبی سپاہی تے ہور

سپاہی کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا وہ اچھے کے لئے اچھا اور برے کے لیے برا ہے .

برادر ہے ساواں کے چوروں کے چور

سپاہی اپنے مالک کے لیے جان دے دیتا ہے یہی اس کی عزت و زندگی ہے .

ایچی آبرو مرد کی زندگی ؛؛ کہ جیتے کو ہووے موت شرمندگی
جنے مار صاحب کوں اپ جیو بچائے ؛؛ جتا ہے تلک منہ کی کالک نہ جائے

بیجاپور میں جیسے ہی خبر ملی کہ مغلوں کی فوج جے سنگھ کی قیادت میں حملے کے لئے بڑھی آرہی ہے پورا بیجاپور تیاریوں میں:

بھرے بان ہر برج میں کئی ہزار ؛؛ بچے سانپ کے ہٹ میں جوں بے شمار
ہتھیاراں کا اوماں سینہ سپر ؛؛ زمین پر قدم آسمان پر نظر

سرداروں نے قومی لباس پہنا:..

سدا کسوتاں زعفرانی و لال ؛؛ سراں پر اوڑھے نت چنور ہور رومال

ایرانی لوگوں نے بڑی توپوں کی مدد سے مغلوں کو قندھار کے مورچے پر بارہا ہرایا تھا ایران کے نے گولکنڈہ اور بیجاپور میں بڑی بڑی توپیں ڈھالیں دونوں مقامات پر قلعوں کی اس طرح توسیع کی گئی کہ بڑ دور دور تک گولے پھینک سکیں۔ بیجاپور کی سب سے بڑی توپ کا نام ہے "ملک میدان" یہ توپ اب بھی برج پر تھی۔ تالی کوٹ کی جنگ میں اسی توپ کی وجہ سے وجے نگر کو شکست ہوئی تھی جے سنگھ کی آمد پر "ملک میدان" برج پر

جو بھپکار ہے تلک میدان کا ؛؛ قیامت کا نیں صور اس شان کا

ٹوپ کا نام تھا شرزہ اور دوسری کا "ہنومنت"

کرے جب او شرزہ کا گولا اٹھان ؛ اڑے تب اے راوت کا ڈر سوں پران
گرنا رتح سوں ہنومنت جب گڑگڑ ے ؛ ریو پیٹ سوں جل سورنج پڑے

لی گرنج سن کر رات کے پیٹ میں سورنج گر جاتا ہے ہنومان جی نے تو آکاش میں چڑھ کر سورنج کو لینا
تی نے یہاں پورانک داستان کا کتنا اچھا استعمال کیا ہے ۔

پور جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ بیجا پوریوں کے لیے جنگ گویا تیوہار تھا اور تیوہار ایک دن کا ہوتا ہے
دنوں تک کے لئے آیا ہے۔

دسے کوٹ پر روز رت روز عید ؛ ہر اک رات شب رات گھتی پدید
تنے تٹ ہزاروں ہلا لاں لگائے ؛ چند جو بر جہاں پہ اَت لک لگائے
ہر اک پل ہر اک دل پہ تازہ کلول ؛ ہر اک تن ہر اک دھات لڑنے کا تول

؛ ہیوں کی تلوار سے مغل اور راجپوت سپاہی دوستی کیسے کر سکتے ہیں مغلوں اور راجپوتوں پر نصرتی
ل دیا ہے :

ہم تیغ سوں کیوں کرے دوستی ؛ کہ راجپوت انیو نی مغل پوستی

کے مقابلے میں بیجا پور کے سپاہیوں کی یوں تصویر کھینچی ہے :

کمند داز کوئی گرزبازی میں چست ؛ تیر انداز کوئی تیر زہ بازہ درست
بھو کے ہو کے جھگڑے کو پھرتے دلیر ؛ لہوا چا ہتے دل نہ ہو وے ان کے سیر
بڑے بانٹ اٹھنے میں نت قاب ہوں ؛ سدا دھوے مکھ تیغ کے آب ہوں

رکی تیاریوں کی تفصیل کے بعد نصرتی نے مغل فوج کا ذکر کیا ہے مغل فوج کا سپہ سالار بے سنگھ مقابلے سنگھ
وت سپاہی زیادہ تھے راجپوت فوج کئی حصوں میں بٹی ہے راجپوتوں کے مختلف فرقے ہیں امیر اور
ے فوجی بھی راجپوت فوج میں شامل ہیں راجپوتوں کے کچھ فرقوں سے نصرتی واقف ہے راجپوت فوج
اور پنجابی سپاہیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے ۔

روہیلے کیتک ذات کے تھے اوٹ ؛ زبردست پنجابیاں دل کے کھوٹ

بھوت راو رانے تھے رن کے پوت ؛ غروری سوں شیطان بھگڑے پہ بھوت
سورے جھٹ دے ہور جب لے کیتے ؛ سولکی و پرمار ڈھالے کیتے
کیتے اہمیل و کیتے بے نظیر ؛ چوہان ہور راٹھور کھاجرا ہیر
پٹھاناں چلے دیکھ داڑھیاں کو چھوڑ ؛ مو چھیاں وہج سوں راجپوت بانٹے مروڑ

بیجاپور کی فوج ایک طرف سے بڑھی دوسری طرف سے مغلوں کی فوج آگے آئی ، دونوں فوجیں برابر تھیں کی فوج پاسنگ کا کام کر رہی تھی شیوا جی کی حالت کا ٹھیک ٹھیک تعین ہوا ہے :

چلی آتی دیکھت یوں ڈونگر سی فوج ؛ چلی یوں بی دریا منی مار موج
دونوں بھار ہم تول تھے یوں اگر ؛ شیوا ان میں پاسنگ کا تھا پتھر
دونوں جب ہم تول تھے دو رخن ؛ زمین ہوئی ترازو کی پلڑیاں منن

دشمن کی فوج کو دیکھ کر بیجاپوری سپاہی بے چین ہو گئے تیر چلنے لگے :

غنیاں کے بھیجیاں کوں کھانے شتاب ؛ خوش آنے لگیاں موں میں کھڑگاں کے آب
کماناں رکھیاں دل کشاکش منے ؛ ابلنے لگے تیر ترکش سنے

تلواریں کھینچ گئیں جیسے وقت کی جیب لپلپانے لگی :

زباں لہو کی پیاسی کھڑگ کی اپار ؛ نکل آئی جیوں میان کے لب تے بھار

بھالے کے پھل چم چم چمک رہے تھے سورج کی شعاعیں پی کر وہ دھوپ کو روشنی بخش رہے تھے :

ہر اک نیزہ خورشید نے پی کے آب ؛ چلے ہونے دینے دھوپ کوں آب و تاب

خون پیے ہوئے بھالے کی تصویر :

جو تھے نیزے باناں کے بھالے تمام ؛ دسے لال کانٹے رسالے تمام

علی نامہ میں اکثر جگہ جنگ کی فطری منظر کشی کی گئی ہے . مبالغے سے بہت کم کام لیا گیا ہے .

بیجاپور اور مغل فوج میں جنگ شروع ہوئی :

ہر اک مکھ تے آواز سن مار مار ؛ کیا بیوے دشمن کی ہونٹاں میں ٹھار

توپوں کی لڑائی کے بیان میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے :

دیکھیا جب پڑے آکے بازی یتی ؛ مغل دیں عرابے کوں دیتا بتی
شرا نگیند باناں تے سٹ شور اٹھیا ؛ گرٹا گرد زنبور یا تے بند ور اٹھیا
جو یک دم چھٹے توپ ہر فرد فرد ؛ اوچایا دھواں بادہو آگ کی گرد

رفتہ رفتہ جنگ کا بیان زیادہ سے زیادہ پر اثر ہوتا گیا ہے ابتدائی بیان میں لفظوں کا استعمال زیادہ ہوا ہے جوں جوں شاعر آگے بڑھتا ہے خارجی بیان کی جگہ جذبات کی تصویر کشی لے لیتی ہے :

لگے تیر ہر تن پہ جب بارے بال ؛ دلیا ہوا چھلنے فوارے کا جال
اٹھی دل میں ہال ہال کی جب یک ہکار ؛ رہیا ابر کا دل ہو پانی کا مار
نہ کوئی کس مدد کر سکے اس گھڑی ؛ ہر اک سر پہ اپنا اپسے پڑے

سپاہیوں کے بھاگنے دوڑنے سے جو دھول اٹھی اس نے چاند کو میلا کر دیا۔

اڑا دل کے وہم نے دھلا رال بڑھا ؛ صفا آب چند نا ہوا گرد گرد ا
دسے گرد یوں تن پہ چندر کے پاک ؛ لگایا ہے جوں انکھ کوں جوگی لے راک

پرندوں نے مردہ سپاہیوں کا گوشت نوچنا شروع کیا کوا برہمن ہو بیٹھا :

گلے بھائے انتڑیاں کہ خوش جانوے ؛ ٹیلے لا کے کوے برہمن ہوئے

مردہ سپاہی ــــ

ڈھلیاں سر تے پگڑیاں چھٹے منہ پہ بال ؛ جھڑے ہت نے ہتھیار ہوجاں نڈھال
یکس یک پہ ڈھالاں پڑیاں ہو نڈھال ؛ کہ جیوں جھاڑ توڑے پہ پاتاں کا حال

کوئی سپاہی قلعہ سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا جے سنگھ کی فوج کے بیلوں اور اونٹوں پر ڈاکہ پڑا۔ بیجاپور کے دھوبی اپنے ساتھ اونٹ لے آئے۔ بیجاپور کے گدڑیوں کو بیل ملے ــ

نکلتا نہ کوئی کوٹ کوں سٹ کیواڑ ؛ جو نکلے تو ہووے بیل اونٹوں پہ دھاڑ
لٹارے لیے چھوڑ نہ گودڑیاں کوں بیل ؛ ہوا اونٹ رکھنے کا دھوبیاں کوں میل

جے سنگھ بہت ہوشیار تھا مگر وہ دو پاٹوں میں پس گیا علی عادل شاہ ایک طرف سے حملہ کر رہا تھا دوسری طرف جے سنگھ کے ساتھی غم زدہ ہو کر لوٹنے کی ضد کر رہے تھے جے سنگھ کی حالت قابل رحم ہو گئی۔ اس کا سر گھٹنوں کا جان بن گیا۔

آنکھیں گریباں میں رہ گئیں:

جم اِسی سیس زانوں میں جہاں ہوا ؛ نظر کا ٹھکانا گریباں ہوا

بیجاپور کے چاروں طرف سات میل کے گھیرے میں سارے تالاب توڑ دیے گئے تھے گھاس میں آگ دی گئی تھی درخت کاٹ دیے گئے تھے ایک شخص بھی اس گھیرے میں موجود نہیں تھا۔ لوٹتے وقت مغل فوج کو یہاں بہت تکلیف برداشت کرنی پڑی:

پڑے سب بے حال ہو بدلیاں کے جیل ؛ نہ سونگھنے کوں گھی ہول کوں لیانے تیل
کہیں دھان میں بیٹھ تھے گھانس تے ؛ برنج تے ادکھ چاولاں بانس تے

سپاہی کوں کے بچوں کو کھانے لگے:

نظر تے پچھے مرغ عنقا تھی ؛ بچے زاغ کے تھے کبوتر انن
نہ دھونے کو صابن طمع پر تھے ؛ بہا چاند کا پاگگن جا چڑھے

مغل فوج بھاگ رہی تھی۔ دال کا دانہ ہن کے برابر ہو گیا تھا تنکہ سونے کی نقل بن گیا۔

لگی ہن برابر ہو دانے کی دال ؛ ہوئی گھانس کی کاڑی نٹنے کی نقل

نشہ کرنے والے سپاہیوں کی حالت سب سے خراب تھی اور اس وقت کے سپاہی پان، تمباکو، افیون، بھنگ، کسی نہ کسی نشے کے عادی تھے۔ عادت کی تکمیل نہ ہونے پر سپاہیوں کی جو حالت ہوتی اس کی تصویر دیکھیے۔

افیوناں کوں کھلا نہ ملنے لگیا ؛ چرس نوار کھنک کھنک گلنے لگیا
منڈی ڈھال کی پوست کی دوستی ؛ رہے جھڑتے ہات تت پوستی
نہ کھلانے تھے خونِ جگر بانچ پان ؛ تمباکو کے دل کے دھوئیں میں نشان
جو تھے کھان ہارے جو یک مُٹھ بھنگ ؛ بسر بھنگ ہے رات دن غم میں دنگ
خیالاں پکانے نہ لکڑی ہی ملے ؛ پنڈاتے دھڑک آگ دردنا جلے

"بوم مارنا" ٹھیٹ دکنی کا محاورہ ہے جب دشمن کی فوج اچانک حملہ کرتی ہے تو سپاہی گھبرا جاتے ہیں اور یہ وقتی تھی کچھ ہی لمحوں میں سپاہی ہتھیار سنبھال لیتے ہیں دشمن کی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جاتا ہے نصرتی نے ایک ا
حملہ کا بیان کیا ہے:

پڑیا فلسلا ہو کے یک بات میں ✤ منڈا سر کس سر کا یک بات میں
تر لگاں پہ الٹی کیتک زین جانے ✤ لگاماں لبسر منہ میں دمچیاں پہنائے
نہ فرصت کمر باندھتے پائے کوئی ✤ نہ ہتیار سے ساندنے پائے کوئی
کھڑے یک بی کر دل بڑا نیں سکے ✤ کماناں کو چلّے چڑا نئیں سکے

جنگ میں بیجاپور کی فتح ہوئی۔ فتح کی خبر سے عوام خوشی سے ناچنے لگے۔ پورے شہر میں کئی دن تک جشن منایا گیا۔ رات کے وقت جگمگاتے چراغوں کی روشنی میں نصرتی کا تخیل جاگ اٹھا :

سب شہر میں کئی لک دیوے یوں پل میں سلگتے لگے ✤ لیلے رتن کے کھول جیوں بیٹھے زین جوہری
پر نور تاریاں تے ادک جوتیں پر چراغاں کوں دسے ✤ آیا کمر بند آسماں کرنے زمیں کی چاکری
دہلی جو کٹ گر جوت دھر لنگا کر شرمندہ کیے ✤ پانی اجالے کا اول یک نور کی دریا بھری

جنگ میں بھی نصرتی نے اہم شخصیتوں کی کردار نگاری پر توجہ دی ہے۔ مغل بیجاپور کے دشمن تھے۔ نصرتی نے مجموعی طور پر فوج کو دشمن مانا لیکن جہاں ضرورت ہوئی ہے اس نے اجتماع سے ہٹ کر شخصی کردار پر بھی غور کیا ہے۔ کردار نگاری کی مثال سے جے سنگھ کا کردار پیش کیا جاسکتا ہے:

اورنگ زیب نے دکن میں جے سنگھ کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ علی عادل شاہ ثانی کی مدد سے شیواجی کو پسپا کرے۔ اورنگ زیب کے حکم کے خلاف جے سنگھ شیواجی کا دوست بن گیا اور علی عادل شاہ کو سبق سکھانے آگے بڑھا۔ ایسی حالت میں جے سنگھ کے ایک جذباتی آدمی ہونے کا تصور ہم کرسکتے ہیں۔ اتنا سب ہوتے ہوئے بھی جب جے سنگھ کے شخصی اقدار کا سوال اٹھتا ہے نصرتی اپنے جذبات پر قابو پالیتا ہے اس نے ایک جگہ جے سنگھ کے متعلق لکھا ہے :

(اورنگ زیب نے جے سنگھ کو بلایا)

بلایا جو راجیا میں یک ڈھنگ تھا ✤ بڑا نادل جس راے جے سنگھ تھا
سکل ہند میں اہل تحقی وہی ✤ دیلوں بادشاہی کو تیزی وہی
سبھوں تے بی اس کی بزرگی جدا ✤ اچھے مرزایاں میں ہو کتخدا
یک یک فن سوں مقدور اپس بدستے ✤ حکیم یہ دیسے یک تردد ستے

علی نامہ کے متعلق نصرتی نے کہا ہے کہ وہ تاریخ لکھنے بیٹھا ہے :

پکڑ اصل تاریخ لکھنیاں کی چال　٭　لکھیا قصہ در قصہ میں حسب حال

حسب حال قصہ لکھتے ہوئے بھی نصرتی نے تخیل کا سہارا نہیں چھوڑا۔ نصرتی نے مورخوں کی روش پر چلتے ہوئے بھی شاعری کی راہ نہیں بھلائی۔ علی نامہ سے پہلے شاعر "گلشن عشق" کی تخلیق کر چکا تھا۔ علی نامہ تاریخ ہوتے ہوئے بھی شاعر کو یہ احساس ہے کہ علی نامہ حقیقتاً شاہ نامہ ہے۔ دکنی ادب کی جان ہے۔

کتا ہوں سخن مختصر بے گماں　٭　کہ یوں شاہ نامہ دکن کا ہے جاں

دکنی شعرا نے اس مثنوی کی بڑی مخالفت کی کیوں کہ نصرتی نے مثنوی کی روایت سے ہٹ کر نیا راستہ اپنایا تھا۔ دکنی کے شعرا نصرتی کی تعریف نہیں کر سکے۔

اس مخالفت کی وجہ سے نصرتی اتنا گھبرایا کہ اس نے اپنے آپ کو شعر نہ کہنے کی صلاح دی :

سخن ور سخن کہتے تھے اپنا چپ آج بہتر ہے　٭　جماعت ہر جہ گویاں کی کہ ہر کوچہ میں گھر گھر ہے
سخن ور کا سخن کچھ ہور بچھا کچھ ہر جہ گویاں کے　٭　مقولہ خام طفلاں کا نہ کہیں مرداں برابر ہے

دکنی ادب میں شعری محاسن کے نقطۂ نظر سے محاسن کے نقطۂ نظر سے نصرتی کی خصوصیت یہ ہے کہ بیان جنگ ہو یا فطری مناظر کی عکاسی وہ گھسی پٹی تشبیہات یا تمثیلوں کو نہیں دہراتا۔ انفرادیت اسے عزیز ہے۔ کسی بھی واقعہ یا منظر کو نصرتی انفرادی ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئی تشبیہات لاتا ہے۔ فطری مناظر کی عکاسی میں یہ خصوصیت صاف دکھائی دیتی ہے۔ فطرت کے جیتے جاگتے بیان میں دکنی کا کوئی شاعر نصرتی کی برابری نہیں کرتا۔ تاروں بھری رات، بیچ میں چاند، ساری زمین زری کا گھونگھٹ اوڑھے بیٹھی تھی :

جو یہ نس ستاراں کی مجلس ہو جمع　٭　اتھی بیچ روشن سپورن کی شمع
اجالے سوں تس خانۂ آسماں　٭　رہیا تھا ہو پر نور خوش تاب واں
ہوا کی بھی سالو کی کسوت یقیں　٭　تنگٹ اوڑ بیٹھی تھی ساری زمیں
دیا چاند تاروں کو ہیریاں کی تاب　٭　کیا سنگ ریزیاں کو بلور تاب

جاڑے میں ٹھنڈی ہوا بہتی ہے۔ اس نے اوس کی گولیاں برسانی شروع کیں :

اپنیا ہوا کا فوج یوں شبنم کی گولیاں چھانٹتا　٭　ڈر سوں اگن منہ چھانپ لے ڈر رہیا ہے تھارے تھار آگ

جاڑے میں پت جھڑ آیا۔ نظر کی جھولی حسن سے بھر گئی:

تس زر فشاں کے ہت تے نت پورسے نظر کی گودیاں ؎ یا تاں سوں پیلے باغ کا دامن ہے یوں زرد ار آج

مہاراشٹرا کے اونچے نیچے گھاٹ، خوف و حسن سے بھرپور ہیں۔ برسات کا موسم ان گھاٹوں کو ہریالی
ے ڈھک دیتا ہے اوپر سے گرنے والے جھرنے اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر کہیں سست اور کہیں تیز رفتار
ے بہنے والے چشمے ان گھاٹوں کو میٹھے پانی سے بھر دیتے ہیں۔ ان گھاٹوں کے ساتھ شیواجی کی داستانیں اور
ساتوں کی کہانیاں وابستہ ہیں۔ نیچے پاتال میں لیٹی گھاٹی اور آسمان کو چھونے والے پربتوں کی قطاروں پر بنا قلعہ
ساتھ گہرائی اور اونچائی سے متعارف کرواتا ہے۔ شیواجی سے پہلے بیشتر گھاٹ بیجاپور کے قبضے میں تھے۔
رتی اپنی دھرتی سے پیار کرتا ہے۔ ایک طرف وہ بیجاپور شہر کی تفصیل بیان کرتا ہے دوسری طرف اس کی نظر ان
ٹوں سے بھی ناواقف نہیں ہے۔ خواص خاں بیجاپور کی طرف سے شیواجی کے ساتھ مقابلہ کرنے لگا وہ ایک
اٹ کے سرے پر کھڑا وہیں سے شیواجی کے ساتھ لڑنے کی بات سوچتا ہے۔ نصرتی گھاٹوں کا ذکر کرتا ہے۔
ن تک پہنچنے میں کتنی دقت ہوتی ہے! ان گھاٹوں کا نام لیتے ہی زبان کے پاؤں پھسل جاتے ہیں:

منگیا دوڑ آ گھاٹ اول باندنے ؎ لڑائی اسی ٹھارتے ساندنے
اندھارے سوں تا سے دسے دن تمام ؎ کریں نت رسد بندواں بیٹھ کام

سورج کو بھی اس زمین سے خصوصی محبت ہے۔ تبھی تو وہ اپنی دھوپ وہاں نہیں بچھاتا:

اد روے زمین گرچہ محبوب ہے ؎ نظر میں سورج کی بی محبوب ہے
بچھاوے سو فراش نت نو بہار ؎ رنگا رنگ پھولوں تے صد داں ہزار

گھاٹیوں میں بانسوں کے جھرمٹ کھڑے ہیں۔ شاعر بانسوں کا تذکرہ کرتے وقت تخیل کی آخری منزل
پہنچ جاتا ہے ؎

ہر اک بانس میں توڑ سٹنے خیال ؎ بلند کیا گردوں تے مکڑیاں کے جال

اور کانٹے بھی شاعر کی نظر سے اوجھل نہیں ہیں:...

زمیں جا بجا خار خونریز خار ؎ قدم در قدم طشت و نشتر ہزار

نصرتی کو باغ و باغچوں سے بھی پیار ہے اس نے مختلف جگہ باغوں کا ذکر کیا ہے۔ گلشنوں کے بیان میں وہ تشبیہات اور استعاروں کا استعمال اپنے ڈھنگ سے کرتا ہے۔ صبح کے وقت باغ کی کیفیت کا اس نے ذکر کیا ہے۔ فطرت بے جان نہیں ہے۔ وہ بھی صبح ہوتے ہی انسان کی طرح منہ دھوتی ہے، غسل کے بعد اپنے حسن کی آرائش میں ڈوب جاتی ہے۔

زمیں لے کے گلشن کے درجک کوں کھول ؎ ہر ایک پھول بست پینی امول

چمن مانگ سنبل پٹیاں میں چھوڑا ؎ بندی جعد ریحاں کا سبزہ جوڑا

کرے تیل شبنم کوں کر ملکہ منجن ؎ ڈبی تے بنفشے کی پینی انجن

پوری مثنوی میں کوئی نسوانی کردار نہیں ہے کہ جس کے سراپے کے بیان میں شاعر اپنی قوت تخیل کو استعمال کرتا اس نے وقتاً فوقتاً فطرت کی تفصیل بیان کرنے میں ہی حسن کاری کی کوشش کی ہے۔ فطری مناظر کو وہ کسی طرح کہانی سے جوڑ دیتا ہے۔

علی نامہ داستانوی مثنوی ہے۔ فارسی ادب کی روایت کے مطابق نصرتی نے اس موضوع کے لیے مثنوی کے سانچے کا استعمال کیا ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ مثنوی کے سانچے کے علاوہ اس میں سات قصیدے بھی ہیں۔ یہ قصیدے ایک ترتیب میں نہیں ہیں۔ ان قصیدوں کے متعلق مرحوم مولوی عبدالحق کا تاثر یہ ہے کہ ان قصیدوں میں صرف بادشاہ کی مدح ہی نہیں ہے بلکہ ان میں منظر نگاری، شاہی دربار کے طور طریقے، جنگ و صلح کی داستانیں سبھی چیزیں ہیں ان کے اتنے اچھے قصیدے نصرتی سے پہلے کسی نے نہیں لکھے۔ کچھ لوگوں نے اسے فارسی کے شاعر افضل الدین خاقانی کے برابر بتایا ہے۔ اسی شاعر پر دکنی زبان کی قوت ترسیل اور عظمت و روانی ختم ہو جاتی ہے نصرتی ایک کامیاب قصیدہ گو شاعر بھی ہے۔ اس کے قصیدے لفظ و معنی دونوں اعتبار سے اعلیٰ پائے کے ہیں۔ اس نے بارہ قصیدے لکھے ہیں۔ ان میں سے اکثر قصیدے علی نامہ میں آتے ہیں۔ یہ قصیدے جنگ کی تفصیل پر مبنی ہیں۔ ایسے رزمیہ قصیدے نصرتی کے بعد پھر کبھی نہیں لکھے گئے۔

نصرتی سے پہلے دکنی میں قصیدہ لکھا جانے لگا تھا۔ نصرتی نے مثنوی میں قصیدے کا استعمال دکنی مثنوی کی روایت سے ہٹ کر کیا تھا۔ علی نامہ میں جو قصیدے آئے ہیں ان میں مدح کا عنصر بہت کم ہے۔ قصیدوں کی وجہ سے بھی نصرتی کا دکنی ادب میں خاص مقام ہے۔ نصرتی پہلا شاعر ہے جس نے دکنی میں یہ تجربہ

کامیاب تجربہ کیا۔ اس کے علاوہ وہ آخری شاعر بھی ہے جس نے دکنی میں اتنے اچھے قصیدے لکھے۔ نصرتی نے اپنے قصیدوں میں عمدہ منظر نگاری کی ہے۔ مثنوی کے سانچے اور قصیدے کی پیش کش میں فرق ہوتا ہے۔ نصرتی نے مثنوی کے سانچے میں فطرت نگاری کے وقت مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ وہاں اس نے نئی تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے ہیں لیکن قصیدے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ جہاں تک ہو سکا ہے فارسی قصیدے کی روایت کی پوری طرح سے پیروی کی گئی ہے۔ علی نامہ کے قصیدوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے کہانی میں جھول آنے نہیں دیا۔ کئی جگہوں پر قصیدے نے کہانی کو ارتقا عطا کیا ہے اور مختلف مقامات پر کہانی کی غیر ضروری تفصیل کو روکا ہے۔ شاعر ذاتی ردِ عمل کے اظہار کے لیے مثنوی کی بہ نسبت قصیدے میں زیادہ کامیاب رہا۔

اس سے پہلے گھاٹوں سے متعلق منظر نگاری پیش کی جا چکی ہے۔ پنالہ قلعہ کی فتح کے موقع پر نصرتی نے ۱۵۲ اشعار کا قصیدہ لکھا۔ اتنے مفصل قصیدے میں شاعر نے صوتی آہنگ کا بھی خیال رکھا ہے۔ مثال کے طور پر ایک قصیدے میں پنالہ قلعہ کی تفصیل کے بعد علی عادل شاہ کے حملے کا ذکر ہے۔ جنگ کی کیفیت کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ مخصوص صوتی آہنگ سے ابھارا گیا ہے۔

کھڑگاں پو کھڑگاں لگ ادک چوندھیر تے یوں چنگیاں اٹھیاں
جوں آگ کیاں بجلیاں چمک برسیاں بدل انگار کا

چلکتیاں سراں کیاں تیر تے دستیاں کنول کے پھول سیاں
بنجہ جھڑیا سو ڈنڈ تھا ہر نس ڈنڈل کے سار کا

(پروفیسر مریم تمرہ نے یہ مضمون ہندی میں لکھا تھا۔ محترمہ فاطمہ پروین نے اسے سب رس کے لیے اردو کا روپ دیا جس کے لیے ادارہ ان کا ممنون ہے۔)

---

## سلسلۂ اُردو نامہ صفحے ۲۳ سے آگے

عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ صلاح الدین نیر نے نظامت کی۔

● ـــ حیدرآباد لٹریری فورم کا ادبی اجلاس عاتق شاہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ جیلانی بانو نے "بعد از درس" کہانی سنائی۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے بحث کے لیے "نظم" پیش کی۔ بانی ظہیر یوسف کا اعلان ...

ضیاء الدین

# گوپال متل کی قومی شاعری

متل نے جس دور میں جنم لیا وہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی طور پر انتشار کا زمانہ تھا۔ دنیا میں نئے نئے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ لاکھوں لوگ تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ ہندوستان بھی دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ یہاں کے عوام غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہوگئے تھے لیکن ان سرفروشوں کے ساتھ ہی ساتھ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی کہ جو اپنے مفاد کی خاطر قوم و ملک سے غداری کرنا معمولی بات سمجھتے تھے۔ خصوصاً سیاسی لیڈروں میں ایسوں کی تعداد خاصی تھی کہ جو انگریزوں سے مل کر اپنے ہی بھائی بندوں سے کھلواڑ کر رہے تھے۔ پورے ملک میں افراتفری کا دور دورہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام جونک بن کر ہندوستانی عوام اور خاص طور پر غریب کسانوں اور مزدوروں کا خون چوس رہا تھا چناں چہ ایسے حالات میں پیدا ہونے والا کوئی بھی حساس انسان ان سے کیسے چشم پوشی کر سکتا تھا۔ وہ ان اندوہناک حالات سے کیوں کر متاثر نہ ہوتا۔ چناں چہ متل نے بھی وہی کچھ کیا جو ان حالات میں ان جیسا کوئی بھی دوسرا حساس فرد کرتا۔ متل کی شاعرانہ زندگی کا آغاز انھیں حالات میں ہوا۔ ان کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک کے کلام تک محیط ہے۔ یہاں یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب ہمارے ہاں ترقی پسند نظریات کا چرچا ہوا۔ ترقی پسند نظریات کے عام ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک نے بھی فروغ پایا — گوپال متل ان تمام سیاسی و ادبی تحریکات سے کیوں کر متاثر نہ ہوتے۔ سارے ترقی پسند ادیب ترقی پسند نظریات

کے فروغ کے ساتھ ساتھ قومی و ملی نظریات کو بھی عام کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اس دور میں ان کی آواز اپنے دور کی قومی ترین آواز تھی ۔ جس نے اس دور کے اکثر دانشور طبقے کو متاثر کیا ۔

گوپال متل باضابطہ طور پر گو ترقی پسند تحریک میں شامل نہ ہوئے یا باقاعدہ طور پر انھوں نے اس کی رکنیت تو اختیار نہ کی لیکن اس کی آواز سے کیوں کر متاثر نہ ہوتے کیوں کہ اس دور کی وہی تو ایک مضبوط ترین آواز تھی ۔ ظلم، استحصال، ناانصافی، رشوت، اور دوسری سیاسی و سماجی بدعتوں کے خلاف آواز بلند کرنا یا احتجاج کرنا انھیں کیوں برا لگتا کیوں کہ وہ خود بھی تو ان کی بیخ کنی کے خواہاں تھے۔ البتہ وہ یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ یہ سب کچھ کسی کے آلۂ کار بن کر کریں۔ وہ یہ سب کچھ آزادانہ طور پر کرنا چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے اس دور میں اپنے تمام نظریات کی بنیاد ترقی پسند نظریات پر اٹھائی۔ شروع میں وہ سوشلزم یا کمیونزم کے مخالف بھی نہ تھے۔ اس کے مخالف وہ اس وقت ہوئے کہ جب انھوں نے بہت سے ترقی پسندوں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے یہ محسوس کیا کہ وہ ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کے پردے میں دراصل کمیونزم کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور وہ بھی آزادانہ طور پر نہیں بلکہ کسی بیرونی طاقت کا آلۂ کار بن کر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں خصوصاً اس ابتدائی زمانے کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد بھی خاصی ہے کہ جو خالص اشتراکی نظریات پر مبنی ہیں اور متل صاحب نے انھیں بلا جھجک اختیار کر کے شعر کے قالب میں پیش کیا۔
چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

ہاتھ بڑھتے ہیں جنوں میں تختِ شاہی کی طرف　　تختِ شاہی کیا ہے اکثر عرش و کرسی کی طرف

---

کیا کہوں ہوتا ہے کیا عالم مرے احساس کا　　دیکھ کر فاقہ زدہ انساں کا مُنہ اُترا ہوا

---

لُٹ رہا ہو جب وطن کی آبروؤں کا سہاگ　　کون گا سکتا ہے پیاری عشرت و مستی کے راگ

---

میں طوفانوں کا خوگر ہوں مجھے منجدھار میں لے چل ڈرا سکتی نہیں ڈوبے ہوؤں کی داستاں مجھ کو

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شروع میں متین صاحب اشتراکی نظریات سے خاصے متاثر تھے۔ چناں چہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے انھوں نے اپنے قومی نظریات کی بنیاد انھیں ترقی پسند خیالات کو بنایا اور انھیں کے زیر اثر قوم میں پھیلی ہوئی تمام بدعتوں کے خلاف آواز بلند کی۔ جمہوری اقدار پر یقین و اعتماد یوں تو اس دور کا اہم تقاضا تھا اور اس شعور کو عام کرنے کے لیے اسی دور میں سیاسی و سماجی جماعتیں اہم رول ادا کر رہی تھیں لیکن متین صاحب کو ان اقدار کا صحیح شعور عطا کرنے میں اشتراکی اور ترقی پسند نظریات نے بھی خاصا رول ادا کیا۔ یہ اسی ذہنی تربیت کا شاخسانہ تھا کہ متین نے اپنی شاعری میں کھل کر ان اقدار پر اظہار خیال کیا اور ایسی تمام طاقتوں کی مخالفت کے لیے آواز بلند کی جو عوام کے اس بنیادی اور انسانی حق کو نظرانداز کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور عوام کے اس مطالبے کو دبانے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال میں لا رہے تھے۔ ایسی تمام طاقتوں کو متین نے رجعت پرست قرار دے کر نہ صرف سماج کے لیے انھیں مہلک قرار دیا بلکہ انھیں خبردار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ نیا دور آیا ہی چاہتا ہے اور پرانے فرسودہ نظام کا خاتمہ ہونے ہی والا ہے۔ متین اس نئے زمانے کی آہٹ پا چکے تھے۔ چناں چہ وہ اپنی مشہور نظم 'یور بائی نس' میں بیانگ دہل کہتے ہیں:

یہ سب سچ تھا مگر اب طور ہی دیگر ہیں دنیا کے\
زمانہ لے رہا ہے ان دنوں اک تازہ انگڑائی\
تری عشرت کی بنیادیں تھیں محکم جن عقائد پر\
وہ بن کر رہ گئے عہد کہن کی قصہ آرائی\
کسے تسلیم ہے پیدائشی حق حکمرانی کا\
ودیعت ہو چکے جمہور کو انداز دارائی\
منظم ہو رہی ہیں کشتگان جور کی فوجیں\
بس اب ہونے کو ہے مظلوم و ظالم میں صف آرائی\
ہوا کرتا ہے عبرت ناک ان کا انتقام اکثر

عطا ہوتی ہے مظلوموں کو جب تاب و توانائی
حقوقِ زندگی کا جب اُسے احساس ہوتا ہے
ملا دیتی ہے مٹی میں رعایا شانِ دارائی

مظلوموں کی صف آرائی کے ہاتھوں شانِ دارائی کے انجام کا یہ تصور قطعی اشتراکی ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ روسی انقلاب سے بے حد متاثر تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سامراجی و بورژوا قوتوں کو خبردار کیا ہے۔

ایک اور نظم بہ عنوان "منافق" ملاحظہ فرمایئے۔ اس نظم میں شاعر کسی فرقہ پرست لیڈر سے مخاطب ہے۔ جو اب کسی مصلحت کی وجہ سے اتحاد و اخوت کے گیت گا رہا ہے اور شاعر اس کی زبان سے اس قسم کے کلمات سن کر حیران ہے اور اسی حیرانی میں اس سے مخاطب ہوتا ہے

یہ کیوں وطن کا زباں پر تری فسانہ ہے
اور اتحاد کا لب پر ترے ترانہ ہے
ترے بھی دل میں گزر ہے وطن پرستی کا
نہیں نہیں ہمیں اس کا یقیں نہیں آتا
تجھی نے فرقہ پرستی کی ابتدا کی ہے
تمام عمر اسی آگ کو ہوا دی ہے
تو اتحاد و اخوت کے گیت گائے گا
تو اور قوم کی بگڑی بنا لیے گا
نہیں فریب میں ہم تیرے آ نہیں سکتے
یقین اب تیری باتوں پہ لا نہیں سکتے

مشق صاحب اپنی نظم "ایک سوال" میں بھی ان قوم کے غدار لیڈروں سے مخاطب ہیں جو چاندی کے چند سکوں کے لیے انگریزوں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کرکے تحریکِ آزادی میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈال رہے تھے۔ اس طرح کے لیڈروں کو جو انگریزوں کی مدد کرتے تھے اور ان کے ساتھ مل کر مجاہدینِ آزادی پر طرح طرح کے انسانیت سوز مظالم ڈھاتے تھے ...... حکومت سے ہر طرح کی آسانیاں میسر تھیں۔ انھیں دولت کی کوئی کمی

نہیں تھی۔ یہ عیش و عشرت میں زندگی گزارتے اور اپنا ضمیر بیچ کر مطمئن تھے۔ ان ضمیر فروش لیڈروں کی ایسی حرکتوں کے باوجود شاعر ناامید نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا یہ یقین مضبوط ہو گیا کہ اس نظام کی بساط جلد ہی لٹنے والی ہے اور ہندوستان میں خوشی کا وہ دور آنے والا ہے کہ جب چاروں طرف آزادی کے نغمے گائے جائیں گے اور محبِ وطن عوام کی مرادیں بر آئیں گی۔ چناں چہ متّن اپنی نظم "ایک سوال" میں اپنے اسی یقین کا اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ تو سب سچ ہے مگر میں پوچھتا ہوں اک سوال
کیا کبھی اس وقت کا بھی تجھ کو آتا ہے خیال
جب نظامِ کہنہ عالم کی اُلٹے گی بساط
جب مرے ہندوستاں میں آئے گا دورِ نشاط
جب وطن میں جشنِ آزادی منایا جائے گا
حریت کا نغمۂ جاں بخش گایا جائے گا
دردمندانِ وطن کی جب بر آئے گی مراد
جب اٹھیں گے سرفروشانِ وطن بہرِ جہاد
گر کبھی اس وقت کا بھی تجھ کو آتا ہے خیال
سچ بتا اس وقت کیا ہوتا ہے تیرے دل کا حال

متّن کے ابتدائی کلام میں ایسی نظموں کی تعداد بھی خاصی ہے کہ جن سے کم عمری کے باوجود ان کے ہاں ایک رچا بسا سیاسی اور تاریخی شعور ملتا ہے۔ اس پختہ سیاسی و تاریخی شعور نے انھیں اس بات کا بھی احساس دلا دیا تھا کہ جس نئے دور کی تمنا میں وہ جی رہے ہیں اور جس کی تعبیر کے لیے ہند کے عوام جدّ و جہد کر رہے ہیں اسے ہند کی نئی نسل ہی ممکن بنا سکتی ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھیں زندگی کی تمام فرسودہ اقدار کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا ہوگا۔ مفاہمت اور مصالحت کی بجائے نعرۂ انقلاب بلند کرنا ہوگا۔ صرف یہی راستہ انھیں منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ چناں چہ انھیں نظریات کی وجہ سے وہ ہمیں گاندھیائی نظریات کے بجائے ہند کے ان انقلابیوں کے نظریات سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ جو غاصبوں کی قوت سے براہِ راست ٹکرانے کی راہ پر گامزن تھے اور جسے درحقیقت اشتراکی نظریات ہی نے سینچا تھا۔ چناں چہ اپنی نظم

انقلاب" میں وہ کہتے ہیں :

وہ آرہا ہے جوانان قوم کا لشکر
ہر اک کے وردِ زباں انقلاب زندہ باد
بنی ہے خرمن بیداد کے لیے بجلی
ستم کشوں کی فغاں انقلاب زندہ باد
بھجن سے کام نہ اس کو دعا سے کچھ مطلب
ہے بے نوا کی اذاں انقلاب زندہ باد

گوپال متل کے پختہ اشتراکی شعور کا ان اشعار سے بھی پتہ چلتا ہے جن میں وہ انگریزوں کو چلے جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ سماج میں برسرپیکار طاقتوں کے شعور اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ طبقاتی کش مکش پر گہری نظر کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ یہ کش مکش اب آخری منزل تک پہنچ چکی ہے اور اب بساط الٹنے والی ہے۔ ہند کے عوام اب اور زیادہ دیر اس جبر کو برداشت نہیں کر سکتے۔ چنگاری شعلۂ جوالہ بننے والی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی نظم "مسافر" میں انگریزوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اٹھاؤ رختِ سفر اپنا کہ وقتِ نازک آپہنچا
مسافر! اب نہیں ہے میزبانی کا ہمیں یارا
یہی لازم ہے تجھ کو کوچ کی کر جلد تیاری
کہ اب برداشت کی حد سے فزوں ہے اپنی ناداری
نہ ایسا ہو کہ تجھ کو بھاگنا دشوار ہو جائے
ہماری مفلسی تیرے لیے آزار ہو جائے
مسافر! مفلسی کے سائے میں پلتی ہے خونخواری
جلو میں اس کے دامن تھام کر چلتی ہے خونخواری
بنا دیتی ہے یہ کم بخت دہقاں میزبانوں کو
چبا جاتے ہیں بھوکے غیر کیا اکثر یگانوں کو
مسافر! مصلحت سے کام لے اب چھوڑ یہ بستی

خدا جانے ہماری مفلسی کیا رنگ لائے گی
سکوں کا دور اب اس سرزمیں سے جانے والا ہے
ہوائیں کہہ رہی ہیں کوئی طوفاں آنے والا ہے

کارل مارکس نے طبقاتی کشمکش اور آویزش کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، مِتّل اس سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں مفلسی اور خونخواری میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اور وہ مفلسی کی شدّت کو خونی انقلاب کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ مِتّل کی شاعری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم جس نتیجے تک پہنچتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ مارکس یا ترقی پسند خیالات کے مخالف نہیں تھے۔ بات صرف یہ تھی کہ وہ کسی کے ہاتھوں میں کھیلنے یا کسی کے آلۂ کار بننے کے شدید مخالف تھے اس لیے انھوں نے مارکس کے ان خیالات سے استفادہ کرنے سے گریز نہیں کیا کہ جن سے اپنے ملک اور عوام کی تقدیر بدلنے میں مدد لی جا سکتی تھی۔ اسی صحت مند نظریۂ حیات کی وجہ سے انھوں نے دراصل اپنے شعری نظریات کی بنیاد جن عناصر پر رکھی وہ وہی تھے کہ جنھیں ہم ترقی پسند یا اشتراکی نظریات قرار دیتے ہیں۔

گوپال مِتّل نے جہاں ایک طرف تحریکِ آزادی کا کھل کر ساتھ دیا اور بے خوف ہو کر اپنی قوم کے حوصلے بڑھائے وہیں اپنے ملک اور اپنی قوم میں موجود سیاسی و سماجی بدعتوں کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ انھوں نے "استحصال" "ظلم" "ناانصافی" غدّاری اور موقعہ پرستی جیسی لعنتوں کو طنز کا نشانہ بنایا اور قوم کو ان کے خلاف برسرِ پیکار ہو جانے کا مشورہ دیا مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کے مسائل کو ابھارا اور ان کی ترجمانی کی۔ قوم کے حقوق پر کھل کر قلم فرسائی کی اور اس فرض کو نبھانے کے لیے کسی ظلم کے سامنے سر نہ جھکایا گوپال مِتّل کے ابتدائی دور کے انھیں نظریات کی بنا پر یہ کہنا ضروری ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے قومی نظریوں کی ترتیب و تشکیل کے سلسلے میں ترقی پسند اشتراکی نظریات سے خاصا استفادہ کیا۔ اگرچہ کہ وہ ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں کی صف میں شامل نہیں ہوئے

ڈاکٹر سید عبدالمنان

# حیدرآباد — دیدہ و شنیدہ

میری عمر ۵ سال کے لگ بھگ تھی کہ میرے والد صاحب جو مہتمم پولس ضلع بیڑ تھے بوجہ علالت ضلع بیڑ سے حیدرآباد آئے۔ علاج کے لیے مکان کی ضرورت تھی۔ ان کے دوست نواب محمد علی خاں تارہ صاحب جاگیردار کے فرزند کی نشاندہی پر انہوں نے تارہ صاحب کے مکان کے متصل کوچۂ تارہ صاحب میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ والد صاحب کی علالت نے شدت اختیار کی۔ افضل گنج کے دواخانہ میں (جس میں بعد کو میڈیکل کالج قائم ہوا) ڈاکٹر رستم جی کوٹڑا والا نے ان کا آپریشن کیا۔ آپریشن کے بارہ گھنٹہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد مجھے دارالشفا مڈل اسکول میں پہلی جماعت میں شریک کروایا گیا۔ یہ مدرسہ امتیاز حسین صاحب تعلقدار کے مکان میں تھا۔ ہمارے مکان سے مدرسے کا فاصلہ چار فرلانگ تھا اور سب طالب علم پیدل ہی چل کر مدرسے جایا کرتے تھے۔ راستے میں بلدیہ کا دفتر تھا جو اس زمانے میں صدر دفتر صفائی کہلاتا تھا۔ یہ عمارت ان دنوں بہت بڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے پیچھے مدرسۂ اعزہ تھا جہاں پر صاحبزادے یعنی خاندان آصفی کے افرادِ خاندان کے لڑکے تعلیم پاتے تھے لہٰذا اس بنا پر اس مدرسہ کا نام مدرسۂ اعزہ رکھا گیا تھا۔ یہ صاحبزادے اُن دنوں رتھوں میں مدرسوں کو جایا کرتے تھے۔ ان رتھوں کو بیل کھینچا کرتے تھے۔ اور یہ کھلی سواری ہوتی تھی۔ نہ اس میں کوئی سیٹ ہوتی تھی۔ نہ پاؤں چھوڑنے کی جگہ۔ چار زانو ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ زیادہ طویل عرصہ کے لیے تو یہ سواری تکلیف دہ اور غیر محفوظ ہوتی تھی۔ روزانہ ان رتھوں میں سوار بچوں اور ہمارے مدرسہ جانے والے بچوں کی مڈبھیڑ ہوتی تھی اور ایک دوسرے پر طنز کرتے تھے۔ مدرسۂ اعزہ کو جانے والے صاحبزادے رتھ میں سوار ہو کر فوقیت محسوس کرتے تھے اور ہمارے مدرسے کو جانے والے بچے پیدل چلنے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ مکان سے کچھ دور نور خاں بازار کے راستے میں راجہ راؤ رمبھا کی دیوڑھی تھی۔ راجہ راؤ رنبھا ضلع عثمان آباد کے تعلقہ بھوم کے جاگیردار تھے اور شہر کی

آتی یہاں کے آدمی تھے بہت کم باہر نکلتے تھے ان کی دیوڑھی پر صبح سوا نو بجے اور شام میں مغرب سے قبل نوبت بجتی تھی جوں ہی نوبت شروع ہوتی ہم لوگ کپڑے پہن بستے لے کر اسکول کو روانہ ہو جاتے تھے ٹھیک ساڑھے نو بجے اسکول شروع ہوتا تھا اور تمام لڑکے صحن مدرسہ میں ٹھیک کھڑے ہو کر تعریفِ خدا پڑھا کرتے تھے۔

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا ؎ کیسی زمین بنائی کیا آسمان بنایا

اس کے بعد سب اپنی اپنی جماعتوں میں چلے جاتے تھے۔ نظم و ضبط کا یہ حال تھا کہ دورانِ اوقاتِ مدرسہ مکمل خاموشی رہتی تھی جس کو انگریزی میں pin drop silence کہتے ہیں۔ اس زمانے میں مدرسوں میں کوئی یونیفارم یا مقررہ لباس نہیں تھا سب کے سب شیروانی ٹوپی پہن کر مدرسے جایا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد مدرسہ عدم گنجائش کی وجہ سے قریب میں عباس حسین صاحب کے مکان میں منتقل ہو گیا اور ابھی تک اس مکان میں قائم ہے مدرسہ میں چونکہ میدان نہیں تھا اس لیے ڈرل کرانے کے لیے لڑکوں کو بالسٹی کے کھیت لیجایا جاتا تھا اس جگہ پہنچنے کے لیے بہت تنگ و تاریک گلیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا اس جگہ کو بالسٹی کا کھیت اب بھی باقی ہے لیکن مکانوں کی تعمیر ہونے کی وجہ سے رقبہ بہت کم ہو گیا ہے اور نقشہ بدل گیا ہے مدرسہ کے قریب ایک بہت بڑی قطب شاہی دور کی مسجد ہے جو اب مکانات کے انہدام کی وجہ سے سڑک پر آگئی ہے تمام بچوں کو ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے وہاں لے جایا جاتا تھا اور نماز سے فراغت کے بعد ہم گھر جاتے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اسکول کو واپس ہوتے ان دونوں سڑکوں پر آمد و رفت بہت کم ہوتی تھی۔ سڑکوں پر سیکل جھٹکے اور فٹکرام نظر آتے تھے اس زمانہ میں سیکل رکشا اور آٹو رکشا کا چلن نہیں تھا فٹکرام ایک کشادہ لیکن سست رفتار سواری تھی جس کو بیل کھینچا کرتے تھے عام طور پر پردہ نشین خواتین کافی تعداد میں اس کو استعمال کرتی تھیں جھٹکے اور ٹانگے نسبتاً اوسط رفتار کی سواریاں تھیں تانگہ بہ نسبت جھٹکے کے زیادہ آرام دہ سواری تھی اور کرایہ بھی نسبتاً زیادہ تھا۔ اچھے جھٹکے میں چار پانچ آدمی آسانی سے سفر کر سکتے تھے اور چار آنے میں کام نکل جاتا تھا اس کے بعد بگھی ذرا زیادہ مرفع الحال لوگ استعمال کرتے تھے عام طور پر بلدیہ کے کارخانے کے بگھیاں، ایک گھوڑے والی اور دو گھوڑے والی چلتی تھیں۔ دن تمام کے لئے عام طور پر پانچ روپیہ کرایہ تھا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے تین روپیہ میں کام نکل جاتا تھا۔ موٹریں سڑکوں پر کم نظر آتی تھیں، دس پندرہ بیس منٹ یا بعض اوقات آدھ گھنٹے میں کوئی موٹر سڑک پر نظر آتی تھی۔ اب جہاں عزا خانہ زہرا واقع ہے اس مقام پر ایک پولس کا جوان متعین ہوتا تھا جو موٹر گذرنے پر سیٹی بجایا کرتا تھا تاکہ لوگ مطلع ہو جائیں اور کنارے ہٹ جائیں عام طور پر فٹے والے، ڈاج اور بیوک موٹریں چلتی تھیں اور صرف امراء و عظام اور اعلیٰ عہدہ داری موٹر رکھتے تھے بعض شوقین

نواب اور جاگیردار کھلی ٹواک کیاٹ استعمال کرتے تھے جو اس زمانہ کے لحاظ سے status symbol تھی. میرے اسکول کے زمانے تک سڑکوں پر بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں تھا اور سڑکوں پر قندیلیں روشن کی جاتی تھیں۔ ایک مشعلچی دوڑ بھاگتا ہوا ان کو روشن کرتا تھا اور صبح چار بجے یہ قندیلیں خود بخود بجھ جایا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں موسیٰ ندی کی فصیل بندی نہیں ہوئی تھی پرانی فصیل طغیانی کے زمانہ میں ٹوٹ کر ضائع ہو گئی تھی۔ بارش کے زمانے میں جو ان دنوں آج کل کے مقابل کافی ہوتی تھی ماہ ستمبر یا ماہ آبان میں اکثر بارش کی زیادتی کی وجہ سے ندی میں پانی کا چڑھاؤ کافی ہو جاتا اور لوگ ندی آئی کہہ کر ۱۹۰۸ء کی طغیانی کی تباہ کاریوں کے قصے سن کر خائف رہتے تھے۔

گھر کے قریب مسجد حاجی کمال جو اب بھی باقی ہے کافی آباد رہتی تھی محلے کے اکثر لوگ پابندی کے ساتھ وہاں نماز کے لیے جایا کرتے تھے ہم لوگ بھی فجر عصر اور مغرب کی نماز کے لیے وہاں جایا کرتے تھے ان دنوں جمعہ کو تعطیل ہوا کرتی تھی اور سب بچے پابندی کے ساتھ نماز جمعہ کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس مسجد میں نواب فصاحت جنگ جلیل ہر جمعہ کو اور نواب یار جنگ اختر مینائی بھی کبھی کبھی آیا کرتے تھے حضرت جلیل کا حلیہ ابھی تک میرے ذہن میں نقش ہے وہ موٹر پر آیا کرتے تھے خطبے سے کچھ پہلے آتے اور فرض کے بعد چلے جاتے تھے۔

ان دنوں پتنگ بازی بہت عام تھی اور پتنگوں کے موسم میں بچے جوان اور بعض اوقات بوڑھے بھی پتنگ اڑایا کرتے تھے اس موسم میں رنگ برنگ کی چھوٹی بڑی خوب صورت پتنگیں آسمان پر دکھائی دیتی تھیں پتنگوں کے جلسے بھی ہوا کرتے تھے ہمارے پڑوسی جاگیردار صاحب کے افرادِ خاندان کو بہت شوق تھا ملک پیٹ سے آگے ایک میدان تھا جو پولو کا میدان کہلاتا تھا بہت ہی مسطح زمین اور ہوا خوب اور کافی دور تک آبادی نہیں تھی جلسوں میں دو پارٹیاں ہوتیں ہر پارٹی میں چار یا پانچ آدمی ہوتے تھے پتنگ کٹنے کے بعد چٹھیاں جمع کی جاتیں اور شام کو جب جلسہ ختم ہوتا تو ہارنے والے ایک کاغذ پر اپنی شکست کا کاغذ لکھ دیتے عام طور پر ہم لوگ جس پارٹی کے ساتھ جاتے وہ پتنگ کاٹتے ہی جا کر چٹھی لاتے جلسے کے اختتام پر پتنگوں کی صورت میں جو مالِ غنیمت ہمارے ہاتھ آتا ہمارے لیے پورے موسم میں کافی ہو جاتا تھا۔

ان جلسوں میں طوائفیں بھی بلائی جاتیں اور پتنگ کاٹنے پر یہ گھنگھرو باندھے ناچتی ہوئی جاتیں اور چٹھی لے کر ناچتی ہوئی واپس آتیں اور دوپہر میں کھانے کے وقت گایا کرتی تھیں۔

اس زمانے میں یہاں بیڈمنٹن بھی بہت مرغوب کھیل تھا۔ ہمارے مکان کے سامنے بھی ایک کورٹ تھا اور ہمارے محلے کی ٹیم بھی حیدرآباد کے مشہور ٹیموں میں سے تھی۔ ہم لوگ پیچھے کھڑے رہ کر گلا چھینا کرتے تھے ہم کو مستعمل کاک مل جایا کرتے تھے جو ہم لوگ بعد

میں استعمال کرتے ۔

شادیاں ان دنوں اکثر رات سے شروع ہوتی تھیں بارات رات آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک نکلتی تو پر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے پیدل ہوتا تھا۔ اور باقی مہمان پیدل ساتھ ہوتے بچے بوڑھے کمزور لوگ بگھیوں، تانگوں میں جاتے ۔ ایک ڈیڑھ بجے تک ہوتا اور دوپہر کے دسترخوان بچھتے عام طور پر دعوتوں کا وقت ۔ رقعوں میں درج ہوتا ہو از صبح تا نصف النہار کیا بلکہ یوں سمجھئے کہ تین بجے تک کھانا چلتا ۔ ان دنوں شادی ہی کے دن تمام مہمانوں کو کھانا کھا دن کھانے کی دعوت کا رواج کم تھا۔ لوازمات بھی اس زمانے میں زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ لیکن بریانی خوشبودار ہوتی تھی کہ جب دیگ کھلتی تو سارے محلے میں بو مہک اٹھتی ۔

دولہا کی برات جاتے وقت بھی اور واپسی میں بھی باجے کے ساتھ جاتی اور اپنی اپنی حیثیت سے تیز ہوتے تھے ۔ تاشا مرفہ، بیانڈ، عروب کا باجا اور ناچ رہتا ۔ بالخصوص بارات کی واپسی کے وقت بسا اوقات گھر پہنچتے پہنچتے گیارہ یا اس سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی

محرم ان دنوں بہت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اور حیدرآباد میں بنارس اور شام اودھ کی وجہ سے مشہور تھا۔ مذہبی تہوار سے زیادہ ایک میلے کی شکل ہوتی تھی۔ مدارس اور دفاتر کو ۵ محرم سے بارہ محرم ہوا کرتی تھیں ۔

ہمارے مکان کے سامنے سے اعلیٰ حضرت (میر عثمان علی خان) کی اور ان کے محلات کی سواری محرم کے دوران ۹ محرم اور شاہی سواری کے گذرنے کی کئی دن پہلے سے تیاری ہوتی ۔ موم اندازی ہوتی اور سڑکیں دو بہت سواری کو دیکھنے کے لیے لوگ بارہ بجے سے ہی دو رویہ جمع ہونا شروع ہوتے تھے بلا لحاظ مذہب و ملت ہوتا۔ پولیس والوں کی سیٹیوں کی آواز سے محلہ گونج اٹھتا ۔ یہ لمبا قافلہ موٹر کاروں پر مشتمل طرح طرح کی موٹریں جس میں محلات اور شاہی افراد خاندان سوار ہوتے۔ محلات کے لیے یہی سالانہ اوٹنگ ہوتی تھی۔ موٹروں پر چلمنیں پڑی ہوتی تھیں ۔ جن کو اٹھا کر یہ خواتین باہر کا منظر دیکھتیں۔ سیٹیاں بجتے قریب موٹروں کا قافلہ شروع ہوتا۔ پولس کے عہدیدار سامنے رہتے اور کوتوال صاحب کی اشتعلانہ ہونے کی موٹر گذرتی اور اس کے بعد ہوگی۔ موٹروں کا قافلہ ۔ یہ ساتویں اور نویں محرم کا سالانہ معمول تھا۔

دسویں محرم کو بی بی کا علم کھلتا۔ ان دنوں تین چار ہاتھی اس جلوس میں ہوتے۔ صبح سے سڑکیں

ہلے پولیس کی جمعیت۔ پھر عزا دار، ماہی مراتب (نشان کا ہاتھی) اس کے بعد ایک اور ہاتھی۔ اور اس کے بعد بی کا علم لیا ہوا
ی۔ عوام جن میں مرد، عورتیں، بچے سب بلا لحاظ مذہب و ملت شریک ہوتے۔ کاغذ کے تعزیے بھی رہتے تھے۔ مجھے یاد
یں ہے کہ کہیں بھی اس جلوس میں کسی سال محرم میں کوئی فساد ہوا ہو۔ البتہ غنڈے اکثر نویں کی رات کو ایک دوسرے سے
یوں سے لڑا کرتے تھے۔

ڈیوک آف ونڈسر جس زمانے میں پرنس آف ویلز تھے۔ تو حیدرآباد کے دورہ پر تشریف لائے تھے۔ ان کی آمد پر
س اہتمام کیا گیا تھا۔ ان کی سواری کا جلوس چوکڑے میں نکلا تھا۔ اور ان کے ساتھ اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں بھی
ے۔ پولیس کا سخت بندوبست تھا۔

تمام مدارس کو تعطیل دی گئی تھی اور . . اسکول کے لڑکوں کو سڑکوں پر مختلف مقامات پر کھڑا کیا گیا تھا۔
راشفا مڈل اسکول کو نیلی باولی کے قریب جگہ دی گئی تھی۔ وہاں پہنچنے کے لیے ہم کو چادر گھاٹ کے دروازے کے پاس سے جواب
ہدم ہو چکا ہے۔ چادر پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ بڑے لڑکے چھوٹے لڑکوں کے ہاتھ پکڑے چادر پر سے گزرتے۔ پرنس اف ویلز
وانگی کے بعد سب کو مٹھائی کے لفافے دیے گئے۔ غالباً ان کا پروگرام دو تین دن رہا جس میں پولو، شیر کا شکار بھی شامل تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان میں ترک موالات اور خلافت کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ لیکن اس کے اثرات ہمارے
ہر میں کم دکھائی دیتے تھے۔ پھر بھی بعض اوقات جلوس سڑکوں پر دکھائی دیتے جو مخالف انگریز نعرے لگاتے۔ لیکن کبھی بھی جلوس
ے نہ تو عوام کو تکلیف پہنچائی اور نہ ان کے املاک کو۔

حیدرآباد میں ان دنوں سنیما کا رواج کم تھا۔ صرف انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ سالار جنگ کی دیوڑھی کے احاطے
یں ایک سنیما تھا جس میں ٹکٹ چار آنے، آٹھ آنے اور بارہ آنے ہوتا تھا۔

میں مڈل اسکول پاس کر کے سٹی کالج میں داخل ہوا۔ اس زمانے میں سٹی کالج کی عمارت نئی نئی تعمیر ہوئی تھی۔ ان دنوں
فضل گنج کے دروازے سے جو سڑک سالار جنگ میوزیم کے سامنے سے گذرتی ہے تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے ہم کو پرانی حویلی
ے جا کر سالار جنگ کی ڈیوڑھی سے گذر کر بادشاہی عاشور خانہ کے سامنے سے سٹی کالج پہنچنا ہوتا تھا۔ پرانی حویلی سے ان
دنوں صبح چار بجے، دن کے بارہ بجے اور رات کے آٹھ بجے توپ داغی جاتی تھی۔ جس سے لوگ اپنی اپنی گھڑیاں صحیح کر لیتے۔
اور جن لوگوں کے پاس گھڑیاں نہیں ہوتیں تو اس سے اپنے کاروبار کو ( Adjustment ) کرتے۔

ارزانی کا یہ عالم تھا کہ پرانی حویلی، دیوان دیوڑھی اور پتھر گٹی کی ہوٹلوں میں صبح کے وقت نہاری، کلچوں کا ناشتہ

وہ ہضم ہوجاتا ۔ اکثر لوگ گھر میں کھانے کی زحمت سے بچنے کے لیے ناشتہ کرتے ۔ میرے کانوں میں اب تک وہ صدا گونجتی ہے جو اکثر اسکول سے آتے وقت قصاب پرانی حویلی کے پاس لگایا کرتے تھے ۔ لگا دیا، راس ۔ چار پیسے پاؤ سیر ۔ ایک آنہ یا ۶ پیسے پاؤ سیر گوشت ملتا تھا ۔ اور شام میں قصاب بجائے گوشت اٹھائے رکھنے کے نکاسی پاؤ سیر بیچتے ۔ ان دنوں کی قیمتوں میں جو تفاوت ہے وہ قابلِ غور ہے ۔ اس طرح سالار جنگ کی کمان جو پرانی کی مسجد کو ملاتی ہے ۔ ایک فالودے کی دوکان تھی جو گرما میں صرف چار مہینے تک چلتی تھی ۔ اس دوکان میں برسوں یہ بیانر دیکھا ہے جس پر لکھا ہوتا ۔

اصلی ہے نہ نقلی ہے فالودہ فصلی ہے
ملکی ہے فروشندہ دوکان قدیمی ہے

تین پیسے میں بہت اچھی فالودے کی گلاس مل جاتی تھی ۔ جس سے سیری ہوجاتی تھی ۔ ادب آداب والی کلام ہم لوگ سٹی کالج جاتے وقت اور آتے وقت بھی سالار جنگ کی ڈیوڑھی کے اندر سے گذرتے تھے ۔ سالار جنگ کی حیدرآباد میں بڑی شہرت تھی ۔ آئینہ محل میں کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے نواب صاحب بعض اوقات دکھ سٹی کالج میں سید محمد اعظم پرنسپل تھے ۔ ان کا رعب کافی تھا ۔ وہ اگرچہ اسکول کا دورہ بہت کم کرتے لیکن ان کی آواز سن کر ہی بچوں کے دل دہل جاتے تھے ۔ اسکولوں کا ماحول اِن دِنوں کے مدارس سے جداگانہ تھا ۔ استادوں شائستگی، آپس کی بھائی چارگی عام تھی ۔ ایک عدد شریر النفس ہوتا تو اس کی خوب تنبیہ ہوتی ۔

سٹی ہائی اسکول یا سٹی انٹرمیڈیٹ کالج حیدرآباد کی بہت مشہور اور باوقار تعلیم گاہ تھی ۔ غریب خاندان کے بچے امرا کے لڑکے سب ہی ساتھ پڑھتے تھے ۔ تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا ۔ میٹرک کے امتحان میں اوّل طالب علم یا تو سٹی کالج، چادر گھاٹ ہائی اسکول، دارالعلوم حیدرآباد کے ہوتے ۔ فٹ بال اس زمانے کا پسندیدہ کھیل تھا ۔ سٹی کالج کی ٹیم بہت مشہور تھی ۔

اس زمانے کے اساتذہ میں سید محمد اعظم صاحب پرنسپل، غلام قادر صاحب وائس پرنسپل، عطاء الرحمٰن، فضل الرحمٰن صاحب، بخاری صاحب، محمود علی صاحب، سید محمد صاحب، سید فضل حق صاحب، سید احمد صاحب ان میں سے اکثر بعد کو ترقی کرکے جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر بھی بنے ۔

حضرات داستان طویل ہے اور وقت کم ۔ دیگر مقررین بھی ہیں اس لیے میں حمایت علی شاعر

کے چند اشعار پر اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں ؎

بدن پہ پیرہنِ خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب آگ کے سوا کیا ہے

یہ شہرِ سجدہ گذاراں، دیارِ کم نظراں
یتیم خانۂ ادراک کے سوا کیا ہے

تمام گنبد و مینار و منبر و محراب
فقیہِ شہر کی املاک کے سوا کیا ہے

یہ میرا دعوئے خود بینی و جہاں بینی
مری جہالتِ سفاک کے سوا کیا ہے

(یہ مضمون یوم ذوق کے موقع پر ایوان اردو میں منعقدہ ایک جلسہ میں پڑھا گیا)

# اعلان شعبۂ امتحانات ادارہ

ادارے کے امتحانات اردو فاضل اور اردو عالم (مسلمہ عثمانیہ یونیورسٹی) کے علاوہ اُردو زبان دانی اور اردو دانی ۱۰ر جنوری ۸۷ء سے ۱۳ر جنوری ۸۷ء تک تمام مراکز پر ایک ساتھ منعقد ہوں گے شرکت کی آخری تاریخ ۱۰ر ڈسمبر ۸۶ء مقرر کی گئی ہے اس کے بعد دیرانہ ۵ روپیے کے ساتھ ۲۰ر ڈسمبر سنہ ۱۹۸۶ء تک فارمس اور درخواستیں قبول کی جائیں گی۔ امتحاناتِ ادارہ کے اسناد بابتہ مئی ۸۴ء جنوری ۸۵ء اور جولائی ۸۵ء تیار ہو چکے ہیں۔ متعلقین مراکز اسناد ایوان اُردو سے بالمشافہ حاصل کریں۔ جواب طلب امور کے لیے کارڈ یا لفافہ ضرور بھجوائیے۔ (منتظم شعبۂ امتحانات ادارہ)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

# مٹی کا دیا

میرزا ادیب نے آپ بیتی کے اختتام پر لکھا ہے :

مسافر تو کہاں سے آیا ؟
ماضی کے اندھیاروں سے
اندھیرے تو آج بھی ہیں !
میرے ہاتھ میں مٹی کا دیا ہے ــــــ روشنی میرے ساتھ چلتی رہی ہے۔
ساتھ چلتی رہی ہے۔
تیری منزل کہاں ہے ؟
وہ ــــ دور ــــ نما فشاں افق ــــ ایک روز میں اپنی یہ ننھی سی لو اس کی بیکراں روشنیوں کر دوں گا۔

اس کے بعد پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

" میری روداد پڑھنے والے ان صفحات میں اس شخص کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے جو اپنے آپ دیا کہتا ہے "

آپ بیتی کے آغاز میں وہ اپنے ماحول اپنی ذات کے تضادیوں واضح کرتے ہیں :

" یہ نسل میری نسل تھی جو صرف جینا جانتی تھی اور یہ صرف اس وجہ سے کہ جینے پر مجبور تھی۔ یہ نسل، مکان میں سانس لے رہی تھی جس کے دروازے تو دروازے کھڑکیاں اور روشن دان تک بند تھے۔ میں ا

نسل کا ایک فرد تھا جس کی پیدائش محض ایک عام واقعہ تھی یہ میں تھا جسے ازل تا آخر وقت کے طاق پر مٹی کا دیا بن کر جلنا تھا۔"

میرے اردگرد اندھیرا تھا۔ جہالت کا اندھیرا۔ قدامت پرستی کا اندھیرا۔ خاندانی بے حسی اور جمود و تعطل کا اندھیرا — خاندان بے حسی اور جمود و تعطل کا اندھیرا — مجھے اندھیرے کی ان بلند دیواروں سے باہر نکلنا تھا۔ میری منزل ایک روشن دنیا تھی۔ افق تا افق منور — تابناک چمکتی دمکتی ہوئی۔

کوئی شقی القلب ہی ہوگا جو اس کتاب میں چھپے ہوئے عظیم کرب کو محسوس نہ کر سکے۔ اس کتاب میں ایک معمولی خاندان کے ایک نہایت باہمت فرد کی داستانِ حیات قلمبند کی گئی ہے اور بظاہر یہ داستان میرزا ادیب کی ہے لیکن میں نے بار بار محسوس کیا ہے کہ یہ کہانی ہندوستان کے مسلم معاشرے کی کہانی ہے جس کے پچانوے فی صد افراد قیام پاکستان سے پہلے انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جن کے گھروں میں معمولی قسم کی ضروریاتِ زندگی بھی موجود نہیں تھیں جہاں جان اور تن کا رشتہ بمشکل برقرار رکھا جا سکتا تھا۔ بچوں کی خواہشات۔ خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہوں — پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ جہاں ایک گھر میں کئی کئی بچے ہوتے تھے اور ان کی صحت، لباس، خوراک اور علاج پر توجہ نہیں دی جا سکتی تھی کہ ماں باپ کے ذرائع آمدنی محدود ہی نہیں اکثر صورتوں میں معدوم تھے۔ جہاں فاتر العقل اور مغضوب الغضب بزرگ اپنے حالات میں اس قدر پس چکے تھے کہ بچوں کو پیس کر رکھنا ان کا مزاج ہی نہیں ذہنی مجبوری بھی تھا۔

لاکھوں کروڑوں خاندانوں کے بچے کبھی کسی اسکول کا منہ نہیں دیکھتے تھے۔ اس بچے کو بھی تعلیم سے مکمل طور پر محروم رکھ کر ایک بڑھئی اور ایک لوہار کے پاس کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا گیا لیکن یہ بچہ اس ماحول میں سمجھوتہ کرنے میں ناکام رہا۔ پھر اسے ایک ایسے سکول میں بھیجا گیا جہاں دروازے پر شکر قندی، کالے چنے اور برف کے گولے متعفن نالیوں کے اوپر مکھیوں کی بھن بھن کے ساتھ بکتے تھے اور اندر دق اور سل کے مریض نسوار کے رسیا اور امرد پرست ماسٹر تھے۔ جو اپنے حالات کے شکار تھے۔

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

مگر بچہ تھا کہ بے مقصد زندگی کے اس بھنور میں غوطے کھاتا ہوا چار ہا تھا اور اس سے بے خبر تھا کہ وہ ایک دن افق پر پہنچنے والا ہے۔ پھر بھی بچہ ذرا بڑا ہوا۔ ہوش سنبھالا۔ اردگرد کی دنیا کو دیکھنا شروع کیا۔ اسکول کی بڑی

کلاسوں میں پہنچا۔ ایک ہم جماعت حسن مثنیٰ شمع کے اکسانے پر شعر گوئی شروع کی۔ دراصل میرے نزدیک نہ
بچے کا بہت بڑا محسن ثابت ہوا۔ وہ خود دوسروں کے اشعار اپنے نام سے سناتا تھا مگر اس بچے کے سینے میں
خفتہ جذبے کو بیدار کر گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتداء میں اس بچے کو بطور شاعر داد و تحسین نہ ملتی تو شاید و
کم ہو کر رہ جاتا۔ جوہر کا موجود ہونا اور بات ہے۔ جوہر کا ڈھونڈ نکالنا اور چیز ہے اور کبھی کبھی "
یافتہ گنج" والی بات بھی درست ہی نکلتی ہے۔

غرض شعر گوئی کا آغاز ہوا اور یہ بچہ پہلے دلاور علی سے دلاور علی عاصی اور پھر دلاور علی ادیب بنا۔
میں شعر گوئی کے ہنر نے اسے خاصی خود اعتمادی بخش دی۔ یہیں سے اور اسی وسیلے سے اس کی ملاقات ا
اور دیگر ادبی شخصیات سے ہوئی۔ نظم و نثر کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر رفتہ رفتہ ایک اہم ادبی مقا
کالج میں داخل ہوتے سے پہلے ہی ادبی حلقوں میں اس کا نام معروف ہو چلا تھا۔ رہی سہی کسر اسلامیہ کالج
ادبی ماحول نے پوری کر دی جہاں اساتذہ میں مولانا اصغر علی روحی، خواجہ دل محمد، ڈاکٹر تاثیر، سید فیاض
علم الدین سالک اور حمید احمد خاں جیسے ادب پرور لوگ اور طلبہ میں محمود نظامی، خضر تمیمی، ضمیر جعفری
حمید نظامی اور نسیم حجازی جیسے مستقبل کے مصنفین حصولِ تعلیم اور ادبی ذوق کی آبیاری میں مشغول تھے

بی اے (آنرز) کرنے کے بعد میرزا ادیب کو دنیا کے اس ماحول سے سابقہ پڑا جس میں بے روزگاری
اور کساد بازاری نقطۂ عروج تک جا پہنچی تھی اور جسے انگریزی میں ECONOMIC DEGRESSION
کہا جاتا تھا۔

اسی عرصے میں فارغ التحصیل ہونے والے تمام شعرا اور ادبا شامل ان میں۔ راشد، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، یوسف ظفر، حفیظ ہوشیارپوری
وغیرہ بھی اسی بے روزگاری کا شکار رہے۔ اگر میرزا ادیب بھی ملازمت کی تلاش جاری رکھتے تو جلد یا بدیر کسی
عہدے پر جا پہنچ جاتے مگر انہوں نے اپنے IDEALS کے مطابق زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ ادبی پرچوں میں
ملازمت کی۔ فلمی پرچوں میں ملازمت ملی تو انہیں ادبی پرچوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ غیر ادبی
انہیں دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ ریڈیو کی ملازمت میں بھی ان کے اندر کا فن کار مطمئن نہ ہو سکا۔ دوبارہ پرچے
کی۔ یہاں سے مایوس ہو کر دوبارہ ریڈیو میں جا پہنچے۔ فلمی دنیا میں بھی آسودگی تلاش کی مگر فطری جھجک
باعث پریشانی کا شکار ہوئی۔

بچپن میں داستانوں نے تخیل کو جو مہمیز لگائی تھی جسمانی توانائی اس سے کوئی نسبت نہ رکھتی تھی اس لیے خوابوں کی دنیا بسانی شروع کی۔ معاشرے نے ان سے اور ان جیسے لاکھوں گھرانوں سے جو سلوک روا رکھا تھا اس نے معاشرتی اور معاشی ناہمواریوں کے خلاف شدید نفرت دل میں پیدا کردی۔ ہر انسان کے لیے آزادی اور ترقی کے مساوی مواقع کا حصول اُن کا مطمحِ نظر بن گیا۔ کچلے ہوئے لوگوں سے ہمدردی اور محبت رگ و ریشے میں سما گئی اور پھر عمر بھر قلم سے اپنے نظریات کا پرچار فنکارانہ انداز میں جاری رکھا۔ یہ ہے میرزا ادیب کی سرگذشت۔

انسان مٹی ہے، مٹی میں مل جائے گا مگر جب تک سانس کی لَو باقی ہے اور جب تک رگوں میں خون گردش کر رہا ہے یعنی بتی میں تیل جل رہا ہے انسان کو دیے کی طرح دبیز تاریکی کو سانولے سایوں میں بدلنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ مجھے مٹی کا دیا پڑھ کر مولانا حالی کی ایک نظم یاد آگئی جس کے چند شعر میرزا ادیب کی حیات اور سوانح حیات پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ انہیں پر مضمون کا اختتام ہے:

جھٹ پٹے کا وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ راہ لاکے روشن کردیا

تاکہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا

یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

○●○

## تحفۂ لاجواب

یہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو — مرغوبِ دلِ ہر کس و ناکس لے لو
سب کا لینا تو امر ناممکن ہے — سب میں بہتر یہ ہے کہ تب رس لے لو

امجد

اد

توفیق حیدرآبادی

# آزارِ انتظار

آہ اے انتظار تو وہ شام ہے کہ جس کا سہانا اور ٹھنڈا وقت آفتابِ گرما کی گرم شعاعوں سے تیز اور گرم ہے اور تو وہ سحر ہے کہ جس کی سپیدی شام کی تاریکی سے زیادہ تاریک اور بھیانک دکھائی دیتی ہے تیرے خوشگوار ہوا کے جھونکوں میں زہریلے سانپ بیٹھے جھولا جھول رہے ہیں۔ تیرے موسم بہار کے سائے میں خزاں پرورش پا رہی ہے، اور تیرے خوشنما پھولوں کی تہہ میں دنیا بھر کی تلخ کامیوں کی بو چھپی ہوئی ہے، آہ میں ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوا ہوں جس کو ایک خوبصورت ایوان کا زینہ کہہ سکتے ہیں مگر میرے لیے یہ سب کچھ خواب ہے، گویا میں عالم خواب میں انتظار کے زینۂ اوّل پر پہنچ گیا ہوں ممکن ہے کہ یہاں سے ڈھکیل دیا جاؤں یا قعرِ ناامیدی میں گرا دیا جاؤں۔

آہ اے انتظار تجھ پر مرنے والے تیری امیدوں کے سہارے جی رہے ہیں، تو سنگِ مرمر کی ایک صاف و شفاف مورت کی طرح دکھائی دیتا ہے مگر آہ! سرد اور بے جان ہے۔

(۱۳۲۲ھ)

# علی ظہیر

## غزل

ماناکہ ہم خراب ہیں خانہ خراب تھے
جو بھی تھے آپ اپنی جگہ آفتاب تھے

خواب و خیال و وہم و گماں ہوکے رہ گئے
وہ لوگ جو چمن تھے، صنم تھے، گلاب تھے

رُکتے تو کیسے رُکتے کہ تنہا نہیں تھے ہم
راہیں تھیں منزلیں تھیں سفر بے حساب تھے

ہم کو چنا گیا تھا اسی کام کے لیے
پڑھتے ہیں بھی آپ کہ ہم انتخاب تھے

آواز وہ ضرور اسی کم سخن کی تھی
گو سامنے خلا تھا کئی اک حجاب تھے

○

## ایک نظم

بے مروّت موت کے ہاتھوں
مجسّم خلق !!
آخر کس طرح
روشنی اور روشنی کے بیچ
خوابوں کی سیاہی لوٹتی ہے
سحر کے بے مایہ چراغوں سے
تھکن یا نیند سے پہلے ہی سو جانے کی کیفیت ٹپکتی ہے
بے مروّت موت کے ہاتھوں
فضا مغموم ہوتی ہے
بہت مغموم ہوتی ہے

○

نصیر پرواز

# غزل

خوشبو رنگت خواب چاندنی انگ لگا کر پچھتائے
دھندلی آنکھوں میں دھرتی کا روپ سجا کر پچھتائے

پربت نے جھک کر نہ دیکھا ساگر کتنا گہرا ہے
پاگل سائے تھکی تھکی باہیں پھیلا کر پچھتائے

گھر گھر مردہ روحیں عریاں وحشت میں ڈوبی بستی
گہرے سناٹے کو ہم آواز بنا کر پچھتائے

جو چہرہ چہرہ دھندلی تھی جو قسمت قسمت بے نور
اپنے دل میں اس چاہت کا درد بسا کر پچھتائے

جس نے اپنی آنکھ نہ کھولی جس نے کوئی بات نہ کی
اس گونگے پتھر کو اپنا نام بتا کر پچھتائے

دوپہری کا پاگل سورج آنگن بیچ نہ کھل پایا
اونچی دیواروں کو اپنا مان بنا کر پچھتائے

چاند مرے قدموں کے نیچے سورج میری مٹھی میں
لوگ مری سوئی راتوں کی ہنسی اڑا کر پچھتائے

تم بھی جھوٹے وعدے کر کے درپن سے شرمائے ہو
ہم بھی اکثر ٹوٹی بکھری قسمیں کھا کر پچھتائے

ان کے در پر بیٹھے بیٹھے ساری عمر گزار آئے
اس کو بھی پاگل پن کہیے ہوش میں آ کر پچھتائے

جتنا تم نے ساتھ نبھایا یہ احسان بھی کافی ہے
دل تو دل ہے دیوانہ ہے آس لگا کر پچھتائے

جس نے اپنا درد نہ جانا اشک نہ پونچھے اے پرواز
اس دنیا کو اپنے دل کا بھید بتا کر پچھتائے

صابر فخرالدین

# غزلیں

ہزاروں مسائل میں الجھا رہا
جو لمحہ بھی گذرا الجھ ایسا رہا

ہواؤں کے طوفان اُٹھتے رہے
مگر میں سمندر تھا ٹھہرا رہا

جہاں روح ساحل سے تھی دور تر
وہاں جسم پانی میں ڈوبا رہا

غمِ زندگی کیا میسّر ہوا
رمِ زندگی کا نہ سودا رہا

خلاؤں میں رہ کر بھی صابر مرا
زمیں سے اٹوٹ ایک رشتہ رہا

○

چھل چھپٹ مایہ سمندر دُور تک
بن گیا سایا سمندر دُور تک

سلسلہ در سلسلہ اک خواب سا
تہہ بہ تہہ پھیلا سمندر دُور تک

تھا تعاقب میں ہمارے بھی کبھی
دستکیں دیتا سمندر دور تک

کھیتے کھیتے میں نے کشتی روک لی
تھم گیا بہتا سمندر دُور تک

جب بھی صابر چھن سے ٹوٹا آئینہ
چیخ کا پھیلا سمندر دور تک

○

# نقد و نظر

## دو شعری مجموعے

**چہرے** (مجموعۂ کلام)
شاعر: شاکر بانکوٹی

"چہرے" شاکر بانکوٹی کا مجموعۂ غزل ہے۔ اس میں کل ۱۲۸ غزلیں ہیں۔ پہلی غزل حمدیہ ہے۔ دیگر غزلیں نئے اور پرانے انداز کے امتزاج کی غماز ہیں۔ بعض شعر بے حد روایتی ہیں جیسے:-

پروانہ ہے چراغِ تمنا کی لَو سے دور
سونی پڑی ہے بزمِ شبستاں ترے بغیر

اور بعض اشعار میں نیاپن ہے۔ علائم کا بھی استعمال ہے اور نئی تشبیہوں کی جستجو بھی مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

میرا بدن ہے دھوپ میں دن بھر جلا ہوا
اے شام انتظار ترا کیا ہوا

اتنی کڑی تھی دھوپ کے سائے سمٹ گئے
مطلب کے یہ بھی دوست تھے رستے سے ہٹ گئے

لیکن اُن کے غالب اشعار کلاسیکی شاعری کی تقلید ہی میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شاکر صاحب خود کہتے ہیں:-

نظم نو نظم کہن ثابت ہوا
ارتقا جو بہ فکر و فن ثابت ہوا

"شاکر" بانکوٹی کا یہ مجموعۂ غزل خوب صورت گٹ اپ کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ اس کے ناشر ہیں کوکن اُردو رائٹرس گلڈ

شاخ نیروبی (کینیا) اور اسے چھاپا ہے موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی نے ۱۲۸ صفحات کی مجلد کتاب کی قیمت ۲۵ پچیس روپے اور ملنے کا پتہ ہے۔ موڈرن پبلشنگ ہاوس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ —

(سید علی ظہیر)

## لہو کے چراغ (مجموعۂ کلام)
### شاعر: انجم عباسی

"لہو کے چراغ" انجم عباسی صاحب کا غالباً پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ انھوں نے "حرفے چند" کے عنوان سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے لکھا ہے کہ "لہو کے چراغ" میری دس بارہ سال کی کاوش کا نتیجہ ہے۔" اس مجموعہ میں نظمیں، غزلیں اور چند متفرق اشعار متفرقات کے عنوان سے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا حصہ نظموں کا ہے اور دوسرا غزلیات کا۔

انجم عباسی کو نہ تو اپنی شاعری کے بارے میں کوئی خوش فہمی ہے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو کسی "پوز" میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو جیسا دیکھا اور محسوس کیا ہے اپنی سیدھی سادی زبان میں ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر مقامات پر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ جیسے اُن کی نظموں "فاصلہ" "نیا ہندوستان" "حیاتِ جاودانی" "عہد و پیمان" میں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے دل کے سچے جذبات ہم تک پہنچا رہا ہے۔ انجم عباسی کی نظموں میں راست گفتگو کے علاوہ اختصار بھی ہے گو کہ وہ اختصار کی کوشش میں زبان و بیان کی باریکیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

غزلوں میں بھی نظموں کی طرح انجم عباسی صاف گوئی کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ گو کہ اس فن میں انھیں کامل ہونے کے لیے ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ پھر بھی " اس دور کا ہے آدمی پتھر بنا ہوا " اور "انگلیوں میں ادھ جلی سگریٹ ہونٹوں پر دھواں" جیسے جدید مصرعے بھی ان کے ہاں ہمیں مل جاتے ہیں۔ ان کی شاعری سے ہمیں صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی بڑے شہر میں رہنے بسنے والے انسان کی شاعری ہے۔

موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی نے اس کتاب کو بڑے اہتمام سے کوکن اُردو رائٹرس گلڈ شاخ نیروبی (کینیا) کے لیے شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت ۲۰ روپے اور ملنے کا پتہ:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

(علی ظہیر)

وقار خلیل

# اُردو نامہ

## اُردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

● ۔۔۔ ۲ مئی ۱۹۸۶ء۔ نقاد اور ادیب پروفیسر یوسف سرمست نے پروفیسر سیدہ جعفر سے صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ کا جائزہ حاصل کیا۔

● ۔۔۔ ۳ مئی حلقہ ارباب مزاح کا فکاہی مشاعرہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی صدارت میں منعقد ہوا، ڈاکٹر بیگ احساس نے نظامت کی۔ طنز و مزاح کے مشہور شعرا نے کلام سنایا۔

● ۔۔۔ جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر "سیاست" نے ممتاز کارٹونسٹ وہاب حیدر مرحوم کے کارٹونوں پر مشتمل کتاب "شعر یہ شوشہ" طبع دوم کی رسم اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور جہاندار افسر نے وہاب حیدر کی شخصیت اور ان کے کارٹونوں کے بارے میں اظہار خیال کیا۔

● ۔۔۔ ۴ مئی بزم تمثیل ادب کے مشاعرے میں مسنر سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، راجہ لال راجہ، مانعابدی آغا سروش، جیلانی بیگ صادق، معراج صوفی، سوز عابدی اور جگجیون پرشاد جیون نے کلام سنایا۔ جناب صادق نقوی نے صدارت کی۔

● ۔۔۔ ۵ مئی مرکز ادب کا ماہانہ مشاعرہ عظیم صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا، ماہر حیدرآبادی، یوسف نظر، عزیز عارف، مومن خاں شوق، الطاف صمدانی، ناقد رزاقی، ضیاء الزماں منیر، عزیزہ ناگپوری اور لیاقت افسر نے کلام سنایا۔

● ۔۔۔ ۶ مئی ماہنامہ "شگوفہ" کے زیر اہتمام ادبی و شعری محفل پرویز یداللہ مہدی نے طنز و مزاح سے بھرپور مضامین

سنائے محفلِ شعر میں جس کی صدارت طالب خوندمیری نے کی مسز فخاہمتین، رؤف خیر، علی الدین نوید، ذکی بلگرامی، مظہر الزماں بشارت علی بشارت، مظہر مہدی، ستار صدیقی، شارق کے علاوہ اقبال ہاشمی، ان پڑھ بھونگیری، حفیظ خاں مذاق اور صدرِ مشاعرہ نے کلام سنایا۔

◉ ـــ اُردو اسوسی ایشن سکریٹریٹ کا اردو، ہندی مشاعرہ مسٹر شراون کمار چیف سکریٹری کی صدارت میں منعقد ہوا مسٹر سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، راشد آذر، بانو طاہرہ سعید، صلاح الدین نیر، ناصر کرنولی، رئیس اختر ڈاکٹر یم یل نگم، رئیس اختر، رحمٰن جامی، محمد منظور احمد، نہپال سنگھ ورما، انڈو ششِ شدطی، انجم قمر سوز، عزیز النسا صبا، مظفر النسا ناز، فیض الحسن خیال اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔

◉ ـــ حیدرآباد لٹریری فورم کے اجلاس میں مظہر الزماں خاں نے ۱۹۸۵ء میں نظم نگاری پر مقالہ سنایا جس پر بحث بھی ہوئی بیگس نواز شارق نائب صدر حلقۂ ارباب ذوق (جدہ) نے حلقہ کے اس اجلاس میں رفتارِ ادب کے موضوع پر مخاطب کیا۔ علی ظہیر جنرل سکریٹری نے رپورٹ سنائی اور غیاث متین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ادبستانِ جلیل کے ادبی و شعری اجلاس میں جس کی صدارت پروفیسر تمنیہ شوکت نے کی، فصاحت جنگ جلیل کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر مجاور حسین رضوی اور ڈاکٹر لئیق صلاح نے مضامین سنائے جلیل بین کلیاتی تحریری تقریری مقابلوں کے کامیاب امیدواروں کو صدر صاحب کے ہاتھوں انعامات تقسیم کیے گئے مشاعرہ کنول پرشاد کنول کی صدارت میں روشن چراغ علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، رحمٰن جامی، رئیس اختر، نہپال سنگھ ورما، راجہ لال راجہ، منوہر لال بہار، نوراں تسکین، شمع پروین اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔

● ـــ دیارِ ادب کی طرف سے جناب طیب انصاری صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج گلبرگہ کو اردو میں ڈاکٹریٹ ملنے پر تہنیتی اجلاس ڈاکٹر یم یل نگم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محمد منظور احمد، صادق نقوی، نہپال سنگھ ورما اور رئیس اختر نے ڈاکٹر طیب انصاری کی ادبی و علمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مبارکباد دی۔ اس موقع پر امیر احمد خسرو نے سفرِ پاکستان کے تاثرات بھی سنائے سعید شہیدی کی صدارت میں منتخب مشاعرے کے بعد خوشگوار تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

● ـــ شگوفہ پبلکیشنز کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر لئیق صلاح لکچرر گلبرگہ یونیورسٹی کا مقالہ عہدِ آصفجاہ کی علمی و ادبی خدمات شائع ہوا اس سے قبل ڈاکٹر لئیق کی دوکتابیں شمس الدین محمد فیض اور طنز و مزاح پر مبنی ستی سنائی شائع ہو چکی ہے۔

● ـــ ہندی اردو شعراء کی بزم گیت چاندنی کا مشاعرہ عزیز صوفی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر نگم، منوہر لال بہار، ثاقب بنارسی، ضیا ساحل، یوسف قادری، الطاف صمدانی، جیلانی بیگ صادق، حمید رونق، نذیر قیصر، عزیز بھارتی، بھگوان پرشاد جیوتی، نہپال سنگھ ورما، سرور حسن اور [illegible] نے کلام سنایا۔

● ۱۰ جون - ممتاز موسیقار پدم شری عزیز احمد خاں وارثی کے انتقال پر حیدرآباد کے شعری اور تہذیبی حلقوں میں رنج و الم کا اظہار کیا گیا۔ وارثی مرحوم قوالی اور کلاسیکی موسیقی کے نامور فنکار تھے۔ ادارۂ ادبیات اُردو کے سالانہ یوم قطب شاہ کے موقع پر وارثی مرحوم اپنے کمالِ فن کا برسوں مظاہرہ کرتے رہے۔

● ۱۴ جون - قومی استحکام داس کمیٹی کے زیر اہتمام اردو گھر میں مشاعرہ عید ملاپ کا مسز کمود ینی جوشی گورنر نے افتتاح

● محفل خواتین کے ادبی و شعری اجلاس میں ڈاکٹر عاصمہ کمال نے "ہندوستانی عورت ایک نفسیاتی جائزہ" کے زیر عنوان مقالہ سنایا۔ خواتین شعراء نے کلام پیش کیا۔

● حیدرآباد لٹریری فورم کا طنز و مزاح کے ادب پر مبنی اجلاس ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پرویز یداللہ مہدی، مسیح انجم اور عابد معز نے فکاہی تحریریں پیش کیں۔ طالب خوندمیری، مصطفیٰ علی بیگ، حمایت اقبال ہاشمی، معین بمبو، صبغۃ اللہ بمباٹ نے کلام سنایا۔ غیاث متین نے نظامت کی۔

● جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست نے نئے اردو ہفت روزہ "جمہور" کی رسم اجرا انجام

● ادارۂ مرکز ادب کا مشاعرہ جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ وقار خلیل، ماہر حیدرآبادی، عظیم حیدرآ مومن خاں شوق، الطاف صمدانی، ابوالفاروق شعور، شاغل ادیب، صادق نوید، شفیع اقبال، عزیز بھ اور منیر الزماں منیر نے کلام سنایا۔

● ۲۲ جون ادارۂ فکر و نظر اور تنظیم اردو کا ملا جلا مشاعرہ عید ملاپ جہاندار افسر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر راہی نے نظامت کی اور قدیم دبستانِ سخن کے شاعروں نے کلام سنایا۔

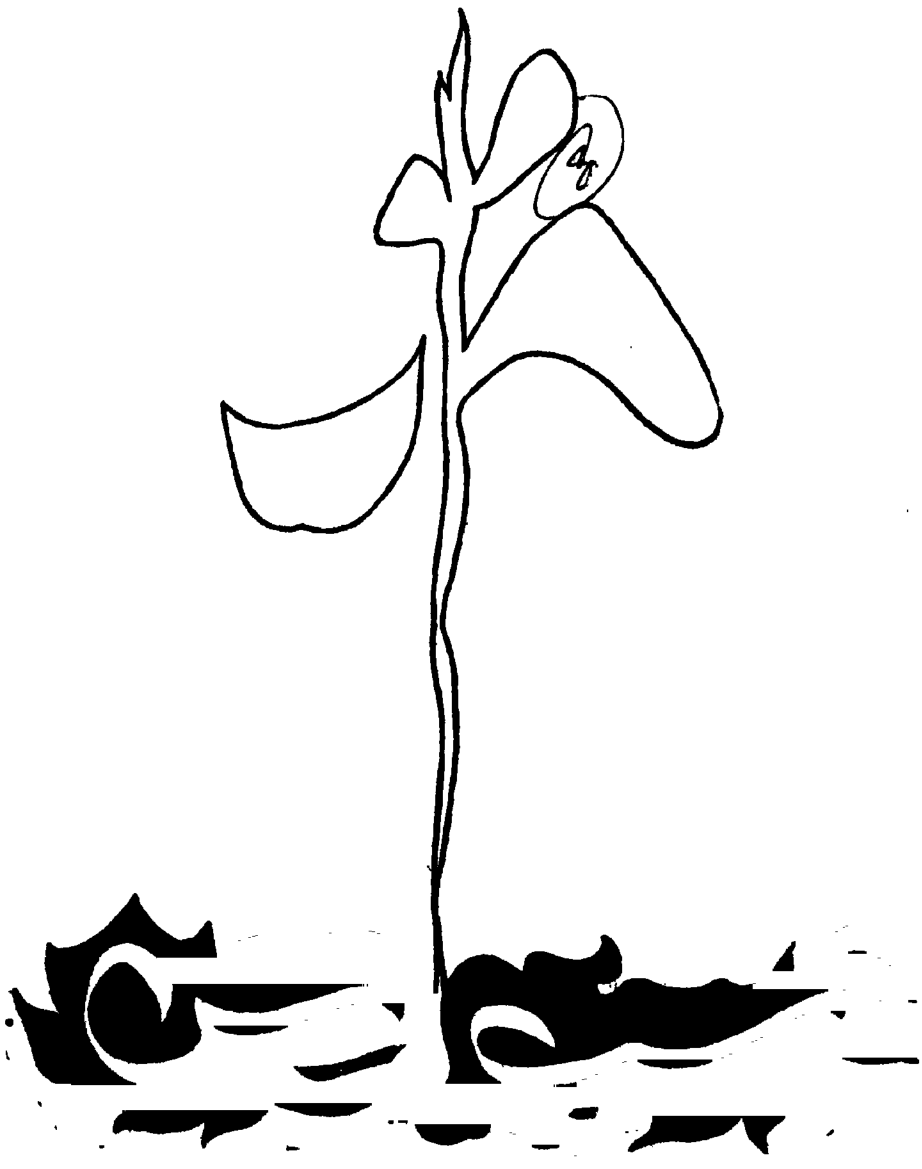
● جناب عارف مجاہد لکچرار اردو کالج آف لینگویجز کو ان کے مقالے "حفیظ قتیل، حیات اور کارنامے" کی تکمیل پر عثمانیہ یونیورسٹی نے ایم فل کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ موصوف نے یہ مقالہ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی کی نگرانی میں تحریر کیا۔

● سالار جنگ میوزیم کے زیر اہتمام سہ لسانی مشاعرہ مسز نارائن راؤ اسپیکر اسمبلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسز بدری وشال پتی مہمان خصوصی تھے۔ اس مشاعرے میں سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، راشد آذر، ڈاکٹر اختر احمد، منوہر لال بہار، خیرات ندیم، خواجہ شوق۔ ڈاکٹر نجم۔ نہپال سنگھ ورما۔ ادم پرکاش زتلی، صلاح الدین نیر، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، علی الدین نوید، صادق نقوی، صبیحہ نسرین اور

(آگے ص ۱۰۲ پر)

27 OCT 1966

# ادارہ ادبیات اردو



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

سنِ اجرا : ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۳۶۹

# ماہنامہ سب رس حیدرآباد

۰ جلد (۴۹) اگست شمارہ (۸) ۹

مدیر اعزازی :- مغنی تبسم

شریک مدیر :- محمد منظور احمد

معاون :- وقار خلیل

صدر :- محمد علی عباسی

نائب صدر :- ہاشم علی اختر

معتمد :- پروفیسر مغنی تبسم

اراکین :- عابد علی خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، محمد اکبر الدین صدیقی، رمن راج سکسینہ، ڈاکٹر پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد

۰ قیمت فی پرچہ ۲ روپے ۰ سالانہ ۳۰ روپے ۰ کتب خانوں سے ۳۵ روپے

بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے :- 

| | ہوائی ڈاک سے | بحری ڈاک سے |
|---|---|---|
| مشرق وسطیٰ | ۱۵ ڈالر | ۶ ڈالر |
| امریکہ | ۲۰ ڈالر | ۷ ڈالر |
| پاکستان، بنگلہ دیش | ۱۰ ڈالر | ۴ ڈالر |
| انگلستان | ۸ پونڈ | ۳½ پونڈ |

ادارۂ ادبیات اُردو "ایوانِ اُردو" پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد 500482

رمن راج سکسینہ، ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد سے شائع کیا

## ترتیب



# پہلی بات

یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق کا معیار دن بدن گرتا جارہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے۔ اسباب و علل کی چھان بین کی جائے اور تحقیق کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

اردو تحقیق کی کم عیاری کا بڑا سبب یہ ہے کہ جو طالب علم ایم۔ اے (اردو) میں داخلہ لیتے ہیں ان کی اکثریت زبانِ ثانیہ کے طور پر اردو پڑھ کر آتی ہے۔ بیشتر طلبہ اردو سے ایم۔ اے کرتے ہیں جنھیں دوسرے مضامین میں داخلہ نہیں ملتا۔ وہ اردو ٹھیک سے لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے۔ اردو زبان و ادب سے انھیں کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبوں کو برقرار رکھنے کے لیے ایم۔ اے کا معیار گھٹا دیا گیا ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد جنھیں ملازمتیں نہیں ملتیں، ایم فل میں داخلہ لیتے ہیں اور لکچراری کے خواب دیکھتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں لکچراری کے لیے پی ایچ ڈی کرنا ضروری ہے۔ ایم فل کے بعد وہ پی ایچ ڈی کے لیے اپنا نام رجسٹر کرواتے ہیں۔ اسی طرح ایم فل اور پی ایچ ڈی میں زیادہ تر ایسے طلبہ آجاتے ہیں جو ریسرچ کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ اساتذہ ان کی بے بضاعتی کو دیکھ کر مقالوں کے لیے ایسے موضوعات تجویز کرتے ہیں جن پر پہلے کام ہو چکا ہے۔ عنوان میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ بیشتر کسی غیر معروف مرحوم یا زندہ ادیب کی حیات اور کارناموں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ افسوسناک صورتِ حال یہ ہے کہ اساتذۂ اردو کی موجودہ نسل میں بہت سے وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے ایسے ہی طریقے سے پی ایچ۔ ڈی کی تکمیل کی ہے۔ ان مسائل پر غور کرنے کے لیے کوئی یونیورسٹی، اردو کی کوئی اکیڈمی یا تحقیقی ادارہ ایک سمینار یا ورکشاپ منعقد کرے تو باتیں کھل کر سامنے آئیں گی۔ اور تحقیق کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ٹھوس تجاویز مرتب کی جاسکیں گی۔ چند اقدامات فوری طور پر کیے جاسکتے ہیں جن سے صورتِ حال کو مزید ابتر ہونے سے روکا جاسکتا ہے مثلاً:

(۱) ایم فل میں داخلے کے امتحان کا معیار بڑھایا جائے۔

(۲) پی ایچ۔ ڈی اور ایم فل کے نگراں کی اہلیت کی جانچ کے لیے دوسری یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے کم سے کم تین پروفیسروں کا پیانل بنا دیا جائے اور انہی کی سفارش کے بعد ہی کسی استاد کو نگراں مقرر کیا جائے۔

(مغنی تبسم)

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

# میر تقی میر اور بقا اکبرآبادی کا ایک یادگار ادبی معرکہ

بقا اکبرآبادی میر و سودا کے زمانے کا ایک ایسا شاعر ہے جو ان دونوں استادان فن سے ہر ایک وقت الجھا۔ اس نے جواب الجواب ہجووں سے ان لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ ہجو گوئی میں بقا کو ایسی قدرت حاصل تھی کہ ان کے مقابلے میں کوئی بمشکل ٹھہر سکتا تھا۔ حیرت ہے کہ اس زمانے کے تذکرہ نگاروں نے ہجو نگار شاعر کی حیثیت سے ان کی صلاحیتوں کا خاطر خواہ اعتراف نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی ہجویات میں سودا کی طرح سماجی اور معاشرتی پہلو نمایاں نہ تھے۔ یہ ایک طرح کی ذاتی اور شخصی ہجویں تھیں۔ کئی تذکرہ نگاروں نے ان کی شوخیِ طبع اور معرکہ آرا طبیعت کا بیان اچھے برے دونوں طریقوں سے کیا ہے۔

بقا اور میر کے معارضے کی ابتدا میر کے اس شعر سے ہوتی ہے:

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں
ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

آنکھوں کے لیے ان سے بیشتر بقا نے دوآبے کی تشبیہ استعمال کی تھی۔ بقا کا شعر یہ تھا۔

ان آنکھوں کا نیت گریہ دستور ہے
دوآبہ جہاں میں یہ مشہور ہے

میر کے شعر کے سامنے جو زیادہ بھرپور اور دلکش تھا، بقا کا شعر ہیچ کر رہ گیا۔ بنیادی خیال بقا کا تھا، اور کامیاب شعر میر کا۔ اس لیے بقا پیچ و تاب کھانے لگے۔ انھوں نے میر کو آڑے ہاتھوں لیا۔

میرؔ نے تو ترا مضمون دھ بے کا لیا
پر بقاؔ تو یہ دعا کر جو وفا دینی ہو
یا خدا میرؔ کے دیدوں کو دوآبہ کر دے
اور بیتی یہ بہار اس کی کہ تربیتی ہو

اس زمانے میں کسی کے مضمون کو اس سے بہتر انداز میں پیش کر دینا کمالِ فن کی دلیل سمجھا جاتا تھا لیکن اس قسم کے شعر گویا بقاؔ کے سمندِ ناز پر تازیانہ تھے

یک چند میرؔ جی نے ہم کو لگا کے لہرے
چھپکے کیے ہمارے جتنے تھے شعر گہرے
آخر کو میرؔ اپنے مضمون کے دزد ٹھہرے
سنتے کہیں نہ ہووِیں شیطان کے کان بہرے

لیکن بقاؔ کا غم و غصہ یہیں پر ختم نہ ہوا۔ انھوں نے اکیس اشعار کی ایک مثنوی بعنوان مینارِ میر لکھی۔ جس میں میرؔ کو ایک مضحک کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ مثنوی کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے (یعنی بقاؔ نے) بیختا کا ایک محل دوآبے (یعنی گوشۂ شعر) پر تیار کیا تھا۔ میرؔ اس نئی تخلیق کو چرانے کے ارادے سے آئے۔ لیکن اپنے اناڑی پن کی وجہ سے پکڑے گئے۔ اس محل کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ اور دو کے کنارے پر نظروں کے مگرمچھ بیٹھے تھے۔ اس اگر یہ اژدہا (یعنی میرؔ بہ رعایت اژدرنامہ) مجھ پر حملہ کرتا تو میں سحر (شاعری) کے زور پر اس کو مینارِ میر میں بند کر دیتا۔ پھر جو کوئی راہ گیر ادھر سے گزرتا وہ یہی کہتا:

یہ مینار دزدِ بداعمال ہے
جو چوری کرے اس کا یہ حال ہے

معلوم ہوتا ہے اس مثنوی کے پس منظر میں میرؔ کی مثنوی "اژدرنامہ" کے شدید تاثرات کار فرما تھے۔ چوں کہ یہ مثنوی کمیاب ہے اس لیے اُسے بہ تمام و کمال نقل کیا جاتا ہے۔

مثنوی در ہجو میر

ان انکھوں کا نت گریہ و دستور تھا ۔ دوآبہ جہاں میں یہ مشہور تھا

حبابِ اشک ان سے اٹھتا تھا زور　　تلاطم میں پڑتا تھا دریائے شور
بنا میں نے اک ریختے کا محل　　لکھی صفحے پہ اس کے یہ ضرب المثل
وہاں آن کر عسس کیا لے گیا　　وہی تازہ مضمون چرا لے گیا
عقب میں چھپا سا ست پانی کا زور　　کہاں جائے گا یہ دو کلیے کا چور
اگر دائیں بائیں طرف یہ پھرا　　کیا فرض دریا میں جا کر گرا
بھلا کون سی پا سکے گا یہ گھاٹ　　نظر ہی تو آتا نہیں اس کا پاٹ
اِدھر منتظر ہیں نہنگ تلے　　نگہ کے اُدھر سونس گاڑے ہیں ہر
بچا ان بلاؤں سے یہ ذو فنون　　تو پھر مردمِ آب ماریں گے کون
نہ منہ پھیرنے کی اسے تاب ہے　　نہ کچھ آگے بڑھنے کا اسباب ہے
کہ راہِ گریز اس پہ سربستہ ہے　　وہ آبہ بھی آگے سے پیوستہ ہے
مگر پھر کے منہ کہے مجھ پہ چوٹ　　پٹے سر سے اژدھا لوٹ پوٹ
مجھے یاد ہیں اس عزیمت کی رسم　　کہ کہتے ہیں جن کو کلید طلسم
نگاہیں ہیں وہ چشم کی دو، ولیک　　جہاں گھر سے باہر گئیں یہ پھر ایک
نگاہوں کی پھر میں چلا کر کمند　　پلک مارتے اس کو کرتا ہوں بند
کمندوں کے گر پھنس گیا تار میں　　چنوں زندہ کے اس کو مینار میں
وہ مینار جب تک رہے برقرار　　رہے میری سارق کشی یادگار
کہ پھر کوئی مضمون نہ سرقہ کرے　　نہ نیت پرائے سخن پہ دھرے
جو گزرے ادھر سے کوئی راہ گیر　　کہے آکے نزدیک مینارِ سیہ
یہ مینارِ مکر بد افعال ہے　　جو چوری کرے اس کا کیا یہ حال ہے

بقا جب یہ قصہ ہوا سب تمام
دھرا میں نے مینارِ سیہ اس کا نام

میر پر چوری کا الزام عائد کرکے اب بقاؔ کو اُن کے کلام پر بھی نکتہ چینی کرنے کا بہانہ مل گیا
ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ بیچارے سوداؔ کی بھی گت بنی۔ حالاں کہ قرائن اس حق میں ہیں کہ سوداؔ نے
سلسلے میں خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ کہتے ہیں:

مرزا و میر باہم دونوں تھے نیم مُلّا ؛ فنِ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقاؔ اب ہجووں کی ریسمان سے ؛ دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پورا

پھر ان دونوں استادوں کی شاعری پر تنقید کرتے ہیں:

عیب ہے گرچہ کثرتِ یک لفظ ؛ سخن فارسی سے تا ہندی
پہ جدا ہے تمام عالم میں ؛ طورِ سوداؔ و وضعِ میر تقی
یعنی واں لفظ "تو" ہے پُر کن شعر ؛ "ہی" سے ہے یاں کلام کی بھرتی
کھول دیوان دونوں صاحب کے ؛ اے بقاؔ ہم نے جب زیارت کی
شعر سوداؔ و میر کے دیکھے ؛ وہ "تو تو" کریں ہیں یہ "ہی ہی"

کثرتِ یک لفظ، کلام کی بھرتی، "تو تو" اور "ہی ہی" کا پُر کن شعر ہونا اگرچہ بقاؔ کی مبالغہ آمیز
اس قطعے میں طنز و مزاح کی جو کیفیت ہے وہ اپنی جگہ بے مثل ہے۔ میر تقی میر چڑچڑے تھے
کو کم تر سمجھتے تھے۔ اُن کے لیے "تو" اور "تو تو" کی تخصیص اور سوداؔ چونکہ ظریف اور یار باش تھے ان کے
ہی ہی کی پھبتی بقاؔ کی بذلہ سنجی اور طباعی کی دلیل ہے[1]

رفتہ رفتہ بقاؔ کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ وہ سنجیدہ غزلوں میں بھی میرؔ و سوداؔ پر چوٹیں کرنے سے ا

یہ ریختہ جس دن سے بن آیا ہے بقاؔ خوب
یاروں نے تو کیا کیا نہ کیے تیشے سے حملے

---

ہے جیسی بقاؔ کی غزل ایسی نہ ہو مضبوط
سوداؔ جو کوئی ریختے کے گھر پہ کرے گچ

---

[1] "ہی" کا استعمال میر کے یہاں بہ کثرت ہوا ہے۔ اس لیے اغلب یہ ہے کہ "تو تو" کا اشا
اور "ہی ہی" کا اشارہ میر کی طرف ہے (م۔ س)

جس سے یارانِ بزم ہوں محظوظ
یوں بھتا میں غزل سرائی کی
میرؔ بھی ورنہ خوب سمجھتے ہیں
کاٹیے جیب اُن کی د ا ئی کی

یارانِ بزم کو اپنی اس غزل سرائی سے محظوظ کرنے کی کوشش میں بالآخر اور بھی حد سے بڑھ گئے۔ اب معاملہ شعر و سخن کی شائستگی تک محدود نہ رہا:

سید صاحب پھر اس سے کیا بہتر ❊ اس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیوان پکارتے پھریے ❊ ہر گلی کوچے کام شاعر کا

اس کے بعد اُن کی ذات اور قومیت پہ حملے کرنا شروع کر دیئے۔

غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑ مریں گے
آگے بھی میر سید کرتے گئے ہیں ساکا
منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میرؔ کی
ذاتِ مقدس اُن کی یہی ذات ہو تو ہو

ایک قطعہ میں اُن کی سیادت کا مذاق اُڑاتے ہیں اور طرح طرح کی پھبتیاں کستے ہیں۔

ڈھونڈتا پھلنہ کرگسوں کا نہ ہو میرؔ کاشتہ ❊ رنڈی کا سوکھ ساکھ بنا ہے گماشتہ
دیکھو تو کس طرح سے کھلاتا ہے مچھلیاں ❊ صید افگناں رہے ہے بصید گزاشتہ
دہقاں تھا تو تو شیخ سے سیّد یہ کیوں ہوا ❊ تو آم زمیں میں گر نہ ہوا تخم کاشتہ
یک چند تا رہے ورقِ دہر پر بقا
کر ایسی ہجو آبِ طلا سے نگاشتہ

ایک دلچسپ قطعہ اور لکھا ہے جس میں میرؔ کی پگڑی کی طرف اشارہ ہے۔

توبہ زاہد کی توبہ تلی ہے ❊ بیٹھے بیٹھے تو شیخ چلی ہے
پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر ❊ اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

میرؔ جیسا انا پرست، خوددار اور نازک مزاج شخص ان باتوں کو کہاں تک برداشت کرتا؛ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ ہی گیا۔ انھوں نے ان ہجویات کے جواب میں ایک مثنوی لکھی۔ ان میں انھوں نے نہ اپنے وقار کا خیال کیا اور نہ معاصر کا۔ جو کچھ زبان پر آیا، سپرد قلم کیا۔ نام "ہجو نااہل مسمّٰی بہ زبان زدِ عالم" ہے۔ مثنوی کے پہلے ہی شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت عاجز آکر لکھی تھی۔

سنیو اے اہلِ سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخمِ حرام

اس کے بعد ان سب شاعروں کو ملامت کرتے ہیں جو ان کے درپے آزار تھے اور جنھیں وہ کہہ رہے تھے۔ کیونکہ ہجوگوئی کو وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور باوقار لوگوں کا یہ شیوہ ہے:

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
گر کسھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا — ہجو اس کی ہو گئی اس کا کہا
پی ہوا گر چاند پر پھینکیں ہیں خاک — پڑتی ہے ان سب کے منھ پر میں ہوں پاک

میر کا دعویٰ ہے کہ وہ خود کسی کی ہجو نہیں کرتے۔ وہ اس حرکت کو اخلاقی جرم سمجھتے ہیں۔ ہجوؤں کا طومار بندھ گیا تو انھیں بھی مجبوراً اس کا مرتکب ہونا پڑا۔ اپنی صفائی میں لکھتے

رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ — مدعی بے بیچ ہے یہ روسیاہ
تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا — دردمند و عاشق و دلریش
کیا کروں پر لاعلاجی ہے اب — غصے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تب

میر نے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ پہلے بقا احترام سے انھیں قبلہ کہا کرتے تھے۔

قبلہ کہتے کہتے بلی ہو گیا ؎ پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا
میرے پاس اس کا کیا ہے سلیاہ ؎ بھونکا کرتا ہے کب یہ ابن فر

بقا کی ہیئت گدائی کا نقشہ کھینچا ہے۔

اونٹ کی شکل خلقت پہ ہے تہمت کو ناز — اس کی خلقت کم ہے کیا اس سے سِوا

ہیئت اس کی مضحکہ ہے سوانگ ہے　　جیدھو ابن عنق کی پانگ ہے

سر کے تئیں اس دیکھوں جوں پھول کر نگاہ　　بالوں پر اک اوندھی ہانڈی ہے سیاہ

مدمی سیرا ہوا یہ بے ہنر

مردۂ صد سالہ سے بے نور تر ۔

بقا کے ساتھ ان کے باپ کو بھی نہیں بخشا:

باپ اس کا سخت ناداں نادرست

کوٹھے کی سی گندی بلی ناق و سست

اس ہجو میں میر نے مغلظات اور رکاکت کی انتہا کر دی ہے۔ بے تامل گالیوں پر اتر آئے ہیں۔ یہ صحیح غصے کی انتہا ہے۔

آخر میں یہ کہہ کر سکون پاتے ہیں:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

بقا نے پھر اس ہجو کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ انھوں نے پچاس اشعار کی ایک مثنوی میر کی ہجو میں لکھی۔ اس نے اپنے دوستوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ لو اور سنو۔ ابھی تم نے اژدر نامہ کا قصہ سنا تھا۔ اب ایک اور لکھ کر اپنی پوچ گوئی کا ثبوت دیا ہے:

قصۂ اژدر رہا بالائے طاق　　تازہ اک اشلک ہوئی ہے اتفاق

یعنی اس نے سن کے ہجو تازہ کی　　پوچ گوئی اپنی پر آوازہ کی

پھر میر کی تذلیل ابلیس کے انداز میں کرتے ہیں:

میر ہے یا نطفۂ شیطاں ہے یہ

اس قدر جو درپئے انساں ہے یہ

یہ مثنوی بھی ایک قصے پر مشتمل ہے یعنی بقا کے ایک دوست ان کے پاس آکر کہتے ہیں کہ میری کیاری پر ایک جھتنا عاشق ہو گیا ہے۔ جو ہر رات کو اس کے پاس آتا ہے۔ بیچاری دن بھر دل جلتی ہے۔

ہے۔ میں نے اس کو مشورہ دیا کہ آج رات ایک اینٹ چولھے پر گرم کرکے رکھو۔ جب بھتنا آئے تو اُسے اس پر بٹھا دو پھر وہ کبھی نہیں آئے گا۔ میں بھی اس کی گھات میں ایک پلنگ پر لحاف اوڑھ کر بیٹھ گیا۔ جب وہ بھتنا آیا اس گرم اینٹ پر بیٹھا تو دونوں سُرین جل گئے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن میں نے اُسے بھاگنے نہیں دیا یہ سمجھا کہ مجھ میں اور اس بھتنے میں ہاتھا پائی ہوئی۔ اس کے تمام حملے مجھ پر ہوتے تھے۔ اور میرا ہاتھ لحاف میں گم جاتا تھا۔ آخر میں اُس سے پیچھا چھڑا کر بھاگ آیا۔ یقین نہ ہو تو دیکھ آؤ۔ دروازے پر کھڑا ہوگا۔ لیکن دروازے پر جاکر دیکھا تو وہ بھتنا نہیں تھا بلکہ میر تھے۔ یہ ہجو بھی کمیاب ہے۔ چونکہ پُرلطف ہے اسی لیے قدرے یہی نقل کی جاتی ہے۔

## ہجو میر

ہم سے کہتے تھیں اے دوستاں — دوستی بندر کی ہے جی کا زیاں
کھائے اور گھُرکے، جو ہو میموں سرشت — تا ابد جاوے نہ اس کی خوئے زشت
قصۂ اژدر رہا بالائے طاق — تازہ اک اشلک ہوی ہے اتفاق
یعنی اس نے سُن کے ہجو تازہ کی — پوچ گوئی اپنی پُر آوازہ کی

میر ہے یا لطفۂ شیطاں ہے یہ
اس قدر جو درپئے انساں ہے یہ

میر کے جو ہمدم و ہم ذات ہیں — وہ بھی سب از عالم جنات ہیں
گر کوئی ہوتا نقیب الشاعرین — یہ منادی پھیرتا میں ہر کہیں
بے مہارت رہیو مت اے مومنوں — جا بجا پھیلے ہیں بھتنے ان دنوں
علم تسخیرات کا پکڑو سراغ — گھر میں لا رکھو کچھ چھے کا چراغ
اُٹھ کے کل میں مسجد جامع گیا — واں تماشا اور ہی دیکھا نیا
چادری کی شہدیاں کھیلے ہیں پیر — ہے زباں زد خلق بھکے آئے ہیں میر
ایسے بھتنے سے جو تم نے چھیڑ کی — جوتیاں سلواؤ دو دو سیر کی
یاد آئی ہے مجھے اک طرفہ نقل — جس کے سننے سے پڑے حیرت میں عقل

آئے کل گھر میرے اک مخلص قدیم
دل غم و اندوہ سے اُن کا دو نیم

دم چڑھا، چھاتی دھڑکی، چہرہ زرد
ہونٹ سوکھے، چشم تر، گردے میں درد

آہ مردم کہہ کے اک کھائی پچھاڑ
مفت میں جی کو لگا تب میرے جھاڑ

جب ہوئی ان کو افاقت بیش و کم
آئی کچھ اعضا میں طاقت بیش و کم

جا سے اُٹھ بیٹھے ہوئے گرمِ سخن
سب کیے اپنے بیاں رنج و محن

کاے محبِ صادق الاخلاصِ من
مخلصے از دوستانِ خاصِ من

کیستکی نامی مری ہے اک کنیز
باسلیقہ، خوش ہنر، صاحب ہنر

اُس پہ اک بھتنا ہوا دل باختہ
رات کو آنے لگا بے ساختہ

اُٹھ کے جب وہ آسیا گرداں کرے
تب وہ ملعون آ، اُسے حیراں کرے

دن بہ دن جھڑنے لگی وہ ماہ چہر
میں نے پوچھا ایک دن از روئے مہر

جانِ من سچ کہہ تجھے کیا درد ہے
ایسا کیا غم ہے تجھے، کیوں زرد ہے

سرگزشتِ حال جب اس نے کہی
مجھ میں کچھ طاقت نہ سننے کی رہی

مصلحت دی میں کہ اے نیکو سرشت
گرم کر رکھ آج اک چولھے میں خشت

آج وہ آوے تو تو مت کیجو شرم
بیٹھنے کو دیجو اُس کے خشتِ گرم

بیٹھ جاوے گا جو وہ اس پر کبھو
پھر تماشا دیکھیو قدرت کا تو

مصلحت میری غرض آئی تھی راس
رہ گیا جب شب سے باقی ایک پاس

بیٹھ کر چکی لگی وہ پیسنے
آہی گھیرا اس کو اس ابلیس نے

مصلحت میں نے جو دے رکھی تھی کل
ہوگیا سرزد وہی اس سے عمل

خشت پر جا ہی وہ بیٹھا کود کے
جل گئے دونوں سرین مردود کے

یک بیک اس جا سے وہ بھاگا اُچھل
لب پہ جاری کی یہ بیتِ برمحل

واہ بی بی کیستکی تم زور ہو
اب جو ایدھر آئیے گا رنڈ و چھد ہو

تھا کہیں میں بھی بالائے پلنگ
جا رہا اس کے مقابل کر شلنگ

کر کے ریلا پیل میں جاں بازیاں
کیں دھما دھم خوب مشت اندازیاں

لیکن اس کی خوب لگتی تھی چپات
پھر مرا رونگٹا میں گھس جاتا تھا ہات

جب وہ میرے مارتا تھا تڑ سے مشت
تیکھا ہوتی تھی کئی جا گہ سے پشت

جی بچا کر میں نے لی راہِ گریز
وہ بھی آیا میرے پیچھے تند و تیز

آپ تک پہنچا تو ہوں میں دوڑ دھوپ
پھر کھڑے ہوویں گے در پر آپ خوب

اُن سے جب یہ ماجرا میں نے سُنا
رہ گیا ہی جی میں سوچ اپنا سر دُھنا

تلخ مجھ پر ہو گیا اس وقت عیش
گھر کے دروازے پہ آیا کھا کے طیش

دیکھتا کیا ہوں کہ میر استادہ ہیں
اُس کے سر چڑھنے پہ یہ آمادہ ہیں

آپ پہ پہلے بڑھا میں نے حصار
پیچھے ٹالا اُن کو رستے مار مار

کر بقا اس بات کا یاروں میں ذکر
تا کریں جلدی وہ اپنی اپنی فکر

ان ہجووں میں جو ہلکی اور لطیف ظرافت اور طنز کی کاٹ ہے۔ وہ میر کے یہاں مفقود ہے۔ میر کا لب و لہجہ تلخ اور تیکھا ہے۔ جس میں طنز کم اور لعن طعن زیادہ ہے۔ غصّے کا عالم یہ ہے کہ بگڑ بگڑ کر گالیاں دیتے ہیں۔ بقا کے یہاں غصّہ کم اور شوخی زیادہ ہے۔ ان کی بذلہ سنجی تکدّر کو بھی مذاق میں بدل دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میر کو چھیڑ چھیڑ کر خود بھی ہنس رہے ہیں اور دیکھنے والوں کو بھی ہنسا رہے ہیں۔ بقا نے جو میر کی ہیئت کذائی پیش کی ہے وہ میر کے مقابلے میں کہیں دلچسپ اور ظرافت آمیز ہے۔ ●●

عابد علی خاں

# اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر

ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی کی نئی تصنیف "اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر" کا کینوس اپنے نفسِ موضوع پر بحث کے علاوہ اردو شعر وادب اور تہذیب کا سیر حاصل جائزہ اور ملک میں مختلف مذاہب، زبانوں، سیاسی ادوار اور نئی سیاسی تبدیلیوں کے پس منظر میں ہندوستان کی قابلِ فخر تہذیب اور روایات کی ایک جامع تاریخ ہے جسے ہم آزادی سے پہلے ایکتا اور اتحاد کہتے تھے۔ لسانی ریاستوں کے قیام کے بعد زبان، علاقہ اور مذہب کے اختلافات نے ہمارے ورثے کے تحفظ اور قومی یک جہتی کے استحکام کے سوال پر ہمیں توجہ کرنے پر مجبور کیا۔ اس پس منظر میں قومی یک جہتی کا نعرہ ۱۹۶۱ء میں پہلی مرتبہ سنائی دیا۔ ملک میں مختلف قسم کے اختلافات، تعصب اور باہمی منافرت کے زہریلے عناصر کو ابھرتے دیکھ کر جواہر لال نہرو نے قومی یک جہتی کی ضرورت پر زور دیا اور قومی یک جہتی کونسل بھی تشکیل دی۔ اس کونسل میں مختلف مذاہب، ذات پات، زبان اور ریاستوں کے قائدین اور دانشور شامل کیے گئے۔ ابتدا میں قومی یک جہتی کونسل تشکیل پائی۔ کچھ دنوں بعد ریاستوں میں بھی یک جہتی کونسلیں تشکیل دی گئیں۔ قومی یک جہتی کو مستحکم کرنے کی تمام سرکاری کوششیں ہنوز کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ علاقائی، لسانی، مذہبی، ریاستی تعصبات جاری ہیں۔ آسام، پنجاب اور گجرات کے واقعات اس کا کھلا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی صاحب نے پرانوں کے دور سے لے کر عہدِ قدیم، ازمنۂ وسطیٰ اور آزادی تک قومی یک جہتی کی اصل بنیادوں اور مظاہر کو تلاش کیا ہے۔ یہ کام آسان نہ تھا لیکن انہوں نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ ایک ادارہ یا انسٹی ٹیوٹ اور دانشوروں کے سمی نار کا کام خود انجام دیا ہے۔

نفسِ موضوع پر اظہارِ خیال سے پہلے دو سال قبل حیدرآباد میں منعقدہ ایک سمینار کا میں اس موقع پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام جوبلی ہال حیدرآباد میں "ڈاکٹر ذاکر حسین قومی یک جہتی سمینار" منعقد ہوا تھا۔ جس میں مرکزی اور ریاستی وزرا کے علاوہ

جواہرلال نہرو، علی گڑھ، دہلی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسروں، دانشوروں، قانون دانوں، اعلیٰ حکام مرکزی اقلیتی کمیشن کے صدر اور معزز شہریوں نے حصہ لیا۔ سیمینار کے مختلف اجلاسوں میں مذہب، زبان، سیاست، قانون اور صحافت کا جائزہ لیا گیا۔ اور ان وجوہ و عوامل کو معلوم کرنے کی کوشش کی گئی جن کے باعث قومی یک جہتی کمزور ہو رہی ہے۔ اور ان حالات میں حکومت، سماج اور قوم کو کیا کرنا چاہیے۔ اس سیمینار کا معیار اعلیٰ علمی اور سائنٹفک تھا لیکن "ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا" کے مصداق یہ سیمینار نہ تو مرض کی تشخیص کر سکا اور نہ سیمینار میں حصہ لینے والوں نے کوئی ٹھوس عملی تجویز پیش کی۔

پروفیسر رضوی نے اپنی کتاب میں قومی تہذیب اور اس کے ارتقا کے تحت قوم، قومیت اور قوم پرستی کی اصطلاحوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ہندوستان اور آفریقہ میں کروڑوں افراد نے عیسائی مذہب اختیار کیا لیکن کلچر کے اعتبار سے وہ لوگ یورپ کے عیسائیوں سے قطعاً مختلف رہے اس طرح اسلام کے پیرو جزائر غرب الہند سے لے کر نیویارک تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن کلچر کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اگر آج ماسکو میں کوئی باشندہ ویدانت کے فلسفے کو ماننے لگے تو اس سے اس کے کلچر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

ان کا یہ تجزیہ نہ صرف کتاب کا محور ہے بلکہ ہمارے ملک میں قومی یک جہتی کے مسئلے کو صحیح انداز سے متعین کرنے کی ایک بنیاد بھی ہے۔ ملک کے ہندو مسلمان ایک اکائی، ایک جزو لازم ضرور ہیں اور یہی حقیقت صدیوں سے برقرار بھی رہی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس مشترک تہذیب و کلچر پر اب سیاسی اثرات غالب آرہے ہیں۔ خود غرض اور مفاد پرست عناصر مذہب کو سیاسی اغراض کے لیے اختلافات اور آپسی دوری کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ فرقہ واریت کو ہوا دی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے قومی یک جہتی کے لفظ کی تلاش میں ملک کی تہذیبی، سیاسی تحریکات کا جائزہ ضرور لیا ہے مگر فرقہ واریت کی ابتدا اور اس کے ماخذ کی تلاش بھی ضروری تھی۔ چونکہ قومی یک جہتی کی سب سے بڑی دشمن یہی فرقہ واریت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کبیر کے اس ایقان کو پیش کیا ہے کہ

"ہندو اور مسلمان ایک ہیں۔ وہ خدا کی پرستش کرتے ہیں اور دونوں ایک ہی باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ دونوں کا خون ایک ہے۔ کبیر رحیم اور رام کی اولاد ہے۔ ہندو رام کو پکارتے ہیں اور مسلمان خدا کو پھر بھی دونوں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو

ہلاک کرتے ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ فرقہ واریت نے جارحانہ رنگ کب سے اختیار کیا اور کیوں کیا؟ یک جہتی امیر خسرو کا بھی پیام تھا۔ صوفیائے کرام کی تعلیمات بھی یہی ہیں۔ شنکر اچاریہ کی تحریک اور بھگتی تحریک بھی اتحاد و یک جہتی کا پیام دیتی ہے۔ پٹھان اور مغل حکمرانوں نے ہندوؤں پر اعتماد کیا اور ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو اپنا دست راست بنایا۔ ہماری تاریخ و تہذیب یہی تھی۔ نہ صرف متحمل تھی بلکہ طاقتور بھی۔ اس جذبۂ یگانگت کو پہلا نقصان برطانوی حکمرانوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی سے پہنچایا اور فرقہ پرستی، قومی یکجہتی کا ایک منفی و مخالف قوت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس بدبختانہ صورتِ حال کا شدت سے مقابلہ ہمارے ادیب، شاعر اور دانشور کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پس منظر میں اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اساتذۂ سخن کے کئی اشعار پیش کیے ہیں۔ میر سے لے کر غالب اور جگر تک کئی اشعار، غزلیں اور نظمیں قومی یکجہتی کی علامت ہیں۔ اس موضوع پر ایسے اشعار کا جامع انتخاب بجائے خود ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے پیام کا ایسا انتخاب بھی مرتب کیا ہے جو صرف اردو ادب اور عصر حاضر ہی کے لیے ایک پیام نہیں بلکہ مستقبل کے لیے ایک تاریخی دستاویز ہے۔ چند ایسے شعر پیش ہیں جو ہمارے ادب اور شاعری کا سرمایہ ہیں جو غالب کے عہد سے قبل کہے گئے ہیں، جنھیں کلاسیکل اہمیت حاصل ہے۔

ہندو پوجے دیہرہ مسلمان مسید
ناما سوئی سیویا جہاں دیہرہ نہ مسید (نام دیو)

---

الک نام اللہ نرنجن ہری کا ہے
نرنکار۔ نرگن اپرمیشوری ہے (شاہ تراب)

---

تسبیح اور زنار کے جھگڑے میں مت بولو
وہ ایک ہیں آپس میں دونوں یہ رشتہ ہے (شاکر ناجی)

---

وہی ایک ریسمان ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں
کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں (ٹیک چند بہار)

ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اس کسی کو جو ہو آشنا پرست　　(سودا)

---

غرض کفر سے ہے نہ کچھ دیں سے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

---

ہندو و مسلمان کو پھر اس پالکی اوپر
ار حق کا تو تہم ہے جنازے کا گماں ہے　　(سودا)

---

چشم شیخ و برہمن میں ہے کہیں جو سرمہ جا
گردِ راہ کعبہ و خاک درِ بت خانہ ہم　　(سودا)

---

ہم دیکھتے تھے کر مت دیر و حرم کی راہ چل
اب اپنا جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا　　(میر)

---

محمد کہ ہے ختم پیغمبراں
جناب اس کی ہے قبلہ گاہِ جہاں　　(مول چند دہلوی)

---

زیر نظر کتاب میں فاضل مصنف نے جدوجہد آزادی کے دوران اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے بتلایا ہے کہ اردو زبان ہر دور میں یک جہتی اور قومی اتحاد کی علمبردار رہی ہے اور دورِ حاضر میں فرقہ واریت کے خلاف ایک زبردست آواز ہے۔

قومی یک جہتی کو کمزور بنانے والے عناصر اور ملک کے اتحاد کو بے اثر کرنے والی قوتوں کے خلاف اردو شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ زیر نظر تصنیف ایک مکمل دستاویز ضرور بن گئی ہے لیکن بصد احترام ایک کمی کی جانب توجہ دلانا چاہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے قومی یک جہتی اور اردو شاعری کے بارے میں زیادہ تر شمال کا ذکر کیا ہے لیکن دکن کی بیش قیمت تہذیبی دین کو مناسب جگہ نہ دی ہے۔ اس کتاب میں مرثیوں میں دکنی تہذیب کے اثرات کا جائزہ ضرور لیا گیا ہے مگر حیدرآباد —

قومی یک جہتی کو جنا دیا ہے شاید ملک کا کوئی حصہ اور شہر اس کی ہمسری نہیں کرتا۔ آج بھی حیدرآباد میں مشترکہ تہذیب اور باہمی دوستی و بھائی چارگی کی فضا زندہ اور باقی ہے۔ یہاں حکمران اور عوام دونوں اس کے سرپرست رہے ہیں۔ اس تذکرے کی شمولیت سے یہ کتاب یقیناً ہر اعتبار سے مکمل کہلائے گی

ڈاکٹر صاحب نے "اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر" میں اپنی عمیق تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے کے لیے اردو شاعری نے جس قدر اہم حصہ لیا ہے وہ کسی دوسری زبان کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ اس تقابلی مطالعہ میں وہ اپنے اخذ کردہ نتیجہ میں صد فیصد حق بجانب ہیں۔ ان کی تحقیق کا یہ نچوڑ ہمارے دانشوروں اور لسانی ماہرین کے لیے ایک دعوت فکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہا ہے کہ دوسری زبانیں مذہبی ادب اور زیادہ سے زیادہ عشقیہ، رومانی اور تاریخی شعری کارناموں تک محدود ہیں۔ ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ اردو شاعری نے اپنے دامن میں ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ کو سمیٹ کر ان عناصر کو ابھارا ہے جن سے فرقہ وارانہ یک جہتی اور علاقائی بنیادوں پر ہم آہنگی کے تصورات مضبوط و مستحکم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ہماری تہذیب اور اردو شاعری کے رول کے تجزیے سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ اردو شاعری اس تہذیبی سنگم کا منطقی نتیجہ تھی۔ ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی قومی اکائیوں کو ایک متحدہ شکل دینے میں تہذیب کا جو کردار رہا ہے اس کے اہم ترین جزو کی حیثیت سے اردو شاعری نے اپنے اندر ان عناصر کو جذب کیا جن کی بنیاد پر سیاسی انحطاط کے دور میں بھی قومی یک جہتی کے شعور نے فروغ پایا اور متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر ہوئی۔

آزادی کے بعد سیاسی، لسانی اور مذہبی جماعتوں نے اپنے مفادات کے حصول کی کشمکش میں قومی یک جہتی کے شعور کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس تنگ نظری کے مقابلے میں مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے نام ہر اول دستہ میں شامل ہیں مسز اندرا گاندھی نے اس کے تحفظ کی کوشش کی لیکن ملک میں بائیں بازو اور سوشلسٹ قوتوں کی کمزوری نے سیدھے بازو کی قوتوں کو ابھرنے کا موقع دیا جس کے نتیجے میں ہمارے ہزاروں سال پرانے اقدار اور مشترکہ تہذیب کو نقصان پہنچ رہا ہے اور اردو بھی اسی عصبیت کا شکار ہے۔

اس کتاب کا آخری باب "اردو کے مسائل اور قومی شعور" ہے۔ اس باب میں مصنف دریافت کرتا ہے کہ ملک کو آزاد ہوئے ۳۸ سال گزر چکے ہیں اس کے باوجود ابھی تک عوام کو استحصال سے چھٹکارا نہیں ملا ہے۔ ان سارے عوامل و عناصر پر غور کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حل

طرح سوویت یونین کے عظیم عوام نے سوشیلزم کی بنیاد پر ہر طرح کے لسانی اور علاقائی فرق کو دور کیا ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی سوشیلزم کی بنیاد پر یکجہتی پیدا کی جا سکتی ہے۔ فاضل مصنف کے اس نتیجہ سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ سوویت یونین اور ہندوستان کے عوام کے حالات اور مسائل میں بڑا فرق ہے۔ سوشیلزم روسی عوام کا ایقان ہے جس کے حصول و استحکام کے لیے وہ کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے اس کے برخلاف ہمارے ملک میں مذہبی، لسانی علاقائی اور طبقاتی اساس پر مفاد پرست عناصر عوام کا ہمیشہ استحصال کرتے آئے ہیں اور آج کر رہے ہیں۔ ان کا تعلیمی معیار پست ہے اور اقتصادی حالت بھی کمزور ہے۔ اسی لیے مفاد پرست عناصر احیاء پسندی کے جذبہ کو ابھارتے ہوئے جمہوریت سے سوشیلزم کے سفر میں رکاوٹ بن جاتے ہیں نیز ملک کے سیاسی و قومی حالات کے باعث سوشیلزم کی طاقتیں بھی کمزور ہو رہی ہیں۔ اور اس کمزوری کے ساتھ ساتھ لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے مسائل بھی پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں

ڈاکٹر مجاور حسین نے یکجہتی کے استحکام کے لیے سوشیلزم سے جو توقعات وابستہ کی ہیں وہ سماجی و سیاسی ارتقا کی ایک منزل ضرور ہے مگر ملک کے موجودہ حالات میں تنگ نظری، عصبیت، فرقہ پرستی اور صوبہ پرستی کے خاتمے کے لیے ایک نیا سائنٹفک ذہن درکار ہے۔ راجیو گاندھی نے جمہوریت پر ایقان اور سوشیلزم سے قرب کے باوجود اکیسویں صدی کا جو نعرہ دیا ہے وہ موجودہ اندھیرے میں امید کی ایک کرن ہے۔ اب وزیر اعظم کو پائیدار یکجہتی اور ہماری مشترکہ تہذیب و روایات کے تحفظ کے لیے قومی زبان کے مسئلہ کو بھی حل کرنا ہوگا۔ اس کے لیے گاندھی جی کا ہندوستانی زبان کا فارمولا پھر ایک بار توجہ چاہتا ہے۔ اب تک ہندی بذات خود ایک ہمہ گیر زبان نہیں بن سکی ہے۔ جنوب اس زبان کو قبول کرنے آمادہ نہیں ہے۔ عام فہم مشترکہ زبان کے لیے فلم، ٹیلی ویژن، مشاعروں اور کوی سمیلن نے ایک نیا راستہ بنایا ہے۔ اب اردو سے انصاف کے لیے موثر اقدام ضروری ہے۔ اس کے لیے گجرال کمیٹی کی رپورٹ، گوپال سنگھ پینل کی سفارشات اور مرکزی اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے علاوہ خود دستور ہند کے دفعہ ۳۴۵ کے تحت صدر جمہوریہ کو اردو سے انصاف کا اختیار ہے۔ اترپردیش میں واسدیو سنگھ نے اردو زبان پر جو تنقید و تعریض کی ہے اور اردو والوں پر جو عجیب و غریب الزامات لگائے ہیں اس کے پیش نظر اب اردو سے انصاف کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔ اردو کے مقام کے تعین کی جدوجہد اب اترپردیش میں شروع ہوئی ہے۔ یہ جدوجہد اردو سے انصاف کے لیے وزیر اعظم اور نوجوان نسل کو دعوت فکر دے گی اور ملک میں قومی زبان کے استحکام کا مسئلہ بھی حل ہوگا۔ جب تک اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوگا، اس وقت تک ہندی کی ترقی اور

ملک میں عام فہم زبان کی تشکیل اور اس کا استعمال ایک خواب بن کر رہیں گے۔ حصولِ آزادی سے اب تک جمہوریت، سوشیلزم اور سیکولرزم نے اردو کو انصاف نہیں دلایا ہے۔ اکیسویں صدی کے لیے قوم کو تیار کرنے کے جذبہ سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے حل کی بھی ایک عملی صورت بھی نکل آئے گی۔ گنگا جمنا تہذیب اور مشترکہ روایات کا تحفظ بھی ملک کا ایک اہم مسئلہ ہے جو اردو سے انصاف کے سوال سے وابستہ ہے۔ راجیو گاندھی مسائل کو حل کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اس دیرینہ مسئلہ کا بھی مستقل حل نکالیں گے۔

---

## باقی سلسلہ ص ۲۴

یہ مجموعہ دکن کی شعری و ادبی سرگرمیوں کی مستند دستاویز اور اہل دکن کے ذوقِ سخن اور ان کی تہذیب و شائستگی کی یادگار تصویر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شمعِ سخن ایک سو بائیس سال پہلے مزارِ فیض پر روشن ہوئی تھی اس کی لو آج بھی تابندہ اور فروزاں ہے۔

---

## باقی سلسلہ ص ۳۱

رسالے میں جملہ دس اوراق ہیں اور تقطیع متوسط ہے۔

آغاز: اگر کوئی تجھ کوں پوچھے کہ نفس سو کیا، روح سو کیا، نور سو کیا ہے؟

جواب: نفس سو منگتا پنا، خطرۂ دل سو جانتا پنا، اور رحمانی فعلاں۔ و روح سو بینائی یعنی دیکھتا پنا۔ نور سو [illegible] ہدی، یعنی سمجھتا پنا۔

سوال: نفس کا و دل و روح کا سو فعل کیا و صفت سو کیا، ذات سو کیا؟

جواب: نفس کا فعل سو برے عملاں، صفت سو خدا کوں نا سمجھ کرے اوس کا ذات سوں [illegible] سوں موں پھیرنا۔ و دل کا فعل سو خواب عملاں کرنا، و صفت سو خدا کوں سمجھنا و ذات سو خدا [illegible] طرف [illegible] توجہ کرنا، و روح کا فعل سو خدا کوں دیکھنا، و صفت سوں ذوق شوق دھرنا، و ذات سو خدا کوں دیکھنا۔

آپ کی نثر سیدھی سادی دکنی ہے۔ بعض مرکب صفات جیسے جانتا پنا، منگتا پنا، دیکھتا پنا، سمجھتا پنا اور بعض محاورے موں پھرانا (منہ پھیر لینا) توجہ کرنا، ذوق شوق دھرنا اور حرفِ عطف "و" کا استعمال قابل [illegible] سے تقریباً تین سو اسّی سال قبل کی ہے۔

---

محمد نورالدین خان

# مشاعرہ عرس حضرت فیضؔ

## کی غزلیات کا پہلا مجموعہ

دکن کی سرزمین نے جن مقدس اور باکمال ہستیوں کو جنم دیا ان میں حضرت فیضؔ کی ذاتِ گرامی اپنا ایک خاص امتیازی مقام رکھتی ہے۔ نام آپ کا میر شمس الدین محمد اور تخلص فیضؔ تھا۔ آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں غفران مآب کے عہد میں ۱۱۹۵ھ بر ار میں پیدا ہوئے۔ اس وقت برار قلمرو آصفیہ میں شامل تھا۔ اسی لیے فرماتے ہیں:

شعرائے ہند کے سب فیضؔ جنھیں کہتے ہیں
حیدرآباد دکن خاص وطن ہے ان کا

تین سال کی عمر تھی جب آپ برار سے اپنے والد میر امیر الدین صاحب کے ساتھ شہر حیدرآباد آئے۔ یہیں تعلیم و تربیت کے مراحل طے ہوئے۔ جب نواب میر نظام علی خاں کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی۔ نواب سکندر جاہ مغفرت منزل، نواب ناصر الدولہ غفران منزل اور نواب افضل الدولہ مغفرت مکان کے دورِ حکومت میں حضرت فیضؔ بقیدِ حیات تھے۔ اور چھٹے بادشاہ نواب میر محبوب علی خان غفران مکان کی پیدائش (۵ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ) کے دو ماہ بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تمام تذکرہ نگاروں نے بہت تعریف اور احترام سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ اور آپ کو کثیر التصانیف بتایا ہے۔ لیکن چند کتابیں مطبوعہ ہیں اور باقی غیر مطبوعہ۔ اردو کلام کے علاوہ دیوان "گلدستۂ عرفان" اور "دیوان فیضؔ" (جس میں فارسی کلام بھی ہے) مطبوعہ موجود ہیں۔ بہ حیثیت شاعر جملہ اصنافِ سخن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

دکن کے بادشاہوں کی شاہانہ سرپرستیوں اور امرا کی قدردانیوں کے سبب کئی بیرونی شعرا شاہ نصیر دہلوی، شیخ حفیظ دہلوی اور مشتاق میرٹھی وغیرہ دکن آچکے تھے اور متوسلین میں شامل

۔ ان کے علاوہ مقامی شعرا دیانؔ۔ قیسؔ۔ تجلیؔ اور آگاہؔ و حیدرؔ جیسے استادانِ سخن کی سخن [illegible] شعر و سخن کی محفلیں گرم تھیں۔ ان محفلوں میں جواں سال فیضؔ نے بہت جلد اپنی سخن سنجیوں کی ـت فنی شعر گوئی کی محفل میں جگہ بنالی اور کاملینِ فن سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

بلند مرتبہ شاعر ہونے کے علاوہ حضرت فیضؔ علوم ظاہری و باطنی میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ـا ایک صوفی کامل اہل اللہ تھے۔ مشرب کل رکھتے تھے۔ آپ کا کمال فن یہی ہے کہ اپنے ـات اور وارداتِ قلبی کو شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ کچھ اس طرح اشعار میں سمویا ہے کہ شراب ـفت دو آتشہ ہوگئی۔ بے شمار مرید اور لاتعداد شاگرد و معتقدین بلا لحاظ مذہب ہندو مسلمان ـد سے وابستہ تھے جن میں امیر کبیر بھی تھے اور فقیر بھی جو آپ کو نہ صرف استاد بلکہ روحانی پیشوا اور ـرِ طریقت جانتے تھے۔ [illegible] جہاں کہیں بھی اپنے استاد حضرت فیضؔ کا ذکر کیا ہے کچھ ایسی ـانہ عقیدت مندی سے کیا ہے کہ اس کی مثال دنیائے شاعری میں نہیں ملتی۔

حضرت فیضؔ کا انتقال ۱۴ رجب ۱۲۸۳ھ حیدرآباد میں ہوا۔ آپ کا مزار آج بھی [illegible] ـزہ مرجع خلائق ہے۔ ۱۴ رجب ۱۲۸۴ھ آپ کا پہلا عرس ہوا اور مزارِ حضرت فیضؔ پر مشاعرہ تمام بھی۔ حضرت فیضؔ کے عقیدت مند شاگرد محمد فیاض الدین خاں فیاضؔ (المخاطب نواب ـرف جنگ) نے پہلا عرس اور مشاعرہ کرکے اپنے استاد کو نذرِ عقیدت پیش کی اور پھر کے بعد ہر سال نہایت اعلیٰ پیمانے پر عرس اور مشاعرے کا انتظام پابندی اور مستعدی سے ـتے رہے۔ مشاعرے کی غزلیات "گلدستہ فیض" کے نام سے بڑے آب و تاب سے طبع ہوتے تھے جناب فیاضؔ عرس کے موقع پر بعد تناول طعام (برائے خاص و عام) شعرا کی نذر کرتے تھے [illegible] ـا حسین تغزل کہتے ہیں۔

قورمہ روٹی ملی اور ملا گلدستہ
ہم نے فیاضؔ کا علانیہ احسان دیکھا

جناب فیاضؔ وضع داری سے پینتالیس سال تک عرس و مشاعرہ کا اہتمام کرکے اپنے استاد ـت فیضؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جب ان کا انتقال ۱۳۲۸ھ ہو گیا تو ان کے فرزند [illegible] ـب عزیز نے اپنے والد مرحوم کی یادگار اور ان کے نام کو قائم رکھنے کے لیے اس سالانہ مشاعرہ [illegible] سال تک جاری رکھا اور گلدستہ فیض بھی مثل سابق نہایت عمدہ طور سے چھپ کر منظر ـعام پر آتا رہا۔ جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اپنی تالیف "فیضِ سخن" میں حضرت فیضؔ کے ـس اور مشاعروں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں: [illegible] قریب قریب پچاس سال تک ہر سال [illegible]

اور اس کے مشاعرے حیدرآباد کی علمی و ادبی دنیا کا مرکز بنے رہے۔"

مشاعرۂ عرس حضرت فیضؒ کی غزلیات کا پہلا مجموعہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ سفید کاغذ کا سرِ ورق چوطرف سے پھولوں کی بیل کے حاشیے سے مزین ہے۔ اوپر پہلی سطر موٹے حروف میں خدا کی حمد و ثنا ہے۔

"ثنائے خدائے سخن آفرین و سپاس خالق مضامین رنگین"

اس توصیف کے بعد درمیان میں ایک مربع میں عنوانِ کتاب ہے۔ "غزلہائے مشاعرہ عرس حضرت فیضؒ" مربع کے اطراف آٹھ اشعار کا قطعۂ تاریخِ وفات حضرتِ فیضؒ ہے جو آپ کے شاگرد حکیم محمد مظفر الدین خاں مزاحؔ کا فرمودہ ہے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے۔

از سر آہی بگفتا رحلت شعر دکن

۱۲۸۳ھ

تاریخ وفات کے بعد دو لکیروں کے نیچے ایک سطر میں مرتب کنندگان مجموعہ کے نام نظر آتے ہیں:

"حسب فرمائش ناظم شریعت بیان محمد ذیاض الدین خاں صاحب تخلص فیاضؔ و جناب میر احمد علی صاحب تخلص عصرؔ۔"

پھر دو لکیروں کے نیچے سرورق کی آخری سطر یہ ہے:۔

"در مطبع کارنامہ لکھنو باہتمام محمد یعقوب مزین بہ طبع شد۔"

سرورق دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس پہلے مشاعرہ کا انعقاد اور غزلیات مشاعرہ کی کتابی شکل میں ترتیب و صورت گری شاگردانِ فیض جناب فیاضؔ اور جناب عصرؔ کی کوشش اور دلچسپی کی رہینِ منت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ مجموعۂ غزلیات حیدرآباد میں نہیں بلکہ لکھنو کے مطبع "کارنامہ لکھنو" میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

سرورق کی پشت پر حاشیہ ہے اور پیشانی کا غذ پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے حروف جلوہ گر ہیں۔ بعد ازاں نو سطروں میں فارسی تحریر ہے اور اس تحریر کے پورے پانچ سطروں میں حضرت فیضؔ کے نام سے پہلے صرف تعریفی القاب لکھے ہیں۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۴ رجب المرجب ۱۲۸۴ھ بروز دوشنبہ بہ تقریب عرس محفلِ مشاعرہ طرحی علامۂ دوران سلطان الشاعرین جناب حافظ شمس الدین محمد فیضؔ قدس سرہ العزیز کے مزارِ پُر انوار پر منعقد ہوا تھا اور مجموعہ مخلوط ان اعجاز بیان کے نتائج افکار کا آئینہ دار ہے مزید یہ صراحت کی گئی ہے کہ "ہر قدر پرچا کہ دست یاب گشتند درج ایں کتاب عجائب شدند" اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت فیضؒ کے انتقال (۱۲۸۳ھ) کے بعد

سرے سال ۱۴ رجب ۱۲۸۴ھ عرس اور مشاعرۂ طرحی حضرت کے مزار واقع لال دروازہ منعقد ہوا۔
غزلیات اٹھائیس صفحات پر محیط ہے اور اس میں ۲۸ شعرا کا کلام درج ہے جن میں زیادہ تر
ردانِ فیضؔ ہیں۔ لیکن "ہر قدر پر چہ با دست یاب گشتند" سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس
عرس میں دیگر شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا تھا اور جن کی غزلیں دست یاب نہ ہونے سے محروم
اعت ہوگئیں۔

اس کتاب میں شعرا کی اردو اور فارسی غزلیں موجود ہیں لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس مشاعرہ
ح مصرع کیا تھا۔ مندرجہ غزلیں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبع آزمائی کے لیے تین طرحیں دی
تھیں۔ قافیہ ردیف اس طرح ہیں:-

۱۔ فیضانِ فیض - دیوانِ فیض
۲۔ بیانِ جنابِ فیض - شانِ جنابِ فیض
۔ درِ فیض صاحب کا - جوہرِ فیض صاحب کا

بجز ایک اور دو طرحوں میں اردو اور فارسی چیدہ شعرا نے سخن طرازی کی ہے اور بجز تینوں میں
اردو میں غزلیں ملتی ہیں۔

ہر شاعر کا نام تخلص دو لکیروں کے درمیان درج ہے۔ اور جو غزلیں مندرج ہیں وہ شاعر
تخلص کے سرِ حرف سے ردیف وار نہیں ہیں جیسا کہ گلدستوں کی اشاعت کا قاعدہ ہے جب
پہلے احتراماً حضرت فیضؔ کے چھوٹے فرزند میر حیات الدین صافؔ (عرف اچھے میاں) کی غزل
آغاز ہوا ہے۔ اس غزل کی بحر ساری غزلوں سے الگ ہے۔ اس مجموعۂ غزلیات کی آخری
استادِ سخن محمد حفیظ الدین پاسؔ کی ہے۔

ایک خصوصی جدت طرازی اس مجموعے کی یہ ہے کہ ہر شاعر کے نام سے پہلے شاندار خطاب
گئے ہیں جیسے ریختہ خامہ، شاعرِ جادو بیان، شاعرِ کوہ وقار، سخنورِ بلند فکر، آبروئے فکر
پایۂ نظم و نثر وغیرہ وغیرہ۔

حضرت فیضؔ جیسے صوفی راز دارِ رموزِ خفی و جلی و پیرِ طریقت اور عدیم النظیر ادیب و شاعر
کے انتقال کے ایک سال بعد ہی عرس اور مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ تمام شاگردان
مرید اور عقیدت مند اس وقت بہ قیدِ حیات تھے جو اس چشمۂ فیض سے فیض یاب ہوتے تھے
ذی صفات اور تقدس مآب شخصیت کی جدائی کا غم دلوں میں تازہ تھا جس کو جدا ہوئے صرف
سال گزرا تھا تمام غزلیں پڑھنے تو معلوم ہوتا ہے کہ غزلیں کاہے کو ہیں اپنے استاد حضرت

فیض کی جو انکے غم میں مرثیہ خوانی ہے اور کمالِ فن کا عقیدت مندانہ اظہار ہے :۔

ایک نقطہ کا نہیں ہے فرق اس میں لا کلام
حرف استادوں پہ رکھ دیتے ہیں شاگردانِ فیض
(میر حیات الدین صافی)

تاقتف شاعروں کو سر بہ سر ہے فیض صاحب کا
جسے دیکھا جہاں میں نوحہ گر ہے فیض صاحب کا
(راجہ بھوج رائے عرف بھولا ناتھ عیش)

منور ہو گیا یمن قدم سے سارا گورستان
چراغِ لحد روشن اس قدر ہے فیض صاحب کا
( " " )

یہ دل کعبہ ہے یا بت خانہ ہے یا بیت المقدس ہے
غرض جو کچھ ہے اے فیاض ہے گھر فیض صاحب کا
(محمد فیاض الدین خان فیاض)

شاہا کمال او ز حد توصیف برتر است
اینا وصف نیست لائقِ شانِ جناب فیض
(گردھاری پرشاد عرف بنسی راجہ باقی)

باقی بپایہ مرقدِ پاکش سپہ درود
کاینجا است در نظارہ نشانِ جناب فیض
( " " )

دانائے راز عارف حق پیر کاملے
نعشان خدا اسعد رتبہ شانِ جناب فیض
(حفیظ الدین پاسش)

صفحۂ آخر پر محمد وجیہ الدین علی خان معنی (شاگردِ فیض) کی رباعی صنعتِ مستزاد میں حضرتِ فیض کی مدح میں ہے اس رباعی کے بعد آخر میں مطبع کارنامہ لکھنؤ کے مالک محمد یعقوب کا اردو میں آٹھ سطری نوٹ ہے کہ مجموعۂ کلام بلاغت نظام شعرائے دکن کو محمد فیاض الدین خان صاحب دام ظلہٗ نے بہر تفریح طبائع شائقان مطبع کارنامہ لکھنؤ میں طبع کر دیا جو آغاز جمادی الاول ۱۲۸۵ھ میں طبع سے آراستہ ہوا۔

آخر میں عرض کرنا ہے کہ حضرت فیضؒ کے پہلے عرس کے مشاعرے کی غزلیات کا یہ مختصر سا مجموعہ نایاب اور کمیاب ہے۔ اگرچہ اس مشاعرے کو منعقد ہوئے ایک سو بائیس سال ہو چکے ہیں لیکن

(آگے ص ۱۹ پر)

دکنیات

سخاوت مرزا

# شیخ محمود چشتی الملقب بہ خوش دہاں بیجاپوری کی نظم و نثر

سنٹرل لائبریری (آصفیہ) حیدرآباد دکن میں تصوف کا ایک دکنی رسالہ 'منظوم' محفوظ ہے، جس کو کسی کتب فروش نے 'نوری نامۂ دائم' کے ایک فرضی نام سے فروخت کیا ہے۔ مگر داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ منظوم رسالہ بیجاپور کے مشہور و معروف بزرگ شیخ محمود چشتی خلیفۂ سید شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری (وفات تقریباً ۹۹۹ھ) کا ہے۔ حضرت شیخ محمود کی فارسی تصنیف معرفت السلوک، تصوف میں نہایت مشہور اور مقبول ہے، جس کا ترجمہ دکنی زبان میں حضرت سید شاہ ولی اللہ (م ۱۱۴۴ء) ابن سید شاہ حبیب اللہ حیدرآبادی نے ۱۱۰۹ھ میں فرمایا تھا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نواب انور الدین خاں والا جاہ (المتوفی ۱۱۶۲ھ) ناظم ارکاٹ کے مرشد تھے۔ غرض شیخ محمودؒ نے جو اس سلسلہ صوفیانۂ بیجاپور کی تعلیمات قلمبند فرمائی تھیں، اس کی تتبع میں بیسیوں رسائل اسی موضوع پر مدوّن ہوئے جس کو بعض صوفیوں نے تصویروں یعنی نفس امارہ و لوامہ و مطمئنہ کی تصاویر کے ساتھ بھی مرتب کیا ہے۔

شیخ محمود چشتیؒ کی کسی دکنی تصنیف کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اور نہ ان کی دکنی شاعری کے متعلق کچھ معلوم ہے۔ اس رسالے سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ آپ دکنی زبان کی نظم و نثر پر قدرت رکھتے تھے اور شاید "دائم" تخلص کرتے تھے۔ اس منظوم رسالے کے آخری صفحات میں "دائم" تخلص کا اشارہ ہے جو یہ ہے:

خوب کام کرتا دایم حال
یوں لورے وہوئے دمال

جس سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ کا تخلص دایم تھا۔ اس رسالے کا نام بموجب تحریر کتب فروش "لوری نامہ" نہیں معلوم ہوتا بلکہ مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرع میں لورے، (لوڑنا، مصدر) آیا ہے۔

مصنف ؒ کی گویا سالک کو ہدایت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ان رموز و اسرار پر مواظبت کرے تو وہ وصلِ حق سے بہرہ ور ہوگا۔ اسی لحاظ سے اس رسالہ کا نام نوری نامہ نہیں ہو سکتا۔

بہر حال اس منظوم رسالے کا طرز عارفانہ اور حضرت شاہ برہان الدین جانم سے ملتا جلتا ہے اور وہی تعلیم ہے جو ان کی فارسی تصنیف معرفتہ السلوک میں قلبند کی گئی ہے کیونکہ یہ عادل شاہی دور کے دکنی مصنف ہیں، اس لیے ہم یہاں ان کا بحیثیت دکنی قدیم مصنف کے تعارف کراتے ہیں۔

شیخ محمود چشتی، حضرت سید شاہ ابو الحسن بیدری ثم بجاپوری، ابن سید شاہ بدر الدین حبیب اللہ بیدری (جن کا مزار شریف قلعہ بیدر کے عقب میں، شمالی جانب ہے) کے ہمشیر زادہ تھے۔ تذکرہ اولیائے دکن اور " اردوئے قدیم "[1] نے آپ کی تاریخ وفات ۵۶۰ھ اور آپ کو حضرت امین الدین اعلیٰ ابن شاہ برہان بیجاپوری کا سجادہ نشین لکھا ہے جو بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ خود حضرت شاہ برہان ؒ ۹۹۹ھ تک بقیدِ حیات تھے اور پھر شاہ امین الدین اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ البتہ بعض بزرگوں کا بیان ہے کہ حضرت شیخ صاحب نے شاہ امین الدین اعلیٰ کی اپنے مرشد کا فرزند ہونے کی وجہ سے تربیت کرنی چاہی۔ چونکہ شاہ امین الدین پیدائشی مجذوب تھے، آپ کی نظر جلال سے شیخ صاحب ؒ کا چہرۂ مبارک ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ مگر مریدوں نے آپ کے تقدس کے لحاظ سے آپ کو "خوش دہاں" کہنا شروع کیا۔ غرض شیخ محمود چشتی[2] شاہ برہان الدین بیجاپوری ؒ کے اجل خلفا میں سے تھے۔ آپ کے ان رسائل کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اوائل گیارہویں صدی ہجری تک بقیدِ حیات تھے اور ان رسائل کا آپ ہی کی تصنیف ہونے کا ثبوت، ہم سطورِ مابعد میں پیش کریں گے۔

رسالہ دکنی منظوم : آصفیہ (سنٹرل لائبریری) کا ایک نادر و نایاب مخطوطہ ہے۔ مگر ناقص الآخر ہے۔ تب بھی یہ تقریباً نو سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا کوئی نام لکھا نہیں ہے البتہ اس کو بہ لحاظ ابتدائی شعر "گنجِ مخفی" سے موسوم کیا جا سکتا ہے، جو یہ ہے :

اللہ واحد، ذات قدیم
مطلق، مخفی گنج مقیم

مصنف نے اپنے پیر و مرشد، سید شاہ برہان الدین اور اپنے دادا پیر حضرت میراں جی شمس العشاق

---

[1] اردوئے قدیم صفحہ ۱۱۹ مطبوعہ نول کشور

[2] ملفوظات مخدوم ساوی مولفہ سید ابو الحسن قربی ویلوری (قلمی آصفیہ)

حضرت خواجہ خواجگانِ دکن خواجہ سید محمد گیسودراز تک سلسلۂ خلافت منظوم فرمایا ہے اور اپنے نام کا اشارہ فرمایا ہے۔ بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

مدح شاہ برہان بیجاپوری قدس سرہٗ

کامل حضرت شاہ برہان
برہان محبوب المستجان
شاہ برہان الدین ولی
جیسے مرتضیٰ علی
فرزند حضرت قطب آفاق
شاہ میراں جی شمس عشاق
شاہ میراں ارشاد کمال
شاہ کمال اور شاہ جمال
شاہ جمال عاشق باز
حسینی گیسو دراز
ہے یو چشت کا خانہ زاد
تخلص : یا نعمت ، دائم آباد
حضرت شاہ برہان نعمت
دیے منج کیتے شفقت
دکھلایا ذات معبود
پایا حق مقصود ، محمود
جب حق منجہ وہ ہوا عیاں
دیے خلافت شاہ برہان
کیے خلیفہ اپنا شاہ
اوسی خلافت کا حق گواہ
تب حق منجہ پر کیا نگاہ
حق تھے ہوا حق آگاہ
اس آگاہی کا کروں بیاں

سن طالب جسے ہوے عیاں
سلوک بن نا آوے بات
حاصل ہونا مشکل بات
بہوت خلق ہے سرگرداں
اسکوں پاکے ہیں حیف انہاں

مندرجہ بالا اشعار میں مصنف نے اپنا نام اور مندرجۂ ذیل شعر میں اپنا لقب بھی ظاہر کیا ہے:

دکھلایا ذات معبود
پایا حق، مقصود و محمود

مولانا شاہ ولی اللہ قادری المتوفی (۱۰۴۴ھ) نے ترجمہ دکنی معرفت السلوک (۱۰۹ھ) میں آپ کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔

"شیخ الشیوخ بندگی معروف بہ شیخ محمود ملقب بہ لطف معبود، قدس سرہٗ۔"

جس سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ یہ تصنیف شیخ محمود چشتی خلیفہ شاہ برہان بیجاپوری کی ہی ہے۔ اس کتاب کا موضوع تصوف اور سلوک ہے۔ اور آپ نے یہ اشارہ کیا ہے کہ میں نے جو کچھ مسائل عرفان کے متعلق حضرت شاہ برہانؒ سے آگاہی حاصل کی تھی اسی کو میں نے بیان کیا ہے تاکہ طالبانِ حق پر معرفتِ الٰہی کی مشکلیں آسان ہو جائیں۔

کتاب زیرِ بحث کے متن سے اقتباسات درج ہیں، جس سے اس زمانہ کی زبان اور محاوروں پر روشنی پڑسکے:

اشغال و اذکار:

چڑتے دم سوں اللہ بول!
اترتیں بھی اللہ بول

یعنی چڑھے دم اور اترتے دم اللہ اللہ بول۔

ہر دم اللہ سوں مشغول
ہر دم اللہ کرے قبول
بھی کچ آ، کہوں مکاں
جی توں اس کا پلے نشاں

---

[1] معرفت السلوک قلمی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن

پلکاں لگتیاں کھولتیاں ہیں
وہ بھی اللہ بولتیاں ہیں

یعنی پلکیں جھپکتی ہیں اور پھر کھل جاتی ہیں گویا استعارہ ہے کہ وہ بھی اللہ بولتی ہیں۔

اس سوں توں بھی ہو مشغول
ہے وہ پلکاں بولنے قبول
بھی رکھ آنکھوں اور ایک راز
ہے کانوں میں ہوے آواز
وہی آواز توں اللہ سنیا
بن اللہ کچھ اور نہ سن
راست دیس توں اللہ بول
اللہ۔ بول جیوں مکہ تنبول

مکہ تنبول۔ ایک قدیم محاورہ معلوم ہوتا ہے یعنی جس طرح کہ تو ہمیشہ پان چباتا رہتا ہے۔

مکہ میں گھول:۔

اللہ بن کچھ اور نہ بول — اللہ اللہ کر مکھ میں گھول

تعلقلہ زبان:۔

یہی زبان کا تعلقلہ — اس میں اللہ ناؤں بھا

کھاتے پیتے بیٹھتے اُٹھتے:۔

کھاتے پیتے اللہ بول
بیٹھتیں اٹھتیں اللہ بول

نظر کھلنا (آنکھیں کھل جانا):

جب ذکر وہ کرے اثر
تب اس دل کی کھولے نظر

بعض اصلاحاتِ تصوف 'ممکن الوجود' 'ممتنع الوجود' 'عارف الوجود' اور 'شاہد الوجود' کی تشریح لطافت سے کرتے چلے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

خوابی تن

ممکن وجود خوابی تن

باطن اس کا ہے برتن
سفلی روح ہے اس کا نام
علوی روح کا عکس تمام
سوتے وقت وہ پھرتا ہے
ہر طرف سیر کرتا ہے

جتا۔ مکتا۔

وہی روحانی جتا ہے اس تن کیرا مکتا ہے

روحانی جتا[1] صورت جسم ہے گویا اس جسم کا مکتا ہے۔

ذکر ستری۔ شاہد الوجود:

ذکر ستری سو ہے بیاز
عاشق معشوق ناز نیاز

من بھانا۔ بھاؤ۔ برتانا (برتنا)

جوں کچھ معشوق کیے من بھائے
اپنے بھاؤ تے اس برتائے

آخری اشعار میں اپنے زمانے کے لوگوں کی کیفیت بیان کی ہے۔ جو ایک شہر آشوب سے کم نہیں۔ اشعار یہ ہیں:

اُن کو کہنا کیوں انساں
بعضے اُن بن سب حیواں
بعضے حیواں سے بدتر
حیواں ان سیتی ہیں بہتر
کوئی روزگار میں سرگرداں
کوئی بے روزگار ہو میں حیراں
جو پیکو یاں کی لذت میں
بعضے ہیں اس محبت میں

---

[1] جتا بمعنی پیکر وہ صورت۔ دیکھو لغت کثیر الفوائد قلمی فارسی (کتب خانۂ آصفیہ)

دنیاں میانے دائم خوار
کوچے کوچے داریں دار
کوئی کبوتر پالتے ہیں
اس میں جوئے کھلتے ہیں
گھر گھر کیتے ناٹک سال
راگ مورت میں ہیں خوشحال

بال بال میں بھرنا :

عورتاں مرداں کا یو خیال
شہوت بھریاں بالیں بال
مُلاں ہوئے ہیں بدبخت
قاضی تو لیتے ہیں رشوت

جیسا تیسا :

حق کیا جیسا تیسا آخر بھی ہوئے ویسا

حضرت شیخ محمود چشتی کا ایک مختصر نثر کا رسالہ بھی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ جس کا نام "تنبیہ الخلائق" ہے جس کے ترجمے سے ظاہر ہے کہ اس کو بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنے کسی منشی مسمی عبدالرحمن سے نقل کرایا تھا۔ اصل الفاظ یہ ہیں :-

"بخطا عبدالرحمن منشی بابائے اردو" بعنوان کتاب "کلام محمود نثر" خاتمہ :
"من کلام شیخ محمود خوش دہاں۔"

تمہید میں نام کتاب مصنف اور سنہ تصنیف کا حوالہ فارسی عبارت میں درج ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں :-

اما بعد چنین گوید مرید و طالب کامل الاوّل و الآخر حضرت شاہ برہان الحق، فقیر حقیر شیخ محمود کہ این رسالہ است تنبیہ الخلایق، بر عارفان صاحب بصیرت پوشیدہ نماند کہ ایں زمانہ متاخر بعد از ہجرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ یکہزار و چند سال بالا گزشتہ اند ایں زمانہ علامات آخرت ..... شدہ اند

جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ وہی شیخ محمود چشتی خوش دہاں خلیفہ شاہ برہان الدین بیجاپوری ہیں اور اس کا طرز بیان وہی بیجاپوری مصنفین حضرت شاہ برہان وغیرہ کا ہے اس

بہادر یار جنگ

ادبی نوادر

# فطرت کائنات

دنیا میں جب نگاہیں دیکھنے کے قابل، کان سننے کے لائق اور دل سمجھنے کے خوگر بنے تو سب سے پہلی چیز جس کا انسان نے مشاہدہ کیا اور اس کی سمجھ میں آئی وہ اشیاء کا ربط باہمی اور ان کی مرکزیت تھی۔ مجھے اس کے ذہن پر ایک شخص آتا ہے جو شہر کی گہما گہمی اور شور، پکار سے دور کسی گاتی ہوئی ندی کے کنارے اونچی چٹان پر بیٹھا ہوا گھنے درختوں کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کا نظارہ کر رہا ہے۔ درخت کے ان گنت پتے، مشام روح کو معطر کرتے ہوئے پھول، ٹیڑھی بانکی لیکن منظم جالیات کو دعوت نظارہ دینے والی شاخیں دیکھنے والا محو ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی فکر فوراً اس کو غلطی سے بچاتی ہے۔ پھول پتے اور شاخ کی طرف سے اس کی نگاہ کو ہٹا کر درخت کی جڑوں کی طرف، متوجہ کر دیتی ہے اور پھر وہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر کسی نے اس جڑ کو قطع کر دیا تو ڈالیوں کی یہ شادابی، پتوں کا یہ نکھار، پھولوں کی یہ شگفتگی کس طرح باقی رہے گی۔

سورج نے آخری کرنیں اس کے منہ پر ڈالیں، درخت کی جڑ پر غور کرنے والا، ڈوبتے سورج میں محو تفکر ہو گیا۔ اس کے سامنے فضائے محیط کی دنیا چکر کھانے لگی، ستارے زبان حال سے کچھ گفتگو کرنے لگے اور وہ سمجھنے لگا کہ دنیا والوں کے لیے ڈوبنے والا یہ سورج اگر سچ مچ ڈوب جائے اور کروں کے لیے کوئی مرکز باقی نہ رہے تو ساری کائنات یا کم از کم ہمارے نظام شمسی کا کیا حال ہوگا۔

سورج ڈوب گیا، آسمان پر سیاہی دوڑ گئی، دور کی چیزیں نگاہوں سے گم، اور نزدیک کی چیزیں دھندلی پڑنے لگیں۔ شفق کی دھیمی دھیمی روشنی میں ندی کی پیشانی اب بھی چمک رہی تھی اور اس سے کاٹ کر نکالی ہوئی چھوٹی چھوٹی نہریں کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی دور دور تک نظر آ رہی تھی۔ ہمارا فلسفی سوچنے

لگتا ہے کہ اگر کسی نے ندی کے دہانے کو بند کر دیا اور اس مرکز پر قفل لگا دیا، جہاں سے چشمے پھوٹ پھوٹ کر دریا بنتے تھے تو نہ صرف میرے سامنے بہتی ہوئی ندی اور اس کے دامن سے تڑپ کر نکلی ہوئی نہریں بلکہ ان سے نیچے جلتے ہوئے کھیتوں سے پیدا ہونے والے غلّے ان غلّوں سے پرورش پانے والے کسان، ان کسانوں سے معاملت کرنے والے تاجر اور ان تاجروں سے خرید کر لطفِ زندگی اٹھانے والے شہریوں کا کا کیا حال ہوگا؟

رات زیادہ جا چکی تھی۔ کائنات کی حقیقتوں پر غور کرنے والا چلّا اٹھتا ہے کہ عالم ارض و سما کی فطرت مرکزیت ہے اور انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ سوچنے لگا کہ فطرت پر پیدا ہونے کے باوجود ہمیشہ فطرت سے بغاوت کرنے والا انسان، دبستانِ فطرت میں بیٹھنے کے باوجود کتابِ فطرت سے ناآشنا انسان، آنکھ رکھنے کے باوجود اندھا انسان کان رکھنے کے باوجود، بہرہ انسان اگر قدرت کی ان ساری تلقینوں کو بھلا دیتا ہے اور اپنے فکر و نظر اور کردار و افعال میں مرکزیت پر انفرادیت کو ترجیح دیتا ہے۔ اور اس پر آخر ہوا قہقہہ لگاتی ہے، پانی کھلکھلا کر ہنس دیتا ہے، ابر رو پڑتے ہیں اور سورج کی آنکھیں حیرت سے کھل جاتی ہیں تو کوئی تعجب کا مقام نہیں۔

□□

## باقی سلسلہ ص ۴۷

○ ۲۸ جولائی۔ حیدرآباد لٹریری فورم کا ادبی اجلاس ستار صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا، باقر محسن نے کہانی اور حسن فرخ نے نظم پیش کی، جس پر مباحث ہوئے۔ سید علی ظہیر نے گزشتہ اجلاس کی روئیداد سنائی اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔

○ ۳۱ جولائی۔ ڈاکٹر محمد علی اثر لکچرار شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی ساتویں کتاب "دکنی غزل کی نشو و نما" جس پر انھیں پی، ایچ ڈی کی ڈگری کا مستوجب [illegible] الیاس ٹریڈرس نے شائع کی۔

●●

ریاض احمد

# اب کے بھی محرّم ....

(۱)

بیچارہ عمر کا رختِ سفر اب باندھ چلا آ دل — چل شاہِ نجف کے در پر کر فریاد بپا اے دل
اب کے بھی محرّم آکے یونہی گر بیت گیا اے دل — میرے نام بلاوا آخر پھر کب آئے گا اے دل

(۲)

اونچے مرتبے والے لوگو، میں ہوں اک نادار
تم کو مبارک ہو دھن دولت، مجھ کو دامنِ تار
تم کو مبارک ہو ساری دنیا مجھ کو نبیؐ کا دیار
میں تو جاکر آلِ نبیؐ کا جاؤں انھیں کے دوار

(۳)

عالم فاضل لوگ بہت ہیں، میں جاہل نادان — علم حدیث و فقہ سے واقف، نہ تفسیرِ قرآن
ذکر اذکار خفی و جلی کی مجھ کو نہیں پہچان — ایک درودِ نبیؐ کا ہر دم میرے وردِ زبان

(۴)

مشرق مغرب کے دامن میں لاکھوں شہر دیار — سیاحوں کے دل بہلائیں، گنبد، محل، مینا
میری آنکھوں کا سرمہ ہے ان شہروں کا غبار — ریت کے تپتے میدانوں میں جن کے ملے آ

(۵)

چشمِ تصور لے آئی ہے وادیٔ معشوق کے پاس — اس وادی کا ہر ذرّہ ہے دل کا رمز شناس
اس وادی کے ہر جھونکے میں اس کے جسم کی باس — جس کا پاک مطہر نام ہے ٹوٹے دل کی آس

دل کہتا ہے محملِ رواں سے چھیڑ فراق کا راگ
سوزِ جدائی سے تو ہو روشن جیسے بھڑکی آگ
ناقہ، محمل، جادہ، رہبر، بھول یہ سب کھڑاگ
شوق ہی راکب، شوق ہی مرکب، شوق کے ہاتھ میں باگ

(۷)

اونچے، نیچے ریت کے ٹیلے کچھ راہیں گمنام
ان راہوں میں بکھرے ہیں، سجدوں کے پیغام
صحرا کی بے رحم ہوا کا ظلم ہوا ہے عام
کام نہ دیں جاروب کشی کا، پھر پلکیں کس کام

(۸)

غازی اونچے مرتبے والے پاک نژاد شہید
ساتھ امامؑ کے، رسمِ وفا کی دے گئے داد شہید
سب کچھ پا گئے اک لمحے میں نیک نہاد شہید
میرے واسطے چھوڑ گئے بس اک فریاد شہید

(۱۰)

اے لوگو یہ حال تو دیکھو دونوں جہاں کا امام
اس کے ساتھی صرف بہتر، باقی سپاہِ شام
نیزے، بھالے، تیر کمانیں جھک جھک کریں سلام
رن میں بچے موتی ایسے، جسم ہیں لالہ فام

(۱۱)

عشق تو یہ کیا ہوگا اک کیفیت ہے بے نام
دل اک نور کے پرتو سے ہے روشن صبح و شام
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں جیسے چھلکت جام

(۱۲)

بنجارہ عمر کا رختِ سفر اب باندھ چلا اے دل
چل شاہِ نجف کے در پہ کر فریاد بپا اے دل
اب کے محرم آکے یوں ہی گر بیت گیا اے دل
میرے نام بلاوا آخر پھر کب آئے گا اے دل

C

سید امتیاز الدین

# ...یہ سال ہم پہ بیت گیا

(مرحوم بھائی شاذ تمکنت کی برسی پر)

اٹھاؤ ہاتھ کہ رسمِ دعا تو باقی ہے
یہ اور بات کہ اب عرضِ حال ہے کچھ اور
امید و بیم کی سب منزلیں تمام ہوئیں
ہماری فرصتِ غم کا سوال ہے کچھ اور

نہ دن رکا نہ کبھی رات دیر سے آئی
وہی ہے نظمِ جہاں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
نہ اب وہ لذتِ گریہ نہ اب وہ دولتِ درد
عجیب دل ہے کہ جیسے کبھی دکھا ہی نہیں

تو یاد آئے نہ آئے تری کمی ہے وہی
ہر ایک کام ادھورا دکھائی دیتا ہے

پلک جھپکتے میں سال ہم پہ بیت گیا
نہ جانے کتنے مہ و سال اور آئیں گے
ہر ایک دور میں چلتی رہے گی بزمِ سخن
تری نوا کے پجاری تجھے نہ پائیں گے

زمانہ شکر طلب ہے روش بجا اس کی
مگر گزار ترے آج کس کے گھر جائیں
نہ غیرِ خود کا یارا نہ تابِ عرضِ سخن
جو کچھ نہیں تو فقط اک سلام کر جائیں

تری لحد کی خموشی بھی اک تکلم ہے
سکوت جیسے صدا ہو گیا ہے میرے لیے
ہر ایک سمت وہی مہرباں آنکھیں ہیں
یہ سچ نہیں ہے کہ تو کھو گیا ہے میرے لیے

جون ایلیا

# راتیں سچّی ہیں، دن جھوٹے

چاہے تم میری بینائی کھرچ ڈالو، میں پھر بھی اپنے خواب نہیں چھوڑوں گا
ان کی لذت اور اذیت سے میں اپنا کوئی عہد نہیں توڑوں گا
تیز نظر بیناؤں کی آبادی میں
کیا میں اپنے دھیان کی یہ پونجی بھی گنوا دوں
ہاں میرے خوابوں کو تمھاری صبحوں کی سرد اور سایہ گوں تعبیروں سے نفرت ہے
ان صبحوں نے شام کے ہاتھوں اب تک جتنے سورج بیچے
وہ سب اک برفانی بھاپ کی چمکیلی اور چکّر کھاتی گولائی تھے
سو میرے خوابوں کی راتیں، جلتی اور دہکتی راتیں
ایسی یخ بستہ تعبیروں کے ہر دن سے اچھی ہیں اور سچّی بھی ہیں
جس میں دھندلا چکّر کھاتا چمکیلا پن چھ اطراف کا روگ بنا ہے
میرے اندھیرے بھی سچّے ہیں
اور تمھارے روگ اُجالے بھی جھوٹے ہیں
راتیں سچّی ہیں، دن جھوٹے
جب تک دن جھوٹے ہیں جب تک
راتیں سہنا اور اپنے خوابوں میں رہنا

خوابوں کو بہکانے والے دن کے اُجالوں سے اچھا ہے
ماں میں بہکاووں کی دھند نہیں اوڑھوں گا

اپنے عہد نہیں توڑوں گا
یہی تو بس میرا سب کچھ ہے
ماہ و سال کے غارت گر سے میری ٹھنی ہے
میری جان پر آن بنی ہے
چاہے کچھ ہو۔ میرے آخری سانس تک اب چاہے کچھ ہو

---

# سب رس کا سکینہ بیگم نمبر

( ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء کا مشترکہ شمارہ )

o

اس شمارے میں ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ خواتین کی سابق معتمد اور ماہنامہ سب رس کی مجلسِ ادارت کی سابق رکن ، حیدرآباد کی ممتاز سماجی کارکن اور اردو کی ادیبہ محترمہ سکینہ بیگم (مرحومہ) کی وفات پر تعزیتی تاثرات ، حالاتِ زندگی اور کارناموں کا جائزہ ، مرحومہ کے منتخب مضامین اور خطوط کے علاوہ مرحومہ کے نام ڈاکٹر زور کے گراں قدر مکاتیب شامل ہوں گے۔ (ادارہ)

# غزلیں

## ڈاکٹر حقیر آستانی

بدلی دھوپ تو بدلے سائے
بس اتنا بھی جان نہ پائے

کوئی ناصح کو سمجھائے
جو بھی جس کے جی کو بھائے

گردشِ دوراں ہی جانے ہے
اس نے کتنے چکّر کھائے

جب جب اپنے اندر جھانکا
خود سے شرمائے گھبرائے

یہ تصویر تصوّر کی ہے
دیکھنے والے میں ڈھل جائے

کس کس کو پہچانیں آخر
جتنے انساں اتنے سائے

اتنی دُور حقیر سے ملنے
کون کہاں تک چل کے آئے

## صابر فخرالدین

خیال و فکر کے رشتے جہاں نہیں ہوں گے
زمیں تو ہوگی وہاں آسماں نہیں ہوں گے

نظر تو آئیں گے ہم دُور سے سلگتے پہاڑ
قریب آؤ گے آتش فشاں نہیں ہوں گے

اک ایسا وقت بھی آئے گا دیکھ لینا تم
مکیں تو ہوں گے بہر سو مکاں نہیں ہوں گے

یہ سچ ہے راستے مل جائیں گے کئی لیکن
وہ ہم سے بچھڑے ہوئے کارواں نہیں ہوں گے

جو میرے اور ترے درمیاں نہ تھے حائل
وہ فاصلے تو کہیں درمیاں نہیں ہوں گے

ہے ساتھ ساتھ مرا حال اس طرح صابر
کہ گذرے لمحے کبھی رائیگاں نہیں ہوں گے

صابر فخر الدین

# غزلیں

میں خود سے انجان نہیں تھا
اس کا تو امکان نہیں تھا

ایسی ہی کچھ مجبوری تھی
ورنہ میں نادان نہیں تھا

پوجا آخر کس کی ہوتی ہے
مندر میں بھگوان نہیں تھا

وہ کیا میرے منہ کو آتے
ان کا کچھ احسان نہیں تھا

میں نے سچی بات کہی تھی
وہ کوئی بہتان نہیں تھا

یوں تو لوگ بہت تھے صابر
ان میں کوئی انسان نہیں تھا

○

شہر میں صرف جھاڑیاں تھیں
اور جنگل میں بستیاں تھیں

جن کو جانا تھا منزلوں تک
پاؤں میں ان کے بیڑیاں تھیں

تھا بظاہر سکون لیکن
مضطرب ساری بستیاں تھیں

فاصلے ختم ہو چکے تھے
اور صدیوں کی دوریاں تھیں

غول در غول تھے پرندے
اور سوکھی سی ٹہنیاں تھیں

کل کے اخبار میں بھی صابر
آج جیسی ہی سرخیاں تھیں

○

# نقد و نظر

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں ارسال کی جائیں

## اُردو کی نئی کتاب

(چھٹی - نویں اور گیارھویں جماعت کے لیے)

اردو کی یہ تین نصابی کتابیں NCERT نے شائع کی ہیں - قبل اس کے کہ ان کتابوں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا جائے چند تمہیدی کلمات اس ادارے کے بارے میں کہتے چلیں

NCERT مخفف ہے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کا قیام ستمبر ۱۹۶۱ء کو عمل میں آیا - اس ادارے کے قیام کا مقصد ملک کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانا ، نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق نصابی کتابیں تیار کروانا اساتذہ کو تربیت دینا ، تعلیمی تحقیقات کا کام منظم کرنا اور وہ سارے کام انجام دینا ہے جس سے تعلیم کا نظام بہتر اور زیادہ مفید ہو سکے -

نصابی کتابوں کی ترتیب و اشاعت این سی - ای - آر - ٹی کے مختلف اہم کاموں میں سے ایک ہے - یہ نصابی کتابیں طریقۂ تعلیم کے بارے میں سو برسوں کی تحقیق کے بعد تیار کروائی گئی ہیں اور مزید تحقیقات کی روشنی میں وقفے وقفے سے ان کی نظرِ ثانی کی جاتی ہے -

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے جب وہ ترقی اُردو بورڈ کے ڈائرکٹر تھے یہ تجویز پیش کی تھی کہ این سی ای آر ٹی اُردو نصابی کتابیں بھی مرتب کروائے - اس تجویز کو منظور کروانے میں جناب مجتبیٰ حسین ایڈیٹر این سی آر ٹی نے خاص دلچسپی لی - چناں چہ این - سی - ای - آر - ٹی نے اردو کی نصابی کتابوں کی تدوین کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ ہیں - پروفیسر ثریا حسین ، جناب شمس الرحمٰن فاروقی ، پروفیسر مغنی تبسم ، پروفیسر حامدی کاشمیری ، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم صاحبہ اور ڈاکٹر ابوذر عثمانی اس

کمیٹی کے اراکین ہیں ۔ اس کے پہلے کنوینر پروفیسر بی۔ وی امو پلے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر محمد صابر مقرر ہوئے۔

اردو کی نصابی کتابیں تیار کرنے سے پہلے اس کمیٹی نے متعدد ورکشاپ منعقد کیے جس میں تدوین نصاب کے رہنما اصول طے کیے گئے۔ بعد ازاں مختلف تعلیمی اداروں اور ماہرین کے ذمے پہلی جماعت سے بارھویں تک اردو کی کتابوں کی تالیف کا کام سپرد کیا گیا۔ کسی کتاب کے مسودے کی تکمیل کے بعد اساتذہ اور ماہرین تعلیم کا ورکشاپ منعقد کر کے اسباق کو قطعی صورت دی جاتی ہے اس طرح اب تک تین کتابیں تدوین کے مختلف مرحلوں سے گزر کر "اردو کی نئی کتاب" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تین کتابیں علی الترتیب چھٹی، نویں اور گیارھویں جماعتوں کے لیے مرتب کی گئی ہیں۔

چھٹی جماعت کی کتابوں کے مرتبین پروفیسر ثریا حسین، پروفیسر عتیق احمد صدیقی ڈاکٹر اطہر پرویز (مرحوم) اور ڈاکٹر شہریار ہیں۔ اس کتاب کی تیاری کے لیے دو ورکشاپ منعقد کیے گئے تھے جن میں مرتبین کے علاوہ دہلی سے (شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، رشید حسن خاں، ڈاکٹر سید فرحت حسین) ڈاکٹر شائستہ ردولوی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر حنیف کیفی، ڈاکٹر سید فرحت حسین، تحسین حیدر، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، فرحت رضوی، مجتبیٰ حسین، مشکور علی صدیقی، ملکہ بیگم اور ڈاکٹر محمد صابر، علی گڑھ سے انوار احمد خاں، مرزا خلیل بیگ، بنارس سے پروفیسر حکیم چند نیّر، بمبئی سے ڈاکٹر نصرت اور فاطمہ انیس، کشمیر سے محمد ایوب بیتاب، بیجاپور سے محمد ابراہیم گوگی، گلبرگہ سے وہاب عندلیب، ... سے ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر رشید موسوی شریک تھے۔

نویں جماعت کی کتاب اردو کے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں بھی دو ورکشاپ منعقد کیے گئے تھے جس میں فاروقی صاحب کے علاوہ دہلی سے گوپی چند نارنگ، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر سید فرحت حسین، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر سیفی پریمی، ڈاکٹر محمد صابر، ڈاکٹر محمد ذاکر، علی گڑھ سے پروفیسر ثریا حسین، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر اطہر پرویز، بہار سے ڈاکٹر ابوذر عثمانی، کشمیر سے مولوی عبدالحی نے شرکت کی۔

گیارھویں جماعت کی کتاب کے مؤلفین پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر حنیف کیفی اور خالد

میں۔ اس کی تیاری کے لیے جو ورکشاپ منعقد ہوئے اس میں دہلی سے مرتبین کے علاوہ ڈاکٹر حنیف کیفی، اکٹر شارب ردولوی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر محمد ابر، سید محمد عاقل، خالد محمود، ڈاکٹر سید فرحت حسین، علی گڑھ سے پروفیسر ثریا حسین پروفیسر عتیق احمد صدیقی، کشمیر سے پروفیسر شکیل الرحمٰن، بہار سے پروفیسر ممتاز احمد، حیدرآباد سے پروفیسر غنی تبسم، اور میسور سے پروفیسر ہاشم علی شریک تھے۔ ورکشاپ کے شرکا میں ماہرین تعلیم اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ وہ ٹیچر بھی شامل ہیں جو اسکولوں میں پڑھاتے ہیں اور تدریس کے عملی مسائل سے واقف ہیں۔

ان کتابوں کے اسباق جدید سائنٹیفک اصولوں کے مطابق تیار کیے گئے ہیں جو این سی۔ ای آر ٹی کے ماہرین تعلیم نے زبانوں کی تعلیم کے لیے تجویز کیے ہیں۔

دو کمیٹی کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دیباچے میں ان مقاصد اور رہنما اصولوں پر روشنی ڈالی ہے جو ان کتابوں کی تدوین میں ملحوظ رکھے گئے:

"ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ان کتابوں کے ذریعے طالب علموں میں اپنی زبان سے محبت کا جذبہ پیدا ہو اور وہ معیاری اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھ سکیں۔ آٹھویں درجے تک کی کتابوں میں زیادہ توجہ زبان کی تعلیم پر ہے، یعنی جملے کی ساخت، اجزائے کلام، بنیادی لفظوں کے معنی، صحتِ تلفظ، صحتِ املا، مطالب کو سمجھنے کی صلاحیت اور درجے کے معیار کے مطابق جذبات و خیالات کے اظہار پر قدرت شروع کی۔ کتابوں میں کوشش کی گئی ہے کہ اردو رسم الخط کو تعلیم و تدریس کے جدید ترین طریقوں کی مدد سے سکھایا جائے اور اسباق اس طرح سے پیش کیے جائیں کہ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور دلچسپی بھی قائم رہے۔ یوں تو چھوٹی چھوٹی نظموں کے ذریعے بھی کچھ نہ کچھ ادبی عنصر تمام درجوں کی کتابوں میں ملے گا لیکن اردو شاعری اور نثری اصناف کا باقاعدہ تعارف تاریخی ترتیب سے نویں درجے کی کتاب سے کرایا گیا ہے۔ ہر سبق کے بعد مشقیں اس طرح سے ترتیب دی گئی ہیں کہ نئے الفاظ اور مطالب طالب علموں کے ذہن نشین ہو جائیں۔ زبان کے متعلق نئے نئے نکات بھی بتدریج سامنے [illegible] معلومات میں بھی اضافہ ہوتا رہے اور معیاری اردو بولنے اور سمجھنے

اور لکھنے کی عادت بھی مستحکم ہو جائے ، نیز شعر سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا ہو اور بتدریج ادبی ذوق پروان چڑھے ۔ ہر سبق کے بعد مشکل الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں ۔

جہاں تک اسباق کے موضوعات کا تعلق ہے بچوں کے ماحول اور ان کی نفسیات کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچانے کے علاوہ ایسے اسباق بطور خاص شامل کیے گئے ہیں جن سے بچوں میں قومی یک جہتی کا شعور پیدا ہو اور وہ اچھے شہری بنیں ۔ اسباق کو زیادہ سے زیادہ دل چسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ زبان کا معیار طلبہ کی عمر اور صلاحیت کے مطابق ہو ۔ ذخیرۂ الفاظ میں بتدریج اضافہ کیا گیا ہے ۔ اصناف اور اسالیب متعارف کروانے میں بھی یہی اصول مدِ نظر رہا ہے اور اسباق کی مشقوں کی ترتیب میں بھی ان اصولوں کو برتا دیا گیا ہے ۔

ان کتابوں کی تہذیب و تزئین نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے ۔ یہ کتابیں اچھے کاغذ پر چھپی گئی ہیں ۔ کتابت اور طباعت بھی معیاری ہے ۔ تصویریں جاذبِ نظر ہیں ۔ عبدالمنان گیاوی اور محمد حامد صدیقی ان کتابوں کے خوش نویس ہیں ۔ سیّد نسیم زیدی اور گورنگا گھوش نے اسباق کو مصوّر کیا اور خوب سرورق بنائے ۔ نویں جماعت کی کتاب کا سرورق چندر پرکاش ٹنڈن کے موقلم کا مرہون ہے ۔ محمد اسلم جو اردو کتابوں کے پروڈکشن انچارج ہیں ان کتابوں کو نہایت سلیقے سے شائع کیا ہے ۔

اردو میں سائنٹفک انداز سے مرتّب کردہ معیاری کتابوں کی جو کمی اب تک محسوس کی جا رہی تھی ان کتابوں کی اشاعت سے اس کا بڑی حد تک ازالہ ہو گیا ہے ۔ پی ۔ ایل ملہوترا ڈائرکٹر این ۔ سی ۔ ای ۔ آر ۔ ٹی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ چیرمن اُردو کمیٹی مبارک باد کے مستحق ہیں ، جن کی خاص توجہ اور دل چسپی سے یہ کام تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے ۔

کتابوں کی قیمت نہایت کم اور مناسب رکھی گئی ہے ۔

(مغنی تبسم)

# لوگ کہتے ہیں

## ادیبوں، دانشوروں اور قارئین کے خطوط

○ — ڈاکٹر رزاق فاروقی (صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی)

مُغنی بھائی۔ سلام و تحیات،

سب رس جون ۱۹۸۶ء وصول ہوا، کبھی کبھی مجھے اس کی ایک آدھ کاپی مل جاتی ہے تو اب جاریہ کے طور پر۔ آپ کا شکریہ ادا کروں یا ادارے کے احباب کا۔ شکریہ تو ادا کرنا ضروری ہے۔

متذکرہ شمارے کا اداریہ سامنے ہے اس سے صرف دو سطور یہاں درج کرتا ہوں۔

" جدید دور کی زندگی میں مقصد اور ذریعے کی دوئی کا تصور کچھ اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ ذرائع کی حرمت باقی نہیں رہی۔"

اس مختصر سے شاندار جملے سے میری بڑی دل جوئی ہوئی۔ اس خوب صورت خیال اور اس کے اظہار کے لیے میری طرف سے ہدیۂ تشکر پیش ہے قبول فرمائیے اور دعا بھی کیجیے کہ میں آپ کے خیال کی استقامت سے عملی طور پر حاصل کرنے کے لیے جامعہ گلبرگہ کے شعبۂ اردو میں جو تگ و دو کر رہا ہوں وہ کامیاب ہو۔ محترم گیان چند صاحب قبلہ کا مضمون

"یادوں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں"

دیکھا، استاذی سروری صاحب، محترم احتشام حسین صاحب اور دیگر بزرگوں کی یاد نے آج مجھے دن بھر خاموش کر دیا تھا۔ دعا ہے کہ جین صاحب قبلہ کے مضمون کا وہ اثر خدا نہ دکھلائے جو مرزا فرحت اللہ بیگ اور پروفیسر وحید الدین سلیم کے لیے ہوا تھا۔ اللہ مالک جین صاحب کو صحت و عافیت کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ میری طرف سے [illegible] سلام، تسلیمات پیش کیجیے۔ آپ کا مخلص،

وقار خلیل

# اُردو نامہ

## علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

○ ــــــ ۱۱۔ جولائی ۔ مولوی غلام ربانی مرحوم کی کتاب " پرانی یادیں " کی اسعد ہال میں صدسیاستی انجمن ڈاکٹر سید عبدالمنان کے ہاتھوں رسم اجرا انجام پائی ۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے صدارت کی ربانی مرحوم عوض سعید نے خاکہ سنایا ۔ پروفیسر سراج الدین ، پروفیسر انور معظم اور جناب اختر حسن کے علاوہ عبدالقیوم نے کتاب اور مصنف کے بارے میں اظہار خیال کیا ۔ جناب سرینواس لاہوٹی نے نظامت کی

○ ــــــ ۱۲۔ جولائی ۔ حیدرآباد لٹریری فورم کے ادبی اجلاس میں صدر حلقہ پروفیسر مغنی تبسم نے لندن ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے تاثرات سنائے ۔ مغیث متین نے نئی نظم بحث کے لیے پیش ظہیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے ۔ تاج مہجور نے اجلاس کی صدارت کی ۔

○ ــــــ ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات اردو فاضل ، اردو عالم ، اردو زباندانی اور اردو د کے مراکز ایلالیو انجعا ورادو گھر کے علاوہ محبوب نگر ، ورنگل ، نارائن کھیڑ ، صنعت نگر اور دیگلور پر جولائی کو ایک ساتھ منعقد ہوئے ۔

○ ــــــ محترمہ شفیقہ قادری ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی کے ۱۱ مضامین پر مشتمل کتاب " تعـ کے نام سے ادارۂ شعور و حکمت کے زیر اہتمام شائع ہوئی ۔

○ ــــــ ۱۵۔ جولائی سیدہ انجم سلطانہ لکچرار پدماوتی کالج کو ان کے مقالہ " اردو غزل " کو اقبال کی دین پر عثمانیہ یونیورسٹی نے ایم فل کی ڈگری کا مستحق قرار دیا ۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی نگرانی میں مقالہ کی تکمیـ

○ ــــــ ۱۶۔ جولائی : جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے چیف منسٹر مسٹر چنا ریڈی سے ملاقات کے بعد اس امر کا انکشاف کیا کہ چیف منسٹر نے حیدرآباد میں علامہ اقبال کی یاد میں " اقبال مینار " کی تعمیر کے منصوبے کی منظوری دے دی ۔ ممتاز شاعر اور آرکیٹکٹ جناب طالب خوندمیری نے اقبال مینار کا ڈیزائن تیار کیا ۔ اس مینار کے چاروں طرف چار زبانوں میں اقبال کا ترانہ " سارے جہاں سے

کنندہ کرایا جائے گا۔

○ ـــــ ۱۔جولائی۔ جناب سلطان صلاح الدین اویسی رکن پارلیمان نے ریاست میں اردو کے تعلق سے تلگو دیشم حکومت کی سرکاری پالیسیوں پر شدید تنقید کرتے ہوئے اس امر پر اظہار تاسف کیا کہ ریاست میں اردو سے غیر منصفانہ طرز عمل ختم ہو اور اردو والوں کے جمہوری تعلیمی و لسانی مطالبات منظور ہوں۔

○ ـــــ جناب خلیل الرحمٰن ڈائرکٹر و سکریٹری ریاستی اردو اکیڈیمی نے اقبال مینار کی تعمیر کے فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے چیف منسٹر سے اظہار تشکر کیا۔

○ ـــــ ڈاکٹر سید ضیاالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے اردو فارسی مخطوطات پر مشتمل ریاستی لائبریری کو تلگو یونیورسٹی کے حوالے کیے جانے کی مخالفت کرتے ہوئے چیف منسٹر کو ایک مکتوب لکھا اور ان سے اس امر کی خواہش کی ہے کہ اس ذخیرے کو ایک علاحدہ عمارت یا پھر عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ کیا جائے۔

○ ـــــ ۲۰۔جولائی۔ بہار اردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۴ء کی جن تصانیف کو ادبی ایوارڈ کا مستحق قرار دیا ان میں حیدرآبادی مصنفین ڈاکٹر حسن الدین احمد (انگریزی شاعری کے منظوم اردو تراجم تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) ڈاکٹر طیب انصاری (نصرتی کی شاعری) ڈاکٹر فرزانہ بیگم (دکنی کی نثری داستانیں) اور ابوالفیض سحر (خلا میں پہلا ہندوستانی) شامل ہیں۔

○ ـــــ ۲۱۔جولائی۔ عثمانیہ لٹریری سرکل کا مشاعرہ محمد حسین نقیب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہمان پاکستانی شاعر صاحبزادہ حسین علی خاں نیر کے علاوہ محمود شرفی، کلیم الحق طالب، کلیم صدیقی، ضیا ساحری، جری القادری، اختر عوزی، نصیر بیابانی، ابوالفاروق شعور، عثمان قادر اور ابراہیم خلیل نے کلام سنایا۔

○ ـــــ ۲۲۔شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام چار روزہ بین کلیاتی ادبی مقابلے منعقد ہوئے۔ کامیاب امیدواروں کی ٹیموں کو نظام مس ٹروفی، پروفیسر سلیم ٹروفی، ڈاکٹر زور گولڈ میڈل، پروفیسر سجاد شیلڈ اور شاذ تمکنت نظم خوانی ٹروفی کا مستحق قرار دیا گیا۔ پروفیسر یوسف سرمست، پروفیسر مغنی تبسم، محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر حبیب ضیاء اور دیگر اساتذہ نے ججس کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر بیگ احساس مقابلوں کے کنوینر اور محمد غوث الدین معاون رہے۔

○ ـــــ بزم کمال ادب کا مشاعرہ اختر عوزی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ رشید قادری، انور سلیم، ضیا ساحری

# نتائج اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو

## منعقدہ جولائی ۱۹۸۶ء

**اردو دانی** : امتیاز بلحاظ رول نمبر: 32، 35، 53، 54، 56، 57، 59، 61، 67۔

کامیاب: 2، 3، 5، 7، 8، 10 تا 15، 17، 19، 20، 26، 27، 29، 31، 33، 34، 38 تا 41، 44، 50، 52، 55، 58، 60، 62، 66،

**اردو زباندانی** : درجہ اول بلحاظ رول نمبر 20، 22، درجہ دوم 21، درجہ سوم: 25۔

**اردو عالم** : درجہ اول بلحاظ رول نمبر: 23، 24، 26،

درجہ دوم: 27، 28، 31 تا 39، 41 تا 43، 46 تا 50، 55 تا 58، 59، 66، 67، 69، 71، 72، 79، 80، 94، 96، 98 تا 100، 102،

درجہ سوم: 18 تا 21، 60، 63، 64، 73، 75، 76، 78، 91، 93، 95۔

**اردو فاضل** : درجہ اول 72

درجہ دوم: 26، 29، 31، 37، 38، 46، 47، 49 تا 52، 55، 71، 73، 79، 96، 102، 106، 111۔

درجہ سوم: 30، 44، 58، 62، 67، 68، 85، 92، 95، 98، 117۔

تکمیل: 39، 48، 56، 80، 81، 88، 112، 113، 116، 119

گروپ I، گروپ II و III: 25، 32، 33، 43، 57، 61، 64، 70، 74، 78، 83، 89، 93، 97، 99، 100، 101، 104، 107، 109، 110، 118

گروپ II 35،

گروپ III: 27، 28، 34، 42، 59، 65، 94، 108۔

نوٹ: آئندہ امتحانات ۱۰ تا ۱۳ جنوری ۱۹۸۷ء کو تمام مراکز پر ایک ساتھ منعقد ہوں گے۔ شرکت کی آخری تاریخ ۱۰۔ ڈسمبر ۸۶ء مقرر کی گئی ہے۔ دیر آمدہ کے ساتھ ۲۰۔ ڈسمبر ۸۶ء تک فارم اور فیس قبول کی جائے گی۔ اس کے بعد کوئی درخواست قابلِ قبول نہ ہوگی۔

(پروفیسر) مغنی تبسم (معتمد اعزازی امتحانات)

46(9,10)
25 NOV 1986
Dr. Zakir Husain Library • J.M.I. New Delhi •
Jamia Nagar

# سب رس

به یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

سن اجرا: ۱۹۳۸ء  فون: ۳۸۴۶۹۰

# ماہنامہ سب رس حیدرآباد

## سکینہ بیگم نمبر

جلد: ۴۶  شمارہ: ۹ و ۱۰  ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۶ء

مدیر اعزازی: مغنی تبسم

شریک مدیر: محمد منظور احمد

معاون مدیر: وقار خلیل

### مجلس مشاورت

صدر: حامد علی عباسی  نائب صدر: ہاشم علی اختر

معتمد: پروفیسر مغنی تبسم

### ارکان:

عابد علی خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، محمد اکبر الدین صدیقی، رس راج سکینہ، پروفیسر سراج الدین، محمد منظور احمد

قیمت فی پرچہ: ۵ روپے

سالانہ: ۲۰ روپے، کتب خانوں سے ۲۵ روپے

بیرونی ملکوں سے:

| ہوائی ڈاک سے | | بحری ڈاک سے |
|---|---|---|
| مشرق وسطیٰ | ۱۵ ڈالر | ۶ ڈالر |
| امریکہ | ۲۰ ڈالر | ۷ ڈالر |
| پاکستان، برما، سیلون | ۱۰ ڈالر | ۴ ڈالر |
| انگلستان | ۸ پونڈ | ۴ پونڈ |

رس راج سکینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، نکیے واڑہ، چھتہ بازار سے چھپواکر دفتر سب رس، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ ۴۸۲ سے شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ:

ادارۂ ادبیات اردو، ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ ۴۸۲۔

# فہرست



# پہلی بات

○ سکینہ بیگم نمبر پیش ہے۔ سوانحی اور تاثراتی نگارشات کے علاوہ مرحومہ کے چند منتخب مضامین، خطوط، تقریریں اور بچوں کے لیے لکھی ہوئی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ اس میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (بانی ادارہ) کے وہ خطوط بھی شائع کیے جا رہے ہیں جو انھوں نے سکینہ بیگم کو لکھے تھے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوگا کہ مرحومہ کے ڈاکٹر زورؔ سے کتنے قریبی مراسم تھے۔ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو سے کتنا گہرا تعلق تھا۔ سکینہ بیگم کے موسومہ مشاہیر کے خطوط ان کی صاحب زادی طیبہ بیگم نے ہمیں عنایت کیے ہیں۔ سب رس کی تنگ دامنی کے سبب انھیں اس خاص اشاعت میں شامل نہ کر سکے۔ انشاء اللہ آئندہ شمارے میں انہیں شائع کریں گے۔

○ اُردو کے ممتاز مزاح نگار ادیب جناب برق آشیانوی ۱۴۔ اگست کو رحلت کر گئے۔ مزاح نگاری میں انھوں نے پھکڑپن اور ابتذال سے دامن بچائے رکھا۔ وہ شستہ زبان لکھتے تھے۔ اسلوب میں بے ساختگی تھی۔ انھوں نے ادبی موضوعات پر چند مضامین بھی لکھے جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلاسیکی اور جدید ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ اپنی وفات سے چند ماہ پہلے وہ ایک بزم مذاکرہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس میں ادبی مسائل اور اہم ادبی تصانیف پر ادیب اور نقاد گفتگو کریں۔ پھر ان مباحث کو شائع کروایا جائے۔ لیکن اپنی علالت کی وجہ سے وہ اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ برق آشیانوی کی وفات سے ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ ایک مدت تک پُر نہیں ہو سکے گا۔ حیدرآباد کی بساطِ تہذیب سے ایک زندہ دل اُٹھ گیا۔ اس کے غم میں ساری فضا سوگوار ہے۔

مغنی تبسم

# روداد جلسہ تعزیت ادارۂ ادبیاتِ اردو

ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا - جناب محمد علی عباسی (معتمد ادارہ) نے جلسے کی صدارت کی۔

آغاز میں پروفیسر مغنی تبسم نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ سکینہ بیگم صاحبہ ادارے کی قدیم رفیق تھیں ۔ وہ ادارے کے شعبۂ نسواں کی معتمدہ رہ چکی تھیں - کئی برس تک سب رس کی مجلسِ ادارت سے وابستہ رہیں - وہ ایک بلند مرتبہ ادیب اور شاعرہ بھی تھیں - بچوں کے ادب پر بھی انہوں نے خاص توجہ دی اور بچوں کے لیے بڑی دل نشیں اور سبق آموز کہانیاں لکھیں ۔

جناب رحمن راج سکینہ (معتمد ادارہ) نے سکینہ بیگم صاحبہ کی وفات پر گہرے رنج وملال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحومہ کا تعلق ادارۂ ادبیاتِ اُردو سے طویل عرصے تک رہا - وہ ان لوگوں میں سے تھیں جنھوں نے ڈاکٹر زور کے ساتھ ادارے کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا - وہ ایک خاموش طبع خاتون اور حیدرآبادی تہذیب کا نمونہ تھیں - ان کی وفات سے نہ صرف ان کے متعلقین بلکہ میں یہ کہوں گا کہ حیدرآبادیوں کا اور بالخصوص ادارے کا بڑا نقصان ہوا - ان کی صحت جب تک ٹھیک رہی وہ پابندی کے ساتھ ادارے کے جلسوں میں شریک ہوتی رہیں - اپنی علالت کے سبب جب وہ اجلاسوں میں شریک ہونے سے قاصر رہیں تب بھی ہماری درخواست پر تقریریں اور مضامین لکھ کر بھیجتی رہیں - ابھی ایک ماہ قبل یومِ قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس کے لیے انھوں نے اپنا مضمون تحریر کر کے روانہ کیا تھا جس کو منظور ... صاحب نے پڑھا - وہ اس وقت شدید علیل تھیں - بستر علالت پر بھی وہ یہ محسوس کر رہی تھیں کہ انھیں ادارۂ ادبیاتِ اردو میں رہنا چاہیے تھا - اپنے وطن اور ادارے کی محبت انہیں بے چین کیے ہوئے تھے - ایسا خلوص اور ایسی لگن بہت کم لوگوں میں دیکھی گئی - آج ادارہ

اس شخصیت کو کھو کر جتنا بھی رنج کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کم ہے۔

ممتاز شاعر راشد آذر جو مرحومہ کے بھانجے بھی ہوتے ہیں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے۔

سکینہ بیگم کا تعلق ددھیال کی طرف سے ایرانی خاندان سے تھا جس کے افراد سفارتی اور تعلیمی خدمات کے لیے مشہور تھے۔ ان کے دادا مرزا موسیٰ خان نے حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم میں خوش اسلوبی سے فرائض کی انجام دہی کے لیے شہرت حاصل کی۔ ان کے بڑے چچا مرزا مہدی خان کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کا تخلص کوکب تھا۔ ان کے منجھلے چچا مرزا محمد علی خان فوجدار تھے اور اپنی بے باکی، حق گوئی، دیانتداری کے لیے مشہور تھے ان کو شیر جنگ کا خطاب ملا تھا۔

سکینہ بیگم کے والد مرزا کریم خان فوج میں ڈاکٹر تھے اور ان کو نواب یار جنگ کا خطاب دیا گیا تھا وہ بھی فرض شناسی اور ہمدردی کے لیے مشہور تھے۔

ننھیال کی طرف سے سکینہ بیگم کا تعلق بلگرامی خاندان سے تھا۔ ان کے نانا سید حسین بلگرامی عماد الملک بانیانِ علی گڑھ یونیورسٹی میں سے تھے۔

سکینہ بیگم صاحبہ کی والدہ طیبہ بیگم بلگرامی اردو کی ناول نگار تھیں اور تعلیم نسواں پر انھوں نے کئی مضامین بھی لکھے تھے۔ لیڈی حیدری کلب اور محبوبیہ گرلز اسکول کا قیام بھی ان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے مدراس یونیورسٹی سے B.A HONORS کی ڈگری حاصل کی اور وہ بھی اس وقت جب وہ چار بچوں کی ماں تھیں۔'

ایسے علمی اور ادبی ماحول میں سکینہ بیگم صاحبہ کی پرورش ہوئی اور ادب کا ذوق انھیں ورثے میں ملا تو اپنی طبیعت کی نفاست اور ادب پسندی کی بنا پر خود سکینہ بیگم صاحبہ کو ادیبہ بننے میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوئی ـــ اور پھر سید رحمت اللہ قادری سے جب ان کی شادی ہوئی تو اس ذوق کو ترقی دینے میں ان کو کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ کیونکہ شوہر خود ادب دوست شخصیت کے حامل تھے اور رسول جاگیردار کالج میں پروفیسر تھے۔

سکینہ بیگم صاحبہ کے مضامین جب ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی نظر سے گذرے تو زورؔ صاحب کی جوہر شناس نظر نے فوراً جوہری کی طرح ان کی قیمت کا اندازہ لگا لیا۔

'سب رس' کے خواتین کے شعبہ سے انھیں وابستہ ہونے کی دعوت دی۔ سکینہ بیگم صاحبہ برسوں 'سب رس' سے وابستہ رہیں اور بڑی خوش اسلوبی سے اس کام کو انجام دیا۔

انھوں نے ادب اور حیدرآبادی تہذیب و ثقافت پر کئی مضامین لکھے۔ اکثر ان کے گھر پر ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں، جن میں مخدوم محی الدین، اسکندر علی وجد اور نیاز حیدر وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے۔

شاید اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ سکینہ بیگم صاحبہ مضامین کے علاوہ کبھی کبھی شعر بھی کہتی تھیں لیکن کبھی کسی کو اس بات سے واقف نہیں کیا۔ ان کے اشعار کا مجموعہ ان کے مضامین کی طرح اخلاقی ذمہ داری کو اجاگر کرتا تھا۔

سکینہ بیگم کے مضامین 'سب رس' اور 'سیاست' میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں پھر سے جمع کر کے اگر 'سب رس' میں سلسلہ وار شائع کیا جائے تو قارئین کو اندازہ ہو گا کہ ان مضامین میں کیسے نکھرے نکھرے خیالات کو کس شستہ بیان میں انھوں نے پیش کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو اور ماہنامہ 'سب رس' اس طرف توجہ کریں گے۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی وفات کو ان کی ادبی زندگی کی وفات نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ ادیب مر جاتا ہے لیکن ادب قائم رہ جاتا ہے۔

ممتاز ادیب اور شاعر جناب فضل الرحمٰن (سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے اپنی تقریر میں کہا کہ

نواب علی یاور جنگ کی دوستی کے تعلق سے میرے روابط اس خاندان سے تقریباً نصف صدی سے رہے ہیں اور مجھے اس خاندان کے ہم عصر ارکین کی سرگرمیوں کو دیکھنے کا کافی موقع ملا ہے۔

آج مجھے وہ دن یاد ہے جب سکینہ بیگم کی شادی کے موقعہ پر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے ایک طویل تہنیتی نظم سنائی تھی اور وہ اس محفل میں پڑھی گئی تھی جو شادی کے سلسلے میں جمع تھی۔[1]

اس کے بعد سے ان کی مصروفیتوں کا مجھے اندازہ رہا۔ ان کی علمی سرگرمیوں کے علاوہ

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ ص ۹۲

اور ان کی ادبی مصروفیتوں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر ہوا ہے، میں ان کی رفاہی کاموں سے بھی واقف ہوں۔ وہ اس خاموشی کے ساتھ رفاہی خدمات انجام دیتی تھیں کہ سوائے ان کے دوستوں کے بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ وہ کس حد تک غریب لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنا وقت دیتی تھیں۔ وہ ایک اسکول چلاتی تھیں جس کے بارے میں اگر کہیں ذکر بھی آتا تھا وہ اپنا نام شائع نہیں ہونے دیتیں۔ اس کے علاوہ نجی طور پر غربا کی امداد اور ہر طرح ان کے مسائل کو حل کرنے میں وہ اسی خاموشی کے ساتھ کوشش کیا کرتی تھیں کہ جس سے ان کے خلوص کا پتہ چلتا تھا۔ عام طور پر یہ رفاہی کام کرنے والے بہت زیادہ پبلسٹی کے عادی ہوتے ہیں اور عموماً سیاست سے ان کا تعلق ہو جاتا ہے یا پبلک زندگی ہی کے تعلق سے وہ بہت زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں۔ سکینہ بیگم صاحبہ ان خواتین میں سے تھیں جو حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتی تھیں کہ ان رفاہی کاموں کے سلسلے میں جو کچھ ان کی سرگرمیاں ہیں اس سے کوئی پبلسٹی کے طور پر پبلک کے سامنے نہ آنے پائے۔ ان کی زندگی میں اسی خلوص کے علاوہ نجی طور پر بھی اپنے دوستوں، اپنے عزیزوں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جس محبت اور خلوص کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا، وہ یقیناً بہت قابل قدر ہے۔ مرحومہ جس محبت سے اپنے دوستوں سے ملا کرتی تھیں اور ان کی تعریف کرتیں وہ ایسی خاص صفت ہے جو حیدرآباد کی تہذیب ہی میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

میں نے ان کو کبھی کسی کے بارے میں کوئی ایسی بات کہتے نہیں سنا کہ جس سے ان کی کسی قسم کی برائی ہوتی ہو۔ وہ ہمیشہ ہر ایک کے بارے میں کلمۂ خیر ہی ادا کرتیں۔ جو خود ان کی شرافت اور صداقت کی دلیل ہے۔

ان کو خاموش زندگی بسر کرنے کی اتنی عادت تھی کہ ابھی حال کا ذکر ہے کہ میرے دوست ہاشم امیر علی کے ہاتھ ان کا ایک شعری انتخاب ملا اور انھوں نے کہا کہ اسے کسی طرح شائع کیا جائے کئی مہینوں تک موصوف نے کوشش کی لیکن مرحومہ اس کے لیے راضی نہیں ہوئیں کہ یہ شعری انتخاب جو انھوں نے (۲۵) سال کے مطالعہ کے بعد کیا تھا [illegible] کے نام سے شائع کیا جائے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاموش کام کرنے کا جذبہ ان میں کس حد تک سرایت کر گیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اپنی قابل والدہ طیبہ بیگم بلگرامی کے نقش پر چلتی رہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کی لائق صاحبزادی جو اب تک بھی ان کے نقش قدم پر چلتی رہی ہیں۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں اور دیگر رفاہی کاموں میں وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں گی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے خاندان کے اور اراکین بھی جن کی شہرت تمام ہندوستان میں ہے اور باہر بھی ___ معصومہ بیگم صاحبہ کی بھی سیاسی اور رفاہی سرگرمیوں کے تعلق سے بہت شہرت ہے۔ یہ ان کے تمام اہل خاندان کا جو TRADITION رہا ہے وہ تین پیڑھیوں سے چلا آرہا ہے اور اب مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی اس خاندان کے اراکین اور خاص طور پر ان کی صاحبزادی اور صاحبزادے اسے قائم رکھیں گے۔

جناب ہاشم علی اور ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ جناب وقار خلیل نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ نے سکینہ بیگم کے بارے میں نیے شخصی تاثرات کو مضمون کی صورت میں پیش کیا[1]۔ آخر میں صدر جلسہ جناب محمد علی عباسی صاحب نے مرحومہ کی علمی ادبی اور سماجی خدمات کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے قرار دادِ تعزیت پیش کی۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا یہ جلسہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج و الم کا اظہار کرتا ہے۔ محترمہ سکینہ بیگم، نواب عماد الملک کی نواسی اور نواب خدیو جنگ کی صاحبزادی تھیں، علمی اور دینی و ملّی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی۔ ان کی والدہ محترمہ طیبہ بیگم بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ "رسائل طیبہ" ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے چھپ چکا ہے، جسے سکینہ بیگم صاحبہ نے مرتب کیا تھا۔ محترمہ ادارے کے شعبۂ خواتین کی معتمد اور مجلس ادارت سب رس کی رکن تھیں، ادارہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں سکینہ بیگم صاحبہ نے نمایاں خدمات انجام دیں، وہ اپنے طرز اور اسلوب کی نثر نگار و شاعرہ بھی تھیں۔ حیدرآباد کی خواتین میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے میں مرحومہ کی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ تربیت اطفال اور ریاستی گرل گائیڈ کی کمشنر بھی تھیں۔

یہ جلسہ محترمہ سکینہ بیگم کی وفات کو حیدرآبادی ادب اور تہذیب کا المناک سانحہ قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحومہ کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

---

[1] جناب وقار خلیل کی نظم، ڈاکٹر اکبر علی بیگ اور ڈاکٹر اختر سلطانہ کے مضامین شریک اشاعت ہیں۔

# تعزیتی قراردادیں

صدر مجلس خواتین، حیدرآباد کے تمام اراکین اپنے عزیز و محبوب ساتھی محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی دائمی جدائی پر بے حد دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحومہ اس کمیٹی کے خازن کے فرائض تقریباً چالیس سال سے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہی ہیں۔ وہ ایک فعال اور مخلص ممبر تھیں۔ اپنی اصول پسندی، مدبرانہ اور مفید مشوروں کی وجہ سے نمایاں حیثیت کی حامل رہی ہیں۔ ان کے انتقال کی وجہ سے جو نقصان اس کمیٹی کو ہوا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔

دعا ہے اللہ تبارک تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور اہل خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

صدر و اراکین
صدر مجلس خواتین ــــــ

۱۸- اپریل ۱۹۸۶ء

---

ہم جمیع اسٹاف و طالبات گرلز ہائی اسکول معظم جاہی مارکٹ کو سکینہ بیگم صاحبہ مرحومہ کی رحلت پر بہت صدمہ ہوا۔ ہم متعلقین اور اعزہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ مرحومہ نے مدرسہ کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی رحلت نے ہمیں ایک ہمدرد، بہی خواہ اور مخلص ساتھی اور ایک بہترین سرپرست سے محروم کردیا۔ ان کی وفات سے مدرسہ بلکہ پوری قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ آپ طالبات واسٹاف کی ہر چھوٹی بڑی علمی ضرورتوں کا خاص خیال رکھا کرتی تھیں اور آپ کی سعی و کوشش نے مدرسہ کو نیا رنگ روپ دیا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ بقول علامہ اقبال:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ فردوس بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین ثم آمین

کو صبر جمیل عنایت فرمائے (آمین)

۱۵- اپریل ۱۹۸۶ء اسٹاف و طالبات مدرسہ

صدر مدرسہ، اسٹاف اور طالبات گرلز پرائمری اسکول انجمن خواتین حیدرآباد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے انتقال پر ملال پر گہرے رنج و صدمہ کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحومہ کی گراں قدر خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ہم سب پسماندگان کے رنج و غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اور اللہ بزرگ و برتر سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے فضل و کرم سے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اساتذہ و طالبات مدرسہ

## قطعۂ تاریخ رحلت حضرت سکینہ بیگم مرحومہ

جوارِ رحمت میں مل گیا ہے مقام ان کو
صدا یہی آرہی ہے پیہم جناں سے
ہوا برآمد یہ سالِ رحلت، حبیب لکھ دو
خجستہ طالع سکینہ بیگم اٹھیں جہاں سے

۱ ۹ ۸ ۶ عیسوی

## قطعہ

سکینہ تھیں پابند صوم و صلوٰۃ ملی ہے انہیں آج راہ نجات
گئی ہے کے دنیا سے اعمال نیک جو تھیں خوش سیر خوش نظر خوش صفات

مرزا حبیب علی حبیب

# دو تعزیت نامے

——————— مالک رام

——————— پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

عزیزہ طیبہ بیگم سلمک اللہ تعالیٰ

آداب،

آج حیدرآباد سے آمدہ اخبارات سے آپ کی والدۂ ماجدہ کے انتقال کی خبر ملی۔ انا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون۔

میں "ابر نیساں" میں ان سے متعلق مضمون پڑھ چکا ہوں۔ ایسی شفیق و محبت کرنے والی کی دائمی جدائی کیوں شاق نہ گزرے گی! لیکن موت برات آدم ہے۔ کون ہمیشہ یہ جیا ہے جو وہ جیتیں ان کی زندگی معیار ماہ و سال نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں کسی کو ودیعت کی ہیں اور جتنی حیات مستعار اسے عطا کی گئی ہے، اُس نے اس وقفے میں ان صلاحیتوں سے کیا فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو ان سے کیا فائدہ پہنچایا۔ اس معیار سے دیکھیے اور مرحومہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اپنی علمی و فنی اور اخلاقی و روحانی صلاحیتوں کو ملک اور قوم اور بنی نوعِ انسان کی بہتری اور ترقی کے۔ صرف کیا۔ کیا ایسی ہستی کبھی مر سکتی ہے! یہ مرحلہ تو سب کا مقدر ہے۔ آپ کو ان کی جدائی کا غم ہونا ہی چاہیے اور اس میں آپ کے سب اعزہ و اقارب اور دوست احباب آپ کے شریک ہیں۔ لیکن سچ ملنیے ان کی زندگی قابلِ رشک اور لائقِ تقلید ہے۔ وہ اپنے خالق کے سامنے سرخرو حاضر ہو گئیں کہ اے میرے پیدا کرنے والے تو نے علم و فن کی جو نعمتیں مجھے عطا کی تھیں وہ میں تیرے بندوں میں تقسیم کر کے پھر تیری خدمت میں آ گئی۔

ایسی بابرکت ہستی کی موت کا غم کیا! اور اس کا ماتم کیا اور کیوں!

اللہ تعالیٰ آپ کا ہر حال میں حامی و ناصر رہے - آمین - والسّلام والاکرام -

خاکسار

مالک رام

---

۸-اپریل ۱۹۸۶ء

میری غمزدہ بہن طلیبہ

آج "سیاست" ملا تو یہ اندوہناک خبر پڑھی کہ میری چاہنے والی ہستی اس جہانِ فانی سے رحلت
ا -کیا بتاؤں مجھ پر کیا گزر گئی - گزشتہ ۴۰، ۴۵ برسوں کی یادیں سینما کے فلم کی طرح دل و دماغ کے پردے
ا - یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے ان کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا تھا ورنہ عمر بھر افسوس رہتا - اس بری خبر کو
میرے دل کو کھٹکا لگا ہوا تھا - میں ان کی صحت کے لیے دعا کرتا رہتا تھا - میں کیا بتاؤں کہ وہ مجھے کتنا
تھیں - میرے خیر مقدمی جلسے کے لیے کتنا محبت بھرا پیام بھیجا تھا - تمھارے گھر کے خیر مقدمی جلسے میں
ت کے باوجود تشریف لائی تھیں اور مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں - اللہ پاک مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت
ہ عطا فرمائے اور تم کو صبرِ جمیل کی توفیق ارزانی کرے - آمین ثم آمین -

جانے والے کبھی نہیں آتے ؛ جانے والوں کی یاد آتی ہے

نی بیماری سے نجات پا گئیں اور جنّت کو سدھاریں - اب مجھے رہ رہ کے تمھارا خیال آتا ہے - تم پر رنج و غم
ڑ ٹوٹ پڑا - اب تم تنہا رہ گئیں لیکن تم باہمت اور باوقار خاتون ہو - اس سانحے کو برداشت کر لو - تم ہرگز
ن اور غم زدہ نہ رہو - اس سے مرحومہ کی روح کو تکلیف ہوگی - مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ - اللہ بس باقی ہوس -

- امجدؔ نے خستہ دلوں کو اس طرح سکون اور تسلّی کا سامان فراہم کیا ہے وہ فرماتے ہیں -

اسباب و علل کا دور کرتے رہیے ؛ اپنی فطرت پہ جور کرتے رہیے
جو کچھ ہوتا تھا ہو چکا رک نہ سکا ؛ اب کیوں ہوا اس پہ غور کرتے رہیے

---

ہم کو کہیں جانا نہ کہیں آنا ہے ؛ ہر حال میں حکم اس کا بجا لانا ہے
یہ کیا وہ کیوں ... غرض ہم کو ؛ بندے کو تو حکم کے ساتھ ہو جانا ہے

... بیگم ایسے لوگ ... کہ جن سانچوں میں یہ لوگ ڈھلے وہ سانچے کب کے ٹوٹ گئے - سوگوار

وقار خلیل

# آنچل سے پرچم تک

(سکینہ بیگم کی یاد میں)

وہ ایسے گھر کی بیٹی تھی
جہاں علم و ادب، دین و سیاست سب کو ازبر تھی
جہاں تہذیب اور تاریخ کا ہر باب روشن تھا
جہاں لکھے ہوؤں کی جستجو کا شوق افزوں تھا

وہ بیٹی گھر کے آنگن سے دبستانِ ہنر تک
زینہ زینہ، عبارت روشنی کی جذب کرتی
کبھی خنداں، کبھی گریاں
ورق اندر ورق، کتنے رسائل، کتنی تحریریں
قلم، ظلمت میں صبحوں کے قبالے
صفحۂ قرطاس پر چھوڑا گیا ایسا
دکن کی ان گنت بہنوں نے پڑھ کر
زندگی کرتے، سنبھلنے اور تابندہ بنے رہنے کا جیسے حوصلہ پایا
اسے دیکھا ہے اور اس کو پڑھا ہے، گفتگو کی ہے
اسے جب سوچتا ہوں اک کمی محسوس ہوتی ہے
وہ اجلی شخصیت
لہجے کی ٹھنڈک اور شرافت کی جھلک جیسے
صنوبر، شاخِ گل، آنچل سے پرچم تک
گھر آنگن سے دکن تک

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

# محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ

بلگرام ایک مردم خیز خطّہ ہے۔ یہاں کی سرزمین سے سید حسین بلگرامی (نواب عماد الدولہ، عماد الملک سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل ایل ڈی) اور ڈاکٹر سید علی بلگرامی جیسے مایہ ناز سپوت پیدا ہوئے۔ نواب عماد الملک اور ان کے بھائی سید علی بلگرامی اپنی خاندانی شرافت، ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے باعث تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ دونوں کی علمی اور عملی سرگرمیاں ہندوستان سے باہر یورپ میں بھی خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ دونوں بزرگوں کے خاندان، حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں اپنی روشن خیالی، تدبّر و فراست کے ساتھ علم و عمل کے میدان میں اب تک سرگرم عمل ہیں اور اپنی خاندانی روایات پر قائم ہیں۔

عماد الملک کو ایک لڑکی اور تین لڑکے تھے۔ تینوں فرزند اپنی خاندانی روایت کے مطابق علم و ادب کے شیدائی رہے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ عابد نواز جنگ، عقیل جنگ اور مہدی یار جنگ یہ تینوں ہونہار صاحبزادے تھے۔ عماد الملک کی صاحبزادی کا نام طیبہ بیگم بلگرامی صاحبہ ڈاکٹر خدیو جنگ نائب ناظم صحت عامہ ریاست حیدرآباد سے بیاہی گئیں وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے مدارس یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اردو کی ممتاز ادیبہ اور ناول نگار تھیں، محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ، طیبہ بیگم صاحبہ بلگرامی کی دختر نیک اختر ہیں۔

ڈاکٹر کریم خاں (نواب خدیو جنگ بہادر) حیدرآباد دکن کے ایک تعلیم یافتہ اور ممتاز ایرانی النسل خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد مرزا موسیٰ خاں حکومت حیدرآباد میں ناظم تعلیمات کے عہدہ پر فائز تھے۔ نواب خدیو جنگ بہادر نے نہ صرف اپنی بیوی

طیبہ بیگم بلگرامی کی علمی اور سماجی خدمات کو جاری رکھنے میں مدد دی بلکہ اپنی تینوں لڑکیوں محترمہ معصومہ بیگم (سابق وزیر حکومت آندھرا پردیش) زوجہ پروفیسر حسین علی خاں مرحوم (ممتاز شاعر راشد آذر کے والد محترم) سکینہ بیگم (اہلیہ سید رحمت اللہ مرحوم) سیدہ بیگم (زوجہ ڈاکٹر سید حسین ظہیر مرحوم سابق ڈائرکٹر جنرل ریسرچ لیباریٹریز نئی دہلی) اور صاحبزادے نواب علی یاور جنگ مرحوم (سابق گورنر مہاراشٹرا) کی نہایت شائستہ اور صحت مند طریقہ سے پرداخت کی۔

محترمہ سکینہ بیگم ۱۷ / نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ نواب علی یاور جنگ بہادر مرحوم ان سے صرف تین سال چھوٹے تھے۔ سکینہ بیگم صاحبہ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی۔ پھر انھیں محبوبیہ گرلز ہائی اسکول میں شریک کروایا گیا جہاں سے انھوں نے سینیر کیمبرج کا امتحان اعزاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اس زمانہ میں مسز وائٹلٹ محبوبیہ گرلز ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ سکینہ بیگم صاحبہ سے سینیر ان کی بڑی بہن محترمہ معصومہ بیگم اور بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کی دوسری صاحبزادی لیلامنی نائیڈو، سلطانہ بیگم (نواب ذوالقدر جنگ کی دختر) ڈاکٹر نندی انسپکٹر جنرل رجسٹریشن اینڈ اسٹامپ کی لڑکیاں میری نندی پرنسپل محبوبیہ جونیر کالج) اور جیسی نندی (ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ) آپ کی ہم جماعت تھیں۔ بیگم ڈاکٹر محی الدین قادری بھی اس اسکول میں زیر تعلیم تھیں اور آپ سے کافی جونیر تھیں۔ محبوبیہ اسکول میں انھوں نے تعلیم کے علاوہ زائد نصاب سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ وہ اپنے اسکول کی ممتاز "ہیڈ گرل" رہ چکی تھیں۔

سینیر کیمبرج کامیاب کرنے کے بعد ایف اے کے لیے وہ تیاری کر رہی تھیں کہ بیمار پڑ گئیں۔ اس بیماری میں آنکھیں متاثر ہوگئیں جس کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ۱۶ / مئی ۱۹۲۹ء کو سکینہ بیگم کی شادی سید رحمت اللہ صاحب (مرحوم) سے ہوئی۔ سید رحمت اللہ صاحب سید احمد صاحب، صدر محاسب کے صاحبزادے تھے۔ وہ محکمۂ تعلیمات اور سکریٹریٹ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے بعد میں ناظم رجسٹریشن کے جلیل القدر عہدے پر فائز رہ کر وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

محترمہ سکینہ بیگم کے تین صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے ہیں۔ ارجمند بانو بیگم

ـطیبہ بیگم توام بہنیں ہیں۔ ارجمند بانو بیگم بنگلور میں مقیم ہیں۔ طیبہ بیگم
ـد کی ممتاز ادیبہ ہیں۔ تیسری صاحبزادی زہرا بیگم واشنگٹن، امریکہ میں
ونت پذیر ہیں وہ ایک اچھی آرٹسٹ ہیں۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سید
رالدین حسین نے عثمانیہ یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ طبیعیات میں ایم ایس
لیا تھا۔ بعد میں انھوں نے امریکہ جاکر "نیوکلیر فزکس" میں ڈاکٹریٹ کا ساس
نت وہ "دائرین اسوسی ایٹ انجینئرنگ" میں بہ حیثیت سائنس داں کارگذار
ے۔ دوسرے صاحبزادے مسعود رحمت اللہ کنسٹرکشن کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔

سکینہ بیگم صاحبہ کو شعر و سخن کا ذوق ورثے میں ملا ہے۔ سماجی خدمات سے
ـبی ان کے خاندان کی روایت رہی ہے۔ سکینہ بیگم صاحبہ بھی مختلف سماجی اور تہذیبی
ـاروں سے وابستہ رہیں۔ تربیت اطفال اور گرل گائنڈ میں سکینہ بیگم صاحبہ نے
یاں حصہ لیا وہ ایک عرصہ تک گرل گائیڈ کی کمشنر رہ چکی ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو
جب ایک "شعبۂ نسواں" قائم کیا تو سکینہ بیگم کو اس شعبہ کا معتمد بنایا گیا۔ سکینہ بیگم صا
ماموں مہدی یار جنگ مرحوم اس ادارے کے صدر تھے۔ شعبۂ نسواں کی معتمدی کے
وہ ادارے کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کی مجلسِ انتظامی کی رکن اور مطبوعات
ـے شعبہ کی مشیر بھی رہیں۔ اس زمانے میں اردو کی ممتاز شاعرہ محترمہ بشیر النساء بشیر مرحوم
ـعبۂ نسواں کی شریک معتمد تھیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کی فرمائش پر آپ نے
ـکتاب "تذکرۂ دکن" مرتب کی، جس میں خواتینِ دکن کے مضامین تھے۔ اس کے علاوہ
سکینہ بیگم صاحبہ نے اپنی والدہ طیبہ بیگم بلگرامی کے مضامین اور تقاریر کو یکجا کر کے "رسالۂ
ـیبہ" کے نام سے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا جس کا پیش لفظ بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو نے لکھا۔
ـینہ بیگم صاحبہ نے بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھی تھیں ان کا مجموعہ ان کی صاحبزادی طیبہ بیگم نے "جوہی کی ڈالی" کے
ـم سے مرتب کر کے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا۔ "جوہی کی ڈالی" بچوں کے ادب میں ایک
ـضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سکینہ بیگم صاحبہ شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ ممتاز شاعر
ـر ادیب نظم طباطبائی (نواب حیدر یار جنگ بہادر مرحوم) سے انھیں شرفِ تلمذ حاصل
ـہا۔ نظم طباطبائی ان کی والدہ کو عربی پڑھایا کرتے تھے۔

سکینہ بیگم صاحبہ نے اپنے نانا نواب عمادالملک کی مدح میں ایک نظم لکھی تھی۔ اس کے چار شعر بطور نمونہ پیش ہیں۔

عالم ہو تم شفیق ہو تم نکتہ داں ہو تم — فاضل ہو تم ادیب ہو تم خوش بیاں ہو تم
فخرِ دکن ہو باعثِ فخرِ جہاں ہو تم — عادل ہو تم لطیف ہو تم مہرباں ہو تم
استادِ شاہ و ملک دکن ہو فہیم ہو — عاقل ہو تم فقیہ و ادیبِ زماں ہو تم
تم سا ہوا نہ کوئی نہ ہوگا جہاں میں — قابل ہو تم عزیز ہو تم قدرداں ہو تم

ممتاز شاعرہ بشیر النساء بیگم بشیرؔ مرحومہ سکینہ بیگم کی گہری دوست تھیں۔ وہ ۱۹۸۷ء میں علیل ہو گئیں۔ سکینہ بیگم صاحبہ بھی ان ہی دنوں بیمار ہو گئیں۔ تقریباً ایک سال تک دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی۔ بشیر صاحبہ اپنی علالت کا ذکر اور مزاج پرسی کے لیے سکینہ بیگم صاحبہ کے تشریف نہ لانے کا شکوہ (۱۴) اشعار کی ایک نظم میں کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

میری بہن سکینہ! اے ہمدم یگانہ — اس درجہ بے رخی پہ حیران ہے زمانہ
حیراں ہوں کہ آخر تو آجکل کہاں ہے — حالانکہ میری حالت ناقابلِ بیاں ہے
بستر پہ بیکسی کے بے بس گذر رہی ہے — اس زندگی پہ دنیا افسوس کر رہی ہے
مانندِ نعش میرے دن رات جیسے گذرے — بارہ مہینے مجھ پر سکرات جیسے گذرے

اس نظم کا آخری شعر یہ ہے : بالیں پہ موت کب سے ہے بے قرار اب تک
شاید کہ آپ ہی کا ہے انتظار اب تک

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی مضمون نگاری کا سلسلہ آخر دم تک جاری رہا۔ روزنامہ "سیاست" کے ادبی ایڈیشن میں ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے۔ سکینہ بیگم صاحبہ کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ تاریخ اور تمدن کے موضوعات سے خاص دلچسپی رکھتی تھیں۔ آخری زمانے میں بھی وہ اپنی علالت کے باوجود اپنا کافی وقت مطالعہ میں صرف کرتی تھیں۔

ڈاکٹر اختر سلطانہ

# محترمہ سکینہ بیگم

۳۰ مارچ ۱۹۸۶ء کی شام جب میں گھر لوٹی تو اطلاع ملی کہ آنٹی (محترمہ سیدہ سکینہ بیگم)
یں انھیں آنٹی ہی کہا کرتی تھی' اس دارِ فانی کو چھوڑ کر ابد کے لمبے سفر پر روانہ ہو چکیں۔

وہ گھر (کوہ نور) جہاں میں نے انھیں ہمیشہ کسی نہ کسی سے ملتے' کچھ نہ کچھ کہتے' کبھی
تے' کبھی کچھ پڑھتے یا پھر آہستہ آہستہ محوِ خرام دیکھا تھا۔ اسی گھر کے اندر ان کے جسدِ خاکی
بدی نیند سوتے پایا۔ ان کے انتقال سے کچھ دن قبل طیبہ (ان کی صاحبزادی) نے مجھے
تھا کہ ان کی طبیعت قدرے بہتر ہے لیکن وہ زیادہ تر سوئی رہنا چاہتی ہیں اور جب
یں بیدار کیا جاتا ہے تو وہ اصرار کرتی ہیں کہ "مجھے سونے دو"۔ کیا آنٹی واقعی اپنی زندگی
تنہا راہ روی اور سفر سے اس قدر تھک چکی تھیں کہ ہمیشہ کے لیے خوابیدہ رہنے پر
ر ہو گئیں؟

آنٹی جن کے لب ہمیشہ خوش شگفتہ غنچوں کی مانند کھلے رہتے تھے جو ہمیشہ بلبل
رح چہکتی رہتی تھیں جن کی ذات انجمن کے لیے بنی تھی لیکن وہ خود بڑی حد تک خلوت پسند
یں۔

ان کے گھر کے چمن میں یہ کیسی محفل آراستہ تھی جہاں کے حاضرین کے چہروں پر
د و حسرت کے سائے لرزاں تھے یقیناً وہ سب اس بلبلِ خوش نوا کے لیے سوگوار تھے
نے ہمیشہ کے لیے چُپ سادھ لی تھی۔

نہ جانے کیوں یہ ماننے کے لیے طبیعت مائل نہیں ہو رہی ہے کہ ناتواں جسم میں
کتا ہوا بہت ہی نرم و نازک لیکن وسیع و کشادہ دل جس میں نہ معلوم کتنے درد و غم کے

اور دوسروں کے جذب ہو چکے تھے۔ اس کی دھڑکن اب کبھی سنائی نہ دے گی اور ان کی محبت اور پیار کا وہ گرم جوشانہ و حرارت بخش لمس جو ان کی قربت سے میسر ہوتا تھا اب مرگ بستہ ہو چکا ہے۔ نہ ہی یہ یقین آرہا ہے کہ بے داغ سپید لباس میں لپٹا ہوا ان کا وہ دھان پان سا وجود اب صحن چمن میں ان شگوفوں کو دیکھنے کے لیے کبھی نہیں نکلے گا جو سال میں صرف ایک مرتبہ مسکراتے ہیں۔

ایک مرتبہ طیبہ گوا گئی ہوئی تھیں اور جاتے ہوئے مجھ سے کہتی گئی تھیں کہ "ذرا امی کا خیال رکھنا"۔ ایک دن جب کہ میں اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑی تھی وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سڑک کی جانب والی روش پر بڑھتی نظر آئیں۔ وہ بہت کم باہر نکلتی تھیں۔ میں نے سمجھا شاید انھیں کسی چیز کی ضرورت ہے اور بڑھ کر پوچھا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ مالی نے ان سے کہا ہے کہ ایک غنچہ کھلا ہے جو سال میں صرف ایک مرتبہ کھلتا ہے اور وہ اسے دیکھنے نکلی ہیں۔ مجھے بھی انھوں نے اس شگوفے کو دیکھنے کے لیے مدعو کیا، جو ایک بڑے سے پتھر کے قریب ذرا سی مٹی میں نرم و نازک سے ڈنٹھل پر تنہا کھلا ہنس رہا تھا۔ یہ ORCHID تھا۔ تب میں نے جانا کہ وہ کس طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں سے مسرتیں اخذ کرتی تھیں۔ یہ بھی ان کی زندگی کا ایک رُخ تھا۔

کچھ دن قبل ہی جب میں ان کی مزاج پرسی کے لیے گئی تھی تو طیبہ نے یہ کہا تھا کہ زندگی ان کے قدموں سے جڑی بھی رہی اور گریزاں بھی، وہ تقریباً ایک مہینہ موت اور زیست کی کشمکش سے دوچار رہیں۔ ان کے بچے ان کے لیے امریکہ سے ملنے آئے تھے لیکن وہ انھیں پہچاننے سے قاصر رہی تھیں لیکن اس وقت بہتر تھیں اور حسبِ معمول باتیں کرتے کرتے وہ کچھ پرانی یادوں میں کھو گئیں۔ کمزوری اور علالت نے ان کی ذہنی حالت کو متاثر کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بیک وقت ماضی اور حال دونوں میں محوِ سفر ہیں۔ ان کی پارینہ زندگی کی یادوں نے بکھرے ہوئے نقوش جو وقت کی بے درد مسیحائی کے تلے دب چکے تھے۔ کچھ شکستہ، کچھ زخم خوردہ، کچھ خوشحالی کے مظہر، ان کے ذہن کے پردوں اور لبوں پر اُبھر اور ڈوب رہے تھے۔

پھر میں ان سے "قلم اور آواز" کے اس جلسے میں ملی جس میں حمیدالدین شاہد صاحب

راعجاز حسین صاحب کھنا مدعو تھے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ تب میں نے انھیں
کمل صحت مند پایا۔ اس وقت اس کشمکش ذہنی اور علالت کے کوئی آثار ان میں موجود نہیں
تھے۔ جن سے وہ گزر آئی تھیں۔ وہ اسی مشفق اور مہربان پیکر کی صورت میں میرے
منے موجود تھیں جیسا کہ میں نے انھیں ہمیشہ پایا تھا۔ شاید یہ موت سے قبل کا سنبھالا
جسے میں نے صحت مندی جانا۔

۱۹۰۳ء سے ۱۹۸۶ء تک ان کی زندگی کا طویل سفر یقیناً ان گنت رازوں کا امین ہوگا
انھیں یہ کبھی گوارا نہ ہوا کہ اس امانت کا بار دوسروں پر ڈال کر انھیں سوگوار کریں۔

تکالیف و عوارض ان کے جسم میں اپنا گھر کر چکے تھے لیکن کبھی میں نے انھیں یہ کہتے
سنا کہ انھیں کچھ تکلیف ہے یا یہ کہ وہ بیمار ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ موسم کی پہلی
نے والی اس چنبیلی کی نرم و نازک کلی کا خیال آتا تھا جو اپنی دھیمی دھیمی مہک سے اپنے
رف کی فضا کو معطر کرتی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی تھیں۔

ضعیفی انسان کو مایوسیوں کے دہانے پر لا کھڑا کرتی ہے اور ایسی شخصیتوں میں
ہاں آنے والی شے کا احساس کچھ افزوں تر ہی ہوتا ہے لیکن میں نے ان کی شخصیت پر
تاریک بادل کے سایوں کو کبھی منڈلاتے نہیں پایا۔ یہ کیسا اطمینان قلب تھا؟ یہ کیسا سکون
؟ یہ کیسی لازوال کیفیت تھی۔ جس کے نشے نے انھیں سرشار، مطمئن اور پرسکون
رکھا تھا۔ کیا وہ اس ان دیکھی تاریک دنیا میں داخل ہونے کے لیے قبل ازیں ہی اپنے
پ کو تیار کر چکی تھیں۔

پہلے پہل جنوری ۱۹۸۳ء میں جب میں ان کے گھر گئی تھی تو وہ اس طرح ملی تھیں جیسے
مجھے برسوں سے جانتی ہوں۔ ان کا وہ دلکش، ہشاش بشاش چہرہ جو ایک دلنواز تبسم سے آراستہ
جسے ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔

نفاست، شرافت اور شائستگی ان صفات کی وہ مجسم تصویر تھیں۔ حاشیئے علمی،
روایتوں کی علمبردار، جدید قدروں سے آشنا اور ان کی ہمنوا بھی۔ شفقت اور خلوص
یسے ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کا وہ محبت آمیز رویہ اور بزرگانہ شفقت جس کے
تے اجنبیوں کے لیے بھی اسی طرح پھوٹتے تھے جیسے کہ اپنوں کے لیے یہ چیز میں
ہی ہستیوں میں موجود پائی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک عمر میں کئی عمریں گزار چکی ہیں

حیدرآباد کے ایک معزز خاندان میں انھیں ولادت کا شرف حاصل رہا۔ آباو اجداد بلحاظ علم و عمل شہرت اور امتیاز کے حامل رہے۔

افسانہ نویس وہ تھیں۔ انشا پرداز وہ۔ شاعرہ اور مصور بھی۔ مغربی اور مشرقی موسیقی میں بھی دست رس رکھتی تھیں۔ یہی نہیں تعلیم کے ساتھ ہر میدان میں اعزازات اور انعامات حاصل کر چکی تھیں۔ اگر کوئی ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو علمی اور سماجی کارناموں کی ایک طویل فہرست ان سے وابستہ ملے گی۔ چند ایک جو میرے علم میں ہیں وہ اس طرح ہیں۔

وکٹوریہ میموریل آرفینج کی خواتین کی مشاورتی کمیٹی کی ممبر، فروخت گاہ مصنوعات ملکی کی پریذیڈنٹ۔ شہزادی درِ شہوار کی فوڈ ریلیف اور شہزادی صاحبہ کی کمیٹی کی رکن۔ مدرسۂ عربیہ کی خازن اور خواتین ملازمین کے مدرسہ کی بانی جہاں وہ خود دستکاری اور کشیدہ کاری کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی معتمد اور "سب رس" کی مجلس ادارت کی رکن بھی تھیں۔ بلاشبہ وہ اپنی ہم عمر خواتین میں ہر حیثیت سے بلند قامت تھیں۔

انھیں دیکھ کر ان سے مل کر نہ معلوم مجھے یہ کیوں محسوس ہوا تھا کہ وہ اس قدیم ہندوستانی تہذیب کی باقیات الصالحات میں سے ہیں جو ہزاروں سال کی پارینہ ہونے کے باوجود بھی تابندہ اور دلکش ہے۔

ان کی شخصیت ایک ایسے گھنے سایہ دار درخت کی سی تھی جس کی چھاؤں میں کوئی بھی سستا سکتا تھا لیکن اس کے سائے سے ان کے اپنے گلشن کے پھول اور کلیاں بھی محروم ہو گئیں۔ ان کا جسم ضرور نظروں سے اوجھل ہے لیکن ان کی یادیں اور روح ۔۔۔ روح اگر باقی رہتی ہے تو ان کی تابناک روح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

---

طیبہ بیگم

# مادرِ مرحومہ

( چند یادیں ——— چند تاثرات )

"زندگی چند سانسوں کی کہانی ہے۔!"

جذبوں کے سمندر میں کبھی لہریں بڑھ بڑھ کر اُٹھتی گرتی اور ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں اور ساحل پر آتے آتے سنبھل کر مچل جاتی ہیں۔ ٹوٹنے لگتی ہیں۔ پھر سے سمندر میں ملنے کے لیے۔ یہی سمندر آج میرے ساحل پر ٹھیرا ہے۔ کبھی چپ چاپ، کبھی تڑپتا سینہ پیٹتے ہوئے، میری گم گشتہ آرزوؤں کا یہ سمندر جو کبھی مجھے لے ڈوبتا ہے۔ کبھی تھپیڑوں کے ساتھ ریت پر نڈھال سا پھینک جاتا ہے۔

ضبط کی حدوں سے کوئی جذبہ دبے پاؤں میرے پاس سے گزر جاتا ہے۔ میں بلک رہی ہوں ماضی کے دھندلکوں میں میری زندگی تپتے ہوئے صحرا کی جھلستی ہوئی ریت میں جیسے سمٹ آئی ہے۔ ہر لمحہ ایک خواب سا محسوس ہوتا ہے۔ ہر گھڑی میری تنہائی کو اور بھی درد انگیز اور ہر پل میرے احساس میں آگ لگا جاتی ہے۔

ماں کیا گئیں میری زندگی کی سانسیں بکھر گئیں۔ بے رنگ و بو فضائیں ہیں، احساسات سہمے سہمے سے ان نازک سلگتے احساسات کو کون سمجھے گا۔ کون سنے گا، کس سے کہوں اور کیا کہوں؟ ہوائیں چلتی ہیں تو لگتا ہے چیخ رہی ہیں۔ میری طرف بارش کے قطرے میری کھڑکیوں پہ بوندیں بن کر پھسلتے ہیں تو لگتا ہے جیسے میرے آنکھوں کی شبنم شیشوں پر سج رہی ہے!

اندھیری تنہا راتوں میں جب ماں میرے خوابوں میں چپکے سے چلی آتی ہیں تو ان کا دامن پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیتی ہوں۔ اب نہ جاؤ ماں۔ جانا ہی ہو تو وعدہ کرو کہ یوں ہی آتی رہوگی۔ تمہارے بغیر میں بے حال ہوں۔ زندگی جیسے ایک نقطے پر آکر ٹھہر سی گئی ہے۔ کوئی منزل نظر نہیں آتی، کہاں جاؤں۔ کدھر جاؤں۔ کیا کروں؟ دل و دماغ، قلم اور آواز سب جیسے تھم گئے ہیں۔ سوچنے کی صلاحیت بھی سلب ہو گئی ہے۔

ماں بغیر میں کتنی ادھوری محسوس کرنے لگی ہوں۔ کون مجھ کو اپنے سینے سے لگائے گا۔ کون آنچل سے میرے آنسو پونچھے گا۔ کون نوالے بنا بنا کر مجھے کھانا کھلائے گا۔ کس کے سینے سے لپٹ کر میں روؤں۔

کس کا ہاتھ تھام کر زندگی کے دشوار گزار راستوں پر قدم اٹھاؤں !!

اب یہ تنہائی برداشت نہیں ہوتی - یہ تاریکیاں ، یہ خاموشیاں مجھے ڈستی جا رہی ہیں- میرا وجود بکھرتا جا رہا ہے- میں بالکل ٹوٹتی جا رہی ہوں- سینے میں سانس بھی گھٹتی محسوس ہوتی ہے- سر میں جیسے شعلے سے دہکتے ہیں- وہ ٹھنڈی نرم ممتا بھری چھاؤں نہیں ملتی جہاں ان شعلوں کو سرد کرسکوں- گھٹی گھٹی سانسوں میں مہر و محبت کی چاندنی جذب کرلوں !

۳۰ مارچ ۱۹۸۶ء کی شام میری ماں یوں چپکے سے چلی گئیں جیسے اندھیرا ہوتے ہوتے پھول کی پنکھڑیاں ایک ایک کرکے فرش پر بکھر جاتی ہیں- سب کچھ اسی طرح منٹوں میں ختم ہوگیا- اکھڑی اکھڑی سانس جسم کی بندشوں سے آزاد ہوگئی - آنکھیں بے نور اور نحیف بدن بے جان !

تیز ہواؤں میں تھرتھراتے ہوئے پتے کی طرح میرا روم روم کانپنے لگا- موت کا یہ جان لیوا تجربہ، روح کی پرواز کا یہ روح فرسا منظر- میرے لیے بالکل نیا تھا- زبان کی مہر بندی اور زندگی کی لَے [illegible] جارہا — عدم کا سفر اور تارِ نفس کا یوں ٹوٹنا- یہ سب کچھ میں نے اس اداس گرم شام کو دیکھا- جس کا ایک ایک لمحہ یوں میری آنکھوں میں منجمد ہوگیا ہے کہ زندگی کے آخری لمحے تک یہ دھندلا نہ سکے گا- جب بھی بکھری ہوئی پنکھڑیوں کو دیکھوں گی اُن کی زندگی کے شیرازے کا بکھرنا یاد آئے گا !

بار بار نظریں انھیں تلاش کرتی ہیں جو آج منوں مٹی تلے مجھ سے چھپی ہوئی ہیں- کہاں ڈھونڈوں انھیں عماد الملک کے اس مقبرے میں اپنے شوہر کے پہلو میں وہ پہنچ گئیں اور مجھے یوں بے حال چھوڑ گئیں - کہیں قرار نہیں ملتا - ان کی لحد پر جاکر آنسو کے ہار چڑھاتی ہوں تب بھی وہ نہیں پوچھتیں-

"کیوں رو رہی ہے بیٹی - نہ رو - میرے سینے سے لگ جا" — اب وہ سینہ کہاں جس سے لگ کر دل کا بوجھ ہلکا کرتی تھی - وہ ایسی سوئیں کہ اب کوئی آواز ان تک نہیں پہنچ سکتی-

کیسا ان کے ناتواں جسم میں زندگی کی بے پناہ تڑپ - عزم و ہمت اور صبر و استقلال کے جلوے تھے- کیا میں نہیں جانتی تھی کہ انھوں نے کتنے دکھ جھیلے — کتنے ہی کٹھن مرحلوں پر بہادری کے جوہر دکھائے خاردار راستوں میں صبر و تحمل کا نمونہ ثابت ہوئیں - انھیں [illegible] نہیں کتنے دکھ پہنچے - لیکن دل کا [illegible] اپنے [illegible] ، اپنے [illegible] کی طرح [illegible] [illegible]

وہ کبھی روتی نہیں تھیں۔ روتی تھیں تو جائے نماز پر ــــ اُٹھے ہوئے ہاتھوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان کتنی باتیں ہوتیں جو اپنے معبود کے سامنے فریاد بن کر ان کے ہونٹوں پر مچلتی تھیں۔ اس کے سامنے اِن کا وجود یوں لرزتا جیسے آندھی میں شمع کی ناچتی ہوئی لو! ان کی ہر نماز یوں ہی ہوتی۔ بندگی کا احساس، اللہ کی عظمت، قیامت کا خوف اور رسولؐ اور اہلِ بیتِ رسولؐ کی محبت سے میری ماں کا سینہ لبریز تھا۔ راتوں میں اُٹھ اٹھ کر تہجد کی نماز اور پھر صبح صادق تک وظیفہ پڑھتیں۔ پنج وقتہ نماز کی وہ پابند تھیں ابا کی طرح۔ "بی بی جلد نماز پڑھ لیں" ابا کہتے اور وہ مصلے پر نظر آتیں۔

وہ ابا پر جان چھڑکتی تھیں اور انھیں پاکر خوش نصیب سمجھتے تھے۔ ابا کے گزرنے کے بعد چودہ برس جیسے انھوں نے بن باس لے لیا تھا۔ کہیں نکلتی نہیں تھیں۔ ابا کے ساتھ گویا ان کی زندگی بھی دم توڑ چکی تھی اور ٹھیک چودہ برس بعد دوبارہ روحوں کا ملاپ ہو گیا۔

وہ سراپا محبت تھیں۔ چند سسرال والوں کی ایذا رسانیوں کا جواب بھی انھوں نے محبت ہی سے دیا اور ایک ایک کر کے اپنے دشمنوں کو اپنا بنا لیا کہ سب "افضل ممانی" کا دم بھرنے لگے۔ ساس سسران کے گرویدہ تھے۔ جیٹھ ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔

وہ اپنے بابا جانی میرزا کریم خاں المخاطب نواب خدیو جنگ اور مما طیبہ بیگم بلگرامی کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ کم عمری ہی میں اپنے ماں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئیں۔ چناں چہ قبل از وقت باشعور ہو گئیں۔ اپنی چھوٹی بہن سیدہ بیگم کی نگہداشت میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس کی ہر خواہش کو اپنی خواہش پر مقدم جانا . . . . . . اسے یہ نہ محسوس ہونے دیا کہ وہ ماں باپ سے محروم ہو گئی ہے۔ جب بابا جانی اور مما دونوں یکے بعد دیگرے کینسر کے موذی مرض کا شکار ہو گئے تو ماموں عقیل جنگ بہادر نے ان کم سنوں کو اپنی شفیق باہوں میں لے لیا۔ بڑی بہن معصومہ بیگم کی شادی ہو چکی تھی۔ میری ماں کا اور چھوٹی بہن کا سہرا ماموں نے ہی باندھا۔ شادی کے بعد بھی ان کی مہربانیاں کم نہیں ہوئیں۔

میری ماں بڑی منکسر المزاج تھی انکساری اور بے غرضی نے ہمیشہ ماموں کے استفسار پر یہی کہلوایا کہ "منے ماموں میرے پاس سب کچھ ہے"۔ جس پر ماموں اکثر کہا کرتے تھے "میری سکو نے مجھ سے کچھ نہیں لیا۔ ایسی صابر و شاکر ہے میری بچی!"

امی کی آنکھیں ہمیشہ دکھتی رہتی تھیں۔ میری نانی طیبہ بیگم ہمیشہ انہیں چوما کرتی تھیں۔ کبھی دوا بھی لگواتیں

میں دوائی لگانے سے پہلے اپنی آنکھوں میں لگاتیں کہ کہیں دوا سے بیٹی کو نقصان نہ پہنچے ۔

اپنی ممانی کی وہ گرویدہ تھیں ۔ وہ تھیں بھی ایسی ۔ بہت پیار کرتی تھیں ۔ اس عاشق زار ماں کے گزرنے پر امی بہت دکھی رہا کرتی تھیں ۔ ان کی وفات کے چند مہینے بعد ان کے بابا جانی بھی انتقال کر گئے اور یتیمی کے احساس نے امی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ۔ اپنی ممانی کے انتقال پر امیؔ نے چند اشعار اپنی بیاض میں لکھے تھے ۔

ہجر میں کس سے کہوں حالِ دلِ زار اماں — نہ تو مونس ہے کوئی اور نہ غمخوار اماں
دن تصور میں کٹے ، رات تڑپتے گزرے — کس طرح ہجر میں جینا نہ ہو دشوار اماں
درد دوری سے اسے ایک دم آرام نہیں — کیوں نہ دن رات کراہے دلِ بیمار اماں
دو گھڑی بیٹھ کے رو لیں گے جہاں جی لگ جائے — نہ مکاں ، دشت ہے مسکن ہے نہ کاشانہ اماں
شمع پروانے پہ مصروف ہے گل بلبل پہ — دل میرا ڈھونڈتا ہے تم کو مری غمخوار اماں

"دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں ——" کے زیرِ عنوان والدہ نے اپنے دل کے درد کی ترجمانی یوں کی ہے :

" کارزارِ ہستی کا ہمیشہ سے یہی انداز رہا ہے ۔ ہر ایک تیغِ ستم کا شکار رہا ہے ۔ لیکن ہم جیسا بدنصیب کوئی نہیں کہ دونوں سرپرستوں کو سپردِ خاک کر کے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں آنکھوں سے نہاں ہزار الامان خاک کے نیچے جا سوئے جن کی تکلیف سے بے چین اور جن کے درد سے بے قرار ہوتے تھے ، وہ آج دنیا کی سب سے بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں ۔ لیکن کہاں ہیں وہ پوچھنے والے ۔ ایک لمحے کو جن کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جاتا تھا ۔ آج وہ اس ناپید دنیا میں تنہا ۔ ہاں —— اے دنیا کو چھوڑ کر قبروں کو جانے والو —— میں تمہارے لیے بے چین و بے قرار ہوں ۔ تڑپتی ہوں ۔ کیا تم کو اس کی خبر نہیں —— کوئی رات ایسی نہیں گزری کہ میرا تکیہ تمہارے غم میں تر نہ ہوا ہو لیکن اے دل کا سکھ لے جانے والو ! تم مجھے اپنے ساتھ لیتے نہ گئے ۔ کس مصرف کی ہے وہ دنیا جہاں ماں جیسی نعمت اور باپ جیسی دولت نہیں ۔ خدا جانے ہم نے کیا قصور کیا تھا کہ دونوں ہم سے چھوٹ گئے ۔ "

یہ تھے وہ خیالات جو کم سنی میں یتیمی کے احساس نے امی سے لکھوائے ۔

امی کی ذات میں اپنے والدین کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی تھیں ۔ منکسر المزاجی ، فراخ دلی ، تسلیم و رضا ، صبر و ہمت ، ذکاوت و ذہانت ، دل دردآشنا اور ایک سلجھی ہوئی فطرت ۔ ایک سلجھے ہوئے شائستہ

علمی ماحول میں امّی نے پرورش پائی جہاں نانا عماد الملک اور دادا میرزا موسیٰ خاں کی علم نوازی اور علمی تبحر انہیں ورثے میں ملا تھا، جہاں ماں طیبہ بیگم بلگرامی نے انہیں کندن بنا کر چمکایا

تینوں بہنوں کی ابتدائی تعلیم محبوبیہ گرلز اسکول میں ہوئی جہاں شرفائے حیدرآباد اپنی لڑکیوں کو بھیجتے تھے۔ امّی ایک ذہین اور ہر دلعزیز طالبہ تھیں۔ انگریزی مضمون نگاری میں انھوں نے کئی تمغے حاصل کیے۔ اردو انشاء پردازی میں کوئی مدمقابل نہ تھا۔ سینیر کیمبرج کا امتحان اعزاز کے ساتھ کامیاب کیا۔

اسی دوران ٹرینٹی کالج آف لندن سے موسیقی (پیانو) کے لیے تمغے حاصل کیے مشرقی موسیقی میں ستار، طبلہ اور ہارمونیم سے شغف رکھتی تھیں۔ مصوّری کی دلدادہ تھیں۔ چنانچہ اس کے لیے بھی گولڈ مڈل حاصل کیے۔ اردو، فارسی اور انگریزی تینوں میں مہارت تھی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی وہ اسکول کے میگزین میں مضامین لکھا کرتی تھیں۔ انھیں اچھے اشعار کے انتخاب کا بڑا شوق تھا۔ کئی ایک بیاضیں خوب صورت اشعار سے بھر دیں۔ جو آج میرے ہاں محفوظ ہیں۔

کہتے ہیں انسان کے کردار کو پہچاننا ہو تو اس کی تحریر کو دیکھنا چاہیے۔ امّی کی اردو اور انگریزی تحریر بڑی ہی خوب صورت تھی جو ان کے خوب صورت سلجھے ہوئے کردار اور فطرت کی آئینہ دار تھی۔

وہ سخن فہم اور سخن سنج تھیں اور شعر گوئی کا سلیقہ بھی رکھتی تھیں۔ سکینہ تخلص تھا اور سید علی حیدر طباطبائی سے تلمذ حاصل کیا تھا۔ امّی نے کئی نظمیں بھی لکھیں جو مجھے حاصل نہ ہوسکیں۔ لیکن ایک طویل نظم کے چند اشعار اپنے نانا عماد الملک کی مدح میں یوں لکھے تھے۔

عالم ہو تم شفیق ہو تم نکتہ داں ہو تم ۔۔۔ فاضل ہو تم ادیب ہو تم خوش بیاں ہو تم
استادِ شاہِ ملکِ دکن ہو، فہیم ہو ۔۔۔ عاقل ہو تم، فقیہ و ادیب زباں ہو تم

تم سا ہوا نہ کوئی نہ ہوگا جہان میں
قابل ہو تم عزیز ہو تم قدر داں ہو تم

میری امّی مغربیت کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ مغرب کی اندھی تقلید سے مشرقی لڑکی اپنا فطری حسن کھو بیٹھتی ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ جدید و قدیم تہذیب و تمدن کے امتزاج کو اپنی زندگی کا اصول بنایا جائے۔ مغربی تعلیم کی آزاد خیالی اور مشرقی روایات اور طرزِ معاشرت اور اخلاق و آداب کا وہ ایک حسین و جمیل سنگم تھیں گویا دو تمدنوں کا نچوڑ ایک سلجھی ہوئی فطرت میں سمویا گیا تھا۔

اسلام کی وہ شیدا اور انسانیت کی دلدادہ تھیں۔ نفیس خیالات اور ستھری فکر اور سچے طور پر وہ ہمیشہ کاربند رہیں۔ اپنے ان ہی اصولوں کے تحت ہم بھائی بہنوں کی تربیت کی۔ اعلیٰ خاندانی روایات

اور اعلیٰ اخلاقی و سماجی قدروں کی ترجمانی کی۔ جدید و قدیم تہذیب و تمدن کے خوشگوار توازن میں ہم بھائی بہنوں کو صحیح اسلامی طرزِ زندگی سے واقف کرایا۔

سید احمد قادری امّی کے بابا جانی میرزا کریم خاں کے اچھے دوست تھے۔ ان کے ساتھ کبھی کبھی ان کے بیٹے سید رحمت اللہ قادری ان کے گھر آتے جاتے تھے۔ تینوں بہنیں پردہ کرتی تھیں۔ لیکن کس وقت نہ جانے کیوپڈ کو شرارت سوجھی۔ امّی کی بڑی بڑی دلنشین آنکھوں کا جادو نہ جانے کب اور کیسے سید رحمت اللہ قادری پر چل گیا۔ کلی کا حسن اور گلاب کی خوشبو کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ تینوں بہنیں ایرانی خدوخال کی نازک اندام حسینائیں تھیں۔ سیّد احمد قادری نے امّی کے والد سے ایک بار کہہ ہی دیا ——— میرزا! ہم تمہارے خاندان سے رشتہ جوڑیں گے۔" اور انھوں نے یہ بات پوری کر دکھائی۔ Leeds سے جب سیّد رحمت اللہ قادری بار ایٹ لا کر کے لوٹے تو سکینہ بیگم انھیں بیاہ دی گئیں۔

کس قدر خوب صورت جوڑی تھی ان دونوں کی۔ میں نے ان کی شادی والی تصویر دیکھی ہے۔ ان کی شادی کے موقع پر مہاراجہ کشن پرشاد نے تہنیتی سہرا[1] پڑھا تھا۔ نظامِ دکن میر عثمان علی خاں نے بھی شرکت کر کے دعا دی۔ سنی شیعہ کا ملاپ تھا۔ دلوں کی صفائی کا مقام تھا۔ اسلامی عقائد کا پرچار تھا ——— دونوں سچے مسلمان تھے۔ پیغمبر اور ان کے نواسے اور اہلِ بیت رسولؐ کے ماننے والوں میں تھے۔ وہ نواسہ جس نے اپنا لہو دے کر اسلام کی شان رکھی تھی، اس کا سوگ منانا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ یہ سنی شیعہ فرقے اسلام کی روح کو کمزور اور اسلامی قوانین کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور دین کی رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔ چنانچہ وہ سب چیزیں جو ان دونوں فرقوں میں بری سمجھی جاتی تھیں، دونوں نے ہم بچوں کو ان سے دور رکھا اور وہی تعلیم دی جو اسلام کی فضیلت کے شایانِ شان تھی۔ لہٰذا ہم بھائی بہنوں نے کبھی اپنے کو سنّی یا شیعہ نہیں کہا بلکہ صرف مسلمان ——!!

ابّا اپنے نانا سید شاہ بدرالدین قادری کے مرید تھے جن کا مزار مبارک مدراس میں ہے جہاں ہر سال عرس کے موقع پر زائرین زیارت کے لیے آتے ہیں۔ ابّا نے مجھے پیری و طریقت کی بہت سی باتیں بتائیں۔ موت و حیات کے فلسفے، اسلامی مسائل، فلسفۂ دین و دنیا پر گھنٹوں مجھ سے گفتگو کرتے۔

مجھے یاد ہے وہ مجھے ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر کہتے تھے۔ "تو میری بیٹی! اس دنیا کے لیے نہیں ہے۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے اور تیرے احساسات بہت نازک! لیکن تو میری بیٹی ہے سیّد کی بیٹی ——— " ابا مرحوم کی یہ باتیں، یہ باتیں، یہ نصیحتیں آج بھی قدم قدم پر میرے ساتھ چلتی ہیں۔

بھائی جانی میری سیدانی ماں کا شیوہ رہا۔ ہر موڑ پر انھوں نے میرا ہاتھ تھاما۔ انھوں نے

---

[1] یہ سہرا بطور ضمیمہ اس اشاعت میں شامل ہے

مجھے سمجھایا کہ زندگی نام ہے مر مر کے جیسے جانے کا۔ زندگی میں رنج و راحت، خوشی و غمی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر غم کے سائے میں خوشی ملتی ہے لہٰذا ۔

گراں آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر — سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
حزہ میں روک لے آنسو کہ دل ہو آئینہ
ستارے توڑ دے اور آفتاب پیدا کر

میری ماں نے ہمیشہ مجھے یہی تلقین کی کہ ؛

"دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر جاؤ"

دشمنوں، منافقوں کو بخش دیا کرو۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں ۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں ۔

حق و صداقت، صاف گوئی اور خودداری، سربلندی اور سرفروشی ان کی تعلیم کا حصہ تھی۔ گر گر سنبھلنا اور سنبھل کر چلنا ہی میں نے اپنی امی سے سیکھا۔ انھیں مجھ پر پورا بھروسہ تھا کہ میں انہیں مایوس نہیں کروں گی۔ میری صاف گوئی اور صداقت کا وہ دم بھرتی تھیں۔ کہتی تھیں۔

"تم بالکل اپنے ابا کی بیٹی ہو۔ خوددار، سچی اور بے باک - ایک کھلی کتاب کہ ہر کوئی تمہیں پڑھ لے مگر میری جان ! دنیا والوں کو کھری باتیں پسند نہیں آتیں۔ کبھی مصلحتوں سے کام لیا کرو ـــــ" لیکن یہ مصلحتیں مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئیں۔ نیک و بد، سچ اور جھوٹ کا سبق جو ماں باپ نے ہمیں پڑھایا آج بھی ہم بھائی بہنیں اس سبق کو دہراتے ہیں۔

امی کہا کرتی تھیں ـــــ "بخش دو گر خطا کرے کوئی" میں نے ہر وقت ایسا ہی کیا ہے۔

وہ کہتی تھیں ـــــ لوگوں کی برائیوں سے سبق سیکھو۔ جن کاموں کے لیے لوگ انھیں برا کہتے ہیں وہ کام ہرگز نہ کیا کرو "

ہم بھائی بہنوں کا بچپن ان دونوں کی شفیق بانہوں میں نہایت خوش گوار گزرا۔ مجھے یاد ہے جب بھی ہمیں اسکول کی چھٹیاں ملتیں ہم سب کہیں نہ کہیں باہر چلے جاتے۔ ابا جاگیردار کالج اور ہم ... جب کا [illegible] ... الف۔ پکڑ جنرل رجسٹریشن اسٹامپس ہوئے، ہم سب ان کے ساتھ

دوروں پر جاتے تھے۔ اس طرح حیدرآباد کے سبھی اضلاع ہم نے دیکھ ڈالے۔ اورنگ آباد، دولت آباد کا قلعہ، ایلورا، اجنٹہ کے غار، ورنگل، محبوب نگر، بیڑ، سوتالڑہ، بیدر، بیجاپور، میدک، گلبرگہ، وقارآباد، عادل آباد، میڑچل اور پھر بنگلور، نندی ہلز، مہابلیشور بھی گھومنے گئے ——— ہماری تفریحات محض تفریح نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان کی نوعیت تعلیمی بھی ہوتی تھی۔ ان مقامات کی تاریخ، صناعوں کی فنکاری، تہذیب و تمدن، بادشاہوں کی، اولیا اللہ اور بزرگان دین کی فتوحات، کرامات و تعلیمات سے متعلق باتیں ہمیں بتائی جاتیں۔ وہاں کے قلعے، فصیلیں، جنگل، امرائیاں، باغات اور پھر ہمالیہ کے دامن میں بہتی ہوئی ندیاں، وادیاں سرسبز و شاداب کھیت میں حل چلانے والے کسان، ان کی سادی سیدھی زندگیاں ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ مشاہدے کیے اور اس بچپن کی تربیت کے نتیجے کے طور پر ہمارے خیالات اور سوچنے سمجھنے کے زاویئے عام سطح سے اونچے ہی رہے۔ دونوں نے ایسے پاکیزہ ماحول میں تعلیم و تربیت دی کہ اس کا اثر آج بھی ہمارے ذہنوں، خیالات اور فکر پر باقی ہے۔ ان ہی مشاہدوں نے مجھے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا سکھا دیا اور میری ماں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔

اس نیم تفریحی اور نیم تعلیمی سیر و سیاحت کے علاوہ کھیل کے میدان میں بھی ہم سب نے خوب حصہ لیا ابا کو دفتر میں کام کرتے دیکھ کر ہم نے بھی اپنی چھوٹی فائلیں دفتیوں سے بنائیں۔ انھیں فیتے لگائے پھر بھیا انسپکٹر جنرل بنتے اور ہم بہنیں کوئی اہلکار، کوئی پیش کار، کوئی معتمد، کوئی چپراسی، فائلیں مختلف مسائل پر اور مختلف احکام سے بھرتیں جن پر بھائی اپنی دستخط کرتے اور پھر یہ آگے بڑھا دی جاتیں آج بھی یہ مثلیں میری ماں نے بڑی احتیاط سے اپنے صندوق میں رکھ چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم SLIDES پر خود تصویریں پینٹ کرتے اور بھائی گھر میں بنائے ہوئے اپنے چھوٹے سے پروجیکٹر کے ذریعہ مختلف SLIDES کو یکے بعد دیگرے کبھی فلم کی طرح پیش کرتے۔ اس کھیل میں امی اور ابا دونوں شریک ہوتے اور ہم انہیں ٹکٹ دے کر اندر آنے کی اجازت دیتے۔

مجھے یاد ہے ہم بھائی بہنوں نے مل کر ایک ماہنامہ اپنے گھر "کوہ نور" کے نام سے نکالا تھا۔ جس کے مدیر بھائی جان ہوتے اور ہم بہنیں معاون مدیر۔ اس میں مضامین لکھنے والے ہمارے علاوہ بشیر النسا بیگم بھی ہوتیں جنھیں ہم بشیر خالہ کہتے تھے۔ ہماری ہمت افزائی کے لیے وہ اچھی اچھی نظمیں لکھتیں، اقبال

کی نظمیں اور دوسرے مشاہیر کے اقوالِ زرّیں بھی شریکِ ماہنامہ ہوتے۔ جیلانی بیگم بھوپالی ہمیں کاغذ، پنسل اور کاربن پیپر فراہم کرتیں۔ اس طرح ہم بڑے انہماک سے اس پرچے میں اچھے اچھے مضامین شائع کرتے۔ یہ تھی اردو ادب سے ہمارے لگاؤ کی ابتدا ـــــ!

اس ادبی ماحول میں تربیت پانے والا ذہن آلودگیوں سے پاک اور مہمل باتوں سے دور تھا۔ ایک متوازن زندگی کا تصوّر والدین نے ہم میں پیدا کیا۔ چنانچہ ہم میں کوئی سائنس داں کوئی مصوّر، کوئی انشاپرداز نکلا اور کسی نے ہوم سائنس کو اپنایا۔ والدہ نے گھر کا سبق یوں دیا کہ ہم میں سے ایک ایک مہینے کے لیے گھر سنبھالتا جس میں بھائی بھی شامل تھے۔

ماڈل پرائمری اسکول میں جہاں (CO-EDUCATION) تھا، تعلیم پانے کے باعث ہم نے لڑکیوں اور لڑکوں کی دوستی کو فطری طور پر قبول کیا۔ جتنی لڑکیاں سہیلیاں ہوتیں اتنے ہی لڑکے۔ یہاں ڈرامے بھی ہوتے تھے اور ہم سب ان میں حصّہ لیتے۔

اس زمانے کی تعلیم و تربیت میں جو ایک معصوم عنصر شامل تھا اس نے ہمیں ان ساری گندگیوں اور برائیوں سے دور رکھا جو آج نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کی ذہنیت کو بھی گھن کی طرح کھاتی نظر آتی ہیں۔ ایک بھرپور، مکمل اور صحت مند زندگی، پُرخلوص، محبّت بھری عنایتوں اور شفقتوں کی زندگی ہمیں میسر آئی۔

جب ہم سونے کے لیے شب خوابی کا لباس پہن کر اپنے اپنے بستروں پہ دراز ہوجاتے تو امّی ہمیں وہ کہانیاں سناتیں جو ان کی ممّا نے انھیں سنائی تھیں۔ اور جسے میں نے بعد میں "جوہی کی ڈالی" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع کروایا ہے۔

بچپن تو یوں سیر حاصل خوش گوار ماحول میں گزر گیا لیکن قسمت میں ان حسین لمحوں کے ساتھ کچھ بدبختیاں بھی لکھی تھیں۔ جن کی بنا پر امّی ہمیشہ متفکّر رہا کرتیں۔ کالج سے کامیاب ہوکر نکلی تو پھوپی زاد بھائی نے میرا ہاتھ مانگا۔ میں آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن ابا کو دل کا دورہ پڑا اور انھوں نے چاہا کہ ہمیں اپنی زندگی ہی میں اپنے گھر بھیج دیں۔ لہٰذا میری بہن کے اور میرے دونوں کے یکے بعد دیگرے ہاتھ پیلے کردیے گئے۔ ابھی سولہ مہینے ہی ہوئے تھے کہ مجھے بیوگی کا لباس پہننا پڑا۔ مجھے یاد ہے میری ماں میرے لیے آٹھ آٹھ آنسو روتی تھیں۔ پاکستان

مجھے لینے کے لیے آئیں۔ میری گود میں چار مہینے کی بچی تھی۔ اسے سینے سے لگا لیا۔ اپنی بیٹی کے سہاگ کے پرانے لال پیلے کپڑے پہننے ترک کر دیئے۔ میرے سفید بے رنگ لباس کو دیکھ کر وہ دل مسوس جاتیں۔ دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہو گئی تھی لیکن معصوم بچی کے سہارے خدا نے میری زندگی کی گھڑیوں کو بھولنے کا سامان پیدا کر دیا۔ وہی بچی آج میری زندگی کا سہارا ہے۔

مجھے خدا سے شکایت نہیں شکوہ اپنی تقدیر سے ہے۔ کتنے زخموں کو دل میں چھپائے میں جیتی۔ صرف آنسو تھے جو میرے دل کا درد ہلکا کرتے تھے اور میری ماں تھیں، میرے ابا تھے جو اپنے پیار شفقت سے میرے زخمی دل پر پھاہا رکھتے تھے۔ میری ننھی بچی میرے زخموں کا مداوا بن گئی۔ یوں یہ دن دونوں کی محبتوں کے سہارے، اپنی بچی کو سینے سے لگائے بتاتی رہی۔ ذمہ داری کے احساس نے مجھے بیوگی کے دوسرے ہی سال سے نوکری کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اسکول میں پڑھانا شروع کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرے ماں باپ نے میری ننھی بچی کو یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ اس کا باپ اسے کچی عمر میں میری گود میں بلکتا چھوڑ گیا۔ کلیجے سے لگا کر اسے زندگی دیتی رہی۔ اس سے زندگی کی خوشی حاصل کرتی رہی۔ وہ گھر بھر کی دل بستگی اور پیار کا مرکز بن گئی۔ صبح اٹھتے ہی ابا اسے بلاتے "میری بیٹی کہاں ہے؟" اور ابا کی بیٹا ابا کی بانہوں میں پہنچ جاتی۔ اس کی کالی نشیلی آنکھیں، سرخ و سفید رنگ گلابی گال۔ اس کے ریشمی گھنگھریالے بال، صحت مند خدوخال پر امی واری جاتیں۔ جب چلنے لگی سب نے اس کے قدم چومے۔ وہ روتی تو سب کے آنسو نکل آتے۔ وہ ہنستی تو جیسے سورج پھوٹ پڑتیں۔ بھائی کہتے "بٹیا بھاگی آؤ۔" اور بٹیا ماموں کے سینے سے لگ جاتی۔ خالہ اس کی ناز برداری کرتی۔

جب وہ اسکول جانے لگی اور پھر کالج اور یونیورسٹی سے امتیازی درجے میں کامیابی حاصل کی تو میری تمنا بر آئی۔ میں پھر اسے شہ سواری بھی سکھائی کہ خود میرے شوہر فوج میں کپتان تھے اور شہسوار۔ سینے پر تمغے لگا کر جب وہ نکلتے تو ان کے مردانہ حسن اور بانکپن پر انھیں خود میری نظر لگ جاتی۔ شاید کہ ۳۲ سال کی عمر میں دل کا دورہ پڑا اور حرکتِ قلب بند ہو گئی اور میں بیوہ ہو گئی۔ میں اور میری بچی پاکستان کی سرزمین پہ بے سہارا ہو گئے اور وہ "خود" کارزار" کے احاطہ میں پیوندِ خاک ہو گئے۔

جب علیگڈھ میں بٹیا کی منگنی ہوئی، امّی کینسر ( LYMPHATIC LEUKAEMIA ) کے عارضے قرب بتلا تھیں وہ چاہتی تھیں کہ اسے دولہن بنتا ہوا دیکھ لیں۔ چنانچہ دھوم دھام سے اس کی شادی ہوئی تو میں نے جانا زندگی کا بہترین سرمایہ، زندگی کا سب کچھ میں نے اس کے چاہنے والے کو سونپ دیا۔ میرے سینے میں ایک ہلچل سی مچی تھی۔ میری اکلوتی بچّی، میری آنکھوں کی روشنی، میری زندگی کا سہارا، کسی اور کو سونپنے پر دل کی کیا کیفیت ہوئی۔ میری ماں سمجھ سکتی تھیں۔ مجھے یاد ہے جب وہ مجھے میرے شوہر کے ساتھ پاکستان وداع کر رہی تھیں۔ ان کی صاف و شفّاف آنسو بھری آنکھیں میرا دل بے چین کیے دے رہی تھیں۔ کیسی اداسی ویرانی اور درد تھا ان آنکھوں میں!! میں ان آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اس درد کو آج بھی میں محسوس کرتی ہوں۔ یہ ممتا بھری آنکھیں ۳۰۔ مارچ کی شام جب ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں تو وہ نہیں جانتی تھیں مجھ پر کیا گزری! ان آنکھوں کا درد میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ وہ آنکھیں جو مجھے دیکھ کر کہتی تھیں —— "مجھے چھوڑ کر مت جانا" خود مجھ سے روٹھ گئیں۔

۱۹۷۹ء میں جب وہ میرے پاس علی گڑھ آئی تھیں تب ہی انھوں نے جان لیا تھا کہ زندگی کی بانہوں میں موت سمٹ کر آنے لگی ہے۔ انھوں نے بڑی ہمت سے اسے گوارا کر لیا۔ ۱۹۸۵ء میں جب انھیں بمبئی کے ٹاٹا میموریل ہوسپٹل میں علاج کے لیے لے کر گئی تھی، موت کے سائے ان پر منڈلا رہے تھے۔ لیکن وہ عزم و ہمّت کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹروں کی نگرانی میں ان کا بہتر سے بہتر علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹر سلطان پردھان اور ڈاکٹر اسد کریم خان کی دیکھ ریکھ نے انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ وطن واپس ہو سکیں۔ جب ہم حیدرآباد لوٹے تو لگا جیسے موت کے سائے ان پر سے ہٹ گئے۔ ان کے عزم اور جینے کی تمنّا نے موت کو شکست دے دی تھی۔ لیکن یہ سائے بہت دور تک نہیں گئے۔ میں نے ان کا کپکپاتا ہوا نحیف بدن زندگی کے لیے تڑپتا محسوس کیا۔ میں نے سینے سے لگ کر کہا تھا! "ماں تم نہ ہوگی تو میرا وجود بکھر جائے گا۔ تم جلد اچھی ہو جاؤ ماں مجھے چھوڑ کر کہیں مت جانا ——" میرے آنسو ان کی آنکھوں میں چمکنے لگے —— "میری بچّی! اللہ تیرا نگہبان ہے۔"

مجھے وہ منظر بھولا نہیں جاتا۔ وہ بستر پہ پڑی تھیں ان کی سانسوں کی آمدورفت، زندگی اور موت میں جیسے تکرار چل رہی تھی۔ دونوں دست و گریباں تھے۔ وہ گھڑیاں مجھے بھولی نہیں جاتیں جب ہم سب بھائی بہنیں بستر سے لگے بیٹھے تھے۔ باری باری کوئی ان کا منہ دھلاتا، کنگھی کرتا۔ چمچہ چمچہ ان کے منہ میں غذا پہنچاتا۔ مگر ان پر صرف غنودگی چھائی رہتی۔ موت کی پرچھائیاں پھر ان کے نزدیک آنے تھیں لیکن ہم نے بھی جیسے قسم کھائی تھی کہ اپنی ماں کو اس کے چنگل سے چھین لیں گے۔ ہمارا عزم اتی کے سے ٹکرا گیا۔ اللہ نے شفا دی اور وہ صحت پانے لگیں۔

لیکن کچھ مہینے بعد موت گھوم پھر کر پھر ان کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ "مجھے نیند آنے لگی ہے" ایک دن انھوں نے کہا اور پھر پلنگ سے لگ گئیں۔ ان کی جان لیوا بیماری تیسرے درجے میں پہنچ گئی۔ وہ عموماً بے ہوش رہتیں۔ جگا جگا کر انہیں غذا دی جاتی تو وہ بچوں کی طرح رونے لگتیں۔ "مجھے کچھ نہ دو صرف سو جانے دو۔" ان کا جسم آگ کی طرح جلنے لگا تھا۔ مرض نے انتہا پکڑی لیکن بے ہوشی نے انھیں تکلیف محسوس نہیں ہونے دیا۔ پھر ان کا منہ لہولہان ہو گیا۔ نازک بدن سے سارا خون نچوڑ لیا جسم کے عضو عضو پر کینسر نے اپنے زہریلے دانت گاڑ دیے تھے۔ اور حلق تک اس کا زہر پھیل چکا تھا۔

۲۴۔ مارچ کی وہ گرم شام میں نے دیکھا ان کی آنکھوں کی پتلیاں سفید اور منجمد ہو چکی تھیں ان کی اکھڑی اکھڑی سانسیں رخصت چاہتی تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "مجھے چھوڑ کر مت جانا ماں!" لیکن وہ خاموش رہیں۔ انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ کوئی دلاسا نہیں پھر انہیں خراٹا لگ گیا اور پھر ایک خوب صورت زندگی موت کے آغوش میں پہنچ گئی — چپ چاپ انھوں سب کچھ برداشت کیا۔ اور چپ چاپ چلی گئیں — تارِ حیات ٹوٹ گیا —

میں لرز گئی — میرا چھوٹا بھائی چیخ پڑا — امّی چلی گئیں — "ہاں ہماری ماں چلی گئی — اور اب یہ تنہائی میرے لیے جان لیوا بن گئی ہے —

اداسی میں ڈوبے شام و سحر لگتا ہے جیسے اب میری بھی جان لے۔ کس سے اس تنہائی کا کرب بانٹوں! تنہا، بے سہارا اس شہر میں — زندگی میں جینے کا کوئی بہانہ نہیں ملتا۔

کہتے ہیں جانے والے لوٹتے نہیں لیکن جہاں وہ گئی ہیں وہیں سے اپنا کمزور ہاتھ میری طرف بڑھا دیں تو اسے تھام لوں اور سمجھوں کہ زندگی میں مجھے دوبارہ میری ماں کا سہارا مل گیا ہے۔

مجھے سہارا دو ماں! میرا ہاتھ تھام لو! میں شام و سحر تمہیں پکارتی ہوں۔ تمہارے لیے آنسو بہاتی ہوں۔ اب تو ہم بھی یتیم ہوگئے ہیں۔ یتیمی کا درد تم جانتی تھیں نا ——— ایک بار آکر کہہ دو ——— "میری بچی میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں" ——— تمہارے پاس ہوں تو یہ درد بھرے شام و سحر بے گوارا ہو جائیں گے ——

○○

نیک توقعات کے ساتھ

○

پالی تھین رنگین اور ہمہ سائز خوب صورت لفافوں اور تھیلیوں کے

ڈیلر

# مسرز فرید ٹریڈرس

۱۸۴/۱-۸-۱۵ بیگم بازار، مقابل مچھلی مارکٹ

حیدرآباد ۵۰۰۰۱۲

سکینہ بیگم

# اکبری دور کی بیگمات

ہر متمدن ملک میں عورت کو ایک خاص امتیاز اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی ایک بڑی حد تک اپنے زمانے کی تہذیب و معاشرت کی بنانے اور بگاڑنے والیاں ہوتی ہیں۔ دستِ قدرت انہی کے نازک ہاتھوں سے قوموں کی زندگی اور انحطاط، ترقی و تنزل کی منزلیں طے کراتی ہے۔ لیکن سمجھنے والے ہی سمجھیں انگریزی میں مثل مشہور ہے "THE HAND THAT ROCKS THE CRADLE RULES THE WORLD" یعنی جو ہاتھ گہوارہ جنبانی کرتا ہے وہی دنیا پر حکمرانی کرتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر مولانا حالی فرماتے ہیں

سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودی کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

اکبر کا دور جہاں علم پروری، سطوت و جبروت، مذہبی رواداری و خوشحالی کے سبب سے اپنے زمانے کا عہد زرین کہلانے کا مستحق ہے وہاں اکبری دور کی بیگمات بھی اپنی عالی دماغی، ہوشمندی، بیدار مغزی اور بلند ہمتی سے اس عہد میں چار چاند لگانے والیاں کہی جائیں تو بے جا نہیں۔

یہ خواتین حسین و جمیل ہونے کے علاوہ علم و فضل، عقل و دانش، فہم و فراست، حوصلہ مندی، بلند نظری، تدبر میں یکتائے زمانہ اور حساز روزگار ہیں۔ وہ صرف پڑھی لکھی ہی نہ تھیں بلکہ وہ فنون سپہ گری میں بھی پوری مہارت رکھتی تھیں اور ضرورت کے وقت اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہو کر میدانِ جنگ میں مردوں کے شانہ بشانہ لڑتیں سیر و سفر میں کبھی ہاتھی میں ہوتیں تو کبھی گھوڑے پر سوار۔

علم و ادب کا انھیں شوق تھا تو موسیقی کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔ سازوں پر بجاتی تھیں اور گاتی بھی تھیں لیکن ان کے دل نواز نغمے نامحرموں کے کانوں کے لیے نہ ہوتے۔ پردے کی پابند ضرور تھیں لیکن تصرف ملتے و جا کی حد تک ورنہ پوری آزادی کے ساتھ پھرتیں محفلوں میں جاتیں، جلسوں میں شریک ہوتیں اور تفریح گاہوں کی سیر کرتیں ان کی زندگی مہذب اور ان کی طرز معاشرت شائستہ اور سادہ تھی۔

اکبر کے زمانے میں ہر مہینے مینا بازار ہوتا تیسرے دن قلعہ میں خاص اہتمام سے زنانے کے لیے انتظام کیا جاتا۔ بیگمات شاہی کے علاوہ امرا، و اعیان کی بیبیاں بھی شریک ہوتیں۔ اس موقع پر بادشاہ خود

نفسِ نفیس بازار میں آ پہنچتے۔ امراء کی بہو بیٹیوں کو بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف حاصل ہوتا
ہی بادشاہ وہیں نشستیں بھی کر بیٹھتے دیکھنے میں یقیناً بازار دل بہلانے کا سامان ہوتا لیکن درپردہ اکبر اس
قصہ پیا بھی اختلافات کی بیخ کنی اور محبت و اتحاد کی داغ بیل ڈالتا۔ بسا اوقات اس دانشمند بادشاہ
نے دو امیروں کی کشیدگی اور عداوت کا خاتمہ یوں کیا کہ ان کی اولاد کی آپس میں شادیاں کرادیں۔
چنانچہ بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خاں کی شادی اسی مصلحت کی تحت خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی
بہن ماہ بانو بیگم سے کردی گئی تھی۔

اسی طرح ہندوستان کے راجاؤں سے شادی بیاہ کی راہ ڈال کر اکبر نے محبت، اتفاق اور اتحاد کی
یوں کو محکم و استوار کر لیا۔ راجہ بہاڑا مل کی بیٹی بھگوان داس کی بہن خود شاہی محل میں تھی اکبر نے بھگوان
داس کی بیٹی سے سلیم کی شادی بھی اسی رشتۂ محبت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی خاطر رچائی۔ اس
ملے کی شادی کا خاکہ شاعر نے یوں کھینچا ہے۔

بہت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہا — کہ یہ رشتۂ مودت کشور آرائی کا زیور تھا
خود فرمانروا جے پور نے شادی کی خواہش کی — گو وہ بھی ایک اچھا صاحب دیہیم و افسر تھا
بعہدِ مبارک اور خود شاہنشہ اکبر — گئے انبیر تک جو پایۂ تخت ملک و کشور تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے — کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے — وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا
ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی — کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

اکبر کی صلح کن پالیسی نے شاہی حرم سرا میں بھی محبت و یگانگت اور میل ملاپ کے خوش گوار تعلقات
دیے تھے۔ چنانچہ یہ راجپوت رانیاں بھی اکبر کے گھرانے میں آکر اپنی ولایتی بہنوں سے ایسی شیر و شکر ہوگئیں
آپس میں مذہب و ملت کا اختلاف بھی باقی نہ رکھا۔

اکبری دور کی بیگمات میں سب سے زیادہ مشہور گل بدن بیگم ہیں جن کا ذکر یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔
گل بدن بیگم بابر کی بیٹی ہمایوں کی بہن اور اکبر کی پھوپی تھیں۔ بڑی عالی دماغ، قابل اور ہوش مند خاتون گزری
اکبر کی فرمائش پر انہوں نے ہمایوں نامہ لکھا تھا جس کو اس زمانے کی مستند تاریخ کہا جائے تو بیجا ہے۔ با
بر ہمایوں اور اکبر کے حالات اور تسخیر ہندوستان کے تذکرے بہت ہی سادہ، دل نشین اور شگفتہ پیرائے
میں ہیں۔ ادبی اور تاریخی نقطۂ نظر سے یہ کتاب بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ ANNETTE BEVE.
R E D نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

دوسرے مورخوں کے برخلاف گل بدن بیگم نے ہمایوں نامے میں اس عہد کی تہذیب و تمدن،

معاشرت، خانگی زندگی، شادی بیاہ کے رسوم، عیش و نشاط کی محفلوں، لباس اور طرز رہائش وغیرہ پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ عبارت سادہ اور شستہ اور طرز تحریر میں غضب کی بے ساختگی لوچ اور روانی ہے۔ اسی کتاب کے متعلق مولانا شبلی جیسے نقاد اور ادیب یوں مدح سرا ہیں۔ "فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ نمونہ تزک جہانگیری اور رقعات عالمگیری ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری اور وقائع نعمت خاں ان پر سے نثار کر دیے جائیں لیکن انصاف کا یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے" شبلی (مقالات)

گل بدن بیگم کے بعد حمیدہ بانو بیگم کا نمبر آتا ہے جو بعد کو مریم مکانی کے خطاب سے مشہور ہوئیں۔ یہ ہمایوں کی چہیتی بیوی اور اکبر کی خوش نصیب ماں تھیں۔ بڑی صاحب الرائے مدبر اور حوصلہ مند بی بی تھیں۔ حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی سے بھی آراستہ تھیں شوہر پرستی ان کی سرشت میں تھی بڑی مستقل مزاج اور بات کی پکی تھیں۔

یہ وہ خاتون ہے جس کو اکبر کی ماں ہونے کا فخر ہے جس نے وفاشعاری اور شوہر پرستی میں سیتا جی کی طرح جنگل جنگل کی خاک چھانی لیکن شوہر کا ساتھ نہ چھوڑا۔ سفر اور حضر میں برابر ہمایوں کی رفاقت اور دل جوئی کرتی رہی جس نے ملک گیری اور ملک داری میں ہمایوں کا ہاتھ بٹایا اور اس کو دوبارہ ہندوستان کے تخت پر لا بٹھایا جس کے فہم و ادراک نے اکبر کو بیرم خاں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر حکومت کرنے سے بچالیا اور جس نے اپنی صائب الرائے سے جملہ امور مملکت میں اکبر کی رہبری کی۔

گل بدن بیگم نے ہمایوں نامے میں حمیدہ بانو بیگم کی شادی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کی عورتوں کو اپنی شادی بیاہ کے معاملے میں کس حد تک آزادی حاصل تھی ہمایوں نے حمیدہ بانو بیگم کو اپنی والدہ کے گھر کسی تقریب کے موقع پر دیکھ لیا تھا اور ان کے حسن و ادا پر دل ہار بیٹھے۔ جب ان کے لیے شادی کا پیام بھجوایا گیا تو حمیدہ بانو نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا بادشاہ اور مجھ جیسی غریب کا جوڑ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اسی سے شادی کروں گی جو میرا برابر والا ہو۔ انکار نے ہمایوں کی آتش شوق کو اور بھڑکا دیا لیکن ادھر سے جوں جوں اصرار بڑھتا گیا حمیدہ بانو کی ضد بھی بڑھتی گئی چالیس دن تک بھی گفت و شنید کا سلسلہ رہا لیکن حمیدہ بانو بڑے مستقل مزاج کے ساتھ اپنی بات پر قائم رہیں۔ آخر گل بدن بیگم کی والدہ نے جا کر سمجھایا منایا اور یقین دلایا کہ ہمایوں اس کا پرستار ہے جس پر بالآخر وہ شادی کرنے آمادہ ہو گئیں۔

حمیدہ بانو بیگم کے بعد سلیمہ سلطان بیگم قابل ذکر ہیں۔ سلیمہ سلطان بیگم گل رنگ بیگم کی بیٹی اور اکبر کی پھوپی زاد بہن تھیں۔ پانچ سال کی عمر میں ان کی شادی بیرم خاں خان خاناں سے کر دی گئی تھی اور پھر

بیرم خاں کی وفات پر اکبر کے محل میں داخل ہوئیں شہزادہ مراد انھیں کے فرزند تھے۔
بڑی نیک طینت، نیک بخت اور باسلیقہ بی بی تھیں صاحب تدبیر اور معاملہ شناس اس قدر تھیں کہ امورِ سلطنت میں جب کوئی معاملہ اُلجھتا تو انھیں دانش مند خاتون کے مشوروں سے سلجھتا۔ پڑھی لکھی قابل خاتون تھیں۔ کتب بینی کا از حد شوق تھا سخن فہم اور سخن گو بھی تھیں۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

کاکلت را گر ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام
مست بودم ایں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

اکبری دور کی بیگمات میں بخت النسا بیگم بھی کافی شہرت رکھتی ہیں۔ یہ اکبر کی بہن تھیں نہایت خوش اخلاق، فیاض اور مہمان نواز تھیں۔ ان کی طرزِ معاشرت سادہ اور بے تکلف تھی۔ خانہ داری کے انتظام میں کمال مہارت رکھتی تھیں۔ سادگی پسند تھیں اس لیے ہر چیز مثلاً لباس، رہائش وغیرہ میں سادگی برتتیں۔ فضول شان و شوکت سے انہیں نفرت تھی اور نخوت و گھمنڈ سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ ہمایوں اپنی اس بیٹی کا شیدا تھا اور ہمیشہ اس کی دلجوئی میں لگا رہتا۔ علمی مجلسوں میں ہمیشہ شریک ہوتی اور مردانہ محفلوں میں بھی جاتی لیکن بڑی سنجیدگی و متانت کے ساتھ۔ ہمایوں اور اکبر دونوں اکثر بڑی بڑی مہموں اور مشکلوں میں اس سے مشورہ کیا کرتے۔

شاہی محل کی بیگمات میں جاناں بیگم کو بہ لحاظ ان کی لیاقت اور قابلیت کے ایک نمایاں مرتبہ حاصل تھا۔ جاناں بیگم، ماہ بانو بیگم اور عبدالرحیم خان خاناں کی بیٹی اور شہزادہ دانیال کی بیوی تھیں۔ نہایت پارسا، حسین اور قابل خاتون گزری ہیں۔ فطرتاً دینی علوم کی طرف زیادہ مائل تھیں۔ قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی جو مقبولِ خاص و عام ہوئی اور جسے اکبر نے بڑی قدر دانی کے ساتھ قبول کر کے اپنے کتب خانے میں جگہ دی اور جاناں بیگم کو پچاس ہزار دینار عطا کیے۔ دانیال سے ان کی شادی بڑے تزک و احتشام سے ہوئی تھی۔

نہایت قابل اور لائق خاتون تھیں۔ شاعری میں بھی بلند مرتبہ رکھتی تھیں ان کا کلام دلوں پر گہرا اثر کرتا تھا۔ ان کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

عاشق ز غلق عشق تو پنہاں بپھاں کند　　　پیدا است از دو چشم ترش خوں گریستن

زمانے کے کروٹ لی تخت و تاج اُلٹ گئے مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا یہ گراں قدر ہستیاں خاک کی نذر ہو گئیں۔ لیکن ان کے کارنامے باقی اور ان کے نام زندہ ہیں ایسی ہی خواتین کی شان میں مولانا حالی نے فرمایا ہوگا۔

زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخرِ بنی نوعِ بشر

سکینہ بیگم

# سری رام نومی

لب ریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
مشہور ان کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند

ہندوستان ہمیشہ سے متبرک پاک اور برگزیدہ ہستیوں کا گہوارہ رہا ہے۔ کیسے کیسے مشا
یہاں پیدا ہوئے اور کیسے کیسے رشی اور مہارشی اس سرزمین پر اپنے کارنامے چھوڑ گئے۔ اسی مایۂ ناز ما
وطن کی آغوشِ محبت میں رام چندرجی جیسے بیٹے نے بھی پرورش پائی تھی اور اپنے کردار اور اصولِ ز
سے ایک زمانے کو اپنا گرویدہ بنا گئے۔

سری رام نومی ہندوستان کے اسی ذی مرتبت مہاتما کی پیدائش کی یادگار ہے۔ اسی دن را
کی کتھا کے نامور تیر انداز، سیتا کے شوہر، راون کے قاتل اور وشنو کے اوتار سری رام چندرجی نے جنم
لیا تھا اور اسی مناسبت سے اس کو سری رام نومی کہتے ہیں۔

رام نومی کے دن رام چندرجی کی ولادت کا جشن منایا جاتا ہے۔ راما کے پرستار بہ عقیدت
اُس دن خوشیاں مناتے، دان دیتے اور دیولوں میں چراغ جلاتے ہیں۔ رام کے نام کی پوجا پاٹ ہ
ہے۔ ایسے مندروں میں جو رام کے نام معنون ہیں جاترا ہوتی اور میلا لگتا ہے اور دور دور سے معتقد
نذرانۂ عقیدت چڑھانے آتے ہیں۔

اہلِ ہنود کا اعتقاد ہے کہ وشنو یعنی محافظِ دنیا نے دنیا میں دس اوتار لیے تھے اور حق
صداقت کی حمایت کرنے، مخلوقِ خدا کو گمراہی سے بچانے اور ظالموں کے ظلم و ستم سے نجات د
کے لیے، مختلف زمانوں میں مختلف روپ لے کر ظاہر ہوتے رہے۔ اسی سلسلے میں اجودھیا
مشہور فرمانروا راجہ دسرتھ جی کے گھر رام چندرجی کے قالب میں بھی وشنو کا ظہور ہوا اور یہ اوتا
راون کی دراز دستی اور جور و ستم سے زمانے کو نجات دلوانے کی غرض سے لیا گیا تھا۔

رام چندر جی کی فرمانبرداری، ایفائے عہد، ایثار وغیرہ کی داستان تو سبھی سن چکے ہیں۔ والمیکی کی سحر زبانی و جادو بیانی نے اس کو وہ شہرت بخشی ہے کہ رہتی دنیا تک اس کے کارنامے زندہ رہیں گے۔ یہیں یہاں وہ پرانا قصہ دوہرانا مقصود نہیں۔ البتہ اس وقت ہم اپنے سامعین کو ایک نیا اور دلچسپ قصہ سنانا چاہتے ہیں جو رام چندر جی کے ایک مخلص بھگت کے متعلق ہے اور جو دکن کی تاریخ اور سرزمین سے بہت نزدیک کا تعلق بھی رکھتا ہے۔

قطب شاہی حکومت کے آخری دور میں راما کے ایک بھکتی نے ازروئے عقیدت و اعتقاد رام جی کے نام سے ایک مندر متعلقہ بدراچلم میں تعمیر کروایا تھا اور ہمارا قصہ اسی سے متعلق ہے یہاں پر بدراچلم کا محل وقوع اور مندر کی چند خصوصیات بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

بدراچلم دریائے گوداوری کے مشرقی ساحل پر علاقہ عظمت میں واقع ہے۔ ندی کی دوسری جانب سرکار عالی کا موضع پورگم پہاڑ ہے جو تحصیل پالونچہ کا مستقر اور سمستان پالونچہ کا موضع ہے۔)

یہ مندر کچھ اپنی قدامت کی وجہ اور کچھ واقعات و روایات کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے دیوتا کو مذہبی تقدس کے علاوہ بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ اس لیے بدراچلم کا یہ مندر سالانہ ہزاروں زائرین و معتقدین کی امیدوں کا مرکز بنا رہتا ہے۔ یہاں پر ہر سال دو جاترائیں ہوا کرتی ہیں ایک موسم گرما میں رام نومی کے دن اور دوسری سرما میں مکتی دیوداسی کے موقع پر لیکن ان دونوں جاتراؤں میں اول الذکر جاترا خاص اہمیت رکھتی ہے۔

یہ مشہور مندر والمیکی کے شہرۂ آفاق رزم نامہ رامائن کے نامی گرامی ہیرو سری رام چندر جی کے نام نامی سے منسوب ہے اور اس لیے یہاں رام نومی کے دن خاص اہتمام اور تزک و احتشام کے ساتھ کتھا بھجن اور رنگ رلیوں کا انتظام ہوتا ہے۔

روایات اس کو رام چندر جی کی ان صحرا نوردیوں سے منسوب کرتے ہیں جو ان کے بارہ سالہ بن باس کے زمانے میں ان کو ڈنڈک کرنیا کے جنگلوں میں پیش آئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ راما یہاں بھدر نامی اپنے ایک بھگت کی بخشش کے سلسلے میں آئے تھے جو ان کے درشن کی خاطر سنیاس اختیار کرکے گوشہ نشینی میں سخت ریاضت کر رہا تھا۔ اسی مناسبت سے شاید یہ جگہ بھدراچلم کے نام سے موسوم و مشہور ہو گئی۔

تاریخی عہد میں ایک اور بھکتی نے جس کا نام رام داس تھے اور جو آخری قطب شاہی بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کے عہد حکومت میں مقامی عہدہ دار مالگزاری تھا، اس مندر کی تعمیر سرکاری رقم کے تصرف سے کروائی تھی جس کی بنا پر حاکم وقت کا اس پر عتاب ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک کثیر سرکاری رقم اس مندر کی تعمیر پر صرف کی گئی تھی اور جب رام داس سرکاری مطالبات کی تعمیل میں اطمینان بخش جواب پیش کرنے سے قاصر اور رقم کی پابجائی سے مجبور رہا تو اس اس تقریب بیجا کی پاداش میں شاہی محل کے ایک تہہ خانہ میں مقید کر دیا گیا۔

ایک طویل مدت تک قید خانہ کی سختیاں جھیلنے کے بعد اپنی نجات سے مایوس، اپنی خلاصی سے ناامید اور اپنی زندگی سے تنگ آکر رام داس نے جب اس سنسار کی زندگی کو خیرباد کرنے کا مصمم ارادہ کر تو سنتے ہیں کہ راما نے اپنے بھگت کو ایک عجیب و غریب طریقے سے نجات بخشی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ راما ایک خدمت گار کا روپ لے کر رات کے سناٹے میں تاناشاہ کے پاس الماسے محل سرا میں جا پہنچے اور اس تمام رقم کو جو رام داس کے ذمے تھی اشرفیوں میں ادا کر کے تاناشاہ سے رسید اور رام داس کی خلاصی کا پروانہ لے گئے۔

یہ کاغذات ایک نامعلوم طریقے پر اس تہ خانہ میں پہنچا دیے گئے جہاں رام داس مقید تھا اور زہر کے اس پیالے کے نیچے رکھ دیے گئے جو رام داس نے اپنے لیے تیار کر رکھا تھا کہ پی کر ابدی نیند اور چین حاصل کرے علی الصبح جب رام داس کی آنکھ کھلی اور اس نے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کیا دیکھتا ہے کہ پیالہ اوندھا پڑا ہے اور وہ زہر جو اس کی نجات کا آخری ذریعہ تھا زمین پر سوکھ چکا ہے اس کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ حسرت و یاس سے وہ کچھ دیر پیالے کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ آخر کار مشیت ایزدی کے آگے اپنی مجبوری کے احساس سے مرعوب ہو کر اس نے پیالہ اٹھایا تو اس کی حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ رہی۔ پیالے کے نیچے دو کاغذ رکھے تھے جن پر مہر شاہی ثبت تھی۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رام داس نے کاغذ اٹھا لیے دیکھا تو اس کی خلاصی کا حکم اور رقم کی رسید تھی فرط عقیدت میں آنسو ڈبڈبا آئے اور دل کی گہرائیوں سے "رام نام ست ہے" کا نعرہ بلند ہوا قید خانہ میں گونج اٹھا۔

وہ ابھی اسی حالت تذبذب میں کھڑا تھا کہ تاناشاہ کی آمد کی دھوم مچی۔ شوق جستجو نے تاناشاہ کو بے چین کر دیا تھا وہ سویرے سے ہی بہ نفس نفیس قید خانہ میں پہنچا جہاں رام داس ہاتھ میں کاغذ لیے محو حیرت کھڑا تھا۔

تاناشاہ نے کاغذات کا بذات خود معائنہ کیا اور پروانے اور رسید کی شناخت کی۔ ابوالحسن تاناشاہ ایک صوفی منش، صاحب دل انسان تھے اس واقعے نے ان پر گہرا اثر کیا۔ راما کی اس روحانی امداد سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً رام داس کو رہا کر دیا اور مندر کے لیے بذریعہ اسناد گراں بہا عطیات از قسم اراضی عطا کیے جس سے مندر کی ایک مستقل آمدنی ہو گئی اور جو باوجود زمانے اور حکومتوں کی

یلیوں کے برابر برقرار رہی یہاں تک کہ آصف جاہی عہد میں بھی یہ معاش جاری رہی اور اب بھی رہے اس منبع فیض و رواداری، حکومت سرکار عالی سے اس مندر کو سالانہ انیس ہزار چار سو چھپن رقم ملا کرتی ہے جو منجملہ ان تین لاکھ دس ہزار نو سو چھیالیس روپیوں کے ہے جو حکومت کی طرف ے مناور کے لیے وقف ہیں۔

مبارک ہے وہ دور جس نے ایسے پر آشوب زمانے میں مخالفتوں کے باوجود بھی اپنی روایات کو رکھا اور قابلِ تقلید و صد ستائش ہے۔ وہ فرمان رواجس نے مذہبی رواداری کی علمبرداری کا جے نے کو دکھا دیا کہ

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

ہمیشہ رہے گا۔ اگر ہم مذہبی تعصب کو پسِ پشت ڈال کر رواداری اور قومیت کی بنیادوں کو محکم و توار کریں وسیع المشربی، روشن خیالی اور اخوت پرستی کو اپنا شیوہ بنالیں فرقہ پرستی کی بیخ کنی اور ت کی تعمیر میں اپنا تن من دھن سبھی نثار کر دیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

○

---

سکینہ بیگم

# حیدرآباد دیدہ و شنیدہ

بیتے ہوئے دن اور دیکھی ہوئی محفلوں کی رنگین فضائیں آج بھی دل و دماغ کے گوشوں میں بسی ہوئی ہیں۔ حیدرآبادی تہذیب، اور حیدرآبادی خلوص و یکجہتی کا شہرہ ہے۔

کیا دن تھے وہ اور کیسے کیسے لوگ تھے جو ہمارے اس جنت نشان حیدرآباد کو اپنی خوبیوں سے، اپنے اعلیٰ کردار سے اور اپنی تہذیب و شائستگی سے صرف آراستہ پیراستہ ہی نہیں بلکہ ایسا مشہور و معروف کیا ہے کہ حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب کے اپنے اور پرائے سب ہی گن گانے لگے۔ جو ایک بار حیدرآباد آتا، وہ یہیں کا ہو رہتا۔

دور و دراز ملکوں میں بھی ایک حیدرآبادی اپنے اخلاق، اپنی طرزِ گفتگو، اپنے اوصاف خصائلِ حمیدہ سے پہچان لیا جاتا۔ لوگ کہتے تھے کہ ہزار آدمیوں میں بھی، ایک حیدرآبادی فوراً پہچان لیا جا سکتا کہ یہ "حیدرآبادی" ہے۔

یہ تو رہا ایک سرسری ذکر حیدرآباد کے تعلق سے جو کبھی "مٹائے نہ مٹے گا"۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ہماری زندگی میں وہ کون سے اعمال پسندیدہ تھے جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے — ؟

اس سلسلے میں ہمارے آباء و اجداد کی عمدہ تربیت، آپس کا اتحاد، بزرگوں کا پاس و لحاظ، چھوٹوں سے شفقت کا برتاؤ — یہ سب ہمارے ہر طرح ممد و معاون رہے۔

ہم نے آنکھ کھولی تو یہ دیکھا کہ بلا تفریقِ مذہب و ملت ہم کو شروع سے یہ تعلیم دی گئی کہ ہم "بزرگوں کا ادب، ماں باپ کی اطاعت، اور فرماں برداری" آپس میں خلوص اور رواداری برتیں۔ بچپن سے ہی ہم کو اچھی باتوں اور اچھے کاموں سے دلبستگی رکھنا سکھایا گیا۔ اور یہی باتیں

ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئیں۔ اقبال کا ترانہ "بانگ درا" بن کر گونجنے لگا۔

ایسی ایسی بلند و برتر ہستیاں بھی ہماری زندگی میں نمایاں ہوئیں، جن کی روشن ضمیری، حکمت عملی اور راست بازی نے ہماری زندگی کے ہر ہر موڑ پر ہم کو سہارا دیا۔ ہم علامہ اقبال کے ہم نوا ہو کر

"چشتی نے جس زمین میں پیغام حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا"

"میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے"

اور "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

کے دل سوز وطن پرستانہ نغموں سے سرشار ہو گئے۔

حیدرآباد کی گوناگوں روایات میں آپس کا میل جول اور بھائی چارہ بھی جنم جنم سے مشہور تھا۔ ہم نے کبھی اپنے آپس کے تعلقات میں مذہب کو بیچ میں نہ آنے دیا۔ ایسی سیدھی سادی زندگی تھی کہ جس میں کبھی دوئی کی بو بھی نہ آنے پائی۔ رنج و راحت، خوشی اور غمی، ہر حالت میں ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیتے اور برابر کے شریک رہتے۔

آج بھی ہم میں ایسی ہستیاں ہیں جو صحیح معنوں میں "مجسم انسانیت" ہیں جن کے دل میں درد ہے، جن کے پاس امیر اور غریب، برتری اور کم تری کوئی معنی نہیں رکھتے، جن کی جود و سخاوت، بخشش و کرم گستری سب کے حق میں یکساں ہے۔

اچھی تعلیم و تربیت نے ہمارے دلوں کو جلا دے دی، ہم میں نیک و بد کا احساس پیدا کیا، ہمارے دل و دماغ کو نخوت و برتری کے مذموم جذبات و خیالات سے میلا نہیں ہونے دیا۔ ہمارے رہن سہن میں ایک ایسی ہم آہنگی تھی کہ کبھی یہ شائبہ یا خیال نہ گزرا کہ ہم میں کسی قسم کا فرق ہے۔

ہماری تہذیبی و جذباتی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ ہماری سرشت میں وہ اعلیٰ اقدار سموئے ہیں جن میں وضع داری، دل نوازی، مساوات کے تانے بانے نے ایک دلکش فضا پیدا کر دی۔ رفتہ رفتہ مشترک زبان و خیال اور صحیح وصحت مند انداز فکر نے ایک صلح کل حکمت عملی کی داغ بیل ڈالی اور ہم اسی اساس پر چلنے لگے۔

اس پس منظر کے کچھ ہی دن گزرنے کے بعد، اس وقت، جب ہماری آنکھیں آج کل کے حالات اور حیدرآباد کی بدلتی ہوئی فضاؤں سے دوچار ہوتی ہیں تو آنے والے دنوں کے خیال سے دل بیٹھ جاتا ہے اور پھر فوراً ہی ایک دھندلی سی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے کہ

"اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے"

اب سوال یہ ہے کہ ہم اس "بگڑے انداز" سے کیسے اور کس طرح نبھا سکتے ہیں؟ اب تک تو ہم اپنی روش پر قائم ہیں اور اللہ کی عنایت سے "مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا" پر اب "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

حیدرآباد میں باہر کے لوگ آنے لگے۔ اچھے بھی اور بُرے بھی۔ نئے دستور اور نئے قاعدے اور نئے ہنگامے بھی ہونے لگے۔ ہر جگہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بننے لگی۔ لباس بدلے، کھانے بدلے اور دل بھی بدلنے لگے۔ فرقہ وارانہ جذبات نے پیر پھیلائے تعصب اور خود غرضی کا بازار گرم ہونے لگا۔ جہاں رواداری تھی وہاں بے راہ روی ہونے لگی۔ کہاں کا امن اور کدھر کا چین!

وہ چیزیں اب کہاں، جن پر ہم کو ناز تھا اور "جس دل پہ ناز تھا مجھے" وہ دل تو پامال ہو کر رہ گیا۔

اب تو جس کو دیکھو ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ نئی نئی پابندیاں سازشیں بلائے جان ہو گئی ہیں، سُکھ کے دن بیت گئے، اب دُکھ کے دن بیتنے کو باقی رہ گئے۔

سب کچھ ہوا اور ہوتا رہے گا لیکن تھا کہ حیدرآباد کا ذرّہ ذرّہ ہمارے لیے اب بھی جان بخش ہے۔ اب بھی ہم اپنے کو "حیدرآبادی" کہتے ہوئے ایک فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے دل میرا بھر آتا ہے تو اور میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی ہوں کہ:

"آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے"

---

سکینہ بیگم

# ادارہ اور شاہد صاحب

[محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ مرحومہ اپنی خرابیِ صحت کی بنا پر اس جلسے کا میں جو پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کے خیر مقدم میں ۷۔ دسمبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوا تھا شریک نہ ہو سکیں انھوں نے یہ تقریر پڑھ کر سنانے کے لیے بھیج دی تھی]

جنابِ صدر و معزز حاضرین!

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکنے کا جتنا ملال ہے اتنا ہی نی ادارہ اور ان کے خاص خاص معاونین کے خلوص اور ارادت اور بے لاگ خدمات کا عادہ کرتے ہوئے اپنی قدردانی اور مبارک باد پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہی ہوں۔

بہت سے پرانے اور نئے احباب جو زورؔ صاحب سے وابستہ تھے، اور ب بھی ہر طرح اس کام میں معروف ہیں ان کی تعریف کرنے کے لیے میرے یہاں الفاظ نہیں۔

بدلتے ہوئے زمانے کی نیرنگیاں اور زندگی کی گوناں گوں معروفیتوں کے باوجود دیکھے کہ ان احباب نے اپنا رنگ نہیں بدلا۔ ان کی دلبستگی اور اردو زبان کے ساتھ موافقت یشگی بلا تفریق ایسی حوصلہ افزا ہے کہ اردو اور اردو والے بجا طور پر ان پہ فخر و ناز کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں، میں حمید الدین شاہد صاحب کا ذکر کرتے ہوئے، ان کے ایک خط کا انھوں نے مجھے ۱۹۸۰ء میں لکھا تھا، کچھ اقتباس حاضرینِ محفل کے آگے پیش کروں گی، س میں انھوں نے قیامِ حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خلوص اور حیدرآباد سے دلبستگی س طرح اظہار کیا ہے کہ شاید ہی کوئی اور کر سکتا۔

حمید الدین شاہد صاحب کا ادارے سے اور خاص کر زورؔ صاحب سے جو رشتۂ خلوص ہے وہ نہ صرف استاد و شاگرد کا بلکہ ایک رفیقِ کار، ایک مخلص دوست اور ایک بہی خواہ ہے جو اب بھی ۲۵، ۳۰ سال گذر جانے کے بعد بھی حیدرآباد اور حیدرآباد کی ان شخصیتوں بھلا نہ سکا۔ جس نے پاکستان میں ایک "ایوانِ اردو" کی بنا ڈالی اور "سب رس" نامی مالہ بھی جاری کر رکھا ہے جو پرانی یادوں کو تازہ کرتا رہتا ہے۔

اپنے خط مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۸۱ء میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

"یہ دونوں انشاء اللہ پاکستان میں حیدرآباد کا نام روشن رکھیں گے۔"

اس خط کی ابتدا انھوں نے یوں کی تھی:

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں    اُنہی کی یاد میری زندگی ہے

جس سے خود ظاہر ہے کہ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی ان کا دل حیدرآباد میں ہے آخر میں فرماتے ہیں: "مجھے آپ لوگوں سے ملنے کی آرزو برسوں سے ہے۔"

اس موقعہ پر پنڈت ترور صاحب کا ایک جملہ جو انھوں نے فروری ۱۹۳۹ء میں 'خدمت اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے جذبے کے تحت لکھا تھا اور جو کم و بیش ان کا موٹو بن گیا تھا' مجھے یہ لکھا تھا کہ "بے فیض زندگی کا عدم و وجود برابر ہے۔" کتنی سچی بات لکھی تھی انھوں نے' خدا انھیں جنّت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

۷۔ دسمبر ۸۵ء کو ایوانِ اردو میں جناب خواجہ حمید الدین شاہد صاحب کی خیر مقدمی تقریب میں پڑھا گیا۔

---

سب رس کے لیے

نیک تمناؤں کے ساتھ

# فینٹیاسی بوٹیک

3/250-3-6 روڈ نمبر ۱ بنجارہ ہلز حیدرآباد 500024

سکینہ بیگم

(بچوں کے لیے)

# مَیں چُگوں سو کیا؟

ایک تھی چڑیا۔ وہ نکلی کہیں چگنے۔ دور سے اس کو ایک چنے کا دانہ نظر آیا۔ بھوکی تو تھی ہی
،تر پڑی اور جھٹ سے دانہ اٹھا کر چلی وہاں سے اڑتی ہوئی کہ کہیں چین سے بیٹھ کر اسے کھائے۔
اڑتے اڑتے وہ ایک مکان کی چھت پر پہنچی اور دانہ کاٹھ پر رکھ کر سستانے لگی۔ کاٹھ
یں سوراخ تھا۔ چنے کا دانہ اس میں گر پڑا۔ جب چڑیا دم لے چکی تو اس نے چاہا کہ چنے کا دانہ
لے۔ لیکن چنے کا دانہ تو سوراخ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ چونچ سے اس کو
ا ے۔ لیکن سوراخ چھوٹا تھا۔ اس میں سے دانہ نہ نکل سکا۔

چڑیا نے بڑی منت اور عاجزی سے کاٹھ سے کہا۔

کاٹھ کاٹھ چنا دے، میں چگوں سو کیا؟

کاٹھ نے چنا دینے سے انکار کر دیا۔ یہ وہاں سے گئی بڑھائی کے پاس اور اس سے کہا۔

بڑھائی بڑھائی کاٹھ چیر۔

کاٹھ چنا دیتا نہیں۔

مَیں چگوں سو کیا؟

بڑھائی نے کہا ایک چنے کے دانے کے لیے میں کاٹھ کہاں چیرنے جاؤں۔ دور ہو یہاں سے
، راجہ کے پاس اور راجہ سے کہا۔

راجہ راجہ بڑھائی ڈانٹ۔

بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں۔

کاٹھ چنا دیتا نہیں۔

میں چگوں سو کیا؟

راجہ نے ہنس کر کہا۔ خوب! اتنی سی بات کے لیے میں بڑھائی کو ڈانٹوں؟ تو یہاں سے چلی جا۔

میں کچھ نہیں کر سکتا۔

چڑیا راجہ کا جواب سُن کر رانی کے پاس گئی اور کہنے لگی۔

رانی رانی راجہ روٹھ

راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں۔

بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں۔

کاٹھ چنا دیتا نہیں۔

میں چگوں سو کیا؟

رانی نے کہا —— دیوانی ہوئی ہے۔ تیرے چنے کے دانے کے لیے میں اپنے راجہ سے روٹھوں؟ یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

چڑیا گئی چوہے کے پاس اور چوہے سے التجا کرنے لگی۔

چوہے چوہے رانی کھٹولا کاٹ۔

رانی راجہ روٹھتی نہیں۔

راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں۔

بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں۔

کاٹھ چنا دیتا نہیں

میں چگوں سو کیا؟

چوہے نے کہا — بی چڑیا۔ میں کھٹولا کاٹوں، نہ تمہارے چنے کا دانہ تمہیں ملے۔ تم کہیں اور جاؤ۔

چڑیا گئی بلی کے پاس اور دل میں یہی سوچتی گئی کہ ٹھیرو میاں چوہے کو مزا چکھاؤں گی۔ بلی سے کہنے لگی۔

بلی بلی چوہے کو کھا۔

چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں۔

رانی راجہ روٹھتی نہیں۔

راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں۔

بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں۔

کاٹھ چنا دیتا نہیں۔

میں چگوں سو کیا ؟

بلی نے کہا ۔ "میری بلا سے! میں کیا کروں! میرا پیٹ اس وقت بھرا ہوا ہے۔ میں تو چوہے کو کھانے سے رہی! چڑیا اپنا سا منہ لے کر لکڑی کے پاس پہنچی کہ بی بلی کو کچھ سزا دلوائے اور لکڑی سے کہنے لگی۔

لکڑی لکڑی بلی مار
بلی چوہا کھاتی نہیں!
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا ؟

لکڑی نے کہا ۔ چل چل میں ایسے باتوں میں نہیں پڑتی۔ چڑیا چلی آگ کے پاس اور آگ سے بولی :۔

آگ آگ لکڑی جلا
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں۔
کاٹھ چنا دیتا نہیں۔
میں چگوں سو کیا ؟

آگ نے کہا ۔۔۔۔ جانے میری بلا ۔ میں کیا جانوں ۔ تم کیا چگو۔
چڑیا پھر چلی سمندر کے پاس اور سمندر سے کہا :۔

سمندر سمندر آگ بجھا

آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟

سمندر نے کہا —— مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکے گا۔ چڑیا گئی ہاتھی کے پاس اور ہاتھی سے کہا

ہاتھی ہاتھی سمندر سوکھ[1]
سمندر آگ بجھاتا نہیں
آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟

ہاتھی نے یہ سب سن کر اپنی گردن ہلائی اور کہا —— "اونہہ ہونہہ! میں تو اس معاملے میں دخل نہ دوں گا۔ زبردستی سمندر کا پانی کیوں سوکھ لوں —— ؟"

اب چڑیا لگی سوچنے کہ کیا کروں جھٹ اس کو خیال آیا کہ چلو چیونٹی کے پاس چلیں۔ اس

---

[1] سوکھ۔ سُکھادے۔ یعنی پی کر ختم کر دے

کام میں تو وہی مدد کر سکے گی۔ فوراً چونٹی کے پاس پہنچی اور اس سے کہا ـــــ

چونٹی چونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس
ہاتھی سمندر سوکھتا نہیں
سمندر آگ بجھاتا نہیں
آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟

چونٹی نے کہا ـــــ بہن یہ کتنی بڑی بات ہے۔ چلو میں ابھی چلتی ہوں۔ یہ کہہ کر چونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھسنے لگی۔

ہاتھی نے کہا ـــــ "میری سونڈ میں نہ کوئی گھسیو میں سمندر سوکھتا ہوں۔"

سمندر نے کہا ـــــ "مجھے کوئی نہ سوکھیو میں آگ بجھاتا ہوں۔"

آگ نے کہا ـــــ "مجھے کوئی نہ بجھائیو میں لکڑی جلاتی ہوں۔"

لکڑی نے کہا ـــــ "مجھے کوئی نہ جلائیو۔ میں بلی مارتی ہوں۔"

بلی نے کہا ـــــ "مجھے کوئی نہ ماریو۔ میں چوہا کھاتی ہوں۔"

چوہے نے کہا ـــــ "مجھے کوئی نہ کھائیو۔ میں رانی کھٹولا کاٹتا ہوں۔"

رانی نے کہا ـــــ "میرا کھٹولا نہ کوئی کاٹیو میں راجہ روٹھتی ہوں۔"

راجہ نے کہا ـــــ "مجھ سے نہ کوئی روٹھے میں بڑھائی ڈانٹتا ہوں۔"

بڑھائی نے کہا ـــــ "مجھ غریب کو نہ کوئی ڈانٹے میں کاٹھ چیرتا ہوں۔"

کاٹھ نے کہا ـــــ "مجھ کو نہ کوئی چیرے میں چنا دے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر کاٹھ نے چنا دے دیا۔ چڑیا جھٹ اپنا چنا اُٹھا کر پھر سے وہاں سے اُڑ گئی۔

سکینہ بیگم (بچوں کے لیے)

# مردانے موسٹی جانی

ایک چیونٹی اور چوہیا میں بڑی دوستی تھی۔ چیونٹی کا نام مردانے مورچہ جانی تھا اور چوہیا کا نام مردانے موسٹی جانی۔ ایک روز چیونٹی بیٹھی چکی پیسنے اور چکی میں خود پس گئی۔ چوہیا کو اپنے دوست کی بے وقت موت کا بڑا رنج ہوا اور مٹی سر پر ڈال کر ایک برگد کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔ درخت نے چوہیا کا یہ حال دیکھ کر پوچھا۔

کیوں خاک بر سر موسٹی؟ کیوں خاک بر سر موسٹی؟

چوہیا نے کہا۔ خاک بر سر موسٹی، مردانے مورچہ جانی مر جائیں اور ہم جیئں ——— ؟

یہ سن کر درخت نے اپنے سب پتے گرا دیئے۔ ایک کوا اُدھر سے اُڑتا ہوا آیا اور درخت پر بیٹھ گیا۔ درخت کو بے برگ و بار دیکھ کر پوچھا۔

کیوں درخت بار کند؟
کیوں درخت بار کند؟

درخت نے کہا۔

درخت بار کند
خاک بر سر موسٹی

' مردانے مورچہ جانی مر جائیں ہم جیئں؟ کوّے نے جو یہ بات سنی تو کیا کام کیا کہ اپنا گردن کے بال و پر تمام نوچ کھسوٹ ڈالے۔ جیسا یہ ندی کنارے پانی پینے گیا تو ندی نے کوّے کو بے بال و پر دیکھ کر وجہ دریافت کی۔

کیوں قلادہ[1] چنگی منگی؟ کیوں قلادہ چنگی منگی۔ کوّے نے جواب دیا۔

قلادہ چنگی منگی

---

[1] قلادہ۔ گلے کا پٹہ۔ یہاں مطلب ہے گردن کے پر نوچ ڈالنے سے جو گروما بن گیا ہے اس سے۔

درخت بار کند
خاک بر سر موسیٰ

مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جیئیں ؟ پانی جو تھا یہ سنتے ہی بہہ نکلا۔ پاس ہی ایک کسان کا گیہوں کا کھیت تھا۔ اسی میں بہہ کر گیا۔

گیہوں نے کہا۔

کیوں آیا تیرا پیرا
کیوں آیا تیرا پیرا

پانی نے کہا ــــــ

آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جیئیں ۔ ؟

یہ سنتے ہی گیہوں جتنے تھے پٹ پٹ گر پڑے۔ کسان جو کھیت میں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ گیہوں جو کچھ دیر پہلے لہلہا رہے تھے سب گر پڑے ہیں۔ اس نے پوچھا۔

کیوں گندما[1] گرتی پڑتی ؟
کیوں گندما گرتی پڑتی ؟

گیہوں نے کہا۔

گندما گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چینگی منگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں اور ہم جیئں ؟

---

[1] گندما۔ گندم کہتے ہیں۔ گیہوں کو۔ گندما۔ پیار کا لفظ ہے۔

کسان نے یہ سن کر بیلدستے[1] جو اس کے ہاتھ میں تھا اُٹھا کر پاؤں پر ماریا۔ کسان کی
عاشقاں جو باپ کے لیے روٹی لایا کرتی تھی اُدھر آنکلی۔ اس نے باپ کا جو یہ حال دیکھا تو بولی

کیوں باوا بیلدستہ کند ؟
کیوں باوا بیلدستہ کند ؟

باپ نے جواب دیا۔

باوا بیلدستہ کند
گندما گرتی پڑتی
آیا تیرا بیرا
قلاوہ چھینگی چھنگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسی
مردانے مور چہ جانی مر جائیں اور ہم جیئیں ؟

بیٹی جو یہ سنتے ہی جھٹ خاک پر لوٹ گئی، ماں نے جب بیٹی کو مٹی میں لوٹتا پایا

کیوں عاشقاں لوٹی پوٹی ؟
کیوں عاشقاں لوٹی پوٹی ؟

عاشقاں بولی۔

عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندما گرتی پڑتی
آیا تیرا بیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسی
مردانے مور چہ جانی مر جائیں ہم جیئں ؟۔

---

[1] بیلدستہ پھاوڑا۔

ماں نے روٹی پکانے کے لیے توا گرم کیا تھا اس پر جھٹ سے جا بیٹھی۔ اتنے میں پڑوسن تکوا[1] درست کروانے آئی۔ وہاں کیا دیکھتی ہے کہ عاشقاں کی ماں توے پر سوار بیٹھی ہے۔ اس نے پوچھا۔

کیوں عاشقاں مادراں[2] توا کند؟
کیوں عاشقاں مادراں توا کند؟

عاشقاں کی ماں بولی۔

عاشقاں مادراں توا کند
عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندما گرتی پڑتی
آیا تیرا پھیرا
قلادہ چنگی متنگی
درخت بار کند
خاک برسر موسلی

مردانے موریچہ جانی مرجائیں ہم جیں۔؟

پڑوسن نے یہ سنتے ہی شدتِ غم سے تکوا اٹھا کر اپنی ناک میں گھیڑ لیا۔ جب پڑوسن گھر سے باہر نکلی تو لوگوں نے پوچھا۔

کیوں پڑوسن تکوا کند؟
کیوں پڑوسن تکوا کند؟

پڑوسن نے جواب دیا۔

پڑوسن تکوا کند
عاشقاں مادراں توا کند
عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند

---

[1] تکوا۔ تکوا چرخہ میں لوہے کی کاڑی جس پر تاگا لپیٹا جاتا ہے۔ [2] مادراں۔ ماں در سے

گن ما گرتی پڑتی
آیا یترا پتیرا
قلادہ چینگی منگی
درخت بار کند
خاک بر سر موسلی
مردانے مورچہ جانی مر جائیں ہم جیئں۔ ؟

یہ سننا تھا کہ سارے گاؤں کے لوگ مردانے مورچہ جانی کی حسرت ناک موت پر رونے لگے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے اپنا شاہی لباس اتار کر معمولی لباس زیب کیا اور تمام رعایا کو حکم دیا کہ مردانے مورچہ جانی کی بے وقت موت پر رنج کا اظہار کریں اور چالیس دن تک سوگ منائیں۔

غرض جب چالیس دن ختم ہوئے تو تمام شہر نے سوگ بڑھایا۔ درخت کی نئی کونپلیں نکلنے لگیں۔ کوے کو بال و پر نکل آئے۔ ندی اپنی روانی میں پہلے کی طرح چلنے لگی۔ گیہوں سب بٹور لیے گئے عاقفاں اور اس کے ماں باپ اپنے دکھ درد کو بھول گئے۔ پڑوسن کی ناک کا زخم سوکھ گیا چوہیا نے مورچہ جانی کے غم میں سر پر خاک ڈالنا نہ چھوڑا اور اسی طرح تمام عمر گزار دی۔


نیک تمناؤں کے ساتھ

**محمد فخرالدین اینڈ سنز**

جنرل مرچنٹ اور ڈیلرس حسامی لاکس رجسٹرڈ نمبر۔ 87856.

۱۵-۶-۵۷۱ بیگم بازار حیدرآباد - ۱۲ ...۵

فون نمبر۔ 352702 R.NO.4572

رقم ۱/

نمونۂ کلام

سکینہ بیگم

# نذرانۂ عقیدت

(میر عثمان علی خاں آصف سابع کے جلسۂ تعزیت کے موقعہ پر)

آہ کس منہ سے کہوں میں سو گیا شاہِ دکن
پاسبانِ سلطنت وہ شاہ ذیجاہ دکن

وہ کہ جس کی زندگانی سے درخشاں تھا دکن
وہ کہ جس کے نام سے تھی شانِ شاہانِ دکن

جس کی پیشانی سے تاباں تھے سعادت کے نشاں
جس کے ہر انداز سے تھی شوکت و سطوت عیاں

جس کے دستِ فیض سے سرشار تھے بے خانماں
جس کے در سے مل رہے تھے سب کو منزل کے نشاں

جس کا دل اپنے پرایوں کے لیئے بے تاب تھا
جس کے دستِ خیر سے ہر ایک بیاں سراب تھا

جس کے دم سے سینکڑوں ویرانیاں آباد تھیں
دل نوازی غمگسارِ خاطرِ ناشاد تھی

دستگیرِ بیکساں، و دردمندِ بیو گاں
کس قدر نازاں ہے تجھ پر آج یہ سارا جہاں

خدمتِ مخلوق و خالق تھی سدا پیشِ نظر
رحمتِ حق تجھ پہ نازاں ہو سدا اے دیدہ ور

"کھو کے سب الماس و گوہر اور کوہِ نور کو
حق سے پایا تھا دکن نے اک سراپا طور کو"

٥

# سکینہ بیگم صاحبہ کے چند مکاتیب

## بنام عبدالرزاق بسمل مدیر ماہنامہ شہاب

**بیگم پیٹھ۔ ۱۷/ اگست ۱۹۴۸ء**

مکرمی و محترمی جناب بسمل صاحب!

تسلیمات! عنایت نامہ موجب تشکر و سرفرازی ہوا اور اس کے پڑھنے سے قلبی مسرت ہوئی۔ میرے والدین سے ــــ جن کا دنیا میں شاید ہی کوئی ثانی ہو۔ آپ سے دوستانہ ملاقات و روابط تھے! یہ خبر میرے لیے باعثِ صد مسرت و شادمانی ہے۔ آپ تو ہمیشہ سے میرے بزرگ تھے لیکن مجھے امید ہے کہ آج سے آپ بھی مجھے اپنے زمرۂ عزیزاں میں شمار کریں گے۔

میری دانست میں یہی سبب ہوگا کہ مجھے شروع سے آپ کے مشاغلِ علمی، آپ کے ماہنامہ شہاب و بزمِ خواتین سے ایک اُنس، ہمدردی و دلچسپی رہی۔ روحانیت کی قائل ہوں اور کوئی تعجب نہیں کہ یہی پاک ہستیاں اس کی ذمہ دار رہی ہوں۔

اب مجھے یقین ہے کہ میرے علمی و ادبی مشاغل میں ایک نمایاں خصوصیت پیدا ہوگی اور مجھے امید ہے کہ آپ بحیثیت میرے بزرگ ہونے کے مجھے اپنی بیش بہا واسطے اور گراں قدر نصائح سے مالا مال کرتے رہیں گے۔

والدہ کے مضامین کتابی شکل میں شائع کر دار ہی ہوں۔ اس کے لیے ایک مختصر سوانح حیات لکھوانے کا قصد ہے۔ میرے بھائی علی میاں نے جس کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ شائع ہو جائے تو ایک نسخہ "رسائلِ طیبہ" آپ کی خدمت میں گذرانوں گی۔ والدہ کی دو ایک نامکمل کہانیاں ہیں جنھیں حسبِ خواہش صاف کر کے فوراً بزمِ خواتین کے لیے ارسال کروں گی۔

والدہ کی کتاب انوری بیگم آپ کی نظر سے گزری ہو گی۔ ایک جلد ہدیۃً پیش کر رہی ہوں۔ قبول کر کے مجھے ممنون فرمایئے۔

جہاں بانو لائق و سعادت مند خاتون ہیں۔ ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ صرف بزم خواتین ہی نہیں بلکہ تمام علمی پرچے ان کی علمی کاوشوں کی رہین منت ہیں اور کیوں نہ ہو، ذہن رسا اور مذاق سلیم رکھتی ہیں۔ میرے یہاں تو سر دست یہ سب چیزیں مفقود ہیں لیکن اب کچھ ہمت سی آ رہی ہے اور آپ کی خاطر اس میدان میں گام زن ہونے کی توقع ہے گو اس کے لیے تھوڑا سا عرصہ درکار ہو گا۔

یوں تو میں جانتی ہوں کہ یونی ورسٹی کی ڈگری لینا لیاقت و علم کی سند نہیں نہ اس سے لیاقت کا کوئی صحیح معیار قائم ہو سکتا ہے لیکن ساتھ ہی تھوڑی سی نوشت و خواند کے بعد اپنے آپ کو مدلل مضامین لکھنے کا ماہر سمجھ لینا بھی خالی از غلطی نہیں۔

سب رس میں آپ نے میرے مضامین دیکھے؟ وہ تو کہانیاں تھیں جو والدہ کی زبانی سنی تھیں۔ کہانیاں اور بھی ہیں جو والدہ نے جمع کی تھیں اور جن میں سے میرے یہاں کم و بیش ایک ہزار تو ہوں گی۔ کہیے تو بزم خواتین کے لیے بھی روانہ کروں۔ دقت صرف یہ ہے کہ ان کہانیوں کو مجھے بذاتِ خود صاف کرنا ہو گا۔ لیکن آپ کی خواہش ہو تو یہ بھی کرنے آمادہ ہوں۔

اس وقت رابعہ بیگم معلمہ محبوبیہ کی چند نظمیں مرسل ہیں انھیں اپنے پرچے میں جگہ دے کر ممنون کیجیے۔ حسبِ ہدایت والدہ کی کہانی ان شاء اللہ آدمی کے ہاتھ روانہ کروں گی۔ زیادہ نیاز۔

خاکسار: سکینہ بیگم

●

بنام جناب مولوی قاسم رضوی

---

کوہِ نور۔ کریم آباد ۔ ۱۱ر فروری ۱۹۴۲ء

محترمی ۔ تسلیم

میری عہد شکنی پر نہ معلوم آپ نے مجھے کتنی ملامت کی ہو گی اور

ممکن ہے میری وجہ سے بے چارے مسلمانوں پر عام طور پر عہد شکنی کا الزام عائد ہوا
آپ کی خفگی بجا۔ آپ کی ملامت درست اور آپ کی ناراضگی سر آنکھوں پر۔ میں بے
خطاکار ہوں لیکن خدا گواہ ہے کہ میری نیت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہوا نہ آئ
کبھی ہوگا۔ کتابیں برابر رکھی ہیں لیکن پہنچانے کے اسباب ہمیشہ ناسازگار رہے
زحمت نہ ہو تو اپنی صفائی میں چند کلمے تحریر کرنے کی جرأت کروں۔

میں نے کتابوں کی آپ تک رسائی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ پہلے تو مجلس
سالانہ جلسے میں خود لا کر دینے کا ارادہ تھا لیکن اس وقت میں دفعتاً بیمار ہو گئی او
جلسے ہی میں شریک ہو سکی نہ آپ کو کتابیں بھجوا سکی۔ پھر دوسرے ذرائع اور
تلاش کیے لیکن ہر ایک میں ناکام رہی۔ بالآخر نواب بہادر یار جنگ ہی کے وسیلے
نکالنے کا خیال بھی فسخ کر دینا پڑا کیوں کہ اس درمیان کچھ تو اپنی طویل علالت کے باعث
اور کچھ گوناگوں پریشانیوں کے سبب ایسی گھری رہی کہ آج تک اس سے کامل خلاصی
لیکن باوجود ان دشواریوں کے غالب کی زبان میں بقدرِ تصرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ :

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن وفائے عہد سے غافل نہیں رہا

اب اپنی بد عہدی کا اعتراف، اس پر اظہارِ شرمندگی اور معذرت اور ساتھ
ایفائے عہد کا ایک زریں موقعہ ہاتھ آیا ہے اس لیے بہ عجلت تمام اس سے فائدہ اٹھا

حامل ہذا مولوی میر محمد اصغر صاحب ہندوستان کو آپریٹیو انشورنس سوسائٹی
نمائندے اور کارکن کی حیثیت سے ممالک محروسہ کا دورہ کر رہے ہیں۔ مجھ سے تعار
خطوط کی خواہش ظاہر کی۔ اس ضلع میں میں بجز آپ کے کسی سے واقف نہیں سوا
آپ کی خدمت میں روانہ کر رہی ہوں۔ یہ مصداق ایک کام دو کاج۔ کتابیں بھی ان
ذریعے بھجوا رہی ہوں۔ براہ کرم اپنے دوست احباب اور سرکاری عہدہ داروں
ان کا تعارف کروا دیجیے۔ میں ممنون ہوں گی۔

خاکسار : سکینہ بیگم اہلیہ سید رحمت اللہ

## بنام محل نواب مہدی نواز جنگ بہادر

۱۰ / اپریل ۱۹۴۲ء
بخدمت گرامی محل نواب مہدی نواز جنگ بہادر
محترمہ!

اے آر پی ٹریننگ کا مرکز بنجارہ روڈ پر قائم کرنے کی تجویز ایک مبارک اور خوش آیند اقدام ہے اور یقینی کارآمد ثابت ہوگی۔ ہم سب ضرور یہ ٹریننگ حاصل کرنے آمادہ ہیں۔ بشرطیکہ ہم کو اپنے گھروں اور محلے ہی کی حد تک کام کرنے اور مدد پہنچانے کی اجازت دی جائے۔

معاوضے یا تنخواہ کی ہمیں ضرورت نہیں۔ صرف ضروری تعلیم و ہدایات ہماری رہبری کے لیے کافی ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آ سکیں نیز جو کچھ ہم سیکھیں اپنی غریب بہنوں تک پہنچا سکیں جس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

جنگ سے متعلق جو خطرات ہیں ان سے غریب عورتیں یکسر ناواقف ہیں اور ہم میں سے ایک اگر اپنے حدود کے غریبوں کو ان حقائق سے روشناس کرائے اور ضروری ہدایات وغیرہ سے آگاہ کر سکے (اور یہ جلد از جلد ہونا چاہیے) تو اس سے بڑھ کر کوئی خدمت نہ ہوگی۔

امید ہے کہ آپ اس امر کے لیے بھی کوشش فرمائیں گی کہ لکچر انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی ہوا کریں تاکہ ہماری ۷۵ فیصد وہ بہنیں جو انگریزی سے قطعی نابلد ہیں، اس ٹریننگ سے مستفید ہو سکیں۔

عملی ٹریننگ کے لیے ہسپتال جانے کی ضرورت میں سواری یا بس مقرر کروا دی جائے تو باعثِ سہولت ہوگا۔ ناچیز: سکینہ بیگم

## بنام جناب سید محمد حسین بلگرامی

۱۸ / فروری ۱۹۴۹ء

محترمی ـــــ ۲۸ / اسفندار کے مکرمت نامہ کی منت پذیری سے گیا

کم سعادت ہے کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ چاہے وہ کسی ضمن میں سہی لیکن اس وقت آ مجھے اپنی بداخلاقی پر شرم آرہی ہے کہ اتنے دن ہوگئے اور نوازش نامے کا جواب تک نہ دیا۔ یقین ہے کہ آپ معاف کردیں گے۔

وجہ یہ تھی کہ اس ہفتے اناطولیہ کی امداد میں کانسرٹ ترتیب دیتے جارہے تھے اور کیوں کہ میں نے کام کا ذمہ لیا تھا بے حد مصروف رہی۔ اس کے بعد مجالس اور محرمؑ کی مصروفیتوں نے موقعہ نہ دیا۔ آج فرصت ملتے ہی لکھ رہی ہوں۔

مولوی علی حیدر صاحب مرحوم سے میں خوب اچھی طرح واقف تھی۔ مرحوم سے مجھے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ ان کے داماد کے لیے کوشش کرنے ہر طرح آمادہ ہوں چناں چہ جب وہ میرے بھائی مسٹر نندی کا سفارشی خط لے کر آئے تھے تو واقعہ اور ان کے مطلوبات دریافت کیے جس کی بنا پر انھوں نے تفصیلی نوٹ بھجوانے کا وعدہ کیا۔

اب کُل واقعات مجھے معلوم ہوگئے ہیں۔ میں اپنی حد تک ضرور اس میں سعی کروں گی۔ باقی جو خدا کو منظور رہو۔ بے بی مالسوں سے بھی ضرور اس بارے میں کہوں گی اور سراکبر سے بھی موقعہ پاتے ہی خود مل کر اس کا تصفیہ کروالوں گی۔

لیڈی حیدری سے کہنا بے سود ہے۔ وہ آج کل سخت علیل ہیں۔ سراکبر نے جب وعدہ کیا ہے تو اس کا پاس بھی کریں گے۔

میں نے سر دست معتمدی کوتوالی و عدالت سے بھی اس کارروائی کے متعلق ضروری امور دریافت کیے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ کارروائی کس نوبت پر ہے اور اس کے لیے کیا ہوسکتا ہے میں اپنے طریقۂ کار سے آپ کو مطلع کروں گی۔

زیادہ نیاز

خاکسار — سکینہ بیگم

**بنام بشیر النساء بیگم بشیر صاحبہ**

میری محترم بہن!

تسلیم۔ رقعہ پہنچا، جس سے اس دور کی کش مکش تو ایک طرف، آپ کی

کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔ خدا بھلا کرے شعبے کی معتمد کا کہ آپ کی پریشانی کی نت نئی تدبیریں کیا کرتی ہیں ان اصلاحات کی پاداش میں بے چارے زور صاحب سے باز پرس ہوتی ہے۔

بات اصل یہ ہے کہ شکریہ ادا کرتے کرتے جی اکتا گیا۔ وہی کام بار بار کرنا ذرا صبر آزما ہوتا ہے۔ اسی لیے اس دفعہ میں نے یہ کام آپ کے سپرد کر دیا۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جو کام میں آپ سے کہوں وہ آپ بلا عذر بجا لائیں گی تو بس لیجیے میں نے یہ کام آپ کے لیے تجویز کیا ہے۔ ہاں اور ایک نظم کی بھی فرمائش کی ہے۔ مزید برآں میرے ساتھ ناگپور چلنے کی بھی درخواست کرنا چاہتی تھی لیکن اس دن آپ اجلاس میں نہ آئیں۔ مجھے تو خیال تھا کہ بھاوج کی علالت کے باعث نہ آئی ہوں گی لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ آپ کو اطلاع ہی نہ ہوی۔

چند روز قبل آپ کے آدمی (ملازم) نے ٹیلی فون پر مجھ سے گفتگو کی تھی اور میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ہفتے تک میں بے حد مصروف ہوں لیکن اس کے بعد کسی دن اور کسی وقت بھی آپ تشریف لا سکتی ہیں لیکن نہ آپ آئیں نہ کوئی پیام آیا۔

زور صاحب سے کل واقعات کا علم ہوا۔ آپ کل صبح یا شام تشریف لا سکتی ہیں۔ ان کا مزاج کل سے ٹھیک نہیں ہے۔

خاکسار — سکینہ

بہترین تمناؤں کے ساتھ

ہلال ٹرنک فیکٹری

سدی عنبر بازار حیدرآباد

اسٹیل کے پائیدار ٹرنکس، بکسیس، گرین ڈرم اور جنرل آرڈر سپلائی

# ڈاکٹر زور بنام سکینہ بیگم

● سکینہ بیگم صاحبہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسوان کی معتمد اور ادارۂ سب رس کی مجلس ادارت کی رکن تھیں۔ ڈاکٹر زور سے ان کے گھر سے خاندانی مراسم بھی تھے۔ ذیل ہم ڈاکٹر زور کے وہ خطوط شائع کر رہے ہیں جو انھوں نے سکینہ بیگم صاحبہ کو تحریر تھے۔ یہ خطوط ہمیں سکینہ بیگم صاحبہ کی صاحب زادی طیبہ بیگم صاحبہ نے عنایت کیے ہیں، جن کے لیے ہم ان کے شکرگزار ہیں ———— (ادارہ)

---

ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد، حیدرآباد دکن

محترمہ

ادارے کے شعبۂ نسوان کے متعلق میں نے تفصیلی معلومات لطیف النسا بیگم صاحبہ بی اے کی زبانی کہلا بھیجی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پوری طرح نہیں سمجھایا۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ ادارے کی طرف سے مختلف کاموں کے لیے مختلف ذیلی کمیٹیاں شعبے بنا دیں تاکہ مختلف اصحاب ادارے کے کاموں میں دلچسپی لیں اور اس طرح ملک اور زبان واقعی کوئی مخلص خدمت ہو سکے۔ ان کمیٹیوں میں ایک داعی ہوگا جس کا کام مہینہ میں کم از کم ایک دفعہ اپنے یہاں کمیٹی کرتا ہوگا اور اس کمیٹی میں جو تصفیے ہوں اس سے معتمدِ ادارہ کو مطلع کرنا تاکہ رسالہ میں شائع ہو اور دیگر ضروری کارروائی کی جائے۔

آپ شعبۂ نسوان کی داعی ہیں۔ آپ کے علاوہ اور چار اراکین ہوں گے جن میں سے دو تین کے نام ادارے ہی نے آپ کے غور کے لیے آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں رکھیں چاہیں تو نہ رکھیں۔ کسی اور کو جو آپ کے ساتھ مل کر کام کر سکیں اس کمیٹی کے رکن بنا لیں۔

یہ کمیٹی مہینے میں ایک بار بیٹھے اور نسوانی ادب کے متعلق غور و خوض کر کے اپنے تجاویز پیش کرے۔ مثلاً دکن کی عورتوں کی تصنیفات و تالیفات کی اشاعت یا ان کی حفاظت یا ان کی امداد وغیرہ۔ بہرحال مسائل خود کمیٹی کے ذہن میں آتے جائیں گے۔ کام کا آغاز تو فرما دیں۔

ہاں اگر آپ کسی مرد کو شریک نہ کرنا چاہتی ہیں تو کمیٹی پر نصیر الدین ہاشمی صاحب کے نام کی ضرورت نہیں۔ آپ اور دوسری خواتین کو منتخب فرما کر مجھے مطلع کریں تو میں ادارے کی طرف سے ان کے نام رکنیت تبدیل کرنے کی درخواست روانہ کروں گا۔

بہرحال یہ معاملہ اہم ہے اور جلد کام کرنے کی ضرورت ہے۔ براہ کرم جلد جواب سے مطلع فرمائیں۔

سید محی الدین قادری زور

۱۲ر آبان ۴۷ف

---

ماہ نامہ سب رس، ادارۂ ادبیات اردو،

رفعت منزل خیریت آباد، حیدرآباد دکن

محترمہ!

ادارے کی رکنیت اور کتب خانہ کی امداد کے مطبوعہ فارم سو سو عدد آپ کے شعبہ کے لیے مرسل ہیں۔ امید ہے کہ اپنے حلقۂ اثر اور اراکین شعبہ کے توسط سے آپ ان فارموں کو تقسیم کر کے ان پر مختلف خواتین اور اصحاب کے دستخط حاصل کر سکیں گی۔ خواتین کی رقمیں تو آپ ہی شعبۂ نسواں میں جمع کر لیں۔

"رسائلِ طیبہ" کے اخراجات آپ پورے دینا چاہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نصف آپ دیں اور نصف ادارہ۔ اس بارے میں کتابت اور کاغذ کی رقمیں ادا کرنی ہیں۔ اب تک جو اخراجات ہوئے ہیں ان کے نصف آپ کو لکھ بھیجوں گا تاکہ آپ روانہ کر دیں۔ کاغذ کی رقم تقاضا بھی ہے۔

میری صحت بہت خراب ہے۔ تین روز سے نزلہ ہو گیا تھا۔ اب بخار اور چھاتی میں درد ہے۔ دعا فرمائیے۔ بورڈ واپس کرنا ہے۔ مدرسہ کا تقاضا ہے۔

"حضرت" والا مضمون نکالا گیا۔ اس پر مضمون نگار کا نام نہیں ہے۔ "خیر اندیش" لکھا گیا ہے۔ اس قسم کے فرضی نام کے مضمون سب تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اگر مضمون نگار کا نام معلوم ہو تو مطلع فرمائیے تاکہ چھاپ دیں، ورنہ تلف کر دیں گے۔

ا۔ رابعہ بیگم صاحبہ کی کتاب "سوتیلی ماں" کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ اس پر آپ دو صفحہ کا پیش لفظ یا دیباچہ لکھ دیں ۲۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ کی کتاب کو چھپوایا جائے یا آپ سے کوئی جواب نہیں دیا۔ براہ کرم مطلع فرمائیے۔ ۳۔ مسز واکر کی تقریر کا ترجمہ آپ کی والدہ صاحبہ نے کیا تھا لکھا جا چکا ہے۔ اس کو رکھیں یا نکال دیں۔ براہ کرم جلد عنایت ہوں۔

مخلص: سید محی الدین قادری زور

۱۸ مہر ۱۳۴۸ف

---

رفعت منزل، خیریت آباد

جناب محترمہ!

کرم نامہ، مضامین اور ہمدردی کا شکریہ۔

آپ کی چڑیا کی کہانی اس "سب رس" میں شائع ہو گئی ہے۔ دوسری کہانیاں ضرور روانہ فرمائیں۔ ان کی بے حد ضرورت ہے۔

آپ کی والدہ صاحبہ مرحومہ کی کہانیاں اور انگریزی قصے کا ترجمہ بھی ضرور روانہ اور موخرالذکر کی تکمیل فرما دیں۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو ان کی کہانیاں ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے کتابی صورت میں شائع کی جا سکتی ہیں۔ آپ انھیں جلد مرتب کر کے روانہ فرمائیں۔

بچوں کے "سب رس" کے پورے پرچے ہاشم صاحب کے ذریعہ سے کل روانہ ہو رہے ہیں۔ آج نیا پرچہ بھی مرسل ہے۔ آپ سب اس کی توسیع اشاعت میں بھی حصہ لیجئے۔ جواب دینے میں تعویق ہوگئی۔ امید کہ معاف فرمائیں گی۔

آپ کا۔ سید محی الدین قادری زور

۲ر جولائی ۴۸ء

---

ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد

محترمہ!

آپ کے عنایت نامہ کا شکریہ۔ کتاب انوری بیگم وصول ہو

میرے یہاں دو جُدا جُدا مطبعوں کے نسخے چھپے ہوئے ہیں۔ میں نے حیدرآباد کے جملہ مصنفین و مولفین کی مطبوعات اور قلمی نسخوں کو اپنے یہاں محفوظ کر لینے کا انتظام کیا ہے اور قریب میں ایک پبلک کتب خانہ کی عمارت بنانے والا ہوں جس میں دکن کی یہ سب چیزیں محفوظ ہو جائیں گی۔

ترجمہ اب تک وصول نہیں ہوا لیکن اگر یہ طویل ہو تو کیوں نہ کتاب کی صورت میں شائع کریں کیونکہ سب رس میں طویل مضامین دو قسطوں سے زیادہ کے نہیں شائع کیے جاتے۔

آپ کے حسبِ ارشاد افندی بیگم کے صفحہ ۱۹۱ سے اقتباسات سب رس میں کسی وقت ضرور شائع کیے جائیں گے۔

آپ کے حسبِ خواہش آئندہ سے صرف سکینہ بیگم لکھا جائے گا۔

آپ کا — سید محی الدین قادری زور

۵ رجولائی ۳۸ء

سب رس ماہنامہ ادارۂ ادبیات اردو
خیریت آباد، حیدرآباد

محترمہ!

حسبِ ارشاد نواب عقیل جنگ بہادر کے لیے سب رس کے پرچے اور بیگم سراج یار جنگ اور سید نقی بلگرامی صاحب کے لیے گریہ و تبسم کی دو جلدیں اور آپ کے لیے سیرِ گلکنڈہ کی دس جلدیں "اردو شہ پارے" "خدیجہ" اور فضل الرحمن صاحب کے ڈرامے مرسل ہیں۔ ان کی قیمتیں الگ کاغذ پر لکھوا کر بھیج رہا ہوں۔ جیسے وصول ہو جائیں روانہ فرما دیں۔ ہاں عقیل جنگ بہادر اور بیگم سراج یار جنگ اور سید نقی صاحب کے یہاں آپ ہی رسالے اور کتابیں بھیج کر قیمت منگا لیں تو سہولت کا باعث ہوگا کیونکہ ہمارے آدمی آج کل رسالے کی تقسیم میں مصروف ہیں۔ امید کہ زحمت گوارا فرما لیں گی۔ [illegible] اور ہندی کلام وغیرہ بعد میں بھجوا دوں گا۔

سعادت علی صاحب کی نظم اور دوسرے مضامین وصول ہوئے شکریہ۔ فرانکن اسٹائین کا ترجمہ حسبِ خواہش واپس ہے۔ بعد تکمیل ضرور روانہ فرمائیں۔ ابھی سرسری دیکھا اس میں تو ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ فرصت ملے تو مکمل کر لیجیے اچھی چیز ہے۔

"آپ اپنی والدہ صاحبہ کے جو مضامین وغیرہ چھپوانا چاہتی ہیں" ان میں ضرور ہر طرح کی مدد کرنے تیار ہوں۔ کتابت، طباعت وغیرہ مہربانیاں ہیں۔ وہاں کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کتابیں آپ چھپوا کر مطبوعات ادارہ میں شامل کر دیں، جیسا کہ دوسرے اصحاب نے کیا ہے۔ اس سے ان کی کافی شہرت ہوگی اور آپ کے خلوص اور علمی خدمت کا ادارہ ممنون بھی ہوگا۔ یا جیسا آپ مناسب سمجھیں۔

مخلص: سید محی الدین قادری زور
۴ر اگست ۳۸ء

---

سب رس، ماہنامہ ادبیات اردو
خیریت آباد، حیدرآباد (دکن)

محترمہ!

یاد فرمائی کا شکریہ۔ میں اس اثنا میں خود علیل رہا ورنہ خود یاد دلاتا رابعہ بیگم صاحبہ کا نام اس شعبہ کے لیے بے حد موزوں ہے۔ وہ داعی نہ بھی بنیں تو رکن ضرور بنا لیجیے۔ میری رائے میں داعی تو خود آپ بنا رہیں۔ پھر جو آپ سب کی مرضی۔ آپ اگر داعی ہوں تو مراسلت میں بھی بڑی سہولت رہے گی۔ نیز میں اپنے تجربہ کی بنا پر بھی یہی سمجھتا ہوں کہ آپ سے بہتر یہ کام فی الحال کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بہرحال جو بھی داعی ہوں کام تو شروع فرما دیں۔ ہاشمی صاحب نے مذاق سے ایک دفعہ کہا تھا۔ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں — اب شعبۂ نسوان حسب ذیل چار اراکین پر مشتمل ہوگا۔

۱۔ سکینہ بیگم صاحبہ ۲۔ لطیف النساء بیگم صاحبہ
۳۔ رابعہ بیگم صاحبہ ۴۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ

ان میں سے اول الذکر دو میں سے کوئی ایک داعی رہیں۔

براہ کرم بہت جلد کمیٹی کر لیجیے اور اس میں یہ امور زیر غور رہے۔

۱۔ حیدرآباد کی اہل قلم خواتین کی ایک فہرست بنائی جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اور کون ادارے کے ساتھ تعاون کر سکتی ہیں۔

۲۔ فی الحال کوئی کام اشاعت کے لیے تیار کر لیا جائے تاکہ شعبۂ نسواں کی زندگی کا عملی ثبوت کسی مطبوعہ کتاب کی شکل میں پیش ہو جائے۔

۳۔ رسالے میں نسواں کی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین کی فراہمی کی کوشش

ہونی چاہیئے۔

اس قسم کی باتیں پہلے بھی ایک دفعہ لکھ چکا ہوں ان کو بھی نظر میں رکھیے۔

آپ کی والدہ مرحومہ کی کسی غیر مطبوعہ تصنیف یا تالیف یا مجموعہ مضامین سے بھی اشاعت کا کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ میں آپ کی کمیٹی کی روئداد کا منتظر رہوں گا۔

سید محی الدین قادری زورؔ

۲۲ ؍ اکتوبر ۳۸ء

رفعت منزل

---

محترمہ!

میں ادارے کی طرف سے آپ کا خاص طور سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے زحمت فرما کر اس علمی و ادبی کام میں ہاتھ بٹانے کی زحمت قبول فرمائی اور عملی طور پر کام کا آغاز کر دیا۔ خدا کرے کہ جس خوبی سے آغاز ہوا ہے اسی طرح یہ کام جاری رہے اور ہم اپنے ملک اور زبان کی خدمت کر سکیں۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ اس خدمت میں صنفِ نازک بھی برابر کی شریک ہو گئی ہیں اور خاص کر شعبۂ نسوان کے جملہ اراکین اور داعی سب مخلص، نیک دل، راست باز اور جذبۂ عمل سے سرشار ہیں۔

لطیف النساء بیگم صاحبہ کی نظمیں میرے یہاں موجود ہیں۔ چناں چہ اسی مجموعہ میں سے ہر رسالہ میں ایک نظم شائع کی جاتی ہے اور ان کا خیال ہے کہ اکثر و بیشتر نظمیں رسالے میں چھپ جائیں تو پھر مجموعہ کتابی صورت میں چھپے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اچھا خیال ہے ورنہ ہمیں نظمیں غیر مطبوعہ کم ملیں گی۔ البتہ آپ کی والدہ صاحبہ مرحومہ کے مضامین جلد صاف کروا کے چھپوا دیجیے۔ میں تو چاہتا تھا کہ یہی کتاب اس شعبہ کی پہلی کتاب ہو۔

اب میں آپ کی مرسلہ روئداد کے لحاظ سے جواب دیتا ہوں۔

۱۔ اہلِ قلم خواتین کی فہرست میں اضافہ ہو سکتا ہے اگر اور غور کیا جائے۔ جن سترہ خواتین کے نام آپ نے لکھے ہیں ان کے یہاں ایک اطلاع روانہ کی جا سکتی ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسوان کی رکن بن جائیں اور اگر رکن بنانا فی الحال ضروری نہیں ہے تو اُن سے مضامین وغیرہ روانہ کرنے کے لیے لکھیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو خواتین دکنی نمبر آپ چھاپنا چاہتی ہیں اس کے لیے مضامین آپ ان ہی سے منگوائیں گی۔

بہرحال جو خط آپ انھیں لکھیں اس میں شعبے کے اجلاس کا حوالہ دیتے ہوئے رکنیت کی استدعا اور علمی و ادبی معاونت کی درخواست کی جاسکتی ہے۔ آپ اگر ان کی نقلیں نہیں کرا سکتیں تو میرے یہاں مسودہ روانہ فرما دیں میں نقلیں آپ کے یہاں بھجوا دوں گا مگر مراسلت آپ ہی کریں۔

آپ کے خط کے ساتھ ادارہ کے قواعد و ضوابط بھی بھیجے جاسکتے ہیں جن میں رکنیت کا چندہ وغیرہ بھی درج ہے۔ اس کی پچیس کاپیاں معہذا مرسل ہیں۔

۲۔ یہ رائے اچھی ہے۔ آپ جلد مضامین جمع کر لیجیے۔ ان کو کتاب کی صورت میں شائع کر دیں گے اور "سب رس" کے خریداروں کو رعایتی قیمت سے یہ کتاب دی جائے گی۔

حسبِ خواہش "سب رس" کے دکن نمبر میں خواتین کے مضامین شریک نہ ہوں گے جو مضامین ہمارے یہاں آئیں گے، آپ کی خدمت میں بھیج دیے جائیں گے۔

۳۔ نسوانی فلاح و بہبود کے مضامین "سب رس" کے لیے جمع کرنا ضروری ہے اس بارے میں بھی اپنے خط (جس کا ذکر نمبر ۱ میں ہے) میں تذکرہ کر دیجیے۔

۴۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ آپ نے سارہ بیگم صاحبہ کو رکن منتخب کر لیا۔ آپ ہی ان کو مطلع فرما دیں یا اگر ضرورت ہو تو میں خود بھی لکھنے تیار ہوں۔

۵۔ شعبۂ نسواں کا اجلاس آپ جب چاہیں منعقد فرما سکتی ہیں کیوں کہ اس میں معتمدِ ادارہ شریک نہیں ہوتے۔ اصل وقت دوسرے شعبوں کے اجلاسوں کی ہے جن میں بحیثیت معتمدِ ادارہ شریک رہتا ہوں۔

---

ہر شعبہ کے لیے جو قواعد و ضوابط ادارہ کی مجلسِ عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۳ر اکتوبر ۳۸ء میں منظور کیے ہیں، آپ کی اطلاع کے لیے مرسل ہیں۔

آپ کے شعبے کی طرف سے جتنے نسوانی اراکین ادارہ کے رکن ہوں گے اتنا ہی اچھا ہے آپ کا شعبہ ان جملہ نسوانی اراکین کی مجلسِ انتظامی کا کام دے گا۔ یعنی ادارہ کے جملہ اراکین نسواں کے ترجمان آپ ہی پانچ خواتین ہوں گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جوں جوں کام بڑھتا جائے گا، ہمیں نئی باتیں معلوم ہوں گی اور نئے مسائل پیش آئیں گے اور ان کے لحاظ سے ہم قاعدہ یا قانون روانی کار کی خاطر

بناتے رہیں گے۔

پھر ایک بار آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس خط کو ختم کرتا ہوں۔

آپ کا: سید محی الدین قادری زور

۶ر نومبر ۳۸ء

سلسلۂ ادبیات اردو، رفعت منزل،
خیریت آباد، حیدرآباد (دکن)

محترمہ!

میں خود صبح ہی ان خطوط کو روانہ کر دینا چاہتا تھا مگر کالج کے کام کے خیال میں بھول کر چلا گیا۔ معاف کیجیے۔

آپ کے شعبے کا جلسہ شاید آئندہ ہفتہ میں ہوگا۔ اس وقت تک بعض باتیں سوچ کر لکھوں گا۔ فی الحال حسب ذیل امور کا خیال رکھیں۔

اس میں سوائے لطیف النساء بیگم، جہاں بانو بیگم کے کسی رکن نے تصنیف کے سلسلے میں کام نہیں کیا ہے۔

۱۔ جملہ اراکین سے دریافت کیا جائے کہ انھوں نے شعبہ کے گذشتہ تصفیوں کے سلسلے میں کیا کام کیا ہے۔ ہر ایک کے کام کو نوٹ کر لیا جائے۔ اور مزید کام کے لیے استدعا کی جائے اور کام سپرد کیا جائے۔

۲۔ علمی دلچسپی رکھنے والی اراکین کی فہرست گذشتہ کی تکمیل۔

۳۔ اگر علاحدہ کتاب نہ بن سکتی ہو تو "سب رس" کے ساتھ ضمیمۂ نسواں شامل کر دینے کا تصفیہ۔

۴۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو شعبہ کے لیے فنڈ جمع کرنے کی تجویز کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ابتداءً عطیے حاصل کریں۔ مثلاً ایسی خواتین سے مل کر یا بذریعۂ تحریر استدعا کی جا سکتی ہے جو عطیہ دے سکتی ہیں۔

مثلاً مختلف سمستانوں کی رانیاں اور پائیگاہوں کی بی بیاں — اور دیگر متمول اصحاب یا عہدے داروں کی بیگمات۔

۵۔ ایسی بیگمات کی فہرست تیار کر لینا جن کو شعبہ کا اعزازی رکن یا معاون بنایا جا سکے۔

مثلاً شہزادی صاحبات۔ لیڈی حیدری۔ لیڈی ولی الدولہ وغیرہ۔

۶۔ حیدرآباد کی مشہور خواتین (زمانہ گزشتہ و حال) کا ایک تذکرہ مثلاً خونزہ ہمایوں، والدۂ اسمٰعیل عادل شاہ۔ بلقیس زمانی والدہ محمد قطب شاہ۔ حیات بخشی بیگم والدۂ عبداللہ قطب شاہ۔ چاند سلطانہ، زوجہ علی عادل شاہ اول۔ خدیجہ سلطانہ، زوجہ محمد عادل شاہ۔ بھاگ متی حیدر محل، محل محمد قلی قطب شاہ۔ تارا متی خورشید بی بی، محل سلطان محمد قطب شاہ پیما متی محل جنتی، محل عبداللہ قطب شاہ۔ جہاں پرور بیگم، زوجہ سکندر جاہ آصفجاہ ثالث ماہ لقا بائی چندا، مشہور شاعرہ۔

زمانۂ جدید :

مثلاً سلطان بیگم صاحبہ، رقیہ بیگم صاحبہ، شہزادی درِ شہوار، شہزادی نیلوفر، طیبہ بیگم، سیدی الماس جاہ، لیڈی ولی الدولہ، صغرا بیگم، لیڈی حیدری، مسز نائیڈو، عاصمہ بیگم۔ دیگر ہندو اور پارسی عورتیں۔

اس تذکرہ کا ہر مضمون ایک انشا پرداز خاتون کے سپرد کر دیا جائے یا ایک سے زیادہ مضامین کسی ایک ہی کے سپرد کیے جاسکتے ہیں

۷۔ بعض انشا پرداز خواتین کے مجموعوں کی اشاعت کا کام مثلاً طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے مضامین اور کہانیاں۔ لیڈی حیدری کی تقریریں۔ اکثر خطبات یا مضامین یا تحریریں۔

۸۔ زنانہ لٹریچر کی تیاری۔ مثلاً : (براہ کرم اس کی وضاحت کی جائے)

۱۔ ایک مجموعۂ نظم کی ترتیب، جس میں بعض ایسی اردو نظمیں شریک کی جائیں جو شریف بیویوں اور ان بیاہی بچیوں کے لیے ضرور مطالعہ میں آسکتی ہیں۔

۲۔ امورِ خانہ داری سے متعلق کتابیں لکھنا یا دوسری زبانوں سے ان کا ترجمہ کرنا۔

۳۔ دوسرے ملکوں میں عورتوں کی مزدورتوں کے لیے جو کتابیں چھپتی جارہی ہیں ان کی فراہمی کی کوشش اور ان سے اخذ و اقتباس کرکے کتابیں یا رسالے کے لیے مضامین تیار کرنا۔

۹۔ رفتہ رفتہ ایک ایسے کتب خانہ کے قیام کی کوشش، جہاں عورتیں بے تکلف جاکر مطالعہ کرسکیں یا جہاں سے انشا پرداز خواتین کو کتابیں مستعار دی جاسکیں۔

بہرحال کام بہت ہے۔ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسی کام کی لڑکی

مل سکے جو آپ کی مددگار ثابت ہو تو اچھا ہے۔ امدادی وظیفہ دے کر کسی کو ہفتہ میں دو روز آکر کام کرنے کے لیے مقرر کیا جا سکتا ہے۔

رقم کی فراہمی کسی نہ کسی وقت شعبۂ نسواں کے لیے ضروری ہوگی۔ اس میں ادارہ بھی مدد کر سکے گا لیکن پہلے شعبۂ نسواں خود اس کا آغاز کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ کام شروع ہو جائے تو اس شعبہ کو سرکار سے امداد بھی مل سکے گی۔ محکمہ جات، سیاحیات و تعلیمات سے مختلف اداروں کو رقمی امدادیں ملتی ہیں۔ امکان ہے کہ شعبۂ نسواں کو بھی مل جائے لیکن محض سرکاری امداد کی توقع پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔

آخر میں مجھے آپ کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ آپ نے کل زحمت فرما کر مجلسِ داعیان میں شرکت کی اور اگرچہ میں آپ کے لیے خاطر خواہ انتظام نہ کر سکا لیکن آپ نے گوارا کر لیا اور خود زحمت اٹھائی۔ مجھے بڑی ندامت ہے۔

آپ کے جذبۂ عمل اور خلوص اور سنجیدہ نقطۂ نظر کا مجھ پر خاص اثر ہوا اور میں خود کو قابلِ مبارک باد سمجھتا ہوں کہ آپ میرے اس بے غرض اور مخلص علمی و ادبی کام میں خود بھی بے غرضی اور خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹا رہی ہیں۔

آپ کا : سید محی الدین قادری زورؔ

۲۵ر نومبر ۳۸ء

---

جلسہ نامہ سب رس، ادارۂ ادبیاتِ اردو،
رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد دکن

محترمہ!

آج اخبار میں سید رحمت اللہ صاحب کے جائزۂ نائب معتمدی کی خبر دیکھی۔ جی خوش ہوا۔ میری طرف سے مبارک باد کہیے۔ خدا کرے وہ جلد معتمد ہو جائیں اور ملک کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچے۔ اگر ہم دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری زندگی کا مصرف پورا ہو گیا۔ بے فیض زندگی کا عدم اور وجود برابر ہے۔

آج صبح لطیف النساء بیگم صاحبہ تشریف لائی تھیں۔ ان کے ذریعے سے مزید کن کے نسخے بعد سب رس کے بڑے اور چھوٹے پرچوں کے فائل، ادارے کی جلد (۱) کتابیں کا

ایک ایک نسخہ اور سیرِ گولکنڈہ اور گولکنڈہ کے ہیرے کے پچیس پچیس (۲۵) نسخے روانہ کیے گئے۔ ان کو خود فروخت کے لیے (۱۰) نسخے نذرِ دکن بھی دیے گئے۔

نذرِ دکن کا کل صرفہ (۱۷۵) ایک سو پچھتر روپے ہوا۔ کتابت (۴۰/-)، طباعت (۵۰/-) کاغذ (۵۰/-)، جلد بندی (۳۵/-) جملہ: ۱۷۵/- آپ کے شعبے کے نوٹ پیپر بھی کل چھپ کر آجائیں گے۔ جو روانۂ خدمت کر دیے جائیں گے۔ یہ ابتدائی رقم دو سو روپیہ تک، ادارہ کی طرف سے شعبہ کی نذر کیجیے۔ اگر کسی وقت شعبہ کی مالی حالت اچھی ہو جائے تو شعبہ چاہے تو واپس کرے ورنہ نہیں۔ البتہ نذرِ دکن کی فروخت سے جو رقم وصول ہو اسی سے دوسری کتابیں مثلاً ہماری معاشرت' از لطیف النساء بیگم صاحبہ شائع ہوں گی۔ (یہ نام آپ کو پسند ہو تو رکھا جائے ورنہ جو آپ تجویز فرمائیں)

اس خط کے ساتھ ادارے میں جو کتابیں قابلِ فروخت ہیں ان کے چند چند نسخے آپ کے اجلاس کی زینت اور ہو سکے تو فروخت کے لیے مرسل ہیں۔ کسی ذمہ دار خاتون کو یہ کام سپرد کیجیے اور ان کی مدد کے لیے پانچ سات گرل گائیڈس کو دیجیے تاکہ رقم اسی وقت وصول ہو جائے۔ قرض کا حساب ہی نہ رکھیں تو مناسب ہے۔ ہاں اگر کوئی اعتبار کی بی بی ہوں تو آپ کی مرضی۔ جتنی رقم فروخت کتب سے اس روز وصول ہوگی اس کا پچیس فی صد شعبہ کو دیا جائے گا کیوں کہ اتنا کمیشن ہم کتب فروشوں کو دیتے ہی ہیں تو شعبہ کیوں محروم رہے۔

فروخت کی کتابوں کی فہرست مع قیمت مرتب کر کے اس کے کئی نسخے ٹائپ کرا کے بھیج رہا ہوں تاکہ وہاں مختلف جگہوں پر لگائیں یا گائیڈس کے ہاتھوں میں دیں تاکہ خواتین قیمت دریافت کرنے کو فوراً جواب دیا جا سکے۔ جو خواتین رقم نہ لائی ہوں ان سے آرڈر لے کر گھر پر کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں۔

مجھے اس کا افسوس ہے کہ پیام میں خبر کو مسخ کر کے شائع کیا گیا۔ دوسرے اخبارات میں صحیح چھپا۔ نہ معلوم پیام نے عمداً ایسا کیا یا کیا۔ کیوں کہ ہم غریب ملکیوں کے کام ان کی نظر میں مسخ کرنے ہی کے قابل ہیں۔

ہاں میں چاہتا ہوں کہ اخباروں میں اس اجلاسِ عام کی پھر خبر پروگرام کے ساتھ شائع ہو۔ جلسے کا پروگرام بہ نظام الحق لکھ دیجیے تو دکن نیوز کے ذریعے چھپ

جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حسبِ ذیل نظام العمل ہوگا۔ خانہ پُری کر دیجیے۔

تحریکِ صدارت محترمہ

تائید "

خطبۂ صدارت " لیڈی حیدری صاحبہ

گلپوشی صدر " جہاں بانو بیگم صاحبہ (بی اے)

تقریر ( عنوان ؟ ) " رابعہ بیگم صاحبہ

نظم ( ؟ ) " بشیر النساء بیگم صاحبہ

تقریر (اغراض و مقاصد شعبہ و ادارہ) " لطیف النساء بیگم صاحبہ

نظم ( ؟ ) " قمر النساء بیگم صاحبہ

شکریہ " سکینہ بیگم معتمد شعبہ

براہ کرم اس پروگرام کو لکھ کر کل صبح ضرور بھجوا دیں۔

مخلص : سید محی الدین قادری زورؔ

۱۴ر فروری ۳۹ء

...رہ ادبیات اردو

...ت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد

محترمہ!

یہ کتاب بہت چھوٹی سائز کی ہے۔ اس میں طباعت ... ورنہ تو بہت ہوگا لیکن حجم بہت زیادہ ہو جائے گا۔ اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے بھی پسند ہے۔ کیونکہ ...ناپسند تو آپ کی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جا سکے کہ کل اور آج جو جملہ چار مضامین دیے گئے ...، ایسے اور کتنے مضامین ہوں گے تو میں اندازہ لگا لوں گا۔

یہ کتاب ۱۴۳ صفحات کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنے حجم میں دس بارہ مضمون اچھی ...ح آجائیں گے۔ فی مضمون اوسطاً بارہ صفحوں کا اندازہ ہے۔ بعض مضمون کم بھی ہوں گے ...پ مہربانی کر کے پہلے سب مضمون بھجوا دیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مکان کے کام ...بے حد مشغول ہیں لیکن یاد رکھیے کہ مشغولیت ہی میں جیسے اچھے اور جیسے کامیاب کام ...تے ہیں فرصت میں نہیں ہوتے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں جتنا زیادہ مشغول رہتا ...ہا اتنا ہی زیادہ اچھے کام انجام پاتے ہیں۔ اس لیے آپ اس خشت و گل اور

چوب و آہن کی مصروفیت کے ساتھ اس علمی اور ادبی کام کو بجالاتے جاییے۔ دو ڈ ایک ایک مضمون پر نوٹ لکھ ڈالیے اور میری طرف سے مولوی سید رحمت اللہ صاحب سے معافی چاہیے کہ میں اپنے وعدہ (چار ماہ کی مہلت) کے خلاف یہ کام کرا رہا ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ آپ سے یہ ہو سکتا ہے۔ شاید اسکاٹ نے لکھا تھا:

ONE CROWDED HOUR OF A GLORIOUS LIFE

IS WORTH A WORLD WITHOUT A NAME IS LIFE.

مجھے الفاظ ٹھیک یاد نہیں رہے۔ مطلب واضح ہے تو میں اسی مرسلہ کتاب کی سائز پر کتابت شروع کرا دیتا ہوں۔

نوٹ: خط لکھ چکا تھا کہ کتاب کے ابتدائی صفحہ پر نظر پڑی جس میں آپ نے یہ کتاب اپنی مہربانی سے بطور ہدیہ کے روانہ کی ہے۔ اس لطف خاص کا شکریہ قبول فرمایئے۔

مخلص: سید محی الدین قادری زور

۱۳-۳-۳۹ء

رفعت منزل، خیریت آباد

محترمہ!

کرم نامے کا شکریہ۔ آپ کی جملہ تصویریں مرسل ہیں۔ صرف علی یاور جنگ بہادر کی تصویر میرے یہاں رہ گئی ہے۔ اس کا بلاک ابھی نہیں بنا۔ اب حسب ارشاد اسی کو بھجوا دیتا ہوں۔

میں نے صبح میں غلطی سے "خط" لکھ دیا۔ مطلب اس مضمون سے ہے جو فارسی میں ہے اور کوئی تقریر معلوم ہوتا ہے۔ یہ کب اور کہاں کی گئی تھی، اس پر ایک نوٹ تحریر فرما دیں تو اوپر ابتدا میں درج کرا دیں۔ کاپی روک لی گئی ہے۔ اس کا عنوان بھی نہیں معلوم۔

شعبۂ نسواں کے بعض جلسے ادارے کے دفتر میں بھی ہوں تو مناسب ہے تاکہ لوگ اصل ادارے کے کام وغیرہ کو بھی دیکھ سکیں۔ یہاں جو لوگ بھی آتے ہیں، اثر لے کر جاتے ہیں، ہم اس دروازے کے پیچھے کا پورا حصہ آپ کے قبضہ میں دے دیا کریں گے۔

رہ ہیچے کا وقت مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ بعض خواتین اپنے اپنے محلوں

میں افطار وغیرہ کا انتظام اسی وقت کرتی ہیں اس لیے چار بجے یا اس سے قبل کا وقت رکھیے تاکہ وہ افطار کے وقت تک واپس ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ خواتین کو اطلاع دیجیے۔ نصف یا تین چوتھائی تعداد تو آجائے گی۔

آپ نے رقعوں کا مسودہ نہیں بھیجا۔ وہ بھجوا دیجیے تو ٹائپ کرا دوں۔ اگر جلسہ آپ ہی کے یہاں ہو تو مناسب یہ ہے کہ ادارے کی جملہ کتابیں اور ان کے رکھنے کے لیے دو والٹ اسٹانڈ بھیج دوں تاکہ حاضرین کو معلوم ہو سکے کہ اس ادارے کی طرف سے اب تک کیا کیا چھپا ہے کچھ تو دلچسپی ہو۔ اگر مناسب سمجھیں تو مسز ہمایوں مرزا کو بھی بلالیں۔ اشک شوئی ہو جائے گی شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کی جملہ اراکین کی شرکت ضروری نہیں ہے۔ اصل مطلب تو یہ ہے کہ ہر وقت نئی خواتین آئیں اور کچھ تاثرات لے جائیں۔ لطیف النسا بیگم کو ضرور بلا لیجیے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ آپ کو لکھنے بیٹھتا ہوں تو قلم رُکتا ہی نہیں ہے۔

مخلص : سیّد محی الدین قادری زورؔ

۱۳-۱-۴۹ ف

ادارہ ادبیات اردو
رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد، دکن

محترمہ!

رسائل طیبہ کے اب جو مضامین مل سکے ہیں، ان کی فہرست خام بھیج رہا ہوں۔ کل ۱۴۴ صفحات (۹ جز) کے مسودے ہیں۔ کتاب کا نام رسائل طیبہ ہی بہتر ہے یا منشورات طیبہ یا کوئی اور؟ میرا خیال ہے کہ اس کے (۳) حصے (ایک ہی کتاب میں) کریں

پہلا: تقریریں　　دوسرا مضامین　　تیسرا خطوط

اسی طرح انگریزی تحریروں کے بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر آپ جو مناسب سمجھیں۔

علی یار خاں صاحب سے بھی کہہ دیجیے تاکہ وہ جلد اپنی والدۂ محترمہ کے حالات قلمبند کر دیں۔ تصنیفات پر تبصرہ میں لکھوں گا اگر ضرورت ہو۔

کتاب کا نام جلد متعین کر کے مطلع کریں تاکہ ڈائی بنوالیں۔ کیا ڈائی خطِ کوفی میں (نذر ولی کی طرح) بنوائیں یا نسخ میں (مرقع سخن کی طرح) یا نستعلیق میں۔ نذر دکن کی ڈائی اب بن کر

آئی سی جے ارادہ ہے کہ نذر ولی کی طرح اس کی بھی چند اچھی جلدیں بنوالوں۔ ڈائی اچھی بنی ہے مگر دیر میں بنی۔

جو بارہ تقریروں کی فہرست بھیج رہا ہوں۔ ان میں اکثر کے عنوان آپ نے نہیں لکھے کیا طویل عنوان ہی لکھ دیں۔ فہرست میں عنوان ٹھیک بنا کر واپس فرمایئے۔

مسز ہمایوں مرزا کے نام کے خطوط میں سے میں نے صرف ۱۲ اچھے قابل اشاعت خط منتخب کر لیے ہیں۔ دوسروں کے نام کے خط آپ فراہم کر دیں۔ ابھی سے طلب کریں تو او پر سو پر مل جائیں گے۔

---

لطیف النساء بیگم صاحبہ کل شام تشریف لائی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی کتاب "ممی کی بیٹا" پر آپ معتمد شعبۂ نسواں کی حیثیت سے ایک مقدمہ لکھ دیں گی۔ میں نے کہا کہ یہ خیال پہلے ظاہر نہیں ہوا ورنہ وہ شاید لکھ دیتیں۔ براہ کرم مطلع فرمایئے کہ کیا آپ کوئی مقدمہ جلد تحریر فرمادیں گی۔ ابھی موقع ہے کیوں کہ ٹائیٹل نہیں چھپا۔ ٹائیٹل خط کوفی میں لکھا گیا ہے آپ کے ملاحظہ کے لیے مرسل ہے۔

رات میں نے ساڑھے دس بجے سے آپ کی والدہ مرحومہ کا ناول احمدی بیگم پڑھنا شروع کیا اور اتنا دلچسپ ثابت ہوا کہ تینوں کاپیاں ختم کیے بغیر نہ سو سکا۔ اس غیر معمولی جاگنے کا یہ اثر ہوا کہ آج نزلہ شدت سے ہو گیا ہے۔ یہ کتاب نہایت مفید اور موثر ہے بعض جگہ خاص کر آنحضرت صؑ کے ذکر میں مجھے رونا آگیا ایک آدھ جگہ شیعہ سنی اختلاف کا مسئلہ ہے جس کا بالمشافہ بیان کروں گا۔

یہ ناول نا مکمل ہونے کے باوجود مکمل اور دلچسپ اور مفید ہے۔

اس کو علاحدہ کتاب کی صورت میں نہ شائع کرنا اس پر ظلم کرنا ہے "رسائل طیبہ" کے ساتھ اس کو نہیں بلکہ علاحدہ شائع کریں گے۔ یہ بحالت موجودہ بھی مکمل ہے۔ پلاٹ کی تکمیل بھی میری نظر میں ضروری نہیں۔

یہ تینوں کاپیاں مل کر "نذر ولی" سے زیادہ موٹی کتاب بن جائے گی۔ یہ کاپیاں واپس

کر رہا ہوں۔ دیگر ایک کاپی اور دو کاغذ ہیں، بعد میں دیکھ کر بھیجوں گا۔ ناول حشمت النسا تو غالباً چھپ چکی ہے۔ یہ آپ نے کس لیے بھیجی معلوم نہ ہوا!

---

آپ کے شملہ جانے کا کیا ہوا؟ ایک کتاب کا موضوع ہاتھ آجائے گا۔

میرے بچے سید تقی الدین کا بخار تو نارمل ہو گیا۔ کمزوری باقی ہے۔

بیوی کل آپ سے ملنا چاہتی تھیں کیوں کہ پرسوں آپ سے نہ مل سکنے کی معذرت کرنے آرہی تھیں۔ اس روز وہ پیچھا تریں اور آپ کی موٹر چلنے لگی۔ وہ آداب کہتی ہیں۔

میری طبیعت ذرا خراب ہے مگر کام جاری ہیں

آپ بھی اب اپنے خطوں پر تاریخ نہیں ڈال رہی ہیں۔ شاید والدۂ مرحومہ کا اثر ہو۔ میں جواب دینے کے لیے خط نکالتا ہوں تو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا پہلے کا ہے اور کون سا بعد کا —

مخلص: سید محی الدین قادری زور

۱۷ مارچ ۶۳ء

---

ادارۂ ادبیات اردو

رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد، دکن

محترمہ!

کاغذات اور تصویریں پہنچیں۔ شکریہ

آپ کے والد صاحب کی وہی تصویر بحالت موجودہ بہتر معلوم ہوتی ہے جو پہلے آپ نے دکھائی تھی اور آج کی آئی ہوئی تصویروں میں شامل ہے اگر وہ گروپ مل سکے تو اسی کو بھجوا دوں گا یا آپ چاہیں تو اور چند روز انتظار کیا جا سکتا ہے۔

میں نے آپ کے خط کا انتظار کر کے کل ایک خط لکھ رکھا تھا لیکن اب وہ مل نہیں رہا ہے نہ معلوم کن کاغذات میں مل گیا۔ اس میں رسائل طبیہ کی ایک نئی فہرست مرتب کر کے منسلک کر دی تھی۔ اس کی نقل بھی نہیں ہے۔ پھر دیکھ کر بھجواؤں گا۔

اور چار کاپیاں بھجوا رہا ہوں۔ ان کے علاوہ اور چھ صفحے تیار ہو گئے ہیں۔ اس طرح جملہ ۱۰۰ صفحے لکھے گئے ہیں۔ مضمونوں کی ترتیب نہ ہونے سے بڑی کشمکش محسوس کر رہا ہوں۔

ارادہ تھا کہ آپ سے مل کر ایک ایک مضمون سامنے رکھ کر دیں ترتیب دے لوں لیکن موقع نہ ملا اور آپ بھی مکان کی منتقلی میں اس قدر مصروف ہیں کہ زحمت دینا گوارا نہیں۔ علی یار خاں صاحب سے ترتیب میں مشورہ کرنے کا خیال ہوا مگر وہ تو آپ سے بھی زیادہ مصروف ہوں گے بہرحال عمر بھر میں یہی ایک کام ایسا معلوم ہو رہا ہے جس کی ترتیب و تنظیم میں دشواری محسوس کر رہا ہوں۔

اگر وہ سوانح حیات لکھتے تو بہت اچھا تھا۔ خیر اس میں بھی مصلحت ہوگی کیوں کہ آپ خود اس طرف راغب ہوگئیں اور یہی میں چاہتا تھا۔ جب سوانح حیات لکھ رہی ہیں تو کیوں نہ پورا مقدمہ بھی آپ ہی لکھیں۔ مجھے بڑی مسرت ہوگی کہ آپ اپنی والدہ کے رسائل پر ایک مبسوط مقدمہ لکھیں البتہ ان کے اسلوب وغیرہ سے متعلق میں کچھ مدد دوں گا آپ ہمت کیجیے اور آپ کے لیے تو کوئی کام مشکل نہیں ہے۔

کاپیاں آپ نہ دیکھیں۔ یہ موقت طلب اور آنکھوں کے لیے مضر کام ہے۔ آپ پروف دیکھ لینا۔ یہ صرف صفحات کے اندازے اور نہج خط وغیرہ دیکھنے کے لیے مرسل ہیں۔ باقی پھر کبھی۔

مخلص : سید محی الدین قادری زور

٢٥-٣-٦٩ء

---

ادارہ ادبیات اردو
رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد دکن

محترمہ!

آج ہی مجھے یونی ورسٹی سے اطلاع ملی ہے کہ جمعرات کو صبح میں دس بجے امتحان کے مقالہ پر زبانی امتحان لینے اڈیکیٹ جانا ہے اس لیے آپ بجائے صبح کے اس روز چار یا ساڑھے چار بجے (جب آپ کو سہولت ہو) تشریف لائیں۔

اس خط کے ساتھ ایک قطعہ تاریخ مرسل ہے۔ قاضی زین العابدین صاحب عابد اول تعلقدار نظام آباد میرے عزیز ہیں اور مولوی سید رحمت اللہ صاحب کے ہم جماعت مدرسہ عالیہ میں رہ چکے ہیں۔ ان سے مکانوں کے قطعات تاریخی کا ذکر آیا تو میں نے آپ کے مکان کا ذکر کیا۔ انھوں نے اسی وقت خانۂ رحمت بنا میں تاریخ نکال دی۔ پھر وہ

اور ہم کو گویا دو مصرع بنا دیتے ہے اور اس طرح یہ قطعہ بن گیا جو فی البدیہہ ہونے کی وجہ سے زیادہ اچھا نہیں ہے۔

اگر قطعہ تاریخ کی واقعی ضرورت ہے تو میں بعض اچھے لکھنے والوں سے لکھوا دوں گا۔ مطلع فرمائیں۔

پانچ نسخے "من کی بپتا" کے اور مرسل ہیں۔ یہ نسخے ذرا بہتر ہیں۔

آج ہاشم آئے تھے۔ من کی بپتا کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ آپ کی یہ کتاب پہنچی یا نہیں۔ پانچ نسخے بھیجے تھے۔ ان سے میں نے ادارہ کی عمارت کے لیے زمین کا ذکر کیا۔ وہ بھی سوچ کر مدد دیں گے۔ آپ نے لیڈی حیدری کو خط لکھا یا نہیں۔ پھر کچھ ذکر نہیں کیا۔ ہمارا کام سعی و کوشش کرنا ہے اور تکمیل خدا کے ہاتھ ہے۔ اپنی حد تک دستخط تو کر لیں تاکہ پھر حسرت نہ رہ جائے کہ ہم نے وقت پر کام نہ کیا۔ آپ خود مشغول ہیں اور سالہا سال سے اس سے پہلے یاد دہانی نہیں کی۔ اب یاد آ گیا تو لکھ دیا۔ برا نہ مانیے کہ اصرار کر رہا ہے۔ یہ چونکہ ادارہ کا معاملہ ہے اس لیے لکھ دیا۔ ورنہ میں اس قسم کی باتیں خود بھی پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی اتنی بے تکلفی اور زحمت دہی محض اس وجہ سے ہے کہ مجھے آپ میں وہ باتیں نظر آتی ہیں جو اچھے سے اچھے مردوں میں نہیں ملتیں۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسی قابلِ فخر بہن مل گئی۔ اس کے لیے میں خدا کا بہت شکر گزار ہوں۔

مخلص: سید محی الدین قادری زور

۲۷-۳-۳۹ء

"منزلِ راحت" ہے بشکرِ خدا — "مسکنِ بیگم سکینہ" بن گیا
زور نے تاریخ اس کی یوں کہی — سالِ ہجری "خانۂ رحمت بنا"

(۱۳۵۷ھ)

---

حامدہ ...

بخدمت منزل خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

محترمہ!

لطیف النساء بیگم صاحبہ کی کتاب چھپ کر آ گئی ہے لیکن طباعت ...

اور کچھ تو کچے پن میں جلد بننے سے اندر حروف پھیل گئے ہیں۔ آئندہ سے اس پریس میں طباعت کا کام نہیں دوں گا۔ یہ طباعت دیکھ کر دل ہی کتابوں کی اشاعت سے کھٹا ہو گیا۔
بہرحال اس کے پانچ نسخے خدمت میں تحفتہً مرسل ہیں۔

---

رسائلِ طیبہ کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ ایک تقریر لکھی گئی ہے جو طلا حفظ کے لیے مرسل ہے۔ آپ ان کاپیوں کو نہ دیکھیں، آنکھوں پر اثر پڑے گا۔ میں دیکھ لوں گا یا دفتر منیجر صاحب سے دکھوا لوں گا۔ البتہ پروف آپ دیکھنا۔
لیکن یہ کتابت رکی رہے گی جب تک آپ یہ نہ بتائیں کہ کون سا مضمون پہلا ہے اور کون دوسرا۔
آپ کے والد صاحب کی یہ دستار والی تصویر پسند نہیں۔ وہی تصویر بہتر ہے جو کل (انگریزی لباس میں) دکھائی تھی۔ کیوں نہ وہ تصویر چھاپیں جس میں سب بچے بھی ساتھ ہیں۔ اس طرح پورا خاندان آجائے گا۔
میں نے آج وہ حالات دیکھ لیے جو آپ کے والد صاحب نے قلم بند کیے ہیں۔ افسوس ہے کہ بعض صفحات بالکل ضائع ہو گئے۔ آپ اس کی نقل ضرور کرا لیں۔ ورنہ یہ بھی تلف ہو جائیں گے۔
علی یار خاں صاحب سے جلد حالات لکھوا لیں اور ان کی تصویر بھی جلد بھیج دیجیے تاکہ سب ایک ساتھ ہو جائیں۔ زیادہ نیاز۔

سید محی الدین قادری زورؔ
۳۱-۳-۳۹ء

---

رفعت منزل، خیریت آباد

محترمہ!

یاد فرمائی کا شکریہ۔ اطلاع نامے تقسیم کے لیے دے دیے گئے۔
لطیف النساء بیگم صاحبہ اورنگ آباد تبادلہ پر جانے والی تھیں۔ غالباً چلی گئی ہوں گی اور جلسے کے لیے ڈرامہ وغیرہ کے انتظام کسی اور کے سپرد کرنا ہو گا۔
آپ کے بھائی صاحب کی شادی کی دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر

سنجوگ سے آپ کی والدۂ مرحومہ کی رُدح پُرفتوح بہت خوشش ہوئی ہوگی۔ آپ کی مساعیٔ جمیلہ بار آور ہوئیں اور اسی لیے خاص طور پر آپ مستحق مبارک باد ہیں۔ میں روز شام میں ٹہلنے نکلتا ہوں۔ ایک روز شادی کے بعد بھی مبارک باد کہنے آیا تھا مگر آپ کے یہاں دو چار موٹریں کھڑی تھیں اس لیے دور ہی سے چلا گیا۔

بلاک بورڈ ابھی واپس نہیں ہوا، میں نے دو روز کے لیے مستعار لیا تھا۔ اگر آپ رابعہ بیگم صاحبہ کو ٹیلی فون پر کہہ دیں تو وہ اپنے ساتھ لے آئیں گی۔ ان کی کتاب "سوتیلی ماں" تقریباً چھپ گئی ہے۔ آپ کے "پیش لفظ" کا انتظار ہے۔ ایک آدھ صفحہ ہی سہی مگر ضرور لکھیے۔ کچھ رابعہ بیگم صاحبہ کے متعلق اور کچھ کتاب کے موضوع کے متعلق۔

مخلص : سید محی الدین قادری زورؔ

۵ ر ستمبر ۳۹ء

---

ماہنامہ سب رس ادارۂ ادبیاتِ اردو
رفعت منزل خیریت آباد، حیدرآباد

محترمہ!

کرم نامہ کا شکریہ۔ کل میرے سر میں بے حد درد تھا، اس لیے جواب نہ دے سکا۔ کام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ الاماں۔ بلاک بورڈ رابعہ بیگم صاحبہ کے یہاں سے آیا یا نہیں؟ ان کی کتاب "سوتیلی ماں" نہایت نفیس چھپ رہی ہے۔ چھپے ہوئے فارم آپ کے یہاں بھیج دوں گا تاکہ پیش لفظ روانہ فرمائیں۔ اس کی بے حد ضرورت ہے۔ جلد لکھ ڈالیے۔

رابعہ بیگم صاحبہ کی نظم "رحمۃ اللعالمین آیا" بھی ملی مگر وہ آئندہ ربیع الاول میں چھپ سکے گی بشرطیکہ آپ یاد صفر ہی میں یاد دلا دیں ورنہ کاغذات میں ایسی مل جائے گی کہ ہم بھول جائیں گے۔ ان سے میری طرف سے بعد آداب و احترام فرمایئے کہ مذہبی عنوانوں پر لکھیں تو مذہبی پرچوں مثلاً خلیق، ارشاد، صوفی، مولوی، واعظ وغیرہ میں بھیجیں۔ "سب رس" کے کئی اصحاب اور صاحبات نے اس معاملے میں کڑی پکڑی۔ بعض مذہبی مضامین ایسے ہوتے ہیں جن میں مسلمانوں کے خلاف باتیں آجاتی ہیں اور اس طرح کی ذمہ داری ہم نہیں لینا چاہتے۔ ایک صاحب

نے حضرت عمر فاروق کے حالاتِ زندگی لکھ کر بھیجے تھے اور کئی مہینے تک تقاضا کیا آخر واپس کرنا پڑا۔ اسی طرح سے اسلام کے متعلق بعض مضمون آئے تھے، سب واپس کردیے گئے۔ سب رس، ہندوؤں، مسلمانوں، سنیوں، شیعوں سب کا پرچہ ہے اگر آج ایک مذہب کے متعلق چھاپیں تو کل دوسرے کے متعلق بھی چھاپنا پڑے گا۔ اس لیے مذہبی مضامین چھاپنا ہی بیکار ہے۔ اس کے لیے بیسیوں پرچے تمام ہندوستان میں موجود ہیں۔

چلکل گوڑہ کے مدرسہ کے بارے میں شعبۂ نسواں ہی کو فیصلہ کرنا چاہیے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس مدرسہ کو انجمن خواتین اسلام کے مدرسوں کے سلسلہ میں شریک کرنے کے لیے محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ کو لکھا جائے یا شعبۂ نسواں اس کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی رائے اور سفارش ناظم تعلیمات کے یہاں روانہ کرے تاکہ وہ اس کی مدد کریں۔ اگر آپ خود سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں سمیٹنا شروع کریں تو اس طرح کی بے انتہا درخواستیں آئیں گی اور آپ کی رقمی گنجائش کس طرح ہوں گی۔ ہاں اگر رقمی حالت اس قابل ہو گئی ہو تو ضرور مدد فرمایئے۔

آپ رقمی امدادیں اور عطیے ضرور وصول کر رہی ہیں اور اگر نہیں کر رہی ہیں تو ان کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول رکھیے۔ ورنہ آیندہ وقتوں کا سامنا ہوگا خود ہم کو فکر دامن گیر ہے کہ ہمارا آئندہ کیسا ہوگا کیوں کہ ہم کو صرف ایک سال کی مدد ملی تھی اگر آیندہ نہ ملے تو بڑی مشکل ہے۔ ابھی سے کارروائی شروع کردی ہے۔ آپ کی دعا چاہیئے۔ ٹائپسٹ صاحب (۱۷) روز سے غائب ہیں، آتے ہی ٹائپ کرا کر روانہ کروں''

سید محی الدین قادری زور

۱۴ ر ستمبر ۴۹ء

رفعت منزل، خیریت آباد

محترمہ!

حسب ارشاد رسائل طیبہ کے جملہ کاغذات مرسل ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو معصومہ بیگم صاحبہ اور صغریٰ بیگم صاحبہ، ہمایوں مرزا سے وصول ہوئے تھے۔

پہلے لفافہ میں وہ کاغذ ہیں جو میں نے مقدمے میں مدد لینے کے لیے ایک جگہ کر لیے تھے۔ دوسرے بڑے لفافے میں خطوط ہیں۔ ان کو ترتیب دینا ہے۔ اگر آپ ترتیب دے کر روانہ فرمائیں تو بہتر ہے۔

سب کے نیچے آپ کے اور معصومہ بیگم صاحبہ کے دیے ہوئے مضامین ترتیب وار رکھے ہیں۔ یہ سب لکھے جا چکے ہیں۔ ان کے واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ جو معصومہ بیگم صاحبہ سے ملے ہیں ان کو آپ خود واپس فرما دیں۔

اب میرے یہاں کوئی کاغذ سوائے فرانکن اسٹین کے نہیں ہے اور یہ بھی کاتب کے یہاں ہے۔ ایک دو روز میں اس کا کام بھی ختم ہو جائے گا تو روانہ کر دوں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام ختم ہو گیا۔ وہ گئے خطوط ان کو آپ مرتب فرما دیں۔ میں نے مکتوب الیہوں کے نام دیکھ کر فہرست بنا دی ہے۔ اس میں آپ چاہیں تو تغیر و تبدل فرمائیں۔

کتاب جلد شائع ہو جائے تو بہتر ہے کیوں کہ کاغذ کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور روز بروز بڑھتی جائے گی جو کاغذ رسائل طیبہ کے لیے استعمال کیا گیا وہ بے حد قیمتی ہے در ہالینڈ کا ہے اب آئندہ ملے گا بھی یا نہیں شبہ ہے اس لیے سوانح وغیرہ جلد تیار ہو جائیں تو مناسب ہے۔ اس عجلت کے خیال سے میں نے آج یہ فہرست ٹائپ کر کے آپ کے یہاں روانہ کی کیوں کہ ٹائپسٹ صاحب عرصہ سے غائب ہیں۔ میں جس قدر کر سکتا تھا آپ کی فرمائش پر کر چکا ہوں اب اس کا جلد یا بدیر شائع ہونا آپ کے ہاتھ ہے۔ جلد بندی کے لیے کیالیکو بھی مہنگا ہو گیا اور روز بروز مہنگا ہوتا جائے گا۔

سب رس کا جو کاغذ ۳ روپے ریم خریدتے تھے اب ۶ روپے یعنی دو گنے سے زیادہ ہو گیا جو چکنا کاغذ ۵ روپے ریم سے خریدتے تھے اس ماہ آٹھ روپے ۱۲ آنے سے ملا۔ اس لیے صفحات کم کر دیے جا رہے ہیں۔

مخلص: سید محی الدین قادری زور

۱۲-۹-۴۸ ف

---

مقصد منزل، خیریت آباد

محترمہ!

رسائل طیبہ کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اس کی فہرست جو ایک حد تک مکمل ہو چکی

مرسل ہے۔ اب فرانکن اسٹین کی کتابت ہو رہی ہے۔ اس کے بعد خطوط طیار ہو جائیں گے۔ خطوط کا انتخاب ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں آپ سے ملنا ہے۔ فرمایئے کب حاضر ہوں یا آپ تشریف لائیں گے۔

اب تک ۲۵۱ صفحوں کی کتابت اور ۲۰۰ صفحوں کی طباعت ہو چکی ہے۔ پوری کتاب ۴۰۰ صفحوں کی اور ابھی ضخیم ہو جائے گی۔ اب تک ۱۹۹-۹-x روپے کا کاغذ صرف ہوا اور کتابت کے ۸۰ روپے دیئے گئے۔ جملہ رقم ۲۷۹-۹-x روپے خرچ ہوئے۔ طباعت کا بل نہیں آیا ختم کار پر آ جائے گا۔

علی یاور جنگ بہادر نے مرحومہ کے حالاتِ زندگی اب تک نہیں دیئے۔ ان کو اور مسز نائیڈو کو بھی پیش لفظ کے لیے خط لکھ دیجیے۔

میرے اندازے میں پوری کتاب پر اخراجات جلد بندی چھوڑ کر تقریباً ۵۰۰ روپے صرف ہوں گے۔ جلدیں جس نرخ کی چاہیں بنا سکتے ہیں۔ باقی بالمشافہ

سید محی الدین قادری زور

۹-۱۲-۴۸ ف

# فہرستِ رسائلِ طیّبہ

پہلا باب

دوسرا باب ۔ تیسرا باب ۔ چوتھا باب ۔ پانچواں باب

۳۶۔ اردو خطوط

بنام معصومہ بیگم
بنام صغریٰ بیگم
بنام رشید فاطمہ بیگم
بنام سکینہ بیگم
بنام مسعود فاطمہ بیگم
بنام عزیز فاطمہ بیگم
بنام بیگم صاحبہ بھوپال

ہفت منزل، خیریت آباد

محترمہ!

اتفاق سے آج دوازدہم شریف کے مبارک دن آپ کی کتاب "رسائل طیبہ" کی بارہ جلدیں ہو کر آئی ہیں۔ جن میں سے پانچ آپ کی خدمت میں مرسل ہیں۔
کل شام تک نندیرولی کی طرح کی پانچ جلدیں کیالیکو کی بھی ہو کر آجائیں گی۔ بقیہ سات ویسی کیالیکو کی جلدیں پرسوں ملیں گی۔
اس کتاب کی باقاعدہ اشاعت پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اگرچہ اب بھی آپ کی طبیعت اور سلیقہ کے مطابق یہ نہیں چھپی ہے لیکن چھپ تو گئی۔ میں تو اسی کو کامیابی سمجھتا ہوں۔ بے عیب ذات خدا کی اور بے عیب کام بھی اسی کے ہوتے ہیں۔ نواب علی یاور جنگ بہادر کو ادارے کی عمارت کے سلسلہ میں یاددہانی فرمایئے۔ لیاقت اللہ صاحب اور انصاری صاحب نے اس معاملہ میں تحریک کر دی ہے۔ حیدری صاحب نے علی یاور جنگ بہادر پر چھوڑا ہے وہ جب توجہ فرمائیں گے ہمارا کام بن جائے گا۔ یوں تو ہر چیز خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ میں نے بارہا علی یاور جنگ بہادر کو توجہ دلائی لیکن جواب سے بھی محروم ہوں۔ خدا ان کو توفیق دے۔ وما توفیقی الا باللہ۔
آپ کو شاید نہیں معلوم کہ میرے بنگلہ میں اوپر کے حصہ میں آگ لگی تھی اور ڈھائی تین سو روپیہ کا اسباب جل گیا۔ شکر ہے کہ نیچے کے حصے کی طرف نہیں پھیلی۔ مکان کی تنگی کی وجہ سے اوپر چاندنی پر ٹٹیاں اور چھپر لگایا گیا تھا اسی سے آگ شروع ہوئی اور بچھونے اور پلنگ اور دوسرا سامان جل گیا۔ شکر ہے کہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ صرف میرا ایک ہاتھ جھلس گیا۔ اب اچھا ہوں اور سب حضرات کی دعا اور دعا کا محتاج۔

عثمانیہ یونیورسٹی

مخلص : سید محی الدین قادری زور
۱۲ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ

---

محترمہ!

مضمون بہت اچھا ہے۔ ہر مدرسہ میں پڑھایا جائے اور میرا تو یہ خیال ہے کہ آئندہ کسی نصابی ریڈر کی ترتیب میں بھی اس کو شامل کر لینا چاہیے۔

چوں کہ کی جگہ آپ ہمیشہ کیوں کہ لکھتی ہے۔ یہ اہم غلطی ہے۔ پہلے بھی کہہ چکا ہوں دونوں کے استعمال کا فرق ان جملوں سے ظاہر ہوگا۔

وہ نہیں آیا "کیوں کہ" بیمار ہے۔

"چوں کہ" وہ بیمار ہے اس لیے نہیں آیا۔

کسی جملہ کی ابتدا میں "کیوں کہ" نہیں آتا بلکہ درمیان میں سبب بتانے کے لیے آتا ہے سبب پہلے بتاتا ہے تو "چوں کہ" سے جملہ شروع کرتے ہیں۔

یہاں، وہاں، جہاں، کہاں کے بعد پر نہیں لکھتے۔

یہاں پر بیٹھیے۔ وہاں پر دو آدمی تھے۔ کہاں پر ڈھونڈوں، غلط ہیں۔

نواب علی یاور جنگ بہادر سے جلد ملیے اور گفتگو کی اطلاع بذریعہ ٹیلی فون فرمایئے۔

... کو خط لکھ دیا گیا۔

صفیہ کو ادارے کی مجلس انتظامی ہے۔ آپ فرمائیں تو آپ کے شعبہ کی طرف سے کتاب یادگارِ حالی کی اشاعت کی منظوری حاصل کر لی جائے گی کیوں کہ آپ کا شعبہ اس کی سفارش کرتا ہے۔

مخلص : سید محی الدین زور قادری
۲۵ نومبر ۵۲ء

---

ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد
حیدرآباد (دکن)

محترمہ!

میں اپنی ایک جدید تالیف آپ کی خدمت میں اس خط کے ساتھ بطور تحفہ ارسال کر رہا ہوں۔ اس کے ذریعے سے ادارہ کے قلمی کتب خانہ کا ایک حصہ

یوں تو اعظم صاحب نے تعلیمات سے سالانہ پانچ ہزار کی امداد اس سال سے جاری کردی تھی مگر جدید احکام میں بذریعۂ فرمان وضاحت کردی گئی ہے کہ موجودہ امداد کی جگہ دس ہزار منظور کیے جاتے ہیں۔ اس طرح تعلیمات کی امداد منسوخ ہو گئی۔ بہتر ہوتا کہ نواب علی یاور جنگ بہادر عرض داشت میں تعلیمات کی امداد کا حوالہ نہ دیتے تو دونوں جاری رہتیں اور ہمارے ہاتھ کو دس ہزار سالانہ لگتے اور شعبہ کی امداد میں حسب وعدہ اضافہ منظور کرا لیتا۔

اس لیے استدعا ہے کہ آپ اعظم صاحب کے نام ایک درخواست مدرسہ تعلیم بالغات کے لیے جلد بھجوا دیجیے جس میں تین ہزار سالانہ کی ضرورت کا اظہار کیجیے مجھے یقین ہے کہ کم از کم پندرہ سو سالانہ منظور ہو جائیں گے۔ امید ہے کہ آپ اور بھائی سید صاحب اور صاحبزادے اور صاحبزادیاں بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص: سید محی الدین قادری زور

معیاری شعر و ادب کی تخلیقی رفتار کی شناخت کے لیے
غیر مطبوعہ تحریروں کا کتابی سلسلہ

**پہچان** ستمبر ۸۶ء

فوٹو آفسٹ پر شائع ہو گیا ہے

ایڈیٹر: نعیم اشفاق —— معاون ایڈیٹر عشرت بیتاب

قیمت:—
مجلد: بیس روپے، غیر مجلد دس روپے

پہچان پبلی کیشنز، مصدی محلہ، آسنسول ۱۳۳۰۲، (مغربی بنگال) بھارت

شناس کرایا گیا ہے اور اس طرح دکن کی علمی تاریخ اور اردو ادب کے کئی پہلو بھی روشنی میں آ گئے ہیں۔

امید کہ یہ تحفہ قبول فرمایا جائے گا۔

سنا تھا کہ آپ کی طبیعت ادھر کچھ ناساز ہے۔ اب مزاج کیسا ہے۔ میں کثرت کار و بار کے باعث عرصے سے خانہ نشین ہوں اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔ سید صاحب قبلہ جدہ ماجدہ کی کتاب کا تذکرہ بھی اس میں چھپا ہے۔

مخلص : سید محی الدین قادری زور

۲۲ اسفندار ۵۳ ف

عزت منزل، خیریت آباد

---

محترمہ!

عرصے سے لکھنا اور ملنا چاہتا ہوں لیکن علائق دنیوی میں گرفتار ہوں اور روز بروز مکڑی کی طرح ان افکار کے جالوں میں زیادہ پھنستا جاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جیسی دیرینہ کرم فرماؤں کی عنایات اور شرف تکلم سے بھی محروم ہوں۔ خدا کرے کہ جلد فراغت ملے جو شاید جیتے جی تو شاید نہ ہو گی۔

یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ گذشتہ ہفتہ ادارے کی مجلس انتظامی میں موازنہ کے سلسلہ میں شعبۂ نسواں کی امداد کی کاروائی بھی پیش ہوئی تھی۔ لیاقت جنگ نے کہا کہ آج کل اعظم صاحب کے یہاں سے مدارس بالغاں و بالغات کی امداد کے لیے کئی کاروائیاں آ رہی اور فینانس سے منظور ہو کر جا رہی ہیں۔ اگر شعبہ بھی درخواست دے تو میں ایک روز میں منظوری بھجوا دوں گا یہ بھی کہا کہ میں آپ کو ان کا یہ پیام شخصی طور پر پہنچا دوں۔ چناں چہ اس بنا پر شعبہ کی امداد حسب سال گذشتہ تین سو سالانہ منظور کی گئی اور اضافہ نہیں کیا گیا۔

ادارے کو توقع تھی کہ سالانہ دس ہزار ملیں گے لیکن پانچ ہزار نقد اور پانچ ہزار کی عمارت بینک میں جمع ہونا منظور ہوا۔ اس طرح اب ہر سال صرف پانچ ہزار ہی ملیں گے جو ہمارے لیے بالکل ناکافی ہیں۔ ہم نے ۳۲ ہزار کا مطالبہ کیا تھا اور توقع تھی کہ کم سے کم دس ہزار ہاتھ آئیں گے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ضمیمہ

کشن پرشاد

# قطعۂ تہنیت عقد

سنی شیعہ میں ہے شادی   یارب ہو خانہ آبادی
دونوں کی رضا کا سودا   کیسا اچھا کتنا زیبا
دولہا ہے وہ مُرادوں والا   سیدھا سادہ بھولا بھالا
اس میں تعصب کچھ نہیں اصلا   شیعی ہے وہ دل کا سچا
معنیِ اسلام اس نے سمجھے   دل سے مٹائے دوئی کے جھگڑے

دونوں کا دل آئینہ ہے   دل میں کپٹ نہیں کچھ کینہ ہے
کیسا یہ پیوند ہے اچھا   چاہیئے مُنہ کھانے کو حلوا
سچ ہے تعصب ہے ناکارہ   سُن رکھیو یہ قول ہمارا
گھر گھر پہنچی ہے یہ منادی   شادی ہے خانہ آبادی
سونے روپے کا ہے میل اب   گنگا جمنی کا ہے کھیل اب

سعدیؔ اک جا حسبِ دل خواہ   سبحان اللہ ماشاء اللہ
جمع ہیں شہری اور دیہاتی   ہم بھی ہیں ان میں ایک براتی
تہنیت اب ہے سب کی زباں پر   چھائی مسرت سارے جہاں پر
نام دلہن کا بی بی سکینہ   چاند سا منہ روشن آئینہ
دولہا ہے اللہ کی رحمت   روشن دل اور چاند سی صورت

ہے یہ دلہن بھی لائق لڑکی   دولہا کی بھی ہے اصلی ڈگری
دونوں اپنے اپنے دیں پر   سنی شیعہ دونوں سے بہتر
ایک ہیں پیرِ کرامت سے   دونوں ہیں راہِ راست پہ چلتے
دونوں نے یہ بات کہ اچھی [illegible]   قوم [illegible] انست پھیلادی

ایسی مبارک ان کی ہے شادی　　رسم دوئی آپس سے مٹا دی
دونوں ہیں اپنے اپنے دیں پر　　ایک خدا ہے اک پیمبر
ایک ہے قبلہ ایک قرآں ہے　　ان میں دوئی اللہ کہاں ہے
جھگڑا دوئی کا خوب مٹایا　　یکتائی کا جلوہ دکھایا
کیسا سنی کیسا شیعہ !　　دونوں کا ہے ایک ہی مولا

## نصیحت

دونوں سے ہے میری نصیحت　　رکھیں باہم مہر و محبت
ہوں دونوں یکجان و دو قالب　　اک مطلوب تو اک طالب
دولہا دولھن کا مذہب کیسا　　سنی و شیعہ مہمل جھگڑا
اہلِ بیت اور جملہ صحابی　　کرتے تھے آپس میں شادی
تم دونوں کا ایک خدا ہے　　دل ہے جدا نے دین جدا ہے
دل سے دعا دیتا ہوں بے شک　　شادی ہو دونوں کو مبارک
شاد رہو دونوں اور آباد　　جلد خدا دے تم کو اولاد
گود میں بچہ کھیلے اس سال　　خوش ہے میکا خوش ہو سسرال
تہنیت آکر ہم بھی دیں گے　　بچے کو بھر پیار کریں گے
دیں گے دعائیں ہم سب مل کر　　قائم رکھیں گے اوس کا حیدر
شاد رہیں ماں باپ اور مولود
سارے گھرانے کو ہو یہ مسعود

وقار خلیل

# اُردو نامہ

## علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

اگست : بزمِ تنویرِ ادب کا مشاعرہ اقبال ہاشمی کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ امکان قریشی ، شاغل ادیب ، رحمت سکندرآبادی ، عثمان لیئق ، مصطفٰے نیاز ، ابوالفاروق شعور ، تجمل اظہر ، قمر رضا اور حبیب حیدرآبادی نے کلام سنایا ۔

۔ اگست ، طنز و مزاح نویس ادیب ، شاعر اور مصنف الحاج سید موسٰی کلیم (برق آشیانوی) مختصر علالت کے بعد چل بسے گئے

۔ اگست : ترقی پسند شاعر اور رفائن آرٹس اکیڈیمی کے رکن مسٹر رگھوبنسی نرمل کا انتقال ہوا ۔

۱۔ اگست ، ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اُردو نے برق آشیانوی کی رحلت پر اظہارِ الم کرتے ہوئے انھیں انسان دوست ، حیدرآبادی تہذیب کے مظہر فرد اور صاحبِ طرز طنز و مزاح نویس کی حیثیت میں خراجِ عقیدت ادا کیا ۔

۔ اگست ، بزمِ سالک اور دیگر شعری انجمنوں کی طرف سے اُردو گھر میں مشہور شاعر جناب نذیر علی عدیل کی شعری خدمات کے اعتراف میں ادبی اجلاس جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف کی صدارت میں ہوا ۔ ڈاکٹر ایم ایل نگم ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم مہمانِ خصوصی تھے ۔ وقار خلیل ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور ڈاکٹر نگم نے جناب عدیل کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ۔ اس موقع پر انھیں تلامذہ کی طرف سے مسرور عابدی نے کیسۂ زر بھی پیش کیا ۔ صاحب زادہ میر معین الدین علی خان مصر کی صدارت میں محفلِ شعر منعقد ہوئی ، عدیل ، نگم روحی قادری ، ڈاکٹر گوبند شاہی ، فرید متین ، مسرور عابدی ، غیاث عارف ، فاروق شکیل ، جری القادری ، عثمان قادر ، اسماعیل ظریف اور دوسروں نے کلام سنایا ۔

۔ اگست : ٹیگور سوسائٹی کے زیرِ اہتمام اُردو گھر میں منعقدہ ادبی اجلاس و مشاعرہ میں ریاستی گورنر محترمہ کمود بین جوشی نے بہ حیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی ۔ نواب طاہر علی خاں نے صدارت کی ، مسز ایم باگا ریڈی ، مسٹر

منوہر راج سکسینہ اور مسز سریتو اس لاہوتی نے ٹیگور کے فکر و فن پر اظہار خیال کیا۔ مشاعرہ میں کنول پرشاد کنول علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، صادق نقوی، عزیز النسا صبا اور سوز عابدی نے کلام سنایا۔ جناب مصطفیٰ شیروانی نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

○ زندہ دلانِ حیدرآباد کی جانب سے جناب برق آشیانوی کا جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ برق آشیانوی کی تعزیت منظور کی گئی اور ان کی شخصیت اور فکر و فن کو خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔

۲۲-اگست : ریاستی گورنر مسز کمود بین جوشی نے ۸ ویں کل ہند اُردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ریاست میں اُردو کے تحفظ و ترقی کے لیے موثر و معقول انتظامات ضروری ہیں۔ اس کانفرنس کو مرکزی مملکتی وزیر تعلیم و ثقافت مسٹر کرشنا ساہی نے بھی مخاطب کیا۔ ریاستی وزیر تعلیم مسٹر مدو کرشنم نائیڈو نے صدارت کی۔ پروفیسر انوبیت راؤ وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، مسٹر وینکٹ رام ریڈی ناظم اعلیٰ تعلیم، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو اور جلیل پاشاہ صدر تعلیمی اور مندوبین نے مخاطب کیا۔ ریاستی گورنر نے اس موقع پر ترقی اُردو بیورو حکومتِ ہند کی جانب سے آراستہ نمائش کتب کا معائنہ بھی کیا۔

۲۲-اگست : نیرنگ ادب کا مشاعرہ جناب صادق نقوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ابتداءً صدر مشاعرہ اور مصطفیٰ نیاز نے برق آشیانوی، رگھوبنسی نرل اور سردر مرزائی کی وفات پر تعزیتی تاثرات پیش کیے اور قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی۔ مشاعرے میں صادق نقوی، ماہر حیدرآبادی، عزیز بھارتی، مومن خاں شوق، شمیم نصرتی، ثاقب بنارسی، مسعود جاوید ہاشمی، شکیل مظہر، حمید حاصل، سوز عابدی اور دوسروں نے کلام سنایا۔

C مسز کمود بین جوشی گورنر آندھرا پردیش نے اردو کانفرنس کے مندوبین کو راج بھون میں عصرانے پر مدعو کیا اور اُردو زبان کی اہمیت و افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کو ریاست میں اس کا مستحقہ مقام ملنا چاہیے کیونکہ اس زبان نے آزادی کی جدو جہد میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ گورنر صاحبہ سے ملاقات کرنے والوں میں پروفیسر عتیق احمد صدیقی (علی گڑھ) ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی) ڈاکٹر امیر اللہ شاہین (میرٹھ) پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) پروفیسر یوسف سرمست صدر شعبہ جامعہ عثمانیہ، محمود انصاری ایڈیٹر منصف اور صدر کل ہند تعلیمی کانفرنس مسٹر جلیل پاشا قابلِ ذکر ہیں۔

C پروفیسر ظہیر احمد صدیقی (دہلی یونیورسٹی) اور پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) نے ادارۂ ادبیات اُردو کا معائنہ کیا۔

مرزا الکس نے ادارے کے شعبۂ امتحانات کے تعلق سے وقار خلیل سے مشاورت کی۔ اس موقع پر ادارے میں جناب محمد منظور احمد اور ڈاکٹر محمد علی اثر بھی موجود تھے۔

۲۹-اگست، حیدرآباد لٹریری فورم اور دیگر مشہور علمی و ادبی اداروں کے اشتراک سے ممتاز شاعر ڈاکٹر شاذ تمکنت کی پہلی برسی کے موقع پر "یادِ شاذ" کا اجلاس پروفیسر سراج الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ (مہمان خصوصی) پروفیسر مغنی تبسم (صدرِ حلف) جناب اختر حسن، جناب عوض سعید، محترمہ آمنہ انصاری، جناب سید امتیاز الدین، مسٹر نہپال سنگھ ورما، سواد عین نثراد تمکنت، جیلانی پیراک نے شاذ مرحوم کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ رؤف خلش، مصحف اقبال توصیفی، علی ظہیر، یوسف اعظمی، رضا وصفی، حسن چشتی اور رشید شہیدی نے منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ فائن آرٹس اکیڈمی کے فن کار وں نے محترمہ زہرہ رخسانہ نے کلام شاذ پیش کیا اور شاذ مرحوم کا T.V. انٹرویو بھی اس موقع پر ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔

۳۱-اگست، اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب راشد آذر کی صدارت میں بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ مسٹر نہپال سنگھ ورما نے "شاذ کی شاعری میں ہندی الفاظ" پر مضمون اور ڈاکٹر حمیرہ جلیلی نے مرہٹی شاعرہ کلتا بائی پر مقالہ سنایا۔ محفل شعر بھی ہوئی صلاح الدین نیر نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا


تاریخ ساز مجلہ

شعر و حکمت

کا دورِ جدید

(مرتبین: ڈاکٹر شہریار - ڈاکٹر مغنی تبسم)

ادب، فنونِ لطیفہ، فلسفہ، طبی اور معاشرتی علوم کا اہم دستاویز ــــ ادبیاتِ عالم کے ترجموں، تلخیص، تعارف اور تنقید ــــ

برِ صغیر کے ادیبوں اور شاعروں کی منتخب تخلیقات کی سوغات لے کر

جنوری ۱۹۸۷ء میں منظرِ عام پر آئے گا

○ سال میں دو کتابیں ○ ضخامت قریب چار سو صفحات ○ آفسٹ طباعت ○ قیمت ۶۵ روپے

مکتبۂ شعر و حکمت 865-6-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004، سول ایجنٹ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸ گلی عزیز الدین وکیل کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۱۱

# ادارہ ادبیات اردو

22 DEC 1986



Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

بہ یادگار ڈاکٹر محی الدین قادری زور

**مجلسِ مشاورت**

صدر: حامد علی عباسی
نائب صدر: ہاشم علی اختر
معتمد: پروفیسر مغنی تبسم
ارکان: پروفیسر گوپی چند نارنگ
پروفیسر افضل الدین
سوراج سکینہ
عابد علی خاں
محمد اکبر الدین صدیقی
محمد منظور احمد

ماہنامہ

# سب رس

جلد (۴۹) — نومبر — شمارہ (۱۱)

مدیر اعزازی: ڈاکٹر مغنی تبسم
معاون مدیر: وقار خلیل

ادارۂ ادبیات اردو - پنجہ گٹہ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

معمولی ڈاک سے:
۳۰/ روپے
لائبریریز سے ۳۵/ روپے

سالانہ رجسٹری سے
۴۵/ روپے

بیرونی ملکوں سے:

| | ہوائی ڈاک سے | بحری ڈاک سے |
|---|---|---|
| مشرقِ وسطیٰ | ۱۵ ڈالر | ۶ ڈالر |
| امریکہ | ۲۰ ڈالر | ۷ ڈالر |
| پاکستان سری لنکا | ۱۰ ڈالر | ۴ ڈالر |
| انگلستان | ۸ پونڈ | ۳½ پونڈ |

## مشمولات



سوراج سکینہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جنگل شاہی پرنٹنگ پریس کے لیے دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار میں طبع کروا کر حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

ٹلیرڈ
ترجمہ: نجمہ شہریار

# علومِ انسانی میں تحقیق[1]

پچھلے برس ریٹائرمنٹ کے بعد میں کناڈا کی ہیومینٹیز ریسرچ کاؤنسل کی طرف سے دیے گئے دعوت نامے کو قبول کر لیا جس کے مطابق مجھ کو تحقیق کے موضوع پر کناڈا کی مختلف یونیورسٹیوں میں بولنا تھا۔ میرا خود اپنے بارے میں یہ خیال ہے کہ میں علمی تنقید کی فقط مشق کر رہا ہوں با قاعدہ محقق نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انڈر گریجویٹ درجات کی تدریس پوسٹ گریجویٹ درجات کی تدریس کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ ساتھ ہی میں تحقیق میں کچھ حالیہ رجحانات پر بھی معترض ہوں اور ان پر عمل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر بظاہر میں ان ہی چیزوں کی مخالفت کرنے جا رہا تھا۔ اسی چیز کے سلسلہ میں شرارت انگیزی کا خطرہ مول لے رہا تھا جس کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں مجھے بات کرنی تھی۔ یوں میں اپنی بات کو اس طرح شروع کرتا ہوں کہ تناقض کے باوجود تحقیق کے عمل کی بنیاد کچھ مستقل انسانی جبلتوں پر ہے۔

ان جبلتوں میں سب سے سادہ جبلت تجسس ہے، جستجو ہے، سیکھنے کی خواہش، جس کے بارے میں ارسطو نے کہا تھا کہ یہ انسانی فطرت کی جڑوں میں موجود ہے۔ کوئی بھی انسان جس میں یہ دھندلی یا

---

[1] انگریزی کے معتبر ناقد ٹلیرڈ کے مضمون RESEARCH IN HUMANITIES کا یہ ترجمہ "علومِ انسانی میں تحقیق" کے عنوان کیا گیا ہے۔ مضمون کو مختصر کیا گیا ہے اس موضوع پر راقم الحروف کا ارادہ مضمون تحریر کرنے کا تھا لیکن جب ٹلیرڈ کو قدم قدم پر خود سے ہم خیال پایا تو اس کے مضمون کا ترجمہ کرنے کو ہی بہتر جانا (ن۔ش)

خوابیدہ ہے وہ نامکمل ہے۔ ملٹن نے "فردوسِ گمشدہ" میں اس تجسس کو بہت واضح صورت میں پیش کیا ہے۔ آدم علم کے لیے بے چین ہوا۔ یہ چیز ان میں تجسس پیدا کرتی ہے۔ اس کی تشفی [illegible] ناممکن ہے۔ تحقیق کا تعلق زندگی کی ان سچائیوں سے ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہوں اس کی صحت کا انحصار انسان کی بھلائی پر ہے۔

حق اور صداقت کی اس لامتناہی توسیع سے کیا فائدہ جو انسان کو انسانیت فراموش کر دینے پر مجبور کر دے۔ وہ سچائیاں اور صداقتیں جو انسان کی بھلائی کے کام آسکیں، انھیں انسانی تحقیق کا موضوع ہونا چاہیے۔

حالاں کہ تجسس اپنے آپ میں بڑی قابلِ تحسین چیز ہے۔ لیکن اسے علاحدگی میں شناخت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ زندگی کی زبردست خدمت کر سکتا ہے۔ لیکن جب یہ آقا بن بیٹھے تو انسانی توازن کے لیے خطرہ پیدا کرتا ہے۔ آدم حالاں کہ ان میں بے انتہا تجسس موجود ہے، اس جذبے کو خدا کی عظمت و شوکت کے ماتحت رکھتے ہیں۔ وہ خدائی کے راز جاننے سے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ منفی صورت میں تجسس گناہ بے لذت ہے جس میں کہ انسان خود کو سارے عمل سے الگ کر لیتا ہے اور بہت بے کسی [illegible] کا شکار ہو جاتا ہے، وہ شخص اس خدمت کا اہل نہیں رہتا جو عام انسان چاہتے ہیں۔ ملٹن اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ علم کو انسان کی بھلائی کے کام آنا چاہیے۔ اس کا مقصود ذاتِ خداوندی کا علم ہے جو کہ حقائق کے محض جمع کرنے کے عمل سے مختلف ہے جو علم انسان کو کتابی علم کے بجائے متوازن قوتِ فیصلہ، عقلِ سلیم، تنقید و بصیرت کا اہل بناتا ہے۔ ملٹن کے خیال کے مطابق ریسرچ کی صحت کا انحصار نوعِ انسانی کی بہبود اور بھلائی پر ہونا چاہیے۔

یہ بہت ہی بحث طلب اور نزاعی بیان ہے یوں کی یہ بیشتر سائنسی تحقیق کے عقائد اور مسلک کے خلاف جاتا ہے کہ ایسی کسی دیوی کا وجود ہے جسے حق کی دیوی کہتے ہیں اور اس کی سلطنت کی توسیع بذاتِ خود اہم اور قابلِ قدر ہے۔ سارے انسانی پاس و لحاظ سے قطعِ نظر۔ لیکن یہ دیوانگی ہوگی اگر ہم وقت کے اڑتے ہوئے رتھ کی آواز اپنی پشت پر دسنیں۔ حق کی اس لامتناہی توسیع سے کیا فائدہ جو انسان اپنی انسانیت فراموش کر دینے پر مجبور کرے۔

حق کو یوں دیوی کا روپ دینے کا غلط رویہ اصل میں مختلف نظریات، عقاید اور اصولوں کے گرد ہونے کا ثبوت ہے۔ سالو تینی سچائی کا صحیح اصول محض حقایق سے لپٹے رہنا نہیں ہے۔ حقائق نہیں بلکہ وہ جو انسان کی بھلائی کے لیے ہوں انھیں کریم النفس اور شائستہ انسانی تحقیق کا موضوع ہونا چاہیے روایتی محقق محض انسانوں کی قربانی دے کر اپنی تصنیفات منظر عام پر لاتا ہے۔ یہ اشاعت برائے اشاعت، تحقیق برائے تحقیق ترقی یا پروموشن کے لیے تشویش ناک صورت حال ہے۔ یہ رسوا اور بدنام کرنا ہے۔ بے روح میکانکی تحقیق کا کوئی حاصل نہیں۔ اکیڈمک ترقی کے لیے سوائے بہ استاد برتری اور فوقیت کے کسی چیز کی ضرورت نہیں جن کے پاس ریسرچ تھیسس نہیں اور جو معتبر استاد ہیں، ان کی ترقی رکنا نہیں چاہیے۔

میرے ذہن میں کچھ تدابیر ہیں جن کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ انتخابی اور مدیرانہ۔ پہلی قسم میں خیال ہے کہ ترقی کے لیے استاد کی حیثیت سے نمایاں ہونے کے علاوہ کوئی خوبی درکار نہیں۔ نمایاں اور نہایت اساتذہ کچھ تحریر بھی کرنا چاہیں گے اور تحریری شائع شدہ نمونے نہ ہونے کی صورت میں نا میں رہیں گے۔ لیکن کچھ اساتذہ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بہ حیثیت استاد کوئی کمی نہیں ہوتی جن کے پاس شائع شدہ تحریریں موجود نہیں ہوتیں ان کی نہ تو ترقی رکنی چاہیے، نہ ان کا زبردستی سے تحقیق کروائی جانی چاہیے نہ شائع شدہ کام پر زور دینا چاہیے۔

اروِنگ بے بٹ کے مطابق اسکالر دو طرح کے ہوتے ہیں پُرنویس، پُرگو اسکالر اور قابل پذیر اسکالر۔ دوسری قسم کے وہ عالم ہیں جو اخذیت رکھنے والے، ترتیب دینے والے اور نظم کرنے والے ہوتے ہیں (تنظیم مربوط کا عمل ہے) جو علم کو خود میں جذب کرتے ہیں، سموتے ہیں، اسے اپنے کا حصہ بناتے ہیں، علم کا خیر مقدم کرتے ہیں جو علم کے امین اور حافظ ہیں۔ پہلی قسم کے اسکالر علم کو دریافت کرتے ہیں، انکشاف کرتے ہیں، اظہار کرتے ہیں، پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرح کے اسکالر علم حاصل کرکے اسے تقسیم کرتے ہیں۔ تہذیب میں اس کی قلب ماہیت کرنے کی بات کرتے ہیں۔

ایک استاد جو سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے، منظم کام کو پورا کرتا ہے، علم کے مختلف عناصر کرتا ہے۔ حالاں کہ کچھ بھی شائع نہیں کرواتا (علم کی نمائش کا قایل نہیں، خود نمائی کو پسند نہیں

کہیں زیادہ اہل ہے، کسی اہم تدریسی عہدے کے بہ نسبت اُس استاد کے جس نے سینکڑوں غیر متفکرانہ، پھیکی بے روح چیزیں لکھی ہیں۔ ایپکٹیٹس ( EPICTETUS ) کی مثال لیجیے وہ زمانۂ قدیم میں فلسفے کا پروفیسر تھا جو فقط لکچر دیتا تھا، درس دیتا تھا، لیکن اس نے کبھی بھی کچھ شائع نہیں کر دیا۔ اس کے شاگرد جو لکچر نوٹس لیتے تھے وہی اس کی تصانیف کی صورت میں سامنے آتے۔ یہ بڑا محتاط، ہوشمند اور معتدل خیال ہے کہ وہ آج کے دور میں یقیناً کسی بھی یونیورسٹی میں اپنا عہدہ اور منصب کھو دیتا۔

حقِ انتخاب رکھنے والوں کو جب وہ امیدوار کے شائع شدہ کام کا جائزہ لیں تو ان کو مقدارِ کثیر کے بجائے عمدگی، قابلیت، کمال، ذہنی اور اخلاقی وصف پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ ان کو یہ چیز خلجان میں ڈال دیتی ہے کہ الف جس نے زیادہ چیزیں تو شائع نہیں کروائیں زیادہ لائق ہیں۔ لیکن اس کا دوبارہ مطالعہ مانگتا ہے۔ سمٹا ہوا اور مجتمع ہے، بحث و مباحثہ اور غور و فکر چاہتا ہے زیادہ توجہ طلب ہے اس میں ارتکاز ہے جو زیادہ ذہنی قوت کا مظہر ہے۔ اور پھر وہ کچھ غیر یقینی کی کیفیت سے بھی دوچار ہوتے ہیں کہ وہ واقعی اہل ہے کہ نہیں ـ ب اور ج نے زیادہ تصنیفات پیش کی ہیں۔ ان کا کام [illegible] سلجھا سلجھا سا، سیر حاصل معلوم ہوتا ہے۔ ان کے مصنف زیادہ زرخیز معلوم ہوتے ہیں، کام بہت ہے تو جناب وہ منصب ب یا ج کو جائے گا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی الف باقی دونوں کے مقابلے میں ہزار گنا لائق ہو۔ لیکن عہدہ اُسے نہیں ملے گا۔ ایسا امکان ہے اور اس خلا پذیر دنیا میں اکثر ایسا ہوگا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ایسا کم سے کم ہو تو اس کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں کہ متفکرانہ تحقیق وجود میں آئے کریم النفس اور عظیم تحقیق جنم لے بجائے میکانکی تحقیق کے) جس میں مقدار کثیر کے بجائے لیاقت پر زیادہ زور ہو، لیاقت جو محض صفحۂ کاغذ سے نہ ناپی جائے ـــــــــــــ

اب ہم اپنی پیش کردہ تدابیر چارہ کار کی دوسری قسم یعنی مدیرانہ تدابیر کی طرف آئیں اور اس سے میری مراد ہے کوئی بھی وہ تنقید جس کے ذریعے مدیر، تبصرہ نگار یا قارئین شائع شدہ تحقیقی کام کی نوعیت پر اثر انداز ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ ان کو مالی نقصان پہنچ جائے یا نکتہ چینیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ حقیقت ہے کہ بیشتر مضامین طویل ہوتے ہیں؟ کہ مضامین کے بجائے ایسے ضخیم نوٹس ہوتے ہیں جو ثقیل الفاظ سے پر ہیں۔ اسی طرح کچھ کتابیں بھی محض ضخیم نوٹس ہوتی ہیں۔ تحقیق کی ضخامت کم کی

اس کی اثر پذیری اور افضلیت میں اضافہ کیا جائے۔ جس کو مدیرانہ سختی سے کیا جاسکتا ہے۔ اشاعت کی قبولیت کا معیار بڑھایا جائے۔

یہ تدابیر ہیں جن کو سامنے رکھنا آسان ہے لیکن جن پر عمل مشکل ہے۔ اس کی وجہ فقدانِ تحقیق کے مخصوص نقائص کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر مدیرانہ سختی ہو تو حسن و دلربائی سے عاری، بے روح اور مبہم تحقیقات کی پیداوار رک جائے گی اور تب ہی کھرے کھوٹے اور اصل و نقل کا فرق محسوس ہو۔

حال ہی میں میں نے ایک کتاب دیکھی، بیشتر جملوں کو سمجھنے میں تین یا چار بار پڑھنے کی ضرورت پیش آئی۔ چار سو پچیس صفحات پر مشتمل وہ کتاب مجھے پڑھنے کے لیے تقریباً تین ماہ کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ یقیناً میں اس کے مطالعے کے بعد کافی عقلمند ہو جاؤں گا۔ لیکن ان دوسری کتابوں کا ہوگا جو مختصر اور کہیں زیادہ تاباں، روشن اور واضح ہیں۔ یہ کتاب ان چند کتابوں میں سے ایک ہے۔ قاری کی ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر نہیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ مجھے بڑی بھیانک بات لگتی ہے کہ تحقیق کا کام کریم النفس، شفیق، ہمدرد، تہذیب و شائستگی سکھانے والی ہونے کا مختار رکھتی ہے اور تہذیب معاملات سے بحث کرتی ہے، اپنے طرزِ نگارش سے اسی مقصد کو مجروح کرے۔

اتنا تو ہوا عملی تدارک اور اصلاح کے بارے میں جو کہ موجودہ تحقیق کے نقائص کے سلسلے میں ہے۔ اب میں تحقیق کو صحت مند رکھنے کے موقع اصول پر غور کروں گا۔ لیکن ان کو میں صرف اس تحقیق لاگو کروں گا جن کا تعلق تخلیقی فن پاروں سے ہے۔ اور وہ اصول یہ ہے کہ ایسی تحقیق کا جواز یہی نکلتا ہے جب یہ جمالیاتی تنقیدی قابلیت اور صلاحیت کی بنیادی اور اساسی ریاضت مشق اور عمل درآمد کو تقویت کرے جو وسیع مناظر میں اس نظریے کا حامل ہے کہ علم کو عام انسانی بھلائی کے لیے استعمال کیا جائے۔

یاد رکھیے کہ اب میں بات کر رہا ہوں ان چیزوں کے بارے میں جن کا تعلق تخیلی تحریروں سے ہے علم سلف اور قدامت شناسی سے نہیں۔ تنقید کا بنیادی مقصد کسی فن پارے کے بارے میں مطالعہ بہم پہنچا کر اس کی تشریح کرنا ہوتا ہے یوں کہ قاری محظوظ ہو اور اس کی تدریس ہو اور [illegible] بڑے فن کاروں پر تنقید، جس میں تحقیق بھی شامل ہے، کرتے وقت [illegible] ہوتا

اگر اسے صحت مند ہونا ہے۔

اب اگرچہ کہ علمی اور منطقی نقاد سب سے زیادہ اہل ہے کہ وہ بڑے ادیبوں کو ان کے دور کے تناظر میں رکھ کر دیکھ سکے تو یا تو اس کو یہ پہچان ہونا چاہیے کہ وہ اپنے کام کو ناکافی اور غیر مکمل سمجھے اور تکمیل کے لیے اسے دوسرے کے سپرد کرے یا پھر اسے خود مکمل کرے۔ یہاں پر میں ایک مثال دوں گا۔ لی کیمپ بل شیکسپیر کے تاریخی ڈراموں پر اپنی تصنیف مالک وینا ڈرین پر حملے کی صورت شروع کرتی ہے کہ وہ غیر تاریخی اور ذاتی نقاد ہیں۔ کیمپ بیل کی کتاب عالمانہ ہے تنقید میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ لیکن ایک نقاد کی حیثیت سے ہم اسے نمایاں نہیں کہہ سکتے۔ وین ڈرین عمدہ نقاد ہیں گو کہ ذرا غیر مستقل اور ڈانوا ڈول ہیں اگر ان کے نکالے ہوئے نتائج کیمپ بیل کے نتائج سے میل نہیں کھاتے تو ان کی تنقید مشتبہ بن جاتی ہے کہ یوں ہی آپس کی مخالفت نامناسب ہے۔ دو کو لڑنا نہیں چاہیے بلکہ ایک دوسرے کے کام کو مکمل کرنا چاہیے۔ جذب کرنا چاہیے[1]

مثال کے طور پر مورس کیلی ملٹن پر اپنی کتاب میں ٹیلیر سے اوپر حملہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق شاعر کو اپنے عہد کی روشنی میں دیکھنا جس طرح کہ اس کے معاصرین نے دیکھا ہو منطقی تنقید کا آخری مقصد ہے اور یوں بہ ظاہر یہ تنقید وجدان کی اہمیت سے انکاری ہے جس پر انحصار کرنے کی وجہ سے وہ ٹیلیر پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ مارس کیلی نے نہایت عمدہ کتاب لکھی ہے۔ ایک انتہائی بردبار اور درست و محتاط تحقیق ہے ملٹن کی "فردوس گمشدہ" پر۔ اور نقاد کو ضرور اسے مد نظر رکھنا چاہیے جب وہ یہ بتاتے کہ "فردوس گمشدہ" اس کے لیے کیا معنی رکھتی ہے ——— ان سب چیزوں سے قطع نظر نقاد کا ردّ عمل سب سے اہم چیز ہے۔ وہ ردِّ عمل خطا پذیر اور غیر اطمینان بخش ہو سکتا ہے تاہم غیر معمولی اور خاص ہے۔

کبھی نہ بھولیں کہ تنقید کا واحد مقصد فن پارے کی طرف آپ کے پورے وجود کا ردِّ عمل ہے۔ یہی تنقید کا بنیادی مقصد ہے اور نقاد کی پرکھ کا واحد معیار۔ تحقیق اور تنقید کا رشتہ آسان نہیں بلکہ عجیب و غریب معاملہ ہے اور جنگ کی مجبوری مشکلات کی یاد دلاتا ہے۔ کون ہے ایسا جو موجودہ جنگ و جدل میں عدم تناسب پر نہ چونکے وہ عدم تناسب جو آمادگی، ساز و سامان اور قلیل ... اور ... کے

[1] ٹیلیر نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں لکھا ہے: TRUTH ...

مابین ہوتا ہے جو کہ سارے واقعات کی خاکہ کشی، نقشہ کشی اور شکوہ و طمطراقیتوں کے مابین ہوتا ہے وہ سارے واقعات جو میدانِ کارزار کے پس منظر میں ہوتے ہیں ـــــ اور اس کے علاوہ بذاتِ خود جنگ کے اتفاقات 'ابتری' پراگندگی' انتشار' اور سفلہ کشمکش و جدّوجہد ـــ اپنے شکوہ میں جدید تحقیق ان آمادگیوں اور سازوسامان سے مشابہ ہے۔ تنقید ایک جنگ کی مانند ہے ' اتفاقیہ ہے منتشر اور گڈمڈ ہے اپنے بہت سے اظہارات میں یہ عمل کی واحد صورت ہے۔ جس کی طرف تحقیق کی پرشکوہ سخت گیریاں لے جاسکتی ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میرا مقصد تحقیق کی مخالفت کرنا ہے ہرگز نہیں۔ میں تو فقط صحیح تحقیق کو عمل میں لانے کی وکالت کر رہا ہوں اور غلط تحقیق سے احتراز کی تلقین۔ ڈینیور کی مورٹے ڈارتھر پر تحقیق توجہ طلب اور قابلِ قدر ہے۔ اس سے پہلے میلوری کا مطالعہ غلط بنیادوں پر کیا جاتا تھا۔ ڈینیور نے نیا نقطۂ نظر پیش کیا۔ شیکسپیئر کے تاریخی ڈراموں پر ڈبلو لارنس کی کتاب بیش بہا ہے۔ جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ بہت سے واقعات طربیوں اور لوک کہانیوں میں مشابہ ہیں۔ یہ علم واقعتاً مددگار ثابت ہوا۔ اب آج کے قارئین ان ڈراموں کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ گرین لانے سڈنی کی آرکیڈیا پر ایک مضمون پیش کیا جس کے مطابق یہ تصنیف سنجیدہ سیاسی موضوع پر مبنی ہے۔ یہ تنقید اور تحقیق کے میدان میں ایک بہت بڑی خدمت اور ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نقائص اور عیوب کی وجہ سے تحقیق سے متنفر ہوں بلکہ اسے صحیح اور بہترین طریقے سے استعمال کریں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کناڈا کا مقصد برطانیہ اور امریکہ کے مابین مفاہمت پیدا کرنا ہے تو اس کے لیے یہ کہوں گا کہ انگریزی تنقید کی خصوصیات ہیں غور و فکر کی پختہ قوت و صلاحیت اور زود حسی۔ اور اس کے عیوب ہیں ناتجربہ کاری' فردیت، ناکافی صلاحیت ( میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ سارے انگریز نقادوں میں یہ عیوب ہیں) امریکی تنقید کے اوصاف ہیں سرگرمی' [illegible] ' دریافت' اور تکمیلیت [illegible]۔ اس کے عیوب ہیں ناکافی غور و فکر' خیال اور رائے اور نتائج نکالنے کی صلاحیت کی کمی اور میرا آخری مشورہ یہ ہے کہ جدید تحقیق کے میدان میں کوئی بڑا کام [illegible] [illegible] کی تنقید کے [illegible] [illegible] رکھیں۔ اور تب اپنی [illegible] منزل [illegible] بڑھائیں۔

ڈاکٹر محمد انصاراللہ

# دستورالفصاحت

تحقیق و تدوین کے سلسلے میں جدید دور میں جن اہل علم حضرات نے شہرت حاصل کی ان میں لانا امتیاز علی خاں عرشی بھی تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عرشی صاحب نے اردو میں تدوین کی روایت صرف مستحکم کیا بلکہ اسے آگے بھی بڑھایا۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو کام کیے ان میں دستورالفصاحت، راتِ شاہی اور دیوانِ غالب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ دستور الفصاحت ایک ضخیم کتاب تھی س کا صرف ایک ہی نسخہ عرشی صاحب کو دستیاب تھا اور جیسا کہ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے صاحب کا خیال تھا کہ شاید وہ نسخہ نا مکمل تھا۔ عرشی صاحب نے اس کتاب کے صرف دو اجزا "مقدمہ اور خاتمہ" کو مدوّن کر کے شائع کیا ہے۔

نادراتِ شاہی ایک مکمل اور مربوط کتاب ہے۔ اس کا بھی صرف ایک نسخہ مدوّن کے شِ نظر تھا۔ یہ کتاب تدوین کے بعد مکمل شائع ہوئی ہے۔

دیوانِ غالب کے متعدد مطبوعہ اور قلمی نسخے دستیاب تھے۔ ان کے علاوہ اس کام کی تکمیل مدوّن نے مختلف کتابوں، رسالوں اور بیاضوں سے بھی مدد لی تھی۔

ان تینوں کتابوں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ عرشی صاحب نے مختلف قسم کے متون کو الگ نقطۂ نظر سے مدوّن کر کے نئی نسل کے سامنے کئی طرح کے نمونے پیش کر دیے تھے۔ راقم کے ایک گرامی نامے میں عرشی صاحب نے دستور الفصاحت کی تدوین پر فخر کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ م آئندہ کام کرنے والوں کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کی صحبت میں اصول و ضوابط کی روشنی

میں عرشی صاحب کے اسی کارنامے کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

انیسویں صدی عیسوی کے ربعِ اوّل میں احمد علی خاں یکتا نامی ایک شخص نے قواعد وغیرہ کے سے متعلق ایک ضخیم کتاب دستور الفصاحت کے نام سے تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کے بارے میں عرشی صاحب نے بتایا ہے:

"اس کے شروع میں مصنف نے اردو زبان کی پیدائش، ترقی اور حلقۂ اثر سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد چند ابواب اور ذیلی فصلیں قائم کر کے صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، عروض اور قافیے کے قواعد و ضوابط بیان کیے ہیں۔ خاتمے میں ۲۵ ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جن کے شعر کتاب کے اندر سند میں پیش کیے گئے ہیں۔"

(دستور الفصاحت، تمہید ص۳)

اس کتاب کے صرف مقدّمے اور خاتمے کو مدوّن کر کے عرشی صاحب نے اسے "حسب الحکم فرماں رام پور" ہندوستان پریس، رام پور سے چھپوا کر ۱۹۴۳ء میں شایع کر دیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے ظاہر کر دیا کہ یہ بات مدوّن کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ وہ کسی کتاب کے جزو کو بھی مدوّن کر سکتا ہے۔ عرشی صاحب نے زیرِ تدوین دونوں اجزا میں اصل ترتیب کو بجنسہٖ قایم رکھا ہے۔ تصحیح متن کے سلسلے میں بھی وہ اپنے منصب کو بخوبی جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اسی لیے خود کو انھوں نے "مصحح" کہا۔ تدوین کا کام کرنے والوں میں کم نے اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ اپنے طریقۂ کار کی وضاحت انھوں نے ان لفظوں میں کی ہے:

"۱۔ اصل نسخے میں کتابت کی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں، نیز املا بھی قدیم انداز کا ہے۔ حقیر مصحح نے ان دونوں کی اصلاح کر کے بعض جگہ اس طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔

۲۔ متن میں جا بجا جو الفاظ رہ گئے تھے انھیں اپنی طرف سے پورا کیا ہے

جہاں کوئی لفظ بڑھانا پڑا ہے وہاں اضافے کو بریکٹ میں لکھا ہے۔

۳۔ کتاب کا دوسرا نسخہ دستیاب نہ ہونے کی بنا پر غالب کا متن کی تصحیح خاطر خواہ نہیں ہو سکی ہے۔

۴۔ اشعار کی صحت میں دواوین یا دوسرے تذکروں سے کہیں کہیں مدد لی ہے۔

(دستور، دیباچہ ص۲۳ تا ص۲۶)

تصحیح متن سے متعلق یہ باتیں نہایت واضح ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عرشی صاحب کے ذہن میں مصحح کی ذمہ داریوں کا تصور بالکل صاف تھا۔ ان کے خیال کے مطابق:

۱۔ مصحح کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ متن میں کتابت کی صریح اغلاط کو بے تکلف درست کر دے۔

۲۔ متن کو زیادہ مفید بنانے کے لیے مصحح اگر ضروری سمجھے تو یہ بات اس کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ وہ اپنے زمانے کے املا کے مطابق اسے ڈھال لے لیکن چوں کہ تحقیق میں املا اور تلفظ کی اہمیت ہے، مصحح پر لازم ہے کہ وہ ایسی ہر لائق توجہ تبدیلی کی نشان دہی بھی کر دے۔

۳۔ متن کی تصحیح کے لیے دوسرے ضمنی ماخذ سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر بین کہہ سکتے ہیں کہ مصحح کو تمام ماخذ سے اور متن کے ہر لفظ کی تصحیح کے لیے مدد لینا ضروری ہے لیکن کسی متن کی تصحیح کے لیے ماخذ اتنے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان سب کی دریافت اور ان سب کا حصول بھی مصحح کے لیے ممکن نہ ہو۔ تصحیح کے دوران بعض مقاموں کا سہواً چھوٹ جانا بھی ناممکنات میں نہیں ہے۔ ایسی صورت میں مصحح اگر نیک نیتی سے کوئی قطعی دعوا نہیں کرتا تو یہ بات اس کے منصب کے مطابق بھی ہے لیکن یہ بات عمداً کسی ماخذ کو نظر انداز کر دینے اور سہل پسندی کے لیے جواز نہیں بن سکتی۔

تصحیح متن کے سلسلے میں بلاشبہ ایک سے زاید نسخوں سے کافی مدد مل جاتی ہے لیکن ایسی صورت میں مصحح کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اس کی تفصیل کا موقع یہ نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنا

کہنا مناسب ہے کہ تصحیح متن کی منزلیں دو ہوتی ہیں۔ پہلی منزل یہ ہے کہ کاتب کے صریحی سہو کو دور کر دیا جائے۔ چوں کہ اس سے بالعموم متن پر براہِ راست اثر نہیں پڑتا ایسی ہر تصحیح کی نشان دہی نہیں لیکن اس سلسلے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اس لیے کہ اس کا امکان بھی ہے کہ ہم ا پنی ناواقفیت کے سبب جسے سہوِ کاتب سمجھ رہے ہوں وہ اس کے برعکس ہو اور ہم غیر شعوری طور متن کو صحیح کرنے کے بجائے اس میں تصرفِ بیجا اور غلطی کے مرتکب ہو جائیں۔ دوسری منزل اغ کاتب کی درستی کی ہے۔ اس مقام پر مصحح کی صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے۔

کبھی کبھی سہواً بعض لفظ کتابت میں چھوٹ جاتے ہیں۔ ایسے محذوفات کی نشان دہی ا (اگر مصحح کے لیے ممکن ہو تو) ان کو اپنی طرف سے متن میں اس طرح داخل کرنا کہ قاری پر یہ بات واضح رہے کہ یہ اضافہ مصحح کا ہے ضروری ہے لیکن یہ کام بھی کچھ بہت آسان نہیں مثال کے طور پر دستور میں ایک جملہ تھا:

"بزرگانش اہلِ خطہ بودند" (دستور، خاتمہ، ص۱۱)

مصحح نے اس پر لفظ "کشمیر" کا اضافہ کر کے جملے کو اس طرح بنا دیا ہے:

"بزرگانش اہلِ خطہ (کشمیر) بودند"

یہ اضافہ غیر ضروری تھا۔ دستور الفصاحت کے زمانۂ تصنیف اور اس کے بہت بعد تک بھی اہلِ خطہ سے مراد اہلِ خطۂ کشمیر ہی مراد لیا جاتا ہے (دیکھو سراپا سخن وغیرہ) چنانچہ مصنف دستور الفصاحت نے بھی وہی لکھا تھا۔ مصحح کا یہ اضافہ غیر ضروری تھا۔ وہ اگر وضاحت ہی کرنا چاہتا تھا تو یہ کام حاشیہ بھی ممکن تھا۔ متن میں مصحح نے لفظ کشمیر کا اضافہ کر کے ایک غلط فہمی کا دروازہ کھول دیا۔ اس مثال سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مصحح کو نہایت غور و فکر کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں متعلق کتاب کے مختلف نسخوں سے (اگر وہ دستیاب ہوں) اور اس موضوع سے متعلق براہِ راست اور بالواسطہ ضروری کتب کا مطالعہ بھی ناگزیر ہوتا ہے یعنی مصحح کے لیے وسیع مطالعے اور تاریخ و نکات تک زود رس طبیعت بھی شرط ہے۔

مؤلفِ دستور الفصاحت نے تنقیدِ متن کے سلسلے میں کوئی بات مقدمہ میں نہیں لکھی ہے۔ متن

مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلو کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ متن میں میر سوزؔ کا ایک مطلع اس طرح لکھا ہے۔

یوں تو نکلی نہ مرے دل کا اما ہے گا ہے
اے فلک بہرِ خدا رخصتِ آہے گا ہے

مصرع اولیٰ سے متعلق مدّون نے لکھا ہے:

"دو دیوان مطبوعہ نیز ہمیں طور واقع شدہ اما در آبِ حیات نوشتہ:
نہیں نکلے ہے مرے دل کی ایا ہے گا ہے
اما ھُوَ ۔ در ہندی بمعنی امنگ و ایا ہے بمعنی تدبیر و فکر وغیرہ می آید۔"

(دستور، خاتمہ صـ۵۵)

اس موقع پر ایک بار پھر تصحیحِ متن اور تنقیدِ متن اور تحشیہ کے فرق کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ متن میں کوئی عبارت مصنف نے کس طرح لکھی ہے اس کا تعین "تصحیحِ متن" کی حدود میں ہے۔ وہ عبارت فی الواقع کیا ہونی چاہیے مختلف قراین اور شواہد سے اس امر کا طے کر دینا تنقیدِ متن ہے اور وہ تمام باتیں جو متن کی تفہیم میں ممد و معاون ہوں تحشیہ کی ذیل میں ہیں۔ مدّون دستور الفصاحت نے غالباً تنقیدِ متن کو بھی تحشیہ ہی کا جزو قرار دے لیا ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس پہلو پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی جا سکی ہے البتہ حواشی لکھنے پر کافی محنت کی ہے۔ مدّون موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

"حواشی میں کوشش کی گئی ہے کہ شاعر کے متعلق یہ بتا دیا جائے کہ اور کون کونسی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اگرچہ اس بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حالاتِ شعرا سے متعلق جملہ حوالے دیے گئے ہیں، تاہم یہ ضرور ہے کہ زاہم پُر انے تذکرے اور تاریخ کی کتابیں نظر انداز نہیں ہونے پائی ہیں۔ ان کتابوں میں سے جو طبع ہو چکی تھیں ان کے صفحوں کا حوالہ دے دیا گیا ہے، اور جو چھپی نہیں اور نہ ہر جگہ دستیاب ہوتی ہیں ان کی پوری پوری عبارتیں نقل

کر دی گئی ہیں تاکہ آیندہ تحقیقی کام کرنے والوں کو زحمت اٹھانا
نہ پڑے۔" (دیباچہ، دستور ص ک)

حواشی کا مقصد بنیادی طور پر متن کی توضیح ہوا کرتا ہے۔ متن کے کسی خاص فقرے سے کوئی ضرور بات دریافت ہوتی ہو یا اس سے کوئی غیر معمولی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہوں، ان کا بیان بھی تحشیے کے تحت آتا ہے۔ اصولی طور پر تحشیے سے اتنا کچھ تو لازماً متوقع ہوتا ہے لیکن اس کا عمل غیر محدود ہے۔ حواشی نگار کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے دائرۂ عمل کو جتنا اور جس چاہے وسیع کرے۔ کچھ شک نہیں کہ مدون دستورالفصاحت نے حاشیہ نگاری کا ایک اہم پہلو نکالا ہے اور اس طرح کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی ہے لیکن ا حواشی کی حیثیت اضافی ہے۔ بنیادی طور پر جو کچھ تحشیہ سے متوقع ہوتا ہے ان سے حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ ان کا براہ راست متن سے تعلق نہیں اور ان سے نہ تو اس کی توضیح ہوتی ہے نہ تفہیم میں مدد ملتی ہے اور نہ اُن سے اس کی صحت کا اندازہ ہوتا ہے بجز چند مقامات کے۔

کتاب کے شروع میں تعارف یا مقدمہ لکھنے کا رواج نیا نہیں ہے۔ دستورالفصاحت کے مدون نے بھی کافی محنت و کاوش کے ساتھ مقدمہ لکھا ہے۔ اس سے انھوں نے اپنا مقصد یہ بتایا ہے

"کتاب کا مالہٗ وما علیہ واضح ہو جائے"

اور اس میں انھوں نے جو لکھا ہے وہ یہ ہے :

"مصنف کا حال، نسخۂ رام پور کی کیفیت اور زمانۂ تالیف وغیرہ چند مباحث۔"

کچھ شک نہیں کہ اس مقدمہ کے لکھنے میں بہت کاوش کی گئی ہے لیکن اس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے لکھنے والے کے ذہن میں پہلے سے کچھ خیال موجود تھے۔ انھیں کی توثیق، تائید، تصریح کے لیے بڑی محنت سے دلایل اور تفصیلات فراہم کر دی گئی ہیں۔ تفصیلی بحث کا موقع نہیں اس لیے محض دو نکات کی طرف توجہ دلانے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ مصنف کے حالات میں

"دیباچے کے متعلق فقرے، امام صاحب الزماں کی تعریف کے اشعار
نیز خاتمۂ کتاب میں اہم جلسے کے اندر بارہ بارہ شاعروں کا تذکرہ" یہ

قراین بتاتے ہیں کہ یکتا کا مذہب اثنا عشری تھا۔"

(دیباچہ، دستور)

منبقع فقرے، امام صاحب الزماں کی تعریف کے اشعار اور شعوری یا غیر شعوری طور پر بارہ کا التزام بعض ان مصنفین کے یہاں بھی مل سکتا ہے جن کا مذہب اثنا عشری نہیں تھا۔ عبارت کے خاتمہ پر بارہ کا عدد لکھنا بھی کوئی بڑا اہم بات نہیں ہے۔ اکثر راسخ العقیدہ سنّی مسلمان بھی ایسا لکھتے رہے ہیں۔ یکتا کے عقیدے کے بارے میں قطعی حکم لگانے کے لیے بہتر دلایل اور شواہد کی تلاش ضروری تھی۔ مدوّن نے اپنے مذکورہ قیاس کی بنیاد پر کتاب کی نوعیت اور ماہیت کا تعین کرنے کی بھی کوشش کی ہے:

"چوں کہ مصنف اثنا عشری مذہب تھا اس لیے غالباً دوازدہ امام کے شمار کے مطابق ہر طبقے میں بارہ شاعروں کا ذکر ہوگا۔ ہمارے نسخے کے طبقۂ اولیٰ کا ایک نام سہواً چھوٹ گیا ہے۔" (ایضاً، ملکی)

ایک قیاس پر دوسرے قیاس کی بنیاد قایم کر لینا بڑی عجیب بات ہے۔ فاضل مدوّن نے ایک تفصیلی بحث کے بعد زمانۂ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"نتیجۂ بحث یہ ہے کہ دستور الفصاحت ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء سے پہلے لکھی گئی تھی۔"

(ایضاً، ص ۲۶)

کتاب میں مرزا حاجی قمر کے علاوہ میر اور انشا وغیرہ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ یقینی طور سے اس سال کے بعد کے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات یقینی ہے کہ مصنف نے اگر اس کتاب کا پہلا مسودہ ۱۲۱۳ھ یا اس سے پہلے تیار کیا تھا تو اس کے ذہن میں بارہ شاعروں کے ذکر کے التزام کا کوئی تصور بھی موجود نہیں تھا۔ کتاب کی تکمیل کے بعد نظر ثانی میں بھی اس نے ہر طبقے میں بارہ بارہ کا التزام نہیں کیا۔

قیاس: اس قایم کرنے کی ایک دوسری مثال بے رنگ سے تعلق ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

"اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ گردیزی نے بے رنگ کا حال آخر ۱۱۶۵ھ
میں لکھا ہے اور چند سے صرف تین سال مراد ہیں تو اس
کا سالِ انتقال ۱۱۶۲ھ قرار پائے گا۔
(دستور، دیباچہ ص۲۲)

دوسری جگہ اس طرح قیاس آرائی کی ہے:

"اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ختم نکات تک زندہ تھا تو پھر اس
کا یہ مطلب ہوگا کہ گردیزی نے اس (بے رنگ) کا حال
کم از کم ۱۱۶۸ھ میں لکھا ہے۔" (ایضاً ص۳)

یہ سمجھنے کی بات تھی کہ دونوں باتیں ممکن نہیں ہو سکتیں۔ بے رنگ دو بار نہیں مر سکتا تھا اور اس کے سالِ وفات سے دو مختلف نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے۔

آخر میں یہ ذکر بھی مناسب ہے کہ کتاب دستور الفصاحت کا نسخہ رام پور کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ عرشی صاحب اسے اشاعت کے لیے مدوّن کر رہے تھے۔ انھوں نے اسے انشا کی کتاب دریائے لطافت پر ترجیح دینی چاہی چناں چہ انھوں نے لکھا:

"اس کی تالیف کا کام انشا کی دریائے لطافت سے پہلے انجام
پا چکا تھا جس کا سالِ اختتام ۱۲۲۲ھ ہے .... مصنف
کی نظر میں دریائے لطافت کا نہ ہونا اس بنا پر تھا کہ یہ ابھی منصۂ
وجود میں نہیں آئی تھی" (دیباچہ، دستور)

بڑی تلاش و جستجو کے بعد عرشی صاحب کو پوری کتاب میں صرف یہ دو مقام [illegible] مل سکے جن کو ۱۲۱۲ھ کا کہا گیا۔ اول خواجہ ریان متوفی ۱۲۱۳ھ کی بابت مصنف کا یہ جملہ:

"می گویند کہ تا حال زندہ است۔" (ایضاً)

اس فقرے میں "میگویند" سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مصنف حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہے صرف سنی سنائی بات لکھ رہا ہے۔ اس جملے کی بنا پر کوئی فیصلہ کر لینا صحیح نہیں ہے۔

دوسرا جملہ قائم کے حال میں یہ ہے:

"چند سال شدہ . . . مدفون گشت ہے" (ایضاً)

خود مدونِ دستور الفصاحت کے قول کے مطابق لفظ "چند" عربی کے لفظ "بضع" کی طرح تین سے نو تک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن روزمرّہ میں مدقق کوئی یہ التزام کرتا ہے اور نہ یہ عملاً ممکن ہی ہے۔ پھر بھی یہاں اگر چند سے نو مراد لیں تو زمانۂ تحریر ۱۲۱۷ھ یا ۱۲۱۹ھ ہو سکتا ہے لیکن اس ایک اقتباس کی بنیاد پر پوری کتاب کے زمانۂ تالیف کا تعین کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ اکثر تحریروں کا ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء کے بعد کا لکھا بالکل ظاہر ہے۔

کتاب کے تعارف کے بعد مدوّن نے اپنے مآخذ کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ مدوّن کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے مآخذ سے بھی قاری کو مطلع کر دے اور اس کا نہایت قابلِ قدر نمونہ عرشی صاحب نے پیش کیا ہے البتہ تحقیق کا انداز وہی ہے کہ جو اوپر بیان ہوا۔

اگرچہ کتاب کی تدوین پر اس کے فاضل مدوّن نے بہت محنت کی ہے۔ لیکن اصولی حیثیت سے اس میں بہت کچھ اضافے کی گنجائش ہے اور تحقیقی حصے پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے البتہ مقدمہ اور حواشی کے سلسلے میں ان کے بعض اضافے قابلِ قدر ہیں۔


تاریخ ساز مجلّہ

شعر و حکمت کا دورِ جدید (مرتبین: ڈاکٹر شہریار۔ ڈاکٹر مغنی تبسم)

ادب، فنونِ لطیفہ، فلسفہ، طبی اور معاشرتی علوم کی اہم دستاویز

ادبیاتِ عالم کے ترجموں، تلخیص، تعارف اور تنقید اور برِصغیر کے ادیبوں اور شاعروں کی منتخب تخلیقات کی سوغاتیں لے کر جنوری ۱۹۸۷ء پر منظرِ عام پر آ رہا ہے

سال میں دو کتابیں ضخامت قریب چار سو صفحات آفسٹ طباعت قیمت ۷۵ روپے

مکتبہ شعر و حکمت 6-865 - 11 ایڈیز حیدرآباد 500004

سول ایجنٹ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۳۱۰۸ گلی عزیز الدین وکیل کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۶

ڈاکٹر محمد علی اثر

# مثنوی پندِ دلبند

(تعارف)

مثنوی "پندِ دلبند" جس کے دوسرے نام "پندنامہ" "نصیحت نامہ" اور "قصۂ پرہیزگارد شیطان" بھی ہیں سترھویں صدی عیسوی کی ایک مقبول نظم ہے۔ اس مثنوی کا تعارف، سب سے پہلے ڈاکٹر زورؔ نے ۱۹۴۳ء میں، تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیاتِ اردو کی پہلی جلد میں کروایا تھا ڈاکٹر زورؔ مندرجہ ذیل اشعار کی مناسبت سے شاعر کا نام "علی" اور مثنوی کا نام "پندِ دلبند" تجویز کیا تھا

اگر علم دھرتا ہے پرکھ اے علی　　توں اس پر عمل کر خفی ہور جلی

دنیا کا جتا مال، دھن ہور گہر　　بلا دور اس پندِ دلبند اوپر

مثنوی کی زبان و بیان، زمانہ تصنیف اور اس کے دیگر نسخوں کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں

"کتاب کی زبان بہت پرانی ہے۔ اس لیے لازمی طور پر ۱۱۰۵ھ سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس کا کوئی نسخہ کسی کتب خانے میں نظر سے نہیں گزرا ہے[1]

بعد کو مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ۱۹۶۳ء میں "دکن میں اردو" کی چھٹی اشاعت میں 'علیؔ کا تذکرہ' عادل شاہی شعرا میں کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس دور کا ایک شاعر علیؔ ہے۔ جس کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات ہمیں نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثنوی "پندِ دل بند" کا پتا چلا ہے۔"[2]

---

[1] ڈاکٹر زور تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو صفحہ ۴۵

[2] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ صفحہ ۲۵۳

پیش نظر مثنوی کی تدوین کے سلسلہ میں راقم نے جب مختلف کتب خانوں کے مخطوطات کی چھان بین کی تو اس کے مزید چار نسخوں کا پتا چلا۔ پہلا نسخہ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری حیدرآباد کی ملکیت ہے، جس کا نام "قصۂ پر بینر گار و شیطان" ہے۔ شاعر کا نام مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "علی رحمن" بتایا ہے۔ دوسرا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے کی زینت ہے۔ مثنوی کا نام ابتدائی ورق پر "نصیحت نامہ" ہے اور "ترقیمہ" میں "پندنامہ" ہے[1] تیسرا نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں "مناجات علی رحمن" کے نام سے محفوظ ہے۔ یہ دراصل اس مثنوی کا ایک اقتباس ہے۔ چوتھا نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کی زینت ہے، جس کا نام نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "رسالہ مناقب" تجویز کیا ہے۔ ذیل میں سہولت کی خاطر "الف"، "ب"، "ج"، "د"، اور "ہ" کے نام سے ان مخطوطات کا تعارف کروایا جاتا ہے۔

## "نسخہ الف"

یہ مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو کی ملکیت ہے۔ اس کا نشان ۲۲ ہے۔ اس مخطوطہ کا تذکرہ ڈاکٹر زور نے دو مقامات پر کیا ہے (تذکرہ مخطوطات جلد اوّل ص۵۲، جلد سوّم ص۸) چھ اوراق پر مشتمل یہ نسخہ ½۵" × ½۸" کی تقطیع پر لکھا گیا ہے۔ ہر صفحے پر ۱۲، اشعار لکھے گئے ہیں بعض صفحات کے حاشیے پر بھی اشعار درج ہیں۔ خط نستعلیق شکستہ ہے اور سنہ کتابت ۱۱۵۸ھ ہے۔ جملہ اشعار ۱۸۳ ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اشعار کی تعداد ۱۹۵ بتائی ہے جو درست نہیں ہے۔ مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے۔

کہوں یک نصیحت عجب خوب تر بھلی پند سن جیو کے کان دھر

بھلے کوں بھلی پند بھاتی اہے بھلائی نئیں دل بھلاتی اہے

اختتام اور ترقیمہ یوں ہے۔

---

[1] افسر صدیقی امروہوی۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی (جلد چہارم) صفحہ ۱۸۳

ایا خالق عالم خیر و شر     توں اس مرد کی عاقبت خیر کر
جو دیکھے غیر اس کے اشعار کوں     منگے ہیں دعا منہ گنہ گار کوں

ترقیمہ ۔ العافیت بالعافیہ تمت بالخیر ۱۱۵۰ھ ہجری

پیش نظر نسخے میں یائے معروف یائے مجہول اور ہائے مخلوط اور ہائے ہوز میں امتیاز نہیں کیا ہے مثلاً بھلے (بھلی) ہی (ہے)

کھوں (کہوں) گھر (گہر) بہلی (بھلی) چہلی (چھلی) اسی طرح ک اور گ میں فرق نہیں کیا گیا ہے ۔ گ پر دوسرا مرکز نہیں ہے مثلاً کنکا (گنگا) گدا (گدھا)

شعری ضرورت کے لحاظ سے بعض الفاظ کے ٹکڑے کیے گئے ہیں مثلاً جام نا (جمنا) کو تے (کتے)

بعض الفاظ کو غیر ضروری طور پر ملا کر بھی لکھا گیا ہے۔ جیسے
پہنچیں (پہنچے ہیں) ادمیکی (آدمی کے)
ہائے مخلوط کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسے
پارک (پارکھ) چاک (چاکھ) دیک (دیکھ) تج (تجھ) بات کو بات لکھا گیا ہے اور "ٹ" کو "ت" مثلاً نیت (نیٹ) پتکا (پٹکا) اسی طرح "ڑ" کو "ر" اور "ڈ" کو "د" لکھا گیا ہے۔
پرنے (پڑھنے) دک (ڈگ) دملے (ڈھلے) بودا (بوڈا)

## نسخہ "ب"

یہ مخطوطہ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری حیدرآباد کی ملکیت ہے جس کا نشان "قصص ۱۰" ہے۔ پہلے صفحے پر سرخ روشنائی سے اس کا نام "قصہ پرہیزگار و شیطان علیہ اللعنت" لکھا گیا ہے۔ آٹھ اوراق اور ۱۰ × ۶ سائز کا یہ مخطوطہ ۱۸۲ ابیات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے پر خط نستعلیق میں ۱۲ سطور لکھے گئے ہیں۔ ابتدائی اور اختتامی اشعار یہ ہیں ۔

کہوں یک نصیحت عجب خوب تر بھلی پند سنو جیو کے کان دھر
بھلے کوں بھلا پند بھاتی بلبہ بھلاتی میں دل کوں بھاتی اہے

---

بروز مبارک ہوا یو تمام داود پر محمد علیہ السلام
بروز مبارک و سالِ سعید بتاریخ فرخ میانِ دو عید

اس نسخہ میں املا کی مندرجہ ذیل اشکال ملتی ہیں۔
"پھلی" بجائے "بھلی" "پھلائی بجائے بھلائی" "بھت" بجائے "بہت"
"نیت" بجائے "نیٹ"، "نھی" بجائے "نہیں"، "بھتر بجائے بہتر" "برا" بجائے
"بڑا"، بودھا "بجائے" بوڑھا" "چھور بجائے "چھوڑ"

# نسخہ "ج"

انجمن ترقی اردو کراچی کے اس مخطوطہ کا نشان $\frac{3}{98}$ ہے۔ ۷ × ۴/۱/۲ " کی تقطیع ' چھ
اوراق اور ۱۵۳ اشعار پر مشتمل اس نسخہ کا عنوان ابتدا میں "نصیحت نامہ" اور اختتام پر "پندنامہ"
لکھا گیا ہے۔ ۱۲ سطور فی صفحہ ' خط نستعلیق رواں۔ ابتدائی اور آخری اشعار و ترقیمہ اس طرح ہے

کہوں اک نصیحت عجب خوب تر بھلی پند سن جیو کے کان دھر
بھلے کوں بھلی پند بھاتی اہے بھلائی اپتے دل بھلاتی اہے

---

ایا خالق عالم خیر و شر تو اس ... کی عاقبت خیر کر
جو دیکھے وو مانے اس اشعار کوں منگے تب دعا مجھ گنہ گار کوں
"تمت تمام شد پند نامہ روز سہ شنبہ بتاریخ بستم ذی الحجہ ۱۱۸۶ھ ہجری نبوی"

# نسخہ "د"

یہ نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کی زینت ہے۔ ۱۰ اوراق، خط نستعلیق ۱۱ سطور فی صفحہ

مخطوطہ ۶×۹۔ نشان ۳۱۵۔ عنوان "رسالہ مناقب"

اس مخطوطے میں "پند دلبند" اور "محی الدین نامہ" (افضل) کے چند اوراق یکجا کر دیئے ہیں۔ کوئی بھی مثنوی مکمل نہیں ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی اس نسخے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اس رسالہ میں چند اخلاقی نصیحتوں کے بعد سیدنا عبدالقادر جیلانی کے مختصر مناقب بیان کیے گئے ہیں۔"[1]

اس مخطوطے کی چھان بین کے بعد راقم اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے ابتدائی دو اوراق "پند دلبند" کے ہیں۔

پہلا شعر: کہوں یک نصیحت عجب خوب تر بھلی پند سن جیو کے کان دھر

آخری شعر: یو یک چیز معلوم ہوا جب تجے دو جا چیز جو حق کوں تو بوجے (ورق

ورق ۳ تا ورق ۸ جملہ ۶ درمیانی اوراق مثنوی محی الدین نامہ (افضل) کے ہیں اور اس کے بعد ورق ۹ اور ورق ۱۰ پر مثنوی "پند دلبند" ہے۔ ان اوراق کو بہ آسانی علاحدہ کیا جا سکتا ہے۔ پند دلبند شکستہ نستعلیق میں تحریر کیا گیا ہے اور محی الدین نامہ خطِ نسخ میں ہے۔ مثنوی کا اختتام ان اشعار پر ہوا ہے۔

ہوا ہے سو ہیوش پیکر خراب پڑا یا ہے حرام سستی خراب

عمل علم پر سخت مشکل مہم ولیکن بھروسا ہے ہمنا تمام

اس نسخے میں بھی "گ" پر دوسرا مرکز نہیں ہے "ک" ہی لکھا گیا ہے یائے معروف اور یائے مجہول اور ہائے مخلوط اور ہائے ہوز میں بھی کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔ دیگر مخطوطات کے مقابلے میں اس نسخے میں کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں مثلاً

ع: "دنیا کا جتا مال دھن ہور گنج" کو اس طرح لکھا گیا ہے۔

ع: دنیا کا جتا مال دہن ہور گنج

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطات کی فہرست۔ صفحہ ۴۹۲

"ٹ" کو "ت"، "ڑ" کو "ر" اور "ڈ" کو "د" لکھا گیا ہے۔ جیسے "نیٹ" (نیٹا)
انپیرنا (انپیڑنا) بدا (بڈھا) وغیرہ

## نسخہ "ہ"

ادارہ ادبیات اردو کے اس نسخہ کا نشان ۷ ہے۔ یہ مخطوطہ دراصل پیش نظر مثنوی کا ایک اقتباس ہے، جس کا عنوان ڈاکٹر زور نے مناجات علی زحمتی لکھا ہے۔ خط نستعلیق شکستہ۔ تقطیع ۵" × ۸"، اوراق ۲، ۱۵ اسطور فی صفحہ

پہلا شعر: ترا نام قاضی جو حاجات ہے کلیاں سب کے دل کی ترے ہات ہے
آخری اشعار: ہماری دعائیں اگر مستجاب محمدؐ کی برکت سوں کر مستجاب
ترے فیض رحمت سوائے کردگار علی زحمتی .. .. تیرا ادھار

اس نسخہ میں بھی "گ" کو "ک"، "ٹ" کو "ت" "ڑ" کو "ر" اور "ڈ" کو "د" لکھا گیا ہے۔ بعض مقامات پر "ن" کا اضافہ کیا گیا ہے جیسے
سرنان (سرنا) مرنان (مرنا)

"تون" کو "تین" اکثر مقامات پر لکھا گیا ہے اسی طرح "سوں" کے بجائے "سین" "ہمنا" کی جگہ "ہمن" "عاجسزاں" کے بجائے "عاجزوں" "پو کی جگہ "پہ" "تہے کی جگہ "ہیگا"، "کروداں کرور" کی بجائے "کرورو کرور" "ہمیں کی جگہ "ہمن"

اس مثنوی کی ایڈیٹنگ کے دوران، اس کے چار نسخے (الف۔ ب۔ د اور ہ) راقم کے پیش نظر رہے ہیں۔ صحت متن، نیز خط اور زبان و بیان کی قدامت کے لحاظ سے نسخہ "الف" کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ لیکن جہاں کہیں یہ نسخہ آب زدہ یا کرم خوردہ ہو گیا ہے یا متن کھل نہیں سکا دوسرے نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔ اس احتیاط کے باوجود دو ایک لفظ نہیں کھل سکے ہیں۔ ایسے مقامات پر سوالیہ علامت (؟) لگا دی گئی ہے۔ اختلاف متن فٹ نوٹ میں درج کیا گیا ہے۔ موجودہ صورت میں اشعار کی تعداد ۱۸۸ ہو جاتی ہے۔

## شاعر کا نام :

نسخہ " د " میں شاعر کا نام نہیں آیا ہے۔ نسخہ " الف " میں ' صرف تخلص علی کا ذکر ملتا ہے جبکہ نسخہ " ب " میں " علی رحمن " ، " د " میں " علی زحمتی " اور " ج " میں واضح طور پر " علی رحمتی " آیا ہے۔ اس لیے شاعر کے نام " علی رحمتی " کے تعین میں کوئی دشواری نہیں ہوی۔ مصنف کے حالاتِ زندگی ' پردہ تاریکی میں ہیں۔ ڈاکٹر زور ' مولوی نصیر الدین ہاشمی اور افسر صدیقی نے بھی علی رحمتی کے حالات سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ علی تخلص کے شاعر کی دو اور کتابوں کا پتا چلتا ہے۔

۱۔ مثنوی علی[1] ۔ مصنف علی زمانہ تصنیف قریب سنہ ۱۱۰۰ھ

۲۔ نامۂ علی[2] ۔ مصنف عبدالعلی زمانہ تصنیف سنہ ۱۱۱۰ھ

ممکن ہے کہ یہ کلام بھی مثنوی پندِ دلبند کے مصنف کا ہو لیکن قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

## زمانۂ تصنیف :

مثنوی پند دلبند کے زمانہ تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔ البتہ آخری ابیات میں سلطان محمد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

بدوران سلطان محمد چناں		بعون الہٰی اتم البیاں

سلطان محمد سے یہاں مراد ' سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ء / ۱۰۲۰ھ۔ ۱۶۲۵ء / ۱۰۳۵ھ) بھی ہو سکتا ہے اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۶۲۶ء / ۱۰۳۵ھ۔ ۱۶۵۶ء / ۱۰۶۷ھ) بھی۔ راقم کا خیال ہے کہ زبان و بیان ' ذخیرہ الفاظ اور شاعر کے متخیلہ کے اعتبار سے یہ مثنوی دبستانِ

---

[1] ڈاکٹر زور ' تذکرہ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو جلد اول ، صفحہ ۲۴۷

[2] " " " صفحہ ...

و لکنڈہ سے متعلق ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں مذہبی کتابوں کو بیحد مقبولیت حاصل ہوی۔ محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد محمد قطب شاہ کے دور میں شعر و ادب اور رقص و سرور کی تمام سرگرمیاں ختم کر دی گئیں۔ سلطان محمد کو شعر و سخن سے زیادہ مذہبی علوم، فلسفہ اور تاریخ سے دلچسپی تھی۔ محمد قلی اور سلطان محمد کے مزاج اور طبیعت میں زمین و آسمان کا فرق تھا اسی لیے محمد قلی کے ملک الشعرا وجہی پر عتاب نازل ہوا اور اس کو مفلسی اور فاقہ کشی کے بھی دن دیکھنے پڑے۔ اسی طرح غواصی نے بھی اپنی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" محمد قطب شاہ کے دور میں تصنیف کی لیکن بادشاہ وقت [illegible] [illegible] یہ کہہ کر پیش کی:

ع : "کہ پھر جگ میں آیا ہے محمد قلی"

اسی لیے "سیف الملوک و بدیع الجمال" کے بعض نسخوں میں محمد قطب شاہ کی مدح میں اشعار ملتے ہیں اور بعض میں سلطان عبداللہ کی مدح میں۔

"پند دلبند" کا شاعر مملکت گولکنڈہ کے چھٹے فرماں روا محمد قطب شاہ کے دور سے متعلق ہے یا دو اس قدر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملک الشعرا غواصی، ابن نشاطی، نصرتی اور ہاشمی کا ہمعصر ضرور تھا۔


## مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو

برق و آشیاں از سید شبیدی ۵/- روپے اردو انسائیکلوپیڈیا از ادارہ ۴/- روپے

عروض از کلیم اللہ حسینی ۲/- روپے بلاغت از کلیم اللہ حسینی ۲/۵۰ روپے

تعلیم کا مسئلہ از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۲/- روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اُردو پنجہ گٹہ روڈ۔ حیدرآباد

# مثنوی پندِ دلبند

کہوں یک نصیحت عجب خوب تر — بھلی پند سن جیو کے کان دھر[1]
بھلے کوں بھلی پند بھاتی اہے — بھلائی منے دل بھلاتی اہے
جکوئی نرم دل پاک اخلاق ہیں — سو اس پاک باتاں کے مشتاق ہیں
جکوئی خوب یارک ہیں پرکار ہیں — سو اس گوہراں کے خریدار ہیں
جکوئی اصل گوہر میں کچھ خوب ہے — او سے پند گوہر تے اپر دیپ ہے
دنیا کا جتا، مال، دھن ہور گھر — بلا دور اس پند دلبند اوپر
یو بن مول گوہر جس ناوں پند — تجے مفت دیتا ہوں رکھ جیو سوں بند
توں نادر ہنر سوں کرے گا اگر — پھتر کوں سنا ہور سُنے کو پھتر
توں حکمت سوں لکڑی کے طوطے کوں بات — کرے گا اگر آدمی کے سنگات
توں پھترے کی مچھلی اگر راست کر — ترائیگا بہت فن سوں پانی اوپر
توں یو سب بڑے کام ہیں کر نہ جان — بھتے کام ہیں کر سمجھ لے سجان[2]
خدا کوں اپنڑنا بڑا کام ہے — بجتے کام اس کام انگے خام ہے
خدا کوں اپنڑنا کے تین چیز ہیں — یو تین چیز جس تے سونا جیز ہیں
اول او جو توں مل اسی یار سوں — کر جو نیط ہے اپنے کرتار سوں

---

[1] نسخہ "ب" بھلی اور سن تو جیو کے کان دہر
[2] نسخہ "ب" توں یو سب بڑے کام جنے کر جان — تہنے کام نئی یو سمجھ ہی سو جان

خدا سوں جکوئی نیٹ ہے استوار — سو اس پر خدا کا بہت ہے پیار
اگر توں بنگا ہے تو مل نیٹ سوں — جو اس سار کا ہوئیگا نیٹ توں
اگر نیٹ ہے توں بنگیاں سوں نہ مل — جو توں بھی بنگا ہوے گا سنگ دل
سچی جان اس بات اے نیک توں — اگر سچ کوں باور نہیں دیک توں
الف نیٹ ہے ہور بنگا ہے سو لام — سمجتے ہیں دو بات سب خاص و عام
دیے لام الف میں الف سربسر — ہوا ہے بنگا لام میں میل کر
یو پرخ توں بی آکر بنگا ہوئیگا — اگر توں بنگیاں میں عمر کھوئیگا
ہوتا نیٹ سوں مل کے نیٹ اے عزیز — ہوا تین چیزاں میں کا ایک چیز
جوں یک چیز معلوم ہوا اجب تجے — دو جا چیز پرنے کہ حق کوں بوجے
خدا کوں بغیر علم بوجا نہ جاے — انکھیاں باجھ کچ چیز سوجا نہ جاے
بہوت خلق اللہ سوں من ڈرامے ہیں — ولیکن بغیر علم نیں پاے ہیں
کرو علم کوں جان و دل سوں قبول — کہ بولے ہیں حضرت محمد رسول
جکوئی علم سکنے کوں جاتے بدل — پینے کفش ہور جاوتے پاؤں سو چل
تو پہلے قدم میں خدا اس پناہ اہے — دیوے ہور بخشے اسے سب گناہ[۱]
بھی عالم کا سونا خوبی پر اہے — کہ جاہل کی طاعت سوں بہتر اہے
جکوئی علم نا سکے رہے بے خبر — سو شیطان غالب ہوا اس اوپر
جکوئی علم سکنے پاے سبحان کوں — کیسے مار کر خوار شیطان کوں
اگر توں خدا کا طلب گار ہے — تجے علم سکنا سونا چار ہے
اول علم سوں توں خدا کوں پچھان — بغیر اس مار شیطان کے دانت بھان
یوں شیطان آپیں ہنوسے کھڑ خجل — پھر اتا ہے پڑنے تھے آدمیں کا دل

---

۱ نسخۂ الف: تو پہلے ڈگ میں خدا اس پناہ    دیوے ہور بخشے اسے سب گناہ

جو اللہ کوں علم تھے پاسے گا بزاں جان بوج کیوں دغا کھاسے گا
بزاں اس سنو جیو کے کان دھر کہ یک روز شیطان کے سب نفر
اپس میں اپیں جمع ہو کر تمام کیے آکو شیطان کوں سب سلام
بزاں سب کہے اپنی شیطانگی بیاں سب کیے اپنی مردانگی
یکس نے کہا آج میں ایک ٹھار لڑاکر جو ماریا ہوں دو جیو کے یار
یکس نے کہا مرد عورت سنے لگایا ہوں جھگڑا انن دو بی سنے
یکس نے کہا میں یکس کوں شراب پلاکر کیا چیر کری صور خراب
یکس نے کہا ایک فرزند کوں توڑایا ہوں میں اس کے ماں باپ سوں
یکس نے کہا یکس کو چھنال کیا صور بگڑیا اوسے کو قوال
یکس نے کہا میں لنگا جام نا لڑاکر جو ماریا ہوں دو ہمنان
یکس نے کہا میں منس جوی کوں لگایا ہوں جھگڑا انن دو بی کوں
یکس اپنے شیطانیاں کے سب جتنے کہے آکو شیطان کے سامنے
بودا ایک شیطان سب کے پچھے کہ وو سب میں بھوتیچ ایلیل اچھے
کہا سب میں ایلیل جیتا ہوں میں سبوں میں نمنا کام کیتا ہوں میں
کہ یک خوب خصلت کے نفر ادنے بھوت پاک دل سوں مرے سامنے
پگی سر اوپر لیکے آتا اتھا سو مکتب میں پڑنے کوں جاتا اتھا
سو اس کے دروے نے منے بیٹھ کر پھرایا ہوں پڑنے تھے دل کھیل پر
بوڑے سوں جو شیطانگی کا یو کام سینا جب وو شیطان نے سب تمام
تب او اوٹ دوڑ آیا اپس ٹھار سوں گلے لاکو بولیا اوسے پیار سوں
کہ شاباش پر کے خوب جیتا ہے توں سبوں میں بڑا کام کیتا ہے توں
دیکھے جب او شیطان کے سب نفر جو شیطان خوشنود ہوا اس اپر

---

سلہ نسخہ "ب" کہا سب منے ایک جیتا ہوں میں

بورا مان کر جہل سوں سب جنے  کیے آ کو شیطان کے سامنے
کیا عدل انصاف تے برطرف  پتوڑے پو رکھنے کوں دیتا شرف
برے کام میں ہم کیے کب بگ سکے[1]  دیا نیں توں ہم کوں شاباشگی
بڈے کوں جو شاباشگی توں دیا  سو ایسا بڑا کام او کیا کیا
بزاں ان کو بولیا کہ شیطان ہاں  تمارے میں اتنا سمج ہے کہاں
اگر او بڈا اس بچنے کا خیال  جو پڑنے تے اونا پھر اتا اتال
تو او علم سکے سیکھ پاتا خبر  تب اس پر نہ چلتا ہمارا مکر
جکوئی علم سوں کئی خبر پاینگا  بزاں جان بوج کیوں دغا کھاینگا
جکوئی راج مارگ سوں ناڈ ملے  سو غول بیاباں کا کیا گر چلے
جکوئی علم سوں بے خبردار ہے  دغا اس کوں دینا سو کیا بار ہے
اگر نیں ہے تمنا کوں باور یو بات  تماشا دیکھو آؤ میرے سنگات
جو جنگل منے ایک پرہیزگار  کہ پرہیزگاری میں ہے استوار
تجیا ہے دو صحبت جتے خلق کا  او سے بلکہ پروا نہیں دلق کا
اگر بادشاہ اس کے ملنے یدل  محبت سوں آتا ہے پاداں سوں چل
طمع بادشاہ کا دو دھرتا نہیں  نظر اس طرف بلکہ کرتا نہیں
جتا شہر کا خلق، سب خاص و عام  او سکا پیر کوں مانتے ہیں تمام
بندیا نیں ہے دو دل کسی یار میں  رہتا ہے دو ڈونگر کے ایک غار میں
سارا دیس اچھتا ہے دو روزہ دار  ساری رات بندگی میں ہے استوار
ولے اس میں کچ علم کا بل نہیں  جتے مشکلاں اس اوپر حل نہیں
دیکھو اس کو کیا ٹھگ لیتا ہوں میں  دغا اس کوں کیا بیگ دیتا ہوں میں

---

[1] نسخہ "ب" برے کام کا ہم کیے کک بے گی

بزاں اپنے نفراں سوں وو لاف مار　　لیا بھیس یک خوب او نابکار
پنیا ایک جبہ خوب جھلکار کا　　بندیا یک مونڈا اسا کہ دسار کا
لیا بھیس وو شیخ نے شیخ کا　　نہ تھا شیخ لیکن ہوا شیخ سا
بزاں اپنے نفراں کوں لے آس پاس　　بنایا سو پرہیزگاری لباس
لیا اپنے آس پاس سارا چشم　　دیا اس حشم کوں اپے محتشم
بزاں پھر کمالت سوں وو بد گوہر　　بیٹھیا ایک تخت مرصع اوپر
ہوا دیو منج سو شیطان آرنتری　　اوڑیا لیکے او تخت جیوں ہرہری
بزاں آیا اس ٹھار او نابکار　　کہ جس ٹھار رہتا تھا پرہیزگار
سو شیطان کی جوت سوں وو مقام　　اوجالا پڑیا سب جنگل میں تمام
دیکھیا جوت اس کا جو پرہیزگار　　دیا اس کوں تعظیم بے اختیار
کہے تب یکس یک کوں اے نیک نام　　سلام علیکم علیکم سلام
سو شیطان سوں دست بوسی کیا　　دیا مانَن حرمت سوں لبسا لیا
بزاں اس کوں پوچھیا کہ اے پاک ذات　　تمیں کون ہیں اس تجمل سنگات
جو منج سے کینے کے پاس آے ہیں　　ایتا مہر ہور لطف دکھلاے ہیں[1]
بزاں اس کوں شیطان کہا اے اصیل　　خدا کا فرشتا ہوں میں جبرئیل
خدا جِ کنے مجہ کوں بھیجا اہے　　سلام و کرم تجہ پہ بھیجا اہے
بزاں تجہ کوں بولیا ہے بعد از سلام　　جو توں پاک بندا ہے اے نیک نام
توں میرے بدل سب کی صحبت تجیا　　توں میرے بدل عیش و عشرت تجیا
جو میری عبادت توں ایسی کیا　　کہ بارا برس نیند یک کچ نیں لیا
مری بات سے پاک بندے چلے　　کیے یک تے یک لئی مشقت وے

---

[1] نسخہ "ب": جو منج سے کینہ پاس تم آے ہو　　ایتا مہر ہور لطف دیکھلاے ہو

مشقت تری دیک سب سر سٹے — عرش کے فرشتیاں کے سینے پھٹے

منجے رج اُپر بھوت آتا ہے پیار — مشقت تری دیک آتا ہے عار

مشقت کیا میں تجے اب معاف — نہ یا کچہ توں اس بات میں شین کاف

کہ صاحب کا پیارا ہوا جب نفر — بخشتے ہیں خدمت اوسے پیار کر

سخاوت کے صاحب ہیں جو نیک نام — سو آزاد کرتے ہیں بوڑا غلام

مجھے کوئی جیب لگ نہیں پائے ہیں — سو میری عبادت میں یوں دھلائے ہیں

منجے پائے بعد از تو طاعت نہیں — بزاں پچ گم عبادت کا حاجت نہیں

کہا جب وو شیطان باتاں سنوار — پھونیا تب خوشی سوں او پرہیزگار

کہ الحمد للہ جو میں اس وفا — ابلیس کی مشقت کا پایا جزا

بھی شیطان بولیا اس تھے معراج کوں[1] — جو رج سار کا کوئی نیں آج کوں تا

سواری کو براق لایا ہوں میں — تو رج کوں لیجانے کوں آیا ہوں میں

ولے باند پٹکا تو انکھیاں اوپر — جو پھرے لگے گی زمیں دیکھ کر؟

انکھیاں اس کیاں پٹکے سوں باند استوار — کیا تب اُسے یک گدھے پر سوار

بزاں اس کوں، جس شہر کے خاص و عام — بڑا پیر کر مانتے تھے تمام

سو بازار کے چوک میں یا ادتار — بھی ھیلی لگا اس کیا شرمسار

بزاں وہاں تے شیطان ناپاک ذات — اوسے پھر مکانگی لفراں سنگات؟

دیکھیا آکو بازار میں ایک گنھار — جو قاضی کا فرزند بے اختیار

ہوا ہے سو بے ہوش و بے اختیار — پڑیا ہے خرابی سوں ہو مست و خوار[2]

کئی ہے بھوت خلق اس پر ہجوم — ہوا ہے اس ابتر آلی دو روز شوم

---

۱ نسخہ "ب" بولایا تھے اپنے معرج کوں

۲ نسخہ "ب" ہوا ہے سو بے ہوش پی کر شراب — پڑا ہے خرابی سوں مست ہو خراب

سو قاضی کے فرزند کے سامنے  کہا آکو غصے سوں شیطان نے
جو توں کیوں پیا ہے شراب حرام  کیا کھوں خدا منع کیتا سو کام
خدا ایچ کوں بخشیا ہے اس بارگی  ولے بعد ازاں پھر گنہ گارگی
اگر پھر کو اس کام میں آئے گا  تو البتہ اپنا کیا پائے گا
دیا اس کو قاضی کا فرزند جواب  جو توبہ بغیر کاں ہے بخشش کا لاب
ہوا نیں تلک میں گنہ تے جدا  بغیر توبہ کیوں مج کوں بخشیا خدا
برسے بول توں کون ہے اے ذلیل  کہا اس کوں شیطان میں جبرئیل
بزاں اس کو قاضی کا فرزند بچار  کہا جھک تکو مار اے نابکار
کیسے جبریل یوں بلائے تمہیں  بغیر از نبی کس پو آئے نہیں
نہ چل سے حریفاں سوں ات کت یتی؟  توں البتہ شیطان ہے لعنتی
سنیا جب وو شیطان اپنا خطاب  گدھا ہو کے غائب ہوا تب شتاب
وہ قاضی کا فرزند لاحول جب  پڑیا ہے گیا تھا س شیطان تب
بزاں آکھا اپنے لنگراں سنے  جو دیکھے تماشا تمیں سب جنے
کہ جاہل اٹھا وو جو پرہیزگار  سو کیا بیگ اُسے میں کیا خوار زار
یو قاضی کا فرزند عالم ہے کر  چلیا نیں مرا مکر اس کے اُپر
جکوئی علم سوں لئی خبر پائینگا  بزاں جانی بوج کیوں دغا کھائینگا
عزیزاں دیکھو کام شیطان کے  جو وو کیوں لیے دنیا کی انسان کے
لکھ لیوں طلبگار سبحان کا  یو سمجھانا نکو کرتوں شیطان کا
عزیزاں بندہ علم سوں جان وو دل  بزاں اس سوں شیطان کو کرنا خجل
سو کرتا طلب علم کر مان توں  فرض مرد و عورت اوپر جان توں
نبی کی سو فرمودگی سوں توں اب  اگر چین میں علم ہے کر طلب [1]

---

[1] نبی کا فرمودہ کریگا تو اب  اگر چین میں علم کر توں طلب

ہوتا علم سک مستعد اے سجان — بزاں مار شیطان کے دانت شکاں؟
ہوا جب دوجے چیز کا سب خبر — تجا چیز کرنا عمل علم پر
اگر علم دھرتا ہے کچھ اے عملی — توں اس پر عمل کر خفی ہور جلی
عمل بن علم کا نہیں فائدہ — تو اس علم سکنے کا کیا فائدا
ہر ایک علم جو نیں ہے اس میں عمل — سواد علم جیوں جھاڑ ہے باج پھل
اگر جان و دل سوں کرے گا اول — توں اس علم ظاہر موافق عمل
خدا تج کوں اخلاص دکھلائے گا — بزاں علم باطن بھی سکلائے گا
اول کر تو علم الیقیں پر عمل — بزاں تج پو عین الیقیں ہووے حل[1]
اپچے جب توں عین الیقیں پر قرار — ہووے تج پو حق الیقیں آشکار
توں حق الیقیں خوب جب پائے گا — توں حق الحقیقت سنے تے گا
غرض حال ہونا ہے تجے اے اصیل — اگر نیں تو کیا فائدہ قال و قیل
یو جو علم سکتا ہے بہر عمل — دسکتا ہے کچھ بحث کرنے بدل[2]
جکوئی بحث کرنے میں ہے مست چاک — کہاں پائے گا لذت ذوق خاک[3]
جو باتاں سوں یو حال حاصل نہیں — بغیر از عمل کوئی واصل نہیں
عمل باج کچھ علم کوں نیں جزا — شکر چاک دیکھے بغیر نیں مزا
جکوئی شہد کے ناوں سوں سربسر — نپاوے لذت چاک دیکھے بغیر
لیوے کوئی اگر نام آب حیات — نہووے کدھیں خضر فرخندہ ذات
جو حلوے کوں بولے سو کیا اعتماد — جکوئی اس کوں کھائے سو پاوے سواد

---

[1] نسخہ "ب" وے کر تو علم الیقیں پر عمل — خدا تج پو حق الیقیں ہووے حل
[2] نسخہ "ب" جو کوچہ علم سکیتا بہرے عمل — نہ سکتا ہے کچھ دنیا کرنے بدل
[3] نسخہ "ب" جکوئی محنت کرنے میں ہے مست خیال — کہاں پائے گا لذت ذوق حال

تو لگے مطبخ پو کے بیٹھا ں  جو کرتے ہیں او خرچ نعمت بیاں
نہ اس کا لذت کچ بھی پاتے ہیں او  سمجھتے ہیں جگوں کر کھاتے ہیں او
اگر چھالاہے تجہ میں ہور نیں ہے مال  تو مطبخ کے ہمن کا تو سا ہے مثال
تیرے قال سا حال کر بے درنگ  سکت پھر توں توفیق حق پاس منگ
خدایا بحق محمد رسول  دعا مج گنہ گار کا کر قبول
ترا ناوں قاضی الحاجات ہے  کلیاں دل کے جب کیاں ترے ہات ہے
ترا نام ستار غفار ہے  مرا نام عاصی گنہ گار ہے
پھرے دل ہمارا برے کام سوں  بخش اپنی بخشش کے انعام سوں
عمل علم پر سخت مشکل ہے کام  ولیکن بھروسا ہے ہمنا تمام
کہ جس پر ترا لطف و احسان ہے  جتیاں مشکلاں اس پر آسان ہے[۱]
خدایا یو مشکل توں آساں کر  ہمن عاجزاں پر توں احسان کر
اگر توں جو دیکھے ہماری طرف  فرشتیاں تے اگلا ہے ہمنا شرف
اگر توں نہ دیکھے تو اے ذوالجلال  کتے سوں برا ہوا ہمارا حوال[۲]
ہمارا تو یو حال ہے اے قدیر  ہمن عاجزاں کا توں ہو دستگیر[۳]
تو ہمنا کہیں یو عقل ہور جیو دیا  سو اپنی عبادت کوں پیدا کیا
ہمیں غافلی سوں عبادت کوں چھوڑ  گناہاں کیے ہیں کروڑاں کروڑ
ہنسی میں گنوا دیں عمر کھیل میں  رہے بھول شیطان کے میل میں
ہمیں سب ترے حکم کوں توڑ کر  کیے کام شیطان کے حکم پر

---

۱ نسخہ "ہ" کہ جن پر ترا لطف احسان ہے  ساری مشکلاں اس کو آسان ہے
۲ نسخہ "ہ" اگر تیں نہ دیکھے جو اے ذوالجلال  کتوں تھے بنٹ بد ہمارا حوال
۳ نسخہ "ہ" ہمارا توں ہیگا جو صاحب قدیم  تو ہیں دستگیر ہے جو ہم ہیں یتیم

خجل ہیں ہمیں کیوں منا دیں تجے    قیامت میں کیا مکھ دکھاویں تجے
جو نا چیز بدکار بد حیف حیف    گنوائے ہمیں عمر صد حیف حیف
عبادت میں یو عمر سرنا بھلا    گناہاں کے جینے سوں مرنا بھلا
ہمارے گناہاں سے لرزے زمین    توں کر رحم یا ارحم الراحمین
گناہاں کے دریا میں یارب اپنے    ہمیں غرق ہوتے ہیں ٹک ہات دے
بوے ہیں ہمیں نفس کے گھات سوں    اوچا لینے توفیق کے ہات سوں
تو بخشے میں قوت دے تقدیس کا    جو توڑیں ہمیں پنجہ ابلیس کا
محمد کی برکت سوں کر مستجاب    دعا مجہ گنہ گار کا بر شتاب
علی رحمتی کوں ہے تیرا دھار    تیرے فضل رحمت سوں اب کر دکار
خدایا جکوئی اس رسالے اوپر    مطالعہ کریگا تو اس میں اثر
جو اس کے موافق چلے تو شتاب    جو مجہ کوں بھی ہوے اس تے ثواب
ایا خالق عالم خیر و شر[۱]    توں اس مرد کا عاقبت خیر کر
جو دیکھے خبر اس کے اشعار کوں    منگے تب دعا مجہ گنہگار کوں
بدوران سلطان محمد چناں    بعون الہٰی اتمم البیان[۲]
بروز مبارک ہوا یوں تمام    درود بر محمد علیہ السلام
بروز مبارک و سال سعید    بتاریخ فرخ میان دو عید

---

۱؎ نسخہ "ب" کہ یا خالق و عالم خیر و شر
۲؎ نسخہ "ب" بدوران سلطان محمد ز...    تمام شد از افضل ہذا لبیان

# فرہنگ

| | | |
|---|---|---|
| جیو = دل | باج = بغیر | ہونڈاسا = بھینسا |
| اسے = ہے | بہوت = بہت | یتا = اتنا، اس قدر |
| کوں = کو | پڑنے = پڑھنے | سار = مانند |
| جکوئی = جو کوئی | آدمیں = آدمی | پٹکا = پٹی |
| تے = سے | ٹھار = جگہ، مقام | اُپرل = اوپر |
| اپروپ = بے مثل | بہوتچ = بہت ہی، نہایت | لاب = فائدہ |
| جتا = جتنا | اکیلیں = منفرد | نھاسنا = بھاگنا |
| بہور = اور | پٹا = تختی، لوح | بیگ = جلد |
| بلادر = خلاف صفتی | درتنا = دل | اوچانا = اُٹھانا |
| یو = یہ | بیس کرنا = بیٹھ کر | ادھار = سہارا |
| رکس = رکھو | اُٹ = اُٹھ | |
| پھتر = پتھر | لانا = لگانا | |
| سنا = سونا | پتولا = ریشم کا کپڑا | |
| انپڑنا = پہنچنا، رسائی حاصل کرنا | اتال = فوراً | |
| کرتار = مالک | تجنا = ترک کرنا، چھوڑ دینا | |
| سیدھا = سیدھا، راست گو | ڈونگر = پہاڑ | |
| بنگا = ٹیڑھا | اچھنا = رہنا | |

بہادر یار جنگ

ادبِ نوادر

# نعت

اے کہ ترے وجود پر خالقِ دو جہاں کو ناز
اے کہ ترا وجود تھا وجہِ وجودِ کائنات

اے کہ تو فخرِ آدمی، واقفِ سرِّ عالمی
لوح و قلم سے بے نیاز تیرے علومِ شش جہات
اے کہ ترا سرِ نیاز، حدِّ کمالِ بندگی
اے کہ ترا مقامِ عشق، قربِ تمامِ عینِ ذات
اے کہ تری زبان سے ربِّ قدیر گفتگو
وحیِ خدا سے علم پر نزل تھی تری ایک ایک بات
تیرے کلام سے کھل گئیں تیرے بیاں سے حل ہوئیں
منطقیوں کی الجھنیں، فلسفیوں کی مشکلات
خوگرِ بندگی جو تھے تیرے طفیل ہم ہوئے
مالکِ مصر و کاشغر، وارثِ نیل و دجلہ و فرات

مجھ سے بیاں ہو کس طرح رفعتِ شانِ احمدیؐ
تنگ مرے تصورات، پست مرے تخیلات

([illegible] ۱۹۲۹ء [illegible] بہادر یار جنگ)

## جگن ناتھ آزاد

# غزل

کس متاعِ شوق کی ہم جستجو کرتے رہے
زندگی بھر زندگی کی جستجو کرتے رہے

جب حریفوں کی زباں تھی شعلہ گفتاری میں غرق
ہم تغزل کی زباں میں گفتگو کرتے رہے

اور ہوں گے جن کو ہوگا چاکِ دامانی پہ ناز
ہم جنوں میں چاکِ داماں کو رفو کرتے رہے

اصل میں ہم تھے تمہارے ساتھ محوِ گفتگو
جب خود اپنے آپ سے ہم گفتگو کرتے رہے

اے خردمندو جنوں سے جب کہ ناواقف تھے تم
سوچتا ہوں کس طرح تم ہائے و ہو کرتے رہے

اُن کو اب نفع و ضرر کی بات کیا سمجھائیں ہم
وہ جو سودائے متاعِ آبرو کرتے رہے

پینے والوں کا جب اوروں کے لہو پر تھا مدار
ہم شریکِ جام اپنا ہی لہو کرتے رہے

گوہرِ مقصد نہ پایا گرچہ ہم اس کی تلاش
یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو کرتے رہے

کوئی یہ آزاد سے پوچھے کہ اپنے دل سے دور
تم کہاں جا کر تلاشِ رنگ و بو کرتے رہے

علی احمد جلیلؔ

# غزلیں

موج و طوفاں نے خیال اتنا تو رکھا میرا
لا کے ساحل پہ ڈبویا ہے سفینا میرا

جانے کیوں آج یہی سوچ رہا ہوں بیٹھا
زندگی چھوڑ کے کب جائے گی پیچھا میرا

وہ جو پہچان مرے پیار کی اخلاص کی تھی
لے گئے چھین کے احباب وہ چہرا میرا

یہ تعلق بھی تسلی کو بہت کافی ہے
اجنبی بن کے سہی، نام تو پوچھا میرا

آج سنتے ہیں وہیں رنگ بہاروں کا ہجوم!
کل گلستاں میں جہاں خون گرا تھا میرا

محترم اب تو مری تشنہ لبی ہے اتنی:
راستہ چھوڑ کے ہٹ جاتے ہیں دریا میرا

میں تری یادوں کی ٹھنڈک میں رہا گرم سفر
میرے قدموں تلے جلتا رہا سایا میرا

چلتے پھرتے کبھی مل جاتی ہے راہوں میں قضا
زندگی سے ہے یہی اب اتنا ہی رشتہ میرا

کچھ افسانے ڈھونڈ کے لاتے — ہم بھی اک تارِ سخن بناتے!
قطرہ عالی ظرف جو ہوتا — دریا پیاس بجھانے آتے
سب ہم کو سمجھانے آتے — ہم کس کو سمجھانے جاتے
گلچیں ہو کر دامن خالی — کانٹے ہیں کچھ چن کر لاتے
اس دھرتی کی پیاس تو بجھتی — بادل خون ہی کچھ برساتے
شاخِ گل سے کھیلنے والے — کاش کہ اب تلوار اٹھاتے
خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر — درد کے ہیں یہ رشتے ناطے
زخمی لب بھی ہنستے لیکن — بیچارے ہنسنے تو پاتے

ہم جو علیؔ ان پر کچھ لکھتے
الفاظ استقبال کو آتے

محمود سعیدی

# غزل

مسندوں کی مدح خوانی کر رہا ہوں اِن دنوں
پیٹ انگاروں سے اپنا بھر رہا ہوں اِن دنوں

لے رہا ہوں سانس، شہرِ مصلحت کی بھیڑ میں
میں، کہ جینے کی ہوس میں مر رہا ہوں اُن دنوں

میں، کہ لڑتا تھا، بہادر دوستوں سے بے دریغ
بزدلوں کی دشمنی سے ڈر رہا ہوں اِن دنوں

کوچہ و بازار کے حالات، کیا سے کیا ہوئے
کیا بتاؤں، میں تو اپنے گھر رہا ہوں ان دنوں

ہو گئے رخصت، صدا کر کے، تقاضے روح کے
چھپ کے اپنے جسم کے اندر رہا ہوں ان دنوں

تن پہ سر اغیار کا، منہ میں رقیبوں کی زباں !
اپنے حال و قال پر ششدر رہا ہوں ان دنوں

آفاق و ہستی پیشِ نظر، زیرِ قدم !
میں حصارِ ذات سے باہر رہا ہوں اِن دنوں

علم میرا، خامشی سے تک رہا ہے میرا منہ
جہل کی میں ترجمانی کر رہا ہوں اِن دنوں!

ناکسوں کی صحبتیں بھی اب گوارا ہیں مجھے
کس کی خاطر! میں یہ کیا کیا کر رہا ہوں ان دنوں

ٹھوکریں کھا کر انا کی، گر پڑا ہوں، بار بار
میں خود اپنی راہ کا پتھر رہا ہوں اِن دنوں

جس کے بارے میں کبھی محمود سوچا بھی نہ تھا
میں یہ کس افتاد کی زد پر رہا ہوں اِن دنوں

حمید سہروردی

# کرسی میں دھنسا آدمی

حالانکہ وہ چھٹی کا دن تھا مگر وہ آفس آیا ہوا تھا۔ جس وقت وہ آفس کے احاطے میں پہنچا، اس وقت وہاں صرف چوکیدار تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ آفس شہر کی پررونق سڑک سے پچاس قدم کے فاصلے پر ایک گلی میں تھا۔ ویسے لوگوں کی آمد و رفت ہر وقت رہتی ہے مگر آج چھٹی کا دن ہے۔ اس لیے سڑک پر اور نہ ہی گلی میں کوئی شخص نظر آ رہا ہے۔ سلام کرتے ہی [illegible] چوکیدار نے کمرے کا قفل کھولا۔ اس نے آفس میں داخل ہوتے ہی پنکھے کا سوئچ آن کر دیا۔ اس کے پیچھے ہی چوکیدار نے کمرہ صاف کرنے میں [illegible] کپڑا اٹھایا، کرسیاں اور ٹیبل صاف کرنے لگا۔ اس نے ٹیبل میں دبائے ہوئے فائلیں ٹیبل پر پھیلا دیں۔ پیچھے دیوار سے لگے ہوئے [illegible] پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کرسی میں دھنس گیا۔ فائلیں کھول کر کاغذات ادھر ادھر کرتے ہوئے کسی مسئلے پر غور کرنے لگا۔ اسے کسی کے قدموں کی آواز کا احساس ہوا مگر اس کی نظریں فائل پر ہی جمی رہیں۔ قدموں کی آواز دھیرے دھیرے اس کے قریب آنے لگی۔ اس نے گردن اٹھائے بغیر پوچھا۔

کون ـــــــ؟ چوکیدار ـــــــ؟

نہیں میں ہوں ـ آپ سے ملنے آیا ہوں۔ اجنبی نے کہا۔

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے پوچھا۔ تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیوں خاموش ہو ـــــ؟

اجنبی نے اس مرتبہ بھی کچھ نہیں کہا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ مگر کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے اجنبی کو بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ اجنبی حیران و پریشان ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ کیسا آدمی ہے۔

اجنبی نے کچھ توقف کے بعد کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی سے اجازت لی۔ "کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔" مگر کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے بغیر گردن اٹھائے ہوئے کہا ـ "ہاں بیٹھ جاؤ۔" اجنبی نے پتلون کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگایا۔ [illegible] مصروفیت کی حالت میں [illegible] ایک بوسیدہ [illegible]

[illegible]

نا دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ ایک ایک تصویر کے ساتھ اس کے ذہن میں کچھ باتیں گھومنے لگیں
یہ گاندھی جی کی تصویر ہے ــــ اہنسا کے اصولوں پر چلنے والا۔ یہ لعل بہادر شاستری کی تصویر ہے ــــ جے جوان،
جے کسان اور یہ کون ہے، کون ہوگا ــ ؟ میں نہیں جانتا، شاید کوئی شاعر ہوگا۔ لیکھک ہوگا یا پھر کوئی لیڈر ــــ اور
پھر وہ کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوا۔ "کیا آپ مصروف ہیں" کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوا "کیا آپ
مصروف ہیں" کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے کسی قدر گردن اٹھاتے ہوئے کہا ــ "کیوں کیا بات ہے"

اجنبی نے کہا ــــ "کیا میں جا سکتا ہوں ــ"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے کہا ــــ "کیوں ــ"

اجنبی نے کہا ــــ "اس لیے کہ آپ مصروف ہیں ــ"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے کہا ــــ "تم کیوں آئے تھے۔ اور کہاں جاؤ گے ۔ ؟"

اجنبی ــ "میں آپ سے ملنے کے لیے آیا تھا ــ"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــــ "کیوں۔ میرے پاس کیا ہے۔ اور تم مجھ سے مل کر کیا کرنا چاہتے ہو ــــ"

اجنبی نے کسی قدر ذہن پر زور ڈالتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "ہاں میں یہاں کیوں آیا تھا۔ آپ سے مل کر کیا کرنا چاہ رہا ہوں،
سوچا کہ آپ کون ہیں جان لینا چاہتا ہوں ــ"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے کرسی کی پشت کو ٹیک لگا کر، سگریٹ کا لمبا کش لیتا ہوا کسی قدر رسیلے ہوئے انداز میں
کہا "یہ سوال مجھے کرنا چاہیے تھا۔ اب تم مذاق چھوڑ دو۔ صاف صاف بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔"

اجنبی نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ "میں صاف صاف ہی کہہ رہا ہوں . . . . . . جیسے آج تم سے کوئی کام نہیں ہے بس یوں
چلا آیا ہوں ــ"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــــ "کیا مطلب ہے ــ"

اجنبی ــــ "صاف ظاہر ہے ــ"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ــــ "تم بیوقوف لگتے ہو ــ"

اجنبی ــ "تمہارے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے ــ"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ——— "کیا باہر میرا چوکیدار نہیں تھا؟"

اجنبی ——— "وہ اونگھ رہا ہے!"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ——— "کب سے"

اجنبی ——— جب سے میں یہاں آیا ہوں۔"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی کے چہرے کا رنگ بدلتا ہے۔" ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے مگر تم کس توقع پر بیٹھے ہوئے ہو۔" پھر اس کی نظریں ٹیبل پر رکھی ہوئی فائل پر جمتی ہیں۔

اجنبی۔ کچھ دیر، تم سے باتیں کر کے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر سکوں۔ اس لیے۔"

کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی کا چہرہ لال ہوتا ہے اور زور سے کہتا ہے۔

"کیا تم نے مجھے باتونی بکواسی اور بے کار سا آدمی سمجھا ہے؟"

اجنبی ——— "نہیں۔ میں ایسا سوچ رہا ہوں۔ میرے دماغ میں اور بھی کچھ باتیں تھیں مگر تم اپنے کام میں مشغول تھے کہ ساری باتیں دماغ میں ہی غائب ہو گئیں۔

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "۔ اس کے چہرے کے تاثرات پھر بدلتے ہیں۔" تو ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

اجنبی ——— "وہ تو میں چلا جاؤں گا . . . . . میرے چلے جانے کے بعد تم کیا کرو گے۔ کرسی اور کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی کی طرف دیکھتا ہے!"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی غصہ سے کہتا ہے۔" تم کون ہوتے ہو ساری باتیں پوچھنے والے۔"

اجنبی ——— ہاں، میں کون ہوتا ہوں، مگر تم کیا کرو گے یہ سب جان کر۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "۔ میں کچھ بھی کروں۔ میرے کاموں سے تمہیں کیوں اتنی دلچسپی ہے۔"

اجنبی ——— خیر۔ تم کیا کرو گے یہ جان کر کہ میں کون ہوں۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی "۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم کون ہو۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں میرے کاموں سے اتنی دلچسپی [illegible] ہو رہی ہے۔ تم کوئی بھی ہو۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

اجنبی [illegible] تو [illegible] تم [illegible] ہو۔ کیوں شک کر رہا ہوا تھا۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ——— بیزارگی سے :" تم کبھی ٹھیک نہیں کہہ سکے کہ تم انتہائی فضول لگتے ہو ——"

اجنبی اطمینان سے :" ٹھہرو ——— ایک بات بتاؤ ۔ میں جس وقت یہاں ——— تمہارے آیا ہوں تم کیا کررہے تھے ۔

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ——— گھبراتے ہوئے :" کیا کررہا تھا ۔ کچھ پڑھ رہا تھا ۔"

اجنبی :" کیا پڑھ رہے تھے ؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ——— تم کون ہوتے ہو ۔ تمام تفصیلات جاننے والے

اجنبی :-" میں یہ کہتا ہوں کہ تم کچھ نہیں پڑھ رہے تھے ——"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ——— بیزارگی سے :" ٹھیک ہے پھر میں کیا کررہا تھا ؟" خود سے پوچھتا ہے ۔ خاموش ہوتا ہے اور اس کی نظریں سامنے رکھی ہوئی فائیلوں پر پڑتی

اجنبی ——— خاموشی کو توڑتے ہوئے کہتا ہے :" تو پھر بتاؤ ۔ تم کیا پڑھ رہے تھے ؟

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی کسی قدر خفگی سے کہتا ہے :" پھر وہی نان سنس قسم کی بات ——— پڑھ رہا تھا تمہیں اس سے کیا سروکار ———

اجنبی :- چلو خاموشی تو ٹوٹ گئی ۔ میں یونہی پوچھ رہا تھا مگر تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو ؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی :- " عجیب نامعقول آدمی ہو ۔ تم بھی ۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمہاری طرح بے کار آدمی تو نہیں ہوں ——"

اجنبی :-" یعنی کہ میں بے کار آدمی ہوں ۔ اور تم کارآمد اور مصروف ترین"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ——— " بالکل ——— تم صدفی صد بے کار آدمی ہو ۔ یہاں کیوں چلے آتے ہو بے پہچان خالہ اماں سلام ——"

اجنبی :- " پھر ناراض ہو رہے ہو ۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی :- " ناراض ہو کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا ۔ اجنبی نے

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی :- " کیا تم میری اجازت لے کر اندر آئے تھے ، ویسے تم جا سکتے ہو "

اجنبی :- " یہ بات تو درست ہے کہ میں تمھاری اجازت لے کر اندر نہیں آیا تھا "

اچانک کرسی میں دھنسے ہوئے آدمی نے میز کی دراز کھول کر اندر سے ایک لفافہ نکالا کے اندر سے کچھ کاغذات نکال کر تیزی سے پڑھنے لگا ۔ اور اجنبی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا

اجنبی کھڑا ہوا ہے ۔ پھر پوچھتا ہے " کیا میں جا سکتا ہوں ؟ "

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی خاموش ، اس کی طرف خوف زدہ ہو کر دیکھنے لگا اور اس کے تیزی سے حرکت کرنے لگے اور اپنی انگلیوں کی لکیروں پر تیزی سے اپنا انگوٹھا پھیرنے لگا ۔ پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ چوکیدار کو آواز دی ۔

" رام دھن ـــــــ رام دھن ـــــــ اے او رام دھن ـــــــ

" پتہ نہیں ۔ یہ منحوس بھی اس وقت کہاں چلا گیا ۔ کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا اور کچھ کام تو بے وقت ہوتے ہیں ۔ میں اس سے تنگ آ گیا ہوں ۔ کہاں گیا ہوگا ۔ رام دھن ـــ "

مگر اس کی نظریں اجنبی پر جمی ہوئی ہیں ۔ اور اس کا انگوٹھا تیزی سے انگلیوں پر گھوم رہا ہے ۔ گلاس کے گرنے کی آواز آتی ہے ۔ کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ایک دم کرسی پر اچھل پڑتا ہے ۔ " کو رام دھن ـــــ کہاں مر گیا تھا بے ادھر آ ـــــ یہاں آ ـــــ کوئی کام وقت پر نہیں کرتا ۔

مگر باہر سے کوئی آواز نہیں آتی ۔ اور نہ ہی رام دھن آیا ۔ پھر وہ بڑبڑانے لگتا ہے ۔

" آخر کیا ہو رہا ہے یہ سب کچھ ـــــــ دراز سے نکلے ہوئے کاغذات ، اندر دراز میں رکھ دیتا ہے ۔ اپنے آپ کو تسلی دینے لگتا ہے ۔ کرسی پر پیر لمبے کر کے کسی قدر دراز ہوتا ہے اور اجنبی سے پوچھتا ہے

" ہاں تو تم نے کیا کہا ـــــ ؟ "

اجنبی حیرت زدہ ہو کر ـــــ " تم کیا سوچ رہے ہو ؟ کیا میں جا سکتا ہوں ؟ "

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ۔ ادھر ادھر رازدارانہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھتا ہے ـــ " کیوں ؟ "

" اجنبی ـــــ مجھ سے کوئی کام ہے ؟ "

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی ـــــ " نہیں کوئی کام نہیں ہے ۔ بس بیٹھو ـــــــ "

اجنبی — گھبراتے ہوئے۔ پھر ادھر اُدھر دیکھتا ہے مگر کیوں۔ کیا مجھ سے کوئی اور کام ہے؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی — کسی قدر بلند آواز میں کہتا ہے اور کام! کیا مطلب؟"

اجنبی — پھر — اور — کام — "

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی —" اس سے پہلے میرا کون سا کام، تم نے کیا تھا؟ جو یہ کہہ رہے ہو کہ کوئی اور کام —

اجنبی — خیر — تمہیں یاد نہیں ہے کیا تم میرے بارے میں نہیں سوچ رہے تھے۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔ حیرت سے! " تمہارے بارے میں نامعقول۔"

اجنبی —" یہ ایک حقیقت ہے۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی — " کیا عجیب آدمی ہو۔ وہ اپنے لمبے لمبے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

اجنبی — "پھر میں جا سکتا ہوں —؟"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی —" ہاں ہاں جا سکتے ہو۔"

اجنبی — " کیا تم نے اب تک مجھے پہچانا نہیں —؟

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی —" میں اپنے سوا کسی اور کو نہیں جانتا۔"

اجنبی — " کرسی کو بھی —" خیر اب میں جاتا ہوں مگر یاد رکھو۔ تمہیں میری ضرورت پڑے گی۔ تم میرے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہاں۔ اور یہ بھی یاد رکھو اس کے بعد پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ اور تم میرے بغیر بے حال ہو جاؤ گے سمجھے —"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔ " جاؤ، جاؤ، بہت ہو چکا۔ بہت آتے ہیں ایسے ایرے غیرے۔ تمہیں بھلے آدمی کی تمیز کرنی آتی ہے یا نہیں؟

اجنبی۔ " کیا یہی سوال میں تم سے کر سکتا ہوں۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔" میں کہتا ہوں یہاں سے چلے جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔

اجنبی — ہاں ہاں — ہاں جاؤں گا مگر ایک مرتبہ اور کہوں گا کہ تم میرے بغیر بے یار و مددگار رہو گے۔"

کرسی میں دھنسا ہوا آدمی۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، جاؤ چلے جاؤ —

اجنبی تیزی سے قدم بڑھاتا ہے اور کرسی میں دھنسا ہوا آدمی پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا۔

وقار خلیل

# اردو نامہ

## علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

۳ - ستمبر: ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس ایوانِ اردو میں صدرِ ادارہ جناب
محامد علی عباسی کی صدارت میں منعقد ہوا، مختلف علمی ادبی مسائل اور دفتری امور پر
مشاورت ہوئی۔ جناب اکبرالدین صدیقی، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، پروفیسر
ضیاءالدین انصاری، نواب سراج الدین احمد، پروفیسر مغنی تبسم، جناب محمد منظور احمد
ڈاکٹر یوسف اعظم اور معتمد ادارہ جناب رمن راج سکسینہ نے شرکت کی۔

۶ - ستمبر: ادارۂ مرکز ادب کا طرحی مشاعرہ جناب خورشید جنیدی کی صدارت میں ہوا۔ ماہر حیدرآبادی
جامی صدیقی، داؤد نصیب، عظیم حیدرآبادی، عزیز بھارتی، مومن خاں شوق، رؤف رحیم
شاغل ادیب، لیق نظر، قاسم بیگ فائق، حسان منظور، عبدالقدیر عروج اور معتمد مشاعرہ
منیرالزماں منیر نے کلام سنایا۔

۸ - ستمبر: جناب خلیل صحرائی (شاگرد حضرت اوج یعقوبی) کا بعارضۂ قلب انتقال ہوا۔

۵ — بزم کہکشاں کے جلسۂ تعزیت میں مرحوم فنکار ادیب برقؔ آشیانوی کو خراجِ عقیدت ادا
کیا گیا، عارف قطامی، خمیم نصرتی، نثار عبدی، امیر محمد شمس اور صدر بزم سید فضل محمود
نے مخاطب کیا۔

۲۰ - ستمبر: حیدرآباد لٹریری فورم کے دوسالہ انتخابات میں متفقہ طور پر پروفیسر مغنی تبسم دوبارہ

صدر منتخب ہوئے نائب صدر مضطر مجاز، معتمد عمومی غیاث متین معتمد تنظیم ذکی بلگرامی خازن؛ ستار صدیقی اور شریک معتمد اقبال ہاشمی کے علاوہ اراکین عاملہ میں مسرز علی الدین نوید، تاج مہجور، ڈاکٹر بیگ احساس، طالب خوندمیری اور مظہر مہدی کا انتخاب عمل میں آیا۔ جناب سید عبدالقدوس ایڈوکیٹ نے پریسائڈنگ آفیسر کے فرائض انجام دیے۔

○ متحدہ مجلس عمل برائے اُردو کا اجلاس ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اُردو کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اراکین مجلس عمل اور اساتذہ نے شرکت کی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے رپورٹ سنائی۔ طے کیا گیا کہ حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اُردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کے لیے جماعت اول سے اُردو، تیسری سے تلگو اور آٹھویں جماعت سے ہندی یا انگریزی پڑھانے کا انتظام کرے۔

۲۲۔ ستمبر: ریاستی اُردو اکیڈیمی کی ادبی کمیٹی کے اجلاس میں جواں مرگ ممتاز شاعر صاحبزادہ میکش حیدرآبادی کے غیر مطبوعہ کلام کو اکیڈیمی کی طرف سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اجلاس میں صدر کمیٹی پروفیسر سیدہ جعفر کے علاوہ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، ڈاکٹر اشرف رفیع، ڈاکٹر بیگ احساس کے علاوہ جناب خلیل الرحمٰن ڈائرکٹر و سکریٹری اکیڈیمی نے شرکت کی۔

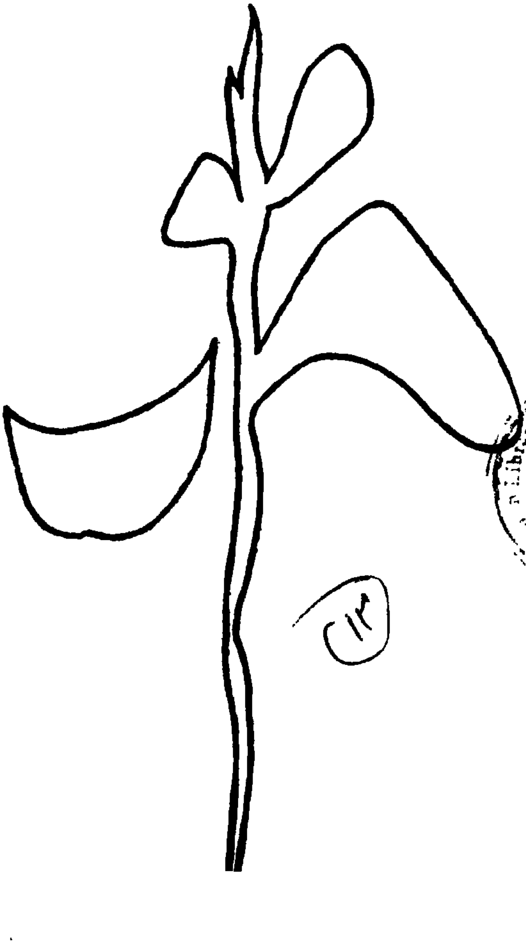
۲۱۔ ستمبر: بہار اُردو اکیڈیمی نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی کتاب "ادبی مطالعے" کو تین ہزار روپے کا ادبی انعام عطا کیا۔

۲۸۔ ستمبر: اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام نامور دانشور پروفیسر عالم خوندمیری کی پہلی برسی کے موقع پر "یادِ عالم" کا ادبی اجلاس حیدرآباد لٹریری فورم، ادارہ جدید ذہن و عصری ادب نیز عالم میموریل کمیٹی کے تعاون سے پروفیسر سید سراج الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز اختر حسن، خلیل اللہ حسینی، قدیر زماں، ظہیر الدین احمد، سلیمان سکندر، علی ظہیر، یوسف اعظمی نے عالم مرحوم کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ کریم رضا نے نظامت کی۔

○ — اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب بھارت چند کھنہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز نریندر لوتھر، رشید قریشی اور مسیح انجم نے فکاہیہ مضامین سنائے۔ طنز و مزاح کے خوشگوار شعرا نے کلام سنا کر داد پائی۔ صلاح الدین نیر نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

5 JAN 1981

# ادارہ ادبیات اردو



(۱۲)

Library 1994

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

سن اجراء : ۱۹۳۸ء
فون : ۳۸۳۶۹

# ماہنامہ سب رس حیدرآباد

● جلد (۴۹) ● نومبر ● شمارہ (۱۱)

مدیر اعزازی : مغنی تبسم

شریک مدیر : منظور احمد

معاون مدیر : وقار خلیل

مجلس منتظمہ

صدر : حامد علی عباسی — نائب صدر : ہاشم علی اختر — معتمد : پروفیسر مغنی تبسم

اراکین : حامد علی خان — پروفیسر گوپی چند نارنگ — پروفیسر سراج الدین — [illegible]

قیمت فی پرچہ ۳ روپے ، سالانہ ۳۰ روپے ، کتب خانوں سے ۴۰ روپے ، [illegible]

[illegible]

# مشمولات




تاریخ ساز مجلہ **شعروحکمت** ۱۰ دورِ جدید (مرتبین: ڈاکٹر شہریار۔ ڈاکٹر مغنی تبسم)

ادب، فنونِ لطیفہ، فلسفہ، طبی اور معاشرتی علوم کی اہم دستاویز

ادبیاتِ عالم کے ترجموں، تلخیص، تعارف اور تنقید اور برصغیر کے ادیبوں اور شاعروں کی منتخب تخلیقات کی سوغات سے کر

سال میں دو کتابیں ضخامت قریب چار سو صفحات جنوری ۱۹۸۷ء میں منظرِ عام پر آئے گا آفسٹ طباعت ۶۵/- روپے

مکتبہ شعروحکمت 865-6-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

سول ایجنٹ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸ گلی عزیز الدین وکیل کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶

**مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو**

برق و تشیاں (سید شہید) ۵/- ۔ انڈین انسائیکلوپیڈیا (حصہ اول) [illegible] (قاری کلیم اللہ حسینی) ۲/-

بانگِ (قاری کلیم اللہ حسینی) ۲/۵۰ ۔ سندری عجائبات [illegible] ۔ علم تعلیم کا مسئلہ

(ڈاکٹر رفیع الدین صدیقی) ۲/- ۔ گاندھی جی (خورشید احمد جامی) ۱/- ۔ [illegible]

[illegible] (ورستہ دہلوی) ۲/۵۰ ۔ ساقی (اظہر افسر) ۲/- [illegible]

خواجہ عبدالقدوس

# وحدۃ الوجود کے مختلف نظریے

## تعبیر:

وید کی کتابوں میں اس نظام کا نام "ادویت" ہے[1]۔ مغرب میں سب سے پہلے لو لینڈ نے طولانڈ اور ایکن کی رو سے اس کے حریف فے (FAY) نے ۱۷۰۵ء میں "پین تھی ازم"[2] کا لفظ استعمال کیا۔ مسلمانوں میں "وحدت الوجود" کا لفظ تیسری صدی سے رائج ہے۔ فارسی میں اس کے لیے "ہمہ اوست" کا لفظ استعمال ہوتا ہے ان تمام الفاظ میں وحدۃ الوجود کا لفظ نہایت پُر معنی ہے اور اپنی آپ تعریف کرتا ہے۔ اس لیے ہم اسی کو اختیار کریں گے لیکن یہ لفظ وسیع المعنی اور مبہم ہے۔ مشرق و مغرب کے مختلف قدیم و جدید نظامات کو بھی اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت اس لفظ میں اس قدر ابہام ہے کہ بہت کم لوگ اس کی خاطر خواہ تعریف و تحدید میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے معنی نہ متفق علیہ ہیں اور نہ اب تک متعین ہو سکے ہیں۔ اسپائنوزا پالیوش۔ برونو۔ اور ہیگل کی مادیت "برونو۔ اسپینوزا اور کراوزے کا وحدۃ الوجود ... نیز اسلامی نظام وحدۃ الوجود (جو کیفیت میں سارے نظامات ہمہ اوست) شامل ہیں ... (Received Theism) کے اسوا ان سارے نظامات پر جو کائنات کے ساتھ خدا کے ایجابی اور عضوی تعلق کے حامی ہیں، یہ لفظ عاید ہوتا ہے۔

## وحدۃ الوجود اور دیگر نظاماتِ عالم کا فرق

---

[1] حرف نفی 'دویت - دو یعنی لا ثنویت

[2] پین - تمام - تھیاس - خدا - سب کچھ خدا ہے۔

مذاہبِ عالم کے نظاماتِ عقاید سے وحدۃ الوجود اس حیثیت سے جدا ہے کہ ان مذاہب کی طرح وہ کسی خاص عہد، جغرافیائی حدود، آب و ہوا اور قوم و نسل سے وابستہ نہیں ہے اور نہ مصری، ہندی، یونانی اور دوسرے مذہب کی طرح اس کی حیثیت مقامی اور عارضی ہے۔ بلکہ وحدۃ الوجود ایک ایسا اساسی نقطۂ نظر ہے جو کم و بیش ہر مذہب کے [illegible] کو نمایاں کرتا ہے۔

اس نظام کی بے تعصبی اور رواداری کے ثبوت میں اسپینوزا اور صوفیائے کرام کی مثال کافی ہے۔ لیکن اس نظام کو سمجھنے میں کبھی بے تعصبی اور رواداری سے کام نہیں لیا گیا۔ [illegible] اسپینوزا کے متعلق [illegible] وحدۃ الوجودی وہ تھا جو خدا کو کائنات کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں [illegible] مشہور [illegible] کہ وحدۃ الوجود کو جس کے مطابق ہر مظہر، خدا کا جسمانی مظہر (THEOPHANY) ہے [illegible] پر ہی صادق آنا چاہیے۔ اسلام میں بھی وحدۃ الوجودیوں کے ساتھ سخت [illegible] الحاد یا بے دینی کو دور کرنے کے لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر الحاد اور لامذہبیت سے مراد [illegible] تو وحدۃ الوجود دعویٰ ہے کہ بجز خدا کے کچھ نہیں۔ اور ان دونوں میں بُعد المشرقین ہے [illegible] وحدۃ الوجود جو اب ہمارے پیش نظر ہے خود بھی الحاد اور لامذہبی وحدۃ الوجود [illegible] خارج سمجھتا ہے، اس لیے وہ ہماری بحث سے بھی خارج ہے۔ یہ دو متضاد نظامات [illegible] استعمال ہوتا ہے اور ہم لامذہبی نظامات کو وحدۃ الوجود نہیں سمجھتے ہیں۔

## [illegible] زاویہ ہائے نظر

[illegible]

لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ وحدۃ الوجود ایک ہی نوعیت کا نظام ہے بلکہ اس کی کئی اقسام اور کئی مدارج ہیں۔ اس کو کئی حیثیتوں سے پیش کیا گیا ہے اور اس میں بے شمار عناصر یکجا جمع کیے گئے ہیں۔ تعقلات و واقعات، تصورات و حقائق [illegible]

[illegible]

---

[illegible]

کے جیسا کہ چاہتے تھے ان سب کو اختیار کیا۔ ان میں ایک عظیم الشان تیری جماعت ہے اور انہوں نے شاید حقیقت کے حسین تصور کو ہر ممکن خط و خال اور آب و رنگ سے آراستہ کیا اور کوئی لطافت و بیاری نہیں چھوڑی (اس کی ذاتی وسعت و ہمہ گیری کے باوجود افسوس ہے کہ اس کی کوئی تاریخ موجود نہیں جس کے کچھ ناگزیر اسباب بھی ہیں) وحدۃ الوجود صرف ایک تجریدی نظریہ ہے بلکہ ایک مجموعی انداز اور ایک مذہب بھی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ انداز مذہبی وجدان کی صورت میں موجود ہو یا فطرت کی حسِ حقیقی کے احساس کی حیثیت سے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک مکمل نظام فلسفہ کی طرح صاف اور واضح، حالات و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسلک کے قدما اور متاخرین میں یہ نظریہ ایک مسلّمہ عقیدہ کی حیثیت سے موجود رہا ہے۔ چنانچہ ذیل کی مبہم اور متنوع تحدیدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کیا کیا مراد ہو سکتی رہی ہیں۔ خدا سب سے پہلے بھی تھا اور ذات کے صدور سے خارج بھی ہے (یعنی [illegible]) وہ منفرد و جوہری ارواح کا وجود نہیں بلکہ ایک عالمگیر ذی حیات اور ذی حس قوت موجود ہے۔

"خدا ساری کائنات میں اسی طرح نفوذ و سرایت کیے ہوئے ہے جس طرح جسم میں جان، روح انسانی خدا کا ایک جز ہے۔" "عالم خلق عدم سے وجود میں نہیں آیا بلکہ ایک لا محدود وحدت ہے جو خود بخود فعلیت اختیار کرتی ہے اور کثرتِ صور کے لباس میں مزین ہوتی ہے انہی صورتوں سے مجموعہ کائنات ہے۔ اور یہ صورتیں بالآخر اسی ناقابلِ فہم وحدت کی طرف لوٹ جاتی ہیں جس سے نکلی تھیں اور اسی میں ناپید ہو جاتی ہیں۔" "وحدۃ الوجود نظام ہے جو خدا یا انسان کی کامل حقیقت [illegible] بغیر وحدت کائنات پر زور دیتا ہے۔" "جو ایک دائرہ مطلق پیدا ہونے والی حقیقت کی وحدت [illegible] ہے کہ انفرادی آزادی و مطلق الحقائی سلب ہو جائے۔" "جو بغیر مزید تحقیق کے یہ تسلیم کرتا ہے کہ خدا عموماً قوانینِ فطرت یا کسی دوسرے شعبۂ حقیقت کی وساطت سے کارفرما ہے۔" "خدا کا کائنات کا [illegible] نظام ہے۔" بعض دفعہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک شخص وحدۃ الوجودی نہیں کہلایا جا سکتا جب تک وہ یہ نہ سمجھے کہ ساری طرح خدا کا مظہر ہے۔ لیکن وحدۃ الوجود [illegible] [illegible] اس [illegible] وحدۃ الوجود کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ وحدۃ الوجود [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ہے اس کی فاکرانہ نوعیت ہے۔ یہ مذہبی حدود کے اندر بھی فاکرانہ حیثیت کی ہوتی ہے۔ فکرِ انسانی ہمیشہ دو مخالف سمتوں میں عمل کرتی ہے۔ یا تو خدا سے آغاز کر کے تمام اشیاء کی طرف آتی ہے۔ یا کائنات (تمام اشیاء) سے خدا کی طرف رسائی کرتی ہے۔ اس لیے اس کی دو صورتیں ہوئیں۔ اگر فلسفیانہ یا عقیدے سے یوں شروع کیا جائے کہ خدا ایک لامحدود و لامتناہی اور ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے تو یہ محدود دنیا خدا میں گم ہو جاتی ہے اور وحدت ایک موہومیت عالم (ACOSMISM) بن جاتی ہے۔ اگر علمی تخیل یا شاعرانہ نظر سے کائنات کو نقطۂ آغاز بنایا جائے تو کائنات کی ساری کثرت میں ایک وحدت نظر آتی ہے اور خدا دنیا میں پنہاں ہو جاتا ہے اور وحدۃ الوجود وحدۃ الوجود PANCOSMISM رہ جاتا ہے۔ اوّل الذکر کی رو سے کائنات ہیچ ہے، دھوکا ہے، فریبِ نظر ہے، لیکن ان اختلافات کے باوجود اس میں خدا کا تصور باقی رہتا ہے۔ اس لیے وہ مذہبی ہے۔ وحدۃ الوجود میں وحدتِ عالم کا دوسرا نام خدا ہے۔ حالانکہ اس کی کثرت ہی مشاہدہ اور تخیل میں حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ یہ الحاد اور لامذہبی ہے۔ صنفِ اوّل کا وحدۃ الوجودی ایک مابعد الطبیعی سے بہت بڑھ کر ہوتا ہے اس لیے کہ فکر و نظر سے زیادہ مذہبیت اور مذہبی وجدانات اس پر غالب رہتے ہیں۔ وہ خدا پرستی کو فلسفے کے تنگ بامر میں چھپاتا ہے اور وحدۃ الوجودی (pancosmist) اپنی فطرت (NATURATION) کی برہنگی پر خدا کے نام کا پردہ ڈال دیتا ہے۔

## یہ نظریہ مختلف شقوں پر منقسم ہے

اس تمہید کے بعد اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ نظریۂ وحدۃ الوجود کی مختلف شقوں پر غور کر سکیں۔

غیر اہم اور دور از کار شکلوں کو نظر انداز کر دینے کے بعد اس کو چند حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے

۱۔ مذہبی الٰہیت جب وجودی ثنویت سے مل جاتی ہے (جس کا ہر وقت امکان رہتا ہے) تو قدرتاً الٰہیاتیت (DEISM) کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ جس کے مطابق انسان اور کائنات فطرت اور خدا میں صرف ایک خارجی اور میکانی تعلق فرض کرنا پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ خدا، انسان اور کائنات سے ماوراء ہے۔ وہ ان پر حکومت کرتا ہے۔ اس کا تعلق صرف خارجی ہے۔ انسان کی فلسفیانہ طبیعت اور مذہبی فطرت اس کا

گوارا نہیں کر سکتی۔

(الف) فلسفیانہ حیثیت سے یہ دشواری محسوس ہوتی ہے کہ محدود اور لا محدود میں کس طرح کا ربط اور تعلق فرض کیا جائے اور ان کے حدود کس طرح قائم رہیں۔ اگر محدود لا محدود سے (کائنات خدا سے) الگ ہے تو اول الذکر خود بھی مطلق آزاد اور خود مختار ہو جائے گا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لا محدود یا خدا کو بھی محدود ماننا پڑے گا۔ اس سے قطع نظر ان دونوں کے مابین محض ایک ربطِ علّی اور غایت کا تعلق باقی رہ جاتا ہے اور پھر مقولۂ علت کو لا محدود پر عاید کرتے ہوئے مشکل پیش آتی ہے۔ کیوں کہ علت سلسلۂ زمان میں کسی نقطے پر قائم نہیں رہ سکتی بلکہ ورا الورا ہوتی جاتی ہے اور غایت کا تخیل ہے؟ اس نوعیت کا کہ اس سے خدا محض ایک خارجی صانع اور صورت گر رہ جاتا ہے۔

(ب) مذہبی ردِّ عمل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان اور خدا میں گہرا باطنی اور دلی تعلق قائم کرنے کے لیے خارجی ربط و تعلق کافی نہیں۔ چوں کہ عمیق مذہبی احساس متقاضی ہے کہ انسان اپنے وجود کو خدا کی ذات میں ضم کر دے، خدا میں فنا ہو جائے، ہر چیز میں اُسی کا جلوہ نظر آئے اور ہر وقت خدا ہی کی معیت کو محسوس کرے اس لیے جد و جہد کی جاتی ہے کہ خدا کے ساتھ محدود کا نیا حقیقی، خالص اور باطنی تعلق قائم کیا جائے۔ اگر یہ کوشش خصوصیت کے ساتھ مذہبی محرکات کی بنا پر عمل میں آئے تو تصوف کی طرف میلان ہوتا ہے اور تصوف کا وحدۃ الوجود کے ساتھ نہایت قریبی تعلق ہے۔

(۲) خالص فلسفیانہ، محدود اور مخصوص معنی کے اعتبار سے وحدۃ الوجود وہ نظام ہے جو صاف اور واضح طور پر محدود کائنات کو ایک واحد اور ازلی وجودِ مطلق کی ایک شان، ایک حالت، ایک انداز، ایک تعین یا اس کا ایک پہلو قرار دیتی ہے اور یہ کائنات اس نوعیت کی ہے کہ اس وجود کے نقطۂ نظر سے اس کا کوئی جداگانہ اور غیر اضافی وجود ممکن نہیں۔ کائنات غیر حقیقی ہے یا خدا سے الگ اس کی حقیقت محض اضافی ہے اور اس کی حقیقت خدا پر منحصر ہے۔ اس اعتبار سے برہمنیت کی وحدت مذہبی روح سے پیدا ہوئی ہے[1] اسپنوزا کی وحدت الوجود خواہ صورتاً کتنی ہی فلسفیانہ ہو معناً مذہبی

---

[1] ویدانت اور فلسفۂ سانکھیا باوجود الحادی ہونے کے اپنے اندر مذہبی جراثیم رکھتے ہیں۔

ہے اور اکثر فلسفیوں پر غالب آجاتی ہے۔ البتہ ہیگل کا نظام عقلِ فائقہ سے بنا ہے۔

(۳) شاعرانہ یا جمالیاتی نظر سے خدا اور اشیاء کی کائنات میں داخل ہے۔ خدا ایک عالمگیر موجود ہے جو ہر شے میں پایا جاتا ہے۔ شاعر فطرت سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ ایک جمالیاتی احساس اس میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی رنگارنگی میں اسے ایک وحدت اور حیات نظر آتی ہے۔ دنیا اس کے حق میں ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

(۴) علمی (scientific) یا فطرتی کائنات ایک وحدت ہے۔ یہ سارا سلسلۂ کائنات سلسلۂ رشتے میں منسلک ہے۔ کوئی شئے کائنات سے الگ اور ماوراء نہیں۔ سب کچھ فطرت اور نیچرا فطرت کی ایک وحدت ہے۔ اس مسلک کی رو سے ایک ہی جوہر کو کئی اور بے انتہا متخالف متباین طریقوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن وہ صرف اس وجہ سے وحدۃ الوجود ہے کہ وہ جوہر واحد تصور کرتی ہے۔ اس اعتبار سے مادی احدیت (MONISM) کے قائلین کو ایک قسم وحدۃ الوجودی کہا جا سکتا ہے۔ مادی وحدۃ الوجود (یا اسلامی اصطلاح میں وحدۃ الوجود) ماننے والے وہ لوگ ہیں جو حقیقت کو سالمات کا ایک مجموعہ نہیں بلکہ ایک وحدت سمجھتے ہیں۔ اور وہ اتنی بھی فراست نہیں رکھتے کہ احدیت (Monism) اور مادیت کو دو متضاد تصورات سمجھیں۔ یا مادیت پر خدا کے نام کا پردہ ڈالنے والے مثلاً ہیگل خدا کو ایک کلی اور عالمگیر جوہر سمجھتے ہیں جو طبعی قوانین توانائی (PHYSICAL LAWS OF ENERGY) کے تابع ہے۔ الذکر دونوں صورتوں میں قباحت یہ ہے کہ خدا کائنات میں گم ہو جاتا ہے اور وحدۃ الوجود صورت وحدۃ الوجود (PANCOMISM) سے بدل جاتی ہے۔ اس لیے یہ لامذہبی نظریات ہیں۔ آخر الذکر تو ہمارے مبحث سے خارج ہے۔ البتہ شاعرانہ اور جمالیاتی وحدۃ الوجود ایک خاص صورت اسلامی وحدت الوجود میں پائی جاتی ہے جہاں مذہب اور توحید کے سے اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔ خود مغرب میں بڑے بڑے وحدت الوجودی شعراء گزرے جن پر مذہبی رنگ طاری ہے۔ چنانچہ لیسنگ اور گیٹے، سولی برن اور ورڈسورتھ بڑے عزم وحدۃ الوجودی ہیں۔

## تعریف و تحدید :

اب ہمیں مذہبی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ بتانا ہے کہ وحدۃ الوجود کے کیا معنی ہیں اور اس کی تعریف کن الفاظ میں ہو سکتی ہے لیکن واضح رہے کہ بجز خاص صورتوں کے مذہبی اور فلسفیانہ پہلو کو الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ وحدۃ الوجود کی تعریف مختلف حیثیتوں سے کی گئی ہے لیکن سب کچھ اس پر منحصر ہے کہ ان تعریفات میں خدا سے کیا مراد لی گئی ہے اور خدا کے تصور کے کیا معنی ہیں اگر ہم خدا سے صرف یہ مراد لیں کہ وہ لے دے کر ایک انتہائی اور مطلق جوہر ہے ، خواہ اس کی ماہیت کچھ بھی ہو ، تو ہر احدیتی (MONISTIC) نظریہ وحدۃ الوجود ہو جاتا ہے ۔ جس میں مادی احدیت بھی شامل ہے ۔ لیکن ہم اس کو وحدۃ الوجود ماننے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہم ان نظریات عالم کو وحدۃ الوجود تسلیم کر سکتے ہیں ، جو خدا کو تمام اشیاء کا مجموعہ قرار دیں خواہ ان اشیاء میں جداگانہ نفسی حیات ہی کیوں نہ مان لی جائے ۔ ہمہ نفسیت ( PANPSYCHISM ) کا وحدۃ الوجود ہونا لازمی نہیں اگرچہ وہ اس کی رفاقت ضرور کرتی ہے اور اس کی ایک تمہیدی صورت ہے ۔

وحدۃ الوجود سے ہماری مراد وہ اصول ہیں جو حقیقت کو صورتاً اور معناً ایک ہی منشاء یا مصداق جانتے ہیں اور اس وحدت کو کسی نہ کسی اعتبار سے معقول اور مقدس سمجھتے ہیں ۔ لہٰذا اس تعلیم کے مطابق خدا ایک وجود ہے جو نہ کائنات سے جدا ہے اور نہ اس سے دور ۔ بلکہ کائنات اسی کا ظہور ہے اور اسی سے موجود ہے ۔ خدا کائنات سے جدا نہیں اور ہر چیز کو خدا تعالیٰ اپنی ذات سے احاطہ کیے ہوئے ہے[1] جزوی اشیاء اور افراد اپنی کوئی علاحدہ اور مطلق ہستی نہیں رکھتے ۔ تمام اشیاء لزوماً خدا ہی سے نکلتی ہیں یا لازمی طور پر اسی لامحدود وجود سے ظاہر ہوتی ہیں ۔ عام طور پر وحدۃ الوجود کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ بجز خدا کے کچھ نہیں اور خدا ہی سب کچھ ہے مگر ہر شے خدا نہیں ہو سکتی جیسے کہ انسان مختلف اعضاء پر مشتمل ہے لیکن اس کا ہر عضو انسان نہیں کہلا سکتا۔ اس تعریف کی رو سے ایک ہی حقیقی وحدت خدا ہے ۔ انسان ، درخت ، پتھر خدا نہیں ہو سکتے۔

---

[1] : میں یہاں وحدۃ الوجود کے ایک عام تصور کو پیش کر رہا ہوں نہ اسلامی وحدۃ الوجود کا۔

تمام اشیائے حسی اور اشیائے فکری بشمول شعورِ انفرادی خواہ بماہیت ہمارے مشاہدہ میں آئیں یا انتاج سے معلوم ہوں کہ دوسروں میں ہیں وجود نہیں بلکہ صرف ایک غیر محدود وحدت کے مختلف مظاہر ہیں جو من حیثیت الحقیقت ایک ہے اور اسی حیثیت سے ایک ہے کہ کسی پر اس وحدت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ وحدت نہ صرف ان تمام محدود اشیاء کا مجموعہ ہے اور ان میں مشترک ہے جن کا ہم مشاہدہ یا انتاج کرتے ہیں۔ بلکہ ایک حیات حقیقی ہے جو غیر محدود اقسام میں خود کو ظاہر کرتی ہے ہمارے تصور اسی کے اجزاء لا یتجزا ہیں لیکن ایسے اجزا نہیں جو فی الحقیقت کسی تقسیم کے متحمل ہو سکیں بالفاظ دیگر وحدۃ الوجود وہ نظریہ ہے جو تمام محدود اشیاء کو ایک ازلی اور قائم بالذات وجود کے صرف شئون، مظاہر یا تجلیات تصور کرتا ہے جس کے مطابق تمام مادی اشیاء اور تمام جزئی اذہان ایک واحد اور غیر محدود جوہر سے نمایاں ہوئے ہیں۔ خدا ایک جوہرِ مطلق[1] اور ایک ہمہ گیر وجود ہے۔ اس طرح خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ خدا ہے۔ کائنات خدا سے جدا کوئی تخلیق نہیں اور نہ خدا کائنات سے خارج ہے نہ وہ ماورا ہے، نہ کائنات کا ایک جزو اور اس کا ایک داخلی پہلو ہے۔ تمام محدود اشیاء، محدود اذہان اور تجزیۂ انسانی کی تمام اشیاء خواہ تجربی ہوں یا انتزاعی اس کے صرف انداز، پہلو، شیون، مظاہر اور اجزاء ہیں اور وہ ہر ایک سے، اور ان کے مجموعے سے بے انتہا زیادہ ہے۔ اس طرح جو کچھ ہے خدا ہے اور کوئی شئے ایسی نہیں ہے جو اس میں شامل نہیں یا لازمی طور پر اس سے نمایاں نہ ہوئی ہو لیکن کوئی شے اپنے اختیار سے سرزد نہیں ہوئی بلکہ یہ ایک ناگزیر قدیم عمل ہے جس کو اسی طرح ہونا تھا اور بجز اس کے اس کو چارہ نہ تھا (اس تعریف کی رو سے احدیت جبر کے ساتھ شامل ہو کر وحدۃ الوجود کی صورت اختیار کرتی ہے)۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ اس نظریہ سے کثرتیت لامذہبیت (الحاد) اور ایک حد تک خود وحدانیت

---

[1] اسلامی وحدۃ الوجود کی رو سے وجود، جوہر اور وجود عام، جوہر مطلق نہیں کہلا سکتا۔ اسی لیے صوفیہ اسپینوزا اور دیگر وحدۃ الوجودیاں کے برخلاف جوہر کو بھی عرض ہی مانتے ہیں۔

: (MONOTHEISM) متمائز ہیں۔ کیوں کہ کائنات کا کوئی زاویۂ نظر جو کسی شئے کو اس مقدس وحدت سے الگ کردے اس امر کے انکار کے مرادف ہوگا کہ خدا ہی سب کچھ ہے۔ [illegible] وحدت الوجود نہیں ہو سکتی۔

## تخلیقِ کائنات فی الزماں کا انکار

وحدۃ الوجود میں یہ امر متنازع فیہ ہے کہ آیا ایک ایسے نظریے کو حقیقی وحدۃ الوجود کی حیثیت سے تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کی رو سے ایک محدود عالم یا عوالم ایک معیّن زمانے یا ازمنہ میں [illegible] مقدس سے سرزد ہوئے ہوں۔ بشرطیکہ قبل از قبل یہ امر مسلّمہ ہو کہ مقدس وحدت ذہن میں بکلیہ محفوظ ہے۔ بہر حال عام طور پر وحدت الوجود کا رجحان یہی پایا جاتا ہے کہ اپنی حدود سے ان [illegible] اہب کو خارج کردے جو معمولی مفہوم میں تخلیق اور قیامت کے تصور کو روا رکھتے ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی انفرادی اشیاء جو ہماری نظر میں ایک جداگانہ ہستی رکھتی [illegible]ں۔ وجود کی سابقہ حالت اور انداز حیثیت سے نمایاں ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے اس ارتقاء کا [illegible] اس نوعیت کا رہا ہے کہ ہمیں ان کا ایک آغاز اور ایک انجام نظر آتا ہے لیکن وحدت الوجود کی [illegible] میں اس عمل کو ساری کائنات پر چسپاں کر دینا ایک دھوکا ہے جو تمثیلِ کاذب کی وجہ سے [illegible] ملتا ہے۔ کیوں کہ اعمال ارتقاء کا ہر عمل جو ہر جگہ اپنا اثر کر رہا ہے اشیاء کے لامحدود کل کے صرف [illegible] تر اپر کارفرما ہے اور تجربہ کبھی اس مفروضے کو حق بجانب قرار نہیں دے سکتا کہ ان کا اثر کل [illegible] ئنات پر یکساں طاری ہے۔ اس طرح مادّہ یا قوّت جس عالم پر (عام خیال کے مطابق) مشتمل ہے اس کا ہر سالمہ ہماری پیدائش سے پہلے تھا اور ہماری ظاہری موت کے بعد بھی رہے

وحدت الوجود کی رو سے بظاہر جداگانہ یا محدود ہستی کی ہر دوسری حالت یا حیثیت کا یہی حال ہے۔ لہٰذا ایک جدید سحابیہ اپنے ظہور سے کائنات میں نہ ایک ذرہ کا اضافہ کرتا ہے اور نہ ایک تحریک پیدا کرتا ہے۔ اگر جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، کسی دن ہمارے نظامِ شمسی پر آفت آجائے

اور وہ زیر و زبر یا فنا بھی ہو جائے تو غیر محدود توازن قوتی میں کوئی تغیر واقع نہیں ہو گا جن پر ہم شب
امتناکا فی زبان سے کام لے کر ازلی کل کو مشتمل سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ۔ فطرت بحیثیت
خدا کی ہم وسعت (CO-EXTENSIVE) سمجھا جاتا ہے[۱] اسی صورت میں وجود مطلق
DIVINE BEING پوری طرح سے مظاہر مقدس میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

## وحدۃ الوجود میں ابھی ترقی کی گنجائش ہے

ان بیانات سے مدعا یہ ہے کہ لفظ وحدۃ الوجود کے عام مفہوم کو واضح کیا جائے نیز
اس کی تعریف میں جو کچھ داخل ہے اس کی پوری توضیح کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدۃ الوجود
کا کوئی نظام مکمل نہیں ہے۔ مذہبی اور فلسفیانہ وحدۃ الوجود کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا
جا سکتا تاہم ہندوستان کے رشی، مذہب صوفیائے اسلام اور عالیہ نوفلاطونیوں کو مستثنیٰ
ایک بڑے مذہب کی حیثیت سے اس کی ترقی بالکل عالیہ ہے اور اسپینوزا اس کا معلم اول
ہے وحدۃ الوجود کی قدیم صورتیں خالص فلسفیانہ تھیں۔ کیونکہ قدما کی کوشش یہ تھی کہ کثرت قلت
پیدا کر دہ انتشار میں حقیقت خالق کا سراغ لگایا جائے تاکہ کثرت کی پیدا کردہ پراگندگی دور
اور انسان کو سکون قلب نصیب ہو۔ لیکن درمیانی دیوتاؤں کی عبادت کے عوض وجودیا
کے تصور و فکر کو کبھی رواج نہیں دیا گیا جس طرح سقراط نے اسکولیپس کو حکم دیا تھا کہ علالت
صحتیاب ہونے کے شکرانہ میں دیوتا پر ایک مرغ کا چڑھاوا چڑھائے اسی طرح فلسفیت
وحدۃ الوجودی خواہ مصری ہوں خواہ یونانی یا ہندوستانی اپنی مذہبی جبلت کی تسکین روایاتی
کی عامیانہ پرستش اور اُن کے ساتھ ارتباط و اختلاط قائم رکھ کر حاصل کرتے تھے یا اگر یہ خیال

---

[۱] ان تمام خیالات مذکرہ سے اسلامی وحدۃ الوجود جداگانہ ہے۔ اسلامی نظریہ کی رو سے
خیالات متذکرہ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس باب میں کہنے سے زیادہ عزیز اسلامی نظریات کو بیان
کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ قبل از قبل اُن کا ایک خاکہ پیشِ نظر رہے۔

جائے کہ قرونِ وسطیٰ کے عیسائی صوفی وحدت الوجود پر قائم تھے تو ان کے خدا پرستانہ اقوال کا بہ نظرِ امعان مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ وحدت الوجود کے قریب پہنچ گئے تھے اور ان کے قیل وقال سے وحدۃ الوجود کی ترجمانی ہوتی تھی لیکن وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی مذہبی کتابوں کے ایسے فقرات کو محفوظ رکھتے تھے جو وحدت الوجود کے سراسر خلاف تھے۔ ان مذہبی عیسائیوں کی شمع اور شمارع والی مقبول عام مثال حقیقت میں وحدت الوجود کے تخیل سے خارج ہے۔ کیوں کہ حقیقی وحدۃ الوجود کے حق میں مخلوق کوئی خارج از خدا اشراق نہیں ہے بلکہ ایک غیر محدود وجود کا محدود انداز ہے تاہم ان لوگوں نے مغرب میں اسپینوزا کے مذہب وحدت الوجود کے تسلیم و قبول کے لیے راستہ بہت کچھ صاف کیا۔

## وحدۃ الوجود بین الاقوامی ہے :

وحدۃ الوجود جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے بہت قدیم اور بین الاقوامی نظریہ ہے لیکن یہ خیال کرنا بڑی غلطی ہے کہ قدیم و جدید وحدۃ الوجود میں عملاً کوئی فرق نہیں ۔ وحدۃ الوجود دو طرح کی ہے[1] ایک وہ جو کثرتیت کے بعد پیدا ہوتی ہے اور دوسری وہ جو وحدتیت (یا وحدانیت [illegible] بعد آتی ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح اوّل الذکر سے کثرتیت کو قوت تقویت پہنچتی ہے اسی طرح آخر الذکر سے وحدتیت کو مدد ملتی ہے لیکن نہ کثرتیت کو اس کا اعتراف ہے نہ وحدتیت کو۔ قدیم ہندوستان میں کوئی ایک ہزار سال قبل مسیح یہ اس حیثیت [illegible] ہر برہمن کو کائنات کے ساتھ کلیتاً ایک کر دیا گیا تھا وہ جو اب تک ہوا ہے اور جو ہوگا۔ مصر قدیم میں یکے بعد دیگرے راہ آئسیس اور آسیرس کو عالم ہستی کی تمام اشیاء سے ایک کر دیا گیا تھا۔ پلوٹارک کی رو سے آئسیس کے مندر پہ یہ حروف کندہ تھے "میں ہوں جو کچھ تھا، ہے اور ہوگا اور کوئی فانی انسان مجھے بے نقاب نہیں کر سکتا" یونانیوں میں چھٹی صدی قبل مسیح سے

---

[1] مادی اور فطری وحدۃ الوجود کو ہم نے اپنی بحث سے خارج کر دیا ہے۔

وحدۃ الوجودی خیال پیدا ہونے لگے تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں وحدۃ الوجود کی بو رواقیوں نو فلاط
اور تاریخی مذاہب کے بعض نمائندوں سے آتی ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں عیسائیوں میں بھی وحد
موجود تھے۔ چنانچہ جان اسکوٹس ارجنا (سنہ ۹۰۰) اور داؤد دینانی (سنہ ۱۲۰۰) ان
ہیں۔ یہودیوں میں قبلائی ( KABALIST ) گروہ وحدۃ الوجودی تھا۔ مغرب میں ا
علوم کے ساتھ ساتھ چودھویں پندرھویں اور سولھویں صدی میں یونانی وعبرانی شعرا
فطرت کے ہم خیال شعرا پیدا ہوئے جو فطرت کے بڑے مداح تھے[1] نشاۃِ جدیدہ کے
دور کے لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور گیارڈینو برونو تھا جس کو (سنہ ۱۶۰۰)
تحقیقاتِ مذہبی (INQUISITION) کے حکم سے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد اسپ
جان ٹولینڈ پیدا ہوئے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر تک لوگ وحدۃ الوجودی اعتقادا
رکھنے کے باوجود اس کے اظہار سے گھبراتے تھے کیونکہ اس کو الحاد سے تعبیر کیا جاتا
اس لفظ کو برے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد تاریخ وحدۃ الوجو
شعرا کی حیثیت سے لیسنگ اور گیٹے اور فلاسفہ میں فشٹے، شلنگ، ہیگل اور عیسای
شیلر ماخر... اور اسٹراس جیسے اولالعزم اشخاص کے نام ملتے ہیں۔

اس موضوعِ بحث کو ختم کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ مذہبی اور فا
نقطۂ نظر سے اس میں کیا اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں اور اس پر کیا اعتراضات وارد
ہیں۔

## اس نظام کے مشکلات:

وحدۃ الوجود میں کچھ (۱) مذہبی دقتیں پیش آتی ہیں اور کچھ (۲) ظنیات۔ اس مقا
میں ان کی طرف محض ایک اشارہ کیا جائے گا، تفصیل ناممکن ہے۔

---

[1] چونکہ ان کی وحدۃ الوجود کے مذہبی ہونے میں شبہ ہے اس لیے ہم اس کو بھی نظر انداز کر

۱۔ عام مذاہب کائنات کی تخلیق کے قائل ہیں۔ خدا نے ایک وقتِ خاص میں کائنات کو یک بیک پیدا کر دیا۔ مثلاً انجیل کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے چھ دن میں کائنات بنائی اور ساتویں دن آرام لیا۔ غالباً یہ کثرتی عقیدہ ہے جو اقوام کو توارثاً ملا ہے۔ نیز یہ عقیدہ کہ تخلیقِ کائنات سے پہلے خدا ہی خدا تھا، حدودِ زماں میں ایک وقتِ خاص میں خدا نے تخلیق کا ارادہ کیا اور یک کلمہ محسوس و مشہود دنیا ہم سے آنکھوں کے سامنے نمودار ہوگا اور ان دونوں میں وہی تعلق ہے جو صانع اور مصنوع میں ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوتا ہے جس کا ذکر پہلے سے آچکا ہے۔ یعنی خدا اور کائنات الگ الگ ہیں اور دونوں میں محض خارجی ربط و تعلق ہے۔ وحدۃ الوجود کو اس سے اختلاف ہے۔ کائنات بحیثیتِ کلی حدودِ زمان کے اندر کسی خاص وقت میں خلق نہیں ہوئی بلکہ جزئی اشیاء ان معنوں میں پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں کہ یہ خدا ہی کے شئون و حالات، اسی کے تغیرات اور اسی کے پہلو اور اجزاء اور مظاہر ہیں: اسی سے نمایاں ہوتے اور اسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ ایک اور مذہبی مسئلہ خیر و شر کا ہے۔ ایمان سے مراد یہ ہے کہ کائنات میں خیر و شر دونوں موجود ہیں لیکن خیر بالآخر شر پر غالب آکر رہے گا اور تمام و کمال متحقق ہوگا۔ وحدۃ الوجود پر مذہب کا اعتراض اس خوف پر مبنی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اخلاقی امتیازات مٹ جائیں اور جزا و سزا کا خوف و رجا لوگوں کے دلوں سے نکل جائے یا اس کی بدولت صرف ایک ایسے خدا کا عقیدہ رہ جائے جس کو ہم نہ مخاطب کر سکتے اور نہ پکار سکتے، نہ اپنا مدعا بیان کر سکتے اور نہ اس سے اعانت و دستگیری کی دعا کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود مذہب کو اسی وحدت سے علانیہ دلچسپی ہے جس کی تصدیق وحدۃ ال کرتی ہے۔ کیونکہ ایمان و عقیدہ کی رو سے خیر کو تمام و کمال متحقق ہونا ہے (کسی اور بنیاد پر مذہبی اخ ممکن نہیں) تو خدا اکمل سے کم نہیں ہو سکتا۔ ایک ایسا خدا جس میں تمام خیر شامل نہیں درجۂ کمال سے محروم رہے۔ اگر خدا میں جس میں تمام خیر شامل ہے، تمام حقیقت بھی شامل نہ ہو تو کائنات تحقیقِ خیر نہیں ہو سکتی۔ ایک باکمال صنعت میں اضافہ سے اسی طرح نقص پیدا ہو جاتا ہے جس طرح کمی سے۔ لہٰذا خدا کی نسبت یہ تصور کرنا پڑتا ہے کہ خدا خیر کا تحققِ کامل ہے۔ وہ صرف

وجودِ مطلق ہی نہیں بلکہ اس میں اس تمام صداقت و حقیقت کا شمول بھی لازمی ہے جو اس کے
میں ہے۔ وہ محض ایک علت نہیں ہے کہ معلول اس سے خارج ہو۔ لہٰذا وحدۃ الوجود میں سب
سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس ہمہ گیر وحدت میں خیر و شر نیز خدا اور انسان کو ان کے تمام
امتیازات کے ساتھ کس طرح شامل کیا جائے۔

۲۔ آخر الذکر مسئلہ شخصیت کا ہے جس کو فلسفۂ مذہب سے تعلق ہے۔ علاوہ ازیں فلسفیانہ
حیثیت سے اختیار اور ماورائیت کے مباحث بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر یکے بعد دیگرے
روشنی ڈالی جائے گی۔ شخصیت کی دو صورتیں ہیں (الف) ایک ایسے خدا کا تصور جو شخص
نہیں ہے جس کو نہ ہم خطاب کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کوئی رشتہ قائم کر سکتے ہیں ہمیں
سرد مہر اور دل شکستہ بنا دیتا ہے۔ (ب) اس خیال کو پسند نہیں کیا جا سکتا کہ نوعِ انسان
کو بقائے دوام اور مستقل شخصیت حاصل نہیں ہے۔ یہ روح کا مسئلہ ہے۔ ان دونوں امور
میں زیادہ طفلانہ اور خام اعتراضات کے قطع نظر بے حد غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ وحدۃ الوجود کی
جانب سے خدا کے اس تخیل پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ مخالفین شخصیت کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ
خدا گویا ایک بہت بڑا قوی ہیکل انسان ہے۔ انسانی شخصیت زیادہ تر تحدیدات اور نقائص کا
نتیجہ ہے جن کو نامحدود پر ہرگز منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ اس نامحدود کو انسانی شخصیت سے بے انتہا
برتر اور اعلیٰ ہونا چاہیے اگر مقدس شخصیت ہی پر زور دینا مقصود ہے تو اس کی شخصیت کا تصور انسانی
شخصیت سے بالکل جداگانہ ہونا چاہیے۔ اور "لیس کمثلہ شیٔ" کا اعتراف کرنا چاہیے۔ اس
کے ساتھ ہی شخصیت کا معمولی مفہوم غائب ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ خوف ہے کہ یہ کہنا کہ خدا
شخصی نہیں یہ کہنے کے مرادف ہے کہ وہ اس سے کمتر ہے۔ لیکن یہ مہمل اور بے معنی سی بات ہے۔

دوسری بات انسانی بقا اور انسانی شخصیت کا استقلال اور بقائے دوام ہے۔ یہ مسئلہ بھی
غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بعض نظریات کی رو سے وحدۃ الوجود شخصی حیات
بعد الموت کی قائل نہیں لیکن اس کی رو سے ایسی بقا کی گنجائش ضرور ہے جو سنجیدہ لوگوں کی
خواہش کے مطابق قابلِ قبول ہو۔ گیٹے نے اپنی نظم ( one & All [illegible]

ظاہر کیا ہے کہ خود کو نامحدود میں گم کر دینا ہی اپنے آپ کو پانے کا صحیح طریقہ ہے۔ کم تر درجے کے لوگوں کا یہ احساس رہا ہے کہ ایک عظیم الشان مبدا میں خود کو ضم کر دینا ہی بہترین بقا ہے۔ اور اکثر باکمال لوگ جب کوئی عظیم الشان کامیابی حاصل کرتے ہیں تو اس کو منجانب اللہ سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ایک عظیم تر قوت ان کے اندر عمل کر رہی ہے۔ قریب قریب تمام بلند پایہ شعرا میں صوفی مشرب لوگوں کی طرح وحدۃ الوجودی خیالات پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب تک وحدۃ الوجود میں جبر شامل نہ کیا جائے اور اختیار اس کی حدود سے باہر نکال لیا جائے حقیقی معنٰی میں کوئی نظریہ وحدۃ الوجودی کہلانے کے قابل نہیں۔ وحدۃ الوجود کو اس طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ تنوعاتِ مظاہر جوہر کی وحدت سے مختلف طریقوں سے مستخرج ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو وحدت الوجود نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ اس کو وجوبی اصدار نہ قرار دے۔ اس کو آزادانہ اور خود اختیاری ارادی اصدار قرار دینا اس مسلک کے خلاف ہے بلکہ یہ ایک ازلی اور دوامی عمل ہے۔ جو بجز اس صورت کے جو کچھ کہ وہ ہے ممکن نہیں۔ اسی لیے وحدۃ الوجود میں جبر اور احدیت ضم ہو جاتے ہیں۔

وحدۃ الوجود میں سب سے اہم اور معرکے کا مسئلہ داخلیت اور ماورائیت کا ہے۔ کائنات سے خدا کے تعلق کی نسبت وحدۃ الوجود الٰہی مباینت ( DEISM ) کے دوسرے سرے پر ہے۔ نظریۂ آخرالذکر خدا کو ایک شخصی وجود کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ جو کائنات سے وراء عالم بالا میں متمکن ہے اور کائنات ایک شئے ہونے کی حیثیت سے اگرچہ اسی کی مخلوق ہے لیکن اب اس سے الگ اور بے نیاز ہے۔ اس میں اب اتنی صلاحیت ہے کہ خود قائم رہ سکے۔ لہٰذا اپنی جبلی، فطری اور غیر منفک قوتوں سے بغیر خدا کی مدد کے اپنا کام آپ چلا رہی ہے۔ نظریہ نہ صرف خدا اور کائنات میں فرق قائم کرتا ہے بلکہ خدا کو کائنات سے جدا اور خارج دیتا ہے۔ اس کے برعکس وحدۃ الوجود کو انکار ہے کہ خدا اور فطرت ایک دوسرے سے جدا

---

٭ ہم نے یہاں مسلمانوں کی مثالیں دینے سے قصداً احتراز کیا ہے۔

میں پا رہ سکتے ہیں۔ اس نظریے کی رو سے خدا بے کائنات علت بے معلول یا جوہر بے اعراض کے مرادف ہوگا اور کائنات بے خدا معلولِ بے علت یا اعراض بے جوہر کے ہم معنی۔ اس بارے میں الٰہی مباینت ( DEISM ) ایسی ہی ہے گویا خدا ایک تخیلی قوت ہے بغیر قابلیت کے اور ایک سایہ ہے بغیر حقیقت کے۔ لہٰذا وہ خدا اور کائنات کو ازلاً و ابداً وجوداً باہم موجود سمجھتا ہے۔ یہ دونوں ایک وحدتِ مطلقہ کے دو ناقابلِ افتراق پہلو یا ایک ہی ظرف کے داخلی اور خارجی رخ یا ایک ہی ہستی کی دو حیثیتیں ہیں۔

## وحدۃ الوجود اور تصوف میں تطبیق

مذہبی وحدۃ الوجود کی بعض صورتوں میں خدا کی لامحدودیت (یعنی خارجیت) اور مطلقیت پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ انسان کی معلومہ محدود اور اضافی دنیا کو خدا سے مترادف کرکے اس کی حقیقت کو بجائے واضح کرنے کے اور دھندلا بنا دیا گیا ہے اور خدا جس حد تک کہ اس سے الگ اور سوا ہے ناقابلِ تصور بن جاتا ہے۔ مثلاً ایک ہندوستانی مفکر کے حق میں برہمن ہر طرح کے علم سے بالاتر ہے لہٰذا انسان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ تلاشِ باری کی منزلِ مقصود یہ ہے کہ شعور سے ایک بالاتر وحدت بلا فرق و امتیاز کے تمام احساس کو مٹا دے۔ باوجود اس کے کہ اسپینوزا تمام اشیاء اور اشخاص کو خدا کی دو مقدس صفات فکر و امتداد کی محض حیثیتیں قرار دیتے ہوئے داخلیت کی تصدیق کرتا ہے وہ اس کا بھی قائل ہے کہ ماہیتِ الٰہی اپنی دو اعراض میں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بے شمار اعراض کی حامل ہے اور اس طرح خدا کو ہماری معلومہ دنیا سے ماورا بھی کر دیتا ہے اور ہماری معلومہ دنیا کے ناقابلِ تصور خدا کی ماورائیت پر اتنا زور دیتا ہے کہ اس عظیم الشان سرحد پر وحدۃ الوجود اور تصوف کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اور ان دونوں مسلکوں سے دوئی مٹ جاتی ہے۔ صوفی [illegible] ہے کہ وہ اپنے اندر خدا کی معیت و داخلیت کو محسوس کرتا ہے اور خدا کے ساتھ اپنی وحدت کو متحقق کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ وہ خدا کے ساتھ اس حیثیت [illegible] وحدت [illegible] یکتائیت ( IDENTITY ) نہیں پیدا کرنا چاہتا کہ حیاتِ دنیاوی

کی رونق کو شانِ ایزدی سمجھ کر یا اُس کو خدا سے وابستہ اور ایک سمجھ کر اس میں مستغرق ہو جائے بلکہ اپنی قوّتِ پرواز سے حق تنہا اس ذاتِ باری تک رسائی کرنا چاہتا ہے جو اس دنیائے چہل پہل سے بالاتر ہے یا اُس کے اندر جاری و ساری ہے۔ تصوّف کے حق میں وحدت باطنہ ایک حصولی اور اکتسابی کمال ہے نہ کہ واقعی و نفس الامری اور خدا دنیا سے دور اور باہر رہتا ہے نہ کہ اس کے اندر۔ لہٰذا التصوّف اپنی منزل پر وحدۃ الوجودی ہے نہ کہ آغاز میں اور اس کا نقطۂ آغاز اشراقی نوعیت کا ہے۔ اسپنوزا کا اصول (OMNIS DETERMINATIO EST NEGATIO) اس اعتبار سے بالکلیہ صوفیانہ ہے کہ اس نے خدا کو تمام تعریف سے بلند اور بالاتر بلکہ ناقابلِ ادراک بنا دیا۔ تاہم یہ خیال اس کے پہلے خیال سے میل نہیں کھاتا کہ کائنات اعراضِ الٰہی کی حیثیتوں (MODES) پر مشتمل ہے اور ہم اس کے اندر خدا کو جان سکتے ہیں[1] الٰہی مباینت (DEISM) کی طرف سے صوفیا پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وحدۃ الوجود نے محدود کو خدا میں گم کر دیا ہے اور وجودیوں کی طرف سے یہ کہ انہوں نے محدود و لامحدود کے تعلق کو فراموش کر دیا ہے۔ وجودی الٰہی مباینت اور وحدۃ الوجود کے بیچ بیچ رہنا چاہتے ہیں۔

## غیر اسلامی وحدۃ الوجود کے نقائص :

وحدۃ الوجود عملاً اخلاق اور مذہب میں انسان کے "میں" اور خدا کے "تو" کے تعلق کو گوارا

---

[1] شوگلر اس بحث کا خلاصہ یوں پیش کرتا ہے: "اسپنوزا کے یہ دو اعراض بظاہر سے انداز کی ہوئی تحلیلات ہیں جو جوہر کی ماہیت سے الگ اور غیر متناسب ہیں۔ جوہر اُن کے پیچھے لا محدود مطلق کی طرح قائم ہے جو ان مخصوص تعلقات سے کسی طرح قابلِ ادراک نہیں۔ ان اعراض سے اس امر کی توضیح نہیں ہوتی کہ فی الحقیقت جوہر کیا ہے اور اس کے مقابلہ میں بالآخر صرف امکانی معلوم ہوتے ہیں اسپنوزا جوہرِ مطلق کے تعقل (NOTION) اور اس مخصوص طریقے کے درمیان جس کے مطابق وہ خود کو ان دو اعراض میں ظاہر کرتا ہے کوئی اصول اتحاد پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔

نہیں کرتی۔ اس لیے کہ ان کی بجائے کل اور جز کے تخیل کو ترجیح دیتی ہے۔ لہٰذا اس کا نصب العین خدا کی ہمسایگی کے ثنائیت" سے متمیز کرکے "انا" کا تحقق ذات نہیں ہے بلکہ کل میں جز کے فنا کا جس سے ان کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن وحدت الوجود نے انائیت اور مرکزیت انا (Egocentric and Egocentrism) کے نقطۂ نظر سے گریز کرکے اخلاق اور مذہب کی محض اضافی حیثیت باقی رکھی ہے۔ وحدۃ الوجود کل کے ساتھ جز کو ملا کر اس طرح ایک کر دیتی ہے اور جز کو اس طرح کل کے ماتحت کر دیتی ہے کہ انسانی شخصیت کے سارے احساسِ اختیار و آزادی اور نیکی کی بقا پامالی پھر جاتا ہے۔ فکر و تامل عمل کی جگہ لے لیتا ہے اور طبیعت میں ایک راہبانہ جمود کا آ جانا یقینی ہے اور چونکہ اس خیال کی رو سے خیر و شر کی محض ایک اضافی حیثیت رہ جاتی ہے اخلاقی جد و جہد اور پیکارِ حیات کی شہ رگ کٹ جاتی ہے اور ترقی کے امکان و توقع میں نزول آ جاتا ہے۔ معصیت اور سزا کا احساس اور اصلاح کی کوشش وحدۃ الوجود کی نظر میں فریب نظر اور دھوکہ بن جاتے ہیں۔ البتہ اس اعتبار سے اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے کہ یہ ایک خام تشبیہ یا سخت الٰہی مباینت (DEISM) کی مصلح ہے اور اس حقیقت پر زور دیتی ہے کہ انسان اور خدا میں قریبی تعلق ہے۔ انسان میں خدا کی معیت ہے نیز وہ اس حقیقت و صداقت کا انکشاف کرتی ہے کہ ہم خدا ہی میں ہیں، اسی میں نقل و حرکت کرتے ہیں، وہی ہم پر محیط ہے، وہی ہمارے اندر ہے وہی ہمارے باہر ہے اور ہم اسی کا ظہور ہیں۔

[illegible] اسلامی وحدۃ الوجود میں وہ سارے مسائل اٹھائے گئے ہیں جو دوسرے نظامات میں پیدا ہوئے لیکن ان کے جواب کی کیفیت و نوعیت جداگانہ ہے۔

اب ہم اصل بحث پر آنے سے پیشتر اس امر کی جانب اشارہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں [illegible] بہت سے مسائل یونانی فلسفے اور عیسائی مذاہب کے اثر کی وجہ سے پیدا ہوئے یا یہ کہ [illegible] نے تحریک کا کام کیا۔

## اسلامی توحید پر فلسفے کا اثر

خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں جب اسلام کی [illegible] کرنیں جب ہر سمت پھیلتی گئیں تو مسلمانانِ عرب

کو نئے معتقدات اور نئی تہذیبوں سے دوچار ہونا پڑا۔ غیر اقوام نے اسلام کو قبول کیا لیکن اکثر عوام کی طرف ان پر بھی سابقہ عقائد کا کچھ نہ کچھ اثر باقی رہ گیا تھا۔ امتِ اسلامیہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں جوں علم اور اہلِ علم کی کثرت ہونے لگی ان کے معتقدات اور معلومات میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ اس کے علاوہ خارجی خطرات بھی کچھ کم نہ تھے۔ غیر مذاہب کے علما نے جن میں عیسائی طور پر قابلِ ذکر ہیں مباحثے اور مناظرے کا دروازہ کھول دیا۔

اس نوبت پر اہلِ بصیرت نے اس امر کے خوف سے کہ کہیں اختلافات کے ضمن میں علمی حقائق فوت نہ ہو جائے عقاید اصلیہ کے تحفظ کے مقصد سے علومِ اساسیہ کو قلمبند کرنا شروع کیا جن کا پہلا مقدمہ علمِ توحید تھا جب مسلمان اس علم میں اہتمام کے ساتھ مشغول ہوئے تو عقایدِ اصلیہ کو محکم کرنے کے لیے پہلی مرتبہ براہینِ عقلیہ سے مدد لینے لگے اور اس کا نام علمِ کلام رکھا۔

اسلام کو قبول کرنے والوں میں سابقہ معتقدات پر قائم رہنے والوں کی ایک بین مثال عبد اللہ بن سبا یہودی کی ہے۔ خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں یہ شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہوا [illegible] حضرتِ علیؓ کی محبت کے اظہار میں اتنا غلو کیا کہ حضرت علیؓ کو خدا کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ اس کا دعویٰ کہ خدا حضرت علیؓ میں حلول کر گیا ہے۔ حضرت عثمانؓ خلیفۂ وقت نے اس کی فتنہ انگیزیوں سے تنگ آکر اسے مصر کی جانب نکال دیا وہاں جاکر اس نے چند حامی پیدا کر لیے اور حضرت علیؓ کے زمانے میں اپنے خیالات کی علی اعلان اشاعت شروع کر دی۔ پھر حضرت علیؓ نے اس کو مدائن کی طرف خارج کر دیا جہاں اس کے عقاید نے ایک غالی قوم پیدا کر دی۔

عنانِ حکومت جب بنو اُمیّہ کے ہاتھ میں آئی تو ہر فرقہ اپنے خیالات کی تائید میں عقلی اور نقلی دلائل پیش کرنے لگا۔ شیعہ فرقہ کے مقابل میں خوارج پیدا ہو گئے۔ مروانِ اوّل کے عہد میں خارجیہ دوسرے فریق کی تکفیر کرتے تھے۔ خوارج کا شیرازہ جب مہلب بن ابی صفرہ کے ہاتھوں بکھرا تو چند خارجیوں نے بلادِ مغرب میں جا پناہ لی اور وہاں از سرِ نو فتنہ و فساد برپا کیا اور ازارقہ اور اباضیہ فرقوں کے قیام کا باعث ہوئے۔ ادھر شیعہ [illegible] کی تحریت حضرت علیؓ کی محبت کے اظہار میں اس قدر غلو کرنے لگے کہ حضرت علیؓ کو [illegible]

ت بھگ پہنچا دیا۔ اسی قبیل کے اختلافات سے بہت سے مسائل میں پیدا ہو گئے۔

غیر مذاہب والوں سے جب مسلمانوں کا میل جول بڑھنے لگا تو نئے نئے مسائل پر مسلمانوں کی نظر پڑنے لگی اس نوعیت کے مسائل میں سب سے پہلا مسئلہ جبر و اختیار کا تھا تابعین بلکہ اُن سے پہلے ہی چھڑ چکا تھا۔ کبائر وغیرہ کی بحث میں واصل ابن عطا (وفات سنہ ۱۳۱ھ) اپنے استاد خواجہ حسن بصری سے اختلاف کر کے اُن سے روگرداں ہوگیا معتزلہ کا امام ہے۔ مروانیوں کے زمانے میں اس فتنہ کا انسداد نہ ہو سکا۔ ہر شخص کو تار تھا کہ جو عقاید چاہے اختیار کرے بشرطیکہ کوئی بات سیاست کے خلاف نہ ہو۔ کے زمانہ میں نہ صرف یہ بلکہ صفات باری کے اثبات و نفی میں بھی گفتگو ہونے لگی تھی اور ماہین عقلی دلائل سے کام لیا جاتا تھا۔

واصل بن عطا کے متبعین کی وجہ سے علوم کے راستے متفرق ہو گئے اور انہوں نے فی حکمت کی کتابوں کو یونانی اور عبرانی زبان سے عربی میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ اپنے عقاید کو ان عقلی دلائل سے تقویت پہنچائیں۔ لیکن اس انتقالِ فلسفہ و اثرات نہایت دوررس تھے۔

۱۔ انہوں نے صرف اُن ہی کتابوں کی نقل کی جو ان کی عقل و فہم کے مطابق اور اُن کی اغراض کے لیے مفید تھیں۔

۲۔ انہوں نے ابتداً جن مسائل کو اخذ کیا اُن کے حسن و قبح کو جانچنے کی کوشش نہیں کی۔

۳۔ اس دوران میں وہ جن جن مسائل سے روشناس ہوتے گئے ان کو برحق اور اٹل سمجھتے گئے۔

۴۔ ان مسائل کا انطباق حقائقِ اسلام پر کرنے کی کوشش کی۔

غرض یہ کہ ان لوگوں نے مسائلِ حکمت کو لے کر بغیر اس کے کہ ان کے اوّلیات کو معیار پر جانچیں معارف میں خلط ملط کر دیا۔ ان کو ان میں سے کوئی چیز وہمی نہیں معلوم ہوتی۔

اس امر میں دوسرے مسلمانوں کو اتنی ترغیب دلائی اور مسائلِ حکمت کی اشاعت اس قدر عام ہوئی کہ اس کی بدولت اسلام میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے۔ بعض دیندار لوگ عقلی مسائل کی لذت میں عقلی دلائل فلاسفہ سے حاصل کرنے لگے اور سعادت و شقاوت کا معیار فلسفہ اور عقل کو ٹھہرایا۔

دولتِ عباسیہ نے سیاسی اسباب کی بنا پر معتزلہ کی مدد کی۔ زیادہ متدین لوگوں کی ایک جماعت ان فتنوں کے انسداد کے لیے ان کے مقابل برسرِ پیکار ہوئی۔ لیکن حکومت نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ معتزلہ کے سوا معنویہ، یزدیہ اور مختلف فارسی فرقے پیدا ہو گئے اور زندقہ اور الحاد پھیل گیا اس وقت تک یونانی حکمت کا بڑا حصہ عربی زبان میں منتقل ہو چکا تھا۔ جس کی اصلاح میں ابو نصر فارابی وغیرہ کا خاص حصہ ہے۔ آخر صورتِ حال اس قدر نازک ہو کہ خلیفہ منصور عباسی نے اپنے عہد میں حکم دیا کہ باطل فرقوں کی تردید میں کتابیں لکھی جائیں۔ اس پہلے مسلمانوں میں عقاید کی بنیاد ابھی پوری طرح محکم نہیں ہوئی تھی۔ عیسائیوں کا دیکھا دیکھی خلق و ازلیت قرآن کی طول طویل بحث چھڑ گئی اور اس مسئلے نے اتنا زور پکڑا کہ اس کی موافقت و مخالفت میں دو جماعتیں، [illegible] پیدا ہوئیں۔ قتل و خون کا بازار گرم ہوا۔ ان کے علاوہ حلولیہ، دھریئے وغیرہ جیسے کئی فرقے اور پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہر فرقہ اپنے اپنے خیال کے مطابق قرآن کی تاویل کرتا تھا بعض لوگ ہر امر خارجی و ظاہری کو سرِ باطنی کی طرف محمول کرتے تھے۔ یہ فرقہ باطنیہ کہلانے لگا جس میں اسماعیلیہ بھی شامل تھا۔ چوتھی صدی میں جس سے پہلے یہ سارے جھگڑے پیدا ہو چکے تھے ابو الحسن اشعری پیدا ہوئے انھوں نے سلف اور مخالفین کے درمیان ایک متوسط راستہ اختیار کیا اور اصول عقاید و اصول نظری پر تنقیدی نظر ڈالی۔ حنابلہ کی مخالفت کے باوجود اکابر علما کی ایک بڑی جماعت جن میں امام الحرمین الغزالی اور ابوبکر باقلانی بھی شامل تھے ان کے طرفدار ہو گئے اور ان کے عقاید کو اہلِ سنت والجماعت کے عقاید کے مطابق قرار دیا جس کی وجہ سے فرقہ نظام اور فرقہ باطنیہ کی قوت ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد یعنی پانچویں صدی کے نصف آخر میں امام غزالی کا ظہور ہوا۔ عالمِ اسلام میں کندی، فارابی، بو علی سینا جیسے بڑے بڑے حکمائے اسلام پیدا ہو چکے

تھے یونانی اور مصری فلسفہ کی تخم ریزی جو صدیوں سے ہو رہی تھی برگ و بار لا چکی تھی۔ غزالی نے پہلی مرتبہ عقاید کو الہیات و مابعد الطبیعات کے پنجے سے چھڑانے کی زبردست کوشش کی۔ اسلام نے جو مشرق میں فلسفے کی وجہ سے دبا جا رہا تھا ایک حد تک نجات پائی۔ تہافۃ الفلاسفہ نے گو مشرق میں فلسفے کی بیخ کنی کر دی اور پھر کبھی اس کا رنگ جمنے نہ دیا۔ لیکن مسلمان عام طور پر اس سے اس قدر محسور ہو گئے تھے کہ اس کا نشہ اب تک باقی ہے۔

رسول خدا ہی کے زمانے میں حاملین توحید کا ایک ایسا فرقہ تھا جو علمائے ظاہری سے متمایز تھا گو ابتدا میں اس کا کوئی خاص نام نہیں تھا لیکن دوسری صدی کے وسط سے صوفیہ کے نام سے اس نے ایک الگ راستہ اختیار کیا۔ پہلے دور میں خلفائے راشدین خصوصاً حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ، انس بن مالک وغیرہ صحابہ اسی انداز کے بزرگ تھے۔ تابعین میں امام زین العابدین، امام محمد باقر، محمد بن حنیفہ، حسن بصری، کمیل بن زیاد اور ان کے بعد امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، ائمہ اہل بیت، سفیان ثوری، مالک بن دینار، محمد بن سماک، حبیب عجمی، شیبان راعی، داؤد طائی وغیرہ ہوئے۔ ان کے بعد ابویزید بسطامی، ابو محمد سہل تستری، حارث بن اسد محاسبی، بشر حافی، جنید بغدادی، ابو حفص حداد، ابو سلیمان دارانی، اس مذہب کے علم بردار رہے۔ سب سے پہلا شخص جو صوفی کے نام سے مشہور ہوا تھا وہ سید ابوہاشم محمد بن احمد تھا (وفات سنہ ۱۶۱ ہجری) ۔۔۔۔۔

صوفیہ میں ہمیشہ وحدۃ الوجود کا ایک دھندلا سا پس منظر موجود ہوتا ہے جو مذہب کے مخفی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ گو تصوف اپنی آخری منزل میں وحدۃ الوجود کی صورت اختیار کرتی ہے لیکن اس کی ابتدائی صورت بہت زیادہ واضح نہیں ہوتی۔ مسلمانوں میں حکمت اور فلسفہ اس قدر رائج ہو چکے تھے کہ کوئی عقیدہ اور کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر اس کا اثر مرتب نہ ہوا ہو یا کم سے کم طرز بیان فلسفیانہ نہ رہا ہو۔ لہٰذا صوفی بھی اس سے بے اثر نہ رہ سکے۔ تیسری صدی ہی سے صوفیہ کا مذہب وحدۃ الوجود کے نام سے رواج پا چکا تھا۔ اس وقت تک فلسفہ کی اکثر اصطلاحات تصوف میں داخل ہو چکی تھیں۔ لیکن بعض اکابرین صوفیہ ایسے بھی تھے جن پر اس کا اثر کچھ نہ تھا۔ ہاں تصوف کے قلم پر فلسفہ کا پیوند

لگانا ابنِ عربی کا کام تھا۔ اندلس کے مسلمان بہ نسبت مشرق کے زیادہ آزادی کے ساتھ یونانی فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ اندلس یونانی اور اسلامی حکمت کا مرکز بن گیا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی میں عالمِ اسلام کا سب سے بڑا فلسفی ابنِ رشد (وفات سنہ ۵۹۵ ہجری) اندلس میں پیدا ہوا اور اس کے ہم عصر محی الدین ابنِ عربی (وفات سنہ ۶۳۸ ہجری) عالمِ اسلامی کے بہت بڑے صوفی فلسفی تھے۔ طبقۂ صوفیہ میں نوفلاطونیت کا سب سے زیادہ اثر انہیں پر معلوم ہوتا ہے۔

ابنِ عربی کے بعد عالمِ اسلام میں بہت کم صوفی ایسے ہوئے ہوں گے جو ان سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جنہوں نے ابنِ عربی کی تردید کا بیڑا اٹھایا تھا وہ بھی اس اثر سے بچ نہ سکے۔ اس طرح فلسفۂ تصوف کے یہ مضامین مشرق کو پھر عود کر آیا اور اب تک مسلمانوں میں قائم ہے۔ صوفیہ میں تنزلاتِ روح، عالمِ عقلِ اوّل، قوسِ صعودی و قوسِ نزولی وغیرہ کی ساری بحثیں وہیں سے چلی ہیں لیکن صوفیہ نے ان سارے مسائل کی ترمیم کر کے اپنے انداز پر ڈھال لیا ہے۔ ان تمام خارجی اثرات کے باوجود اسلامی وحدۃ الوجود دنیا کے تمام نظامات سے مختلف و ممتاز، لطیف تر اور زیادہ مکمل نظام ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں (۱) اسلام دنیا کا سب سے بڑا توحیدی مذہب ہے۔ (۲) اسلام میں جس کثرت سے صوفیہ پیدا ہوئے ہیں تاریخِ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی (۳) یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ دنیا کے سب سے عظیم الشان صوفی مسلمانوں ہی میں پیدا ہوئے اور بڑی کثرت سے پیدا ہوئے (۴) صوفیہ ہمیشہ سختی کے ساتھ اپنے مذہب پر قائم رہے اور ہر مسئلے میں قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرتے تھے۔

(۵) اسلامی وحدۃ الوجود کی آہستہ آہستہ تعمیر ہوئی ہے اور صوفیہ نے اپنی تعمیری جدت سے اس کو ایک عظیم الشان قصر بنا دیا ہے۔ (۶) جبر و اختیار، خیر و شر، سزا و جزا اور وحدت کی تخصیص جیسے سنگین مسائل کو قرآن کی مدد سے اس خوبی کے ساتھ حل کیا کہ خود اسلامی علمِ کلام بھی اس کے آگے ماند ہے۔

محمد نورالدین خاں

# معین الدولہ اور صفی اورنگ آبادی

سلطنت آصفیہ میں بادشاہ کے بعد امرائے پائیگاہ سب سے زیادہ اعزاز اور بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اقربائے سرکار ہونے کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں مسند مکان کے عہد میں نواب معین الدولہ امیر پائیگاہ تھے اور ریاست کے امرائے عظام میں خاص شہرت اور مرتبے کے مالک تھے۔ وہ ۱۳۰۸ھ میں سرور نگر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ محمد معین الدین خاں نام اللہ اعانت جنگ، معین الدولہ کے خطاب سے آصف سابع نے سرفراز کیا تھا۔ وہ بڑی آن بان اور شان کے امیر تھے۔ نواب ممدوح کا پسندیدہ شوق شکار تھا۔ ایک ماہر شکاری کی حیثیت سے ان کے کئی حیرت انگیز قصے دکن میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس کے علاوہ شاعری، فنون لطیفہ، گیمس اور اسپورٹ سے بھی نواب صاحب کو بے حد دلچسپی تھی۔ فنون اور گیمس کی ترقی کے لیے وہ ہمیشہ مستعد رہتے تھے اور ہمیشہ تعاون و امداد کرتے تھے۔ ہر سال کرکٹ کے ٹورنمنٹ منعقد کرتے جن میں بیرون ملک کی ٹیمیں شریک ہوتیں اور ان کے قیام و طعام کا انتظام نواب صاحب کے ذمے رہتا۔ چنانچہ آج بھی ان کے نام سے معین الدولہ کرکٹ ٹورنامنٹ کا انعقاد ہر سال حیدرآباد میں عمل میں آتا تھا۔ اس کے علاوہ دکن کے عام پسندیدہ شوق پتنگ بازی میں بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ کرکٹ کی طرح پتنگ بازی کے ٹورنامنٹ ان کی سرپرستی میں ہوتے تھے۔

شاعر بھی تھے اور معین تخلص تھا۔ اپنے دربار کے ایک مصاحب مولوی لیاقت علی صاحب سیف سے ابتدا میں مشورۂ سخن کیا اس کے بعد حضرت جلیل کو بھی کلام دکھایا۔ اپنی زندگی میں اپنا دیوان "معین سخن" کے نام سے مرتب و شائع کیا۔ ان کی غزلیں عاشقانہ مضامین، رندی و سرمستی کے علاوہ سادگی و پرکاری کا مرقع ہیں۔

# نواب معین الدولہ سے حضرت صفیؔ کی واقفیت

جناب لیاقت علی سیف کے بعد ان کے دو فرزند میر باور علی فخرؔ اور میر بہادر علی جوہرؔ پائیگاہ میں ملازم ہوئے۔ انھیں نواب صاحب کی پیشی میں ہر وقت باریاب رہنے کا شرف بھی حاصل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت صفیؔ کی شاعری حیدرآباد میں زبان زدِ خاص و عام ہو چکی تھی۔ نواب معین الدولہ صفیؔ کی غزلیں گانے والوں کی زبان سے سن کر متاثر تھے اور ان سے ملنے کے مشتاق تھے۔ فخرؔ اور جوہرؔ دونوں حضرت صفیؔ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے بارہا حضرت صفیؔ کو معین الدولہ کے ہاں چلنے آمادہ کرنا چاہا لیکن صفیؔ کی قلندرانہ طبیعت کے آگے ان کی کچھ نہ چلی۔

## حضرت صفیؔ اور کشن لعل

حضرت صفیؔ کی کتابِ زندگی کا ایک ورق سادہ رہ جائے گا اگر ہم کشن لعل کا ذکر نہ کریں۔ تفصیل میں گئے بغیر ہم اتنا کہنے کی جسارت کریں گے کہ ایک وقت خدائے سخن میر تقی میرؔ پر ایسا آیا کہ انھوں نے صاف صاف اپنے جذباتِ عشق کا اظہار کر دیا:

میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ایسا ہی کچھ سابقہ حضرت صفیؔ کو موتی لعل کلال کے قبول صورت لڑکے کشن لعل سے پڑا۔ شراب کی دکان دبیر پورہ ریلوے گیٹ کے قریب تھی۔ شغل مے نوشی اور اک گونہ بے خودی کے لیے اپنی دوا لینے حضرت صفیؔ کشن لعل کی اس دکان کو جایا کرتے تھے۔ کشن لعل، حضرت صفیؔ کا بہت احترام کرتا تھا اور ان کی نشست کا خاص اہتمام و انتظام کرتا تھا۔ اسی لیے حضرت صفیؔ کشن لعل کے حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت سے بھی متاثر تھے اور ازراہِ تفننِ طبع اسے "ساقی" کا خطاب دے رکھا تھا۔

ایک غور کہ صفیؔ ضعف میں ہے اے ساقی　　　یہ جو شیشوں میں ہے سب اس کو دوا کہتے ہیں

کشن لعل کی دکان پر جن اصحاب کو حضرت صفی کے ہمراہ جانے کا موقع ملا ہے اُن کا بیان ہے
غزلیں اسی دوکان کی نشستوں میں ہوئیں۔ غزلیں لکھ لکھ کر صفی کشن لعل کو دے دیا کرتے
لیے کہ کشن لعل کو گانے کا بہت شوق تھا اور وہ حضرت صفی کی غزلیں بہت عمدگی سے گاتا
لعل کا ایک گراموفون ریکارڈ حیدرآباد میں جن لوگوں نے سنا ہے ان کو اچھی طرح یاد ہوگا۔ صفی
کی جو غزل کشن لعل نے گائی اس کا مشہور مطلع ہے

محبت میں کیا کیا مزے داریاں ہیں
کبھی دشمنوں کی بھی غم خواریاں ہیں

کشن لعل، نواب معین الدولہ کے شعبۂ اربابِ نشاط سے وابستہ اور ان کا ملازم تھا۔ نو
کو کشن لعل کا گانا بہت پسند تھا۔ وہ صفی کی غزلیں اپنی دلکش آواز میں سناتا تو معین
کے حسنِ کلام سے متاثر ہوتے تھے اور دکن کے استادِ سخن سے ملنے کا اشتیاق بڑھ

## نوابِ معین الدّولہ کی حضرتِ صفیؔ سے ملاقات

حضرت صفی بڑے یاباش اور زندہ دل تھے۔ وہ ایسے مواقع تلاش کرتے جہاں
دل بہلنے کا سامان ہو۔ ان کے شاگرد اور دوست ان کے اس مزاج سے واقف تھے اور
کی خاطر انھیں جلسوں اور میلے ٹھیلے میں لے جاتے اور صفی بصد شوق شریک ہوتے۔
کے شاگرد جناب مسلم نے ہمیں نواب معین الدّولہ کی حضرتِ صفی سے ملاقات کا یہ قصّہ
خود حضرت صفی نے ان سے بیان کیا تھا۔

قصّہ یوں ہے کہ ایک دن مغل پورہ والوں اور کوٹلہ عالی جاہ والوں کے درمیان پتنگ
کا پیچ میدان میں ہو رہا تھا۔ حضرت صفی کو بھی ان کے دوست اور شاگرد اپنے ساتھ پتنگ بازی
دیکھنے لے گئے۔ اسی اثنا میں نواب معین الدّولہ کا گزر اس طرف ہوا۔ وہ موٹر میں
سرو نگر پیالیس جا رہے تھے۔ اپنے شوق کی خاطر وہ بھی مجبور ہوئے اور موٹر روک کر پتنگ
دیکھنے کے لیے میدان میں اتر پڑے۔ اس وقت نواب صاحب کی پیشی میں جو جو بھی موجود

نے دور سے دیکھا کہ ان کے استاد صفی بھی جلسے میں شریک ہیں تو وہ اُن سے ملنے گئے۔ بہت ادب و احترام سے ان کو ملتے دیکھا تو جوہر کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں جن سے ملتے ہوئے تم جھکے جا رہے تھے۔ انھوں نے ادباً عرض کیا کہ وہ ان کے استاد حضرت صفی ہیں۔ حضرت صفی کا غائبانہ تعارف نواب صاحب کو تھا۔ وہ صفی سے ملنے کے شائق تھے۔ یہ ایسا نادر موقع تھا کہ خود صفی ان کے سامنے تھے۔ بھلا معین الدولہ جیسے شکاری یہ شکار کیوں کر چھوڑتے۔ انہوں نے موقع کو غنیمت جانا اور جوہر سے کہا کہ وہ صفی کو بلا لائیں۔ جوہر دوڑے دوڑے گئے اور حضرت صفی سے کہا کہ چلیے نواب صاحب نے یاد کیا ہے۔ صفی بڑے پابند وضع اور سلیقہ مند تھے۔ انہوں نے عذر خواہی کی کہ وہ پھر کسی وقت نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ نواب صاحب نے ان کا جواب سنا تو کہلا بھیجا کہ اگر وہ نہیں آتے تو خود نواب صاحب ان سے ملنے آئیں گے۔ جب جوہر نے یہ بات آکر صفی کو سنائی تو وہ نواب صاحب کی قدردانی سے متاثر ہوئے اور جس حالت میں تھے اسی حالت میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ نواب صاحب بہت عزت سے ملے اور مجبور کر کے اپنے ساتھ موٹر میں بٹھایا اور سید ھے اپنے بنگلے سرورنگر پہنچے۔

## دربارِ معین سے حضرتِ صفی کی وابستگی

یہ بات در پردہ راز رہی کہ نواب معین الدولہ کے دربار میں حضرتِ صفی کی رسائی کب ہوئی اور کب تک وہ دربارِ معین سے وہ وابستہ رہے۔ لیکن خوش قسمتی سے حضرتِ صفی کا لکھا ہوا ایک خط اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ یہ تو نہیں معلوم کہ کس کو لکھا ہے لیکن طرزِ تخاطب بتاتا ہے کہ مخاطب کا احترام حضرتِ صفی کے دل میں زیادہ تھا۔ خط کے القاب "حضرت استادی زادہ اللہ فیضہٗ" اور خط کے ایک جملے "آپ میرے محسن اور خیر خواہ ہیں۔" ان الفاظ سے جذبۂ عقیدت عیاں ہے۔ اس وقت اس شخصیت کی کھوج میں جانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہمیں تو یہ جاننا ہے کہ نواب معین الدولہ کے دربار میں حضرت صفی کی رسائی کب اور کس سنہ میں ہوئی مزید اس خط سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ معین اللہ کا سلوک حضرت

حضرتِ صفیؔ کے ساتھ کیا رہا اور خود حضرت صفیؔ کے کیا احساسات تھے۔

اس خط پر تاریخ ۸ ار فروری ۱۳۳۸ ف (۱۸ار رمضان ۱۳۴۷ھ ۱۹ار فروری ۱۹۲۹ء) درج ہے۔ حضرتِ صفی لکھتے ہیں "کچھ دنوں سے میرا قیام سرور نگر رہا ہے۔ کوئی دو مہینے سے نواب معین الدولہ کے پاس آ جا رہا ہوں۔ یا دفرمائی کا کوئی وقت نہیں۔ جب موٹر آئے چلا جانا پڑتا ہے۔ دن ضائع تو نہیں جا رہے ہیں لیکن معتد کچھ نہیں ہوا۔ . . . . . میں نہایت خلوصِ قلب سے دعا کرتا ہوں کہ خدا اے تعالیٰ انھیں خاص حفاظت میں رکھے۔" آگے فرماتے ہیں "علی الحساب سرفرازی کا حساب ہی کیا۔ ساتھ کھاتا ہوں ساتھ پیتا ہوں۔ ہم نوالہ ہم پیالہ بنا ہوا ہوں۔ ابھی تک عزت سے گزر رہی ہے۔ آئندہ اللہ مالک ہے۔ میرے ذمے صرف یہی کام ہے کہ فرمائش پر اپنی غزلیں سنا سنا کر ان کا دل خوش کیا کروں۔"

امرا کا دربار مصاحبوں کی رقابتوں کی آماج گاہ ہوتا ہی ہے۔ معین الدولہ کا دربار حاسدوں سے کب خالی تھا۔ بھلا وہ کیسے گوارا کرتے کہ کل کے آئے ہوئے صفی کو نواب صاحب کی ہم نشینی اور ان کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ کا شرف ملے۔ حضرتِ صفیؔ کی دور رس نگاہوں نے درباری نزاکتوں کو بھانپ لیا تھا۔ اس اندیشہ کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے۔ "آپ میرے محسن اور خیر خواہ ہیں اس لیے اس بات کی خبر کر دی۔ حقیقی مسرت ہر ایک کو نہیں ہوتی اور میں ہر ایک کو اپنی طرف سے آگاہ بھی کیوں کرتا، وہاں بھی اخوان الشیاطین لگے ہوئے ہیں۔

شود بجاں بآرزو خواہند
مقبلان زوال نعمت و جاہ"

لیکن معین الدولہ ایک بلند حوصلہ، نیک نفس اور بارعب امیر تھے۔ ان کی عنایات حضرتِ صفیؔ پر بڑھتی ہی گئیں اور کسی سازشی کو سازش کا موقع نہ مل سکا۔ موٹر انھیں لینے روز آتی اور کبھی موٹر حضرتِ صفیؔ کے بغیر واپس آتی تو نواب اپنے کسی صاحب زادے کو بھیجتے۔ وہ صاحب زادے سیدھے حضرتِ صفیؔ کے مکان آکر گھر میں داخل ہوتے۔ بے تکلفی سے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی شیروانی پہنا کر موٹر میں بٹھا لیتے۔ اس وقت حضرتِ صفی چپ چاپ موٹر میں بیٹھ کر حاضرِ خدمت ہوتے۔

## بنگلور کا سفر

ایک دفعہ نواب معین الدولہ بغرضِ تفریح اور تبدیلِ آب وہوا اپنے محل اور اپنے استاذ کے ساتھ بنگلور تشریف لے گئے۔ حضرتِ صفیؔ کو بھی اپنا شریکِ سفر بنالیا۔ اپنی غزل کے ایک مقطع میں سفرِ بنگلور کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

کیا لطفِ سیر، ذوقِ تماشا کہیں صفیؔ
کل سات آٹھ دن تو رہے بنگلور میں

## درباری مصروفیتیں

جناب مسلم بیان فرماتے ہیں کہ حضرتِ صفیؔ نے نواب معین الدولہ کے دو فرزندوں کی بسم اللہ پڑھائی تھی۔ ہر "بسم اللہ" پر نواب صاحب نے استاد صفیؔ کو دو سو روپیہ اور گیارہ اشرفی پیش کئے۔ گیارہ اشرفیاں تو استاد نے اپنی جیب میں رکھیں اور دو سو روپیہ ملازمینِ دربار میں تقسیم کر دیے۔

نواب صاحب کے صاحبزادے شاعری میں حضرت صفیؔ کے شاگرد تھے۔ خاص طور سے نواب کے چہیتے فرزند نواب مظہر الدین خاں عرف "شاہ صاحب" کو حضرتِ صفیؔ سے زیادہ ربط تھا ان کے بنگلے نارائن پور ہوس اے سی گارڈز میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں حضرت صفیؔ اپنے شاگردوں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں:

اے صفیؔ خوب یہ طرح دی ہے
شاہ صاحب ہیں شاہکار مجھے

## دربار سے وظیفہ

اب یہ راز ہی ہے کہ حضرتِ صفیؔ کو معین الدولہ کے دربار سے کیا وظیفہ ملتا تھا۔ تذکرہ

خط دربارِ عثمانی میں رسالہ کے دو ماہ بعد لکھا گیا ہے۔ خط میں صرف اتنا بتایا گیا کہ "[illegible] نہیں ہوا . . . . آگے اللہ مالک ہے۔" گویا دو مہینے تک یوں ہی آتے جاتے رہے۔ بعد کچھ مقرر ہوا یا کتنا مقرر ہوا یہ بات کسی کو نہیں معلوم۔ بس اتنا ہے کہ علی الحساب ہوتی رہیں۔

## درباری مگر حرص و طمع سے دُور

حضرت صفی جیسے فقیر منش، قلندر طبیعت اور رند مشرب کو کبھی بھی دولت و جاہ کی طمع نہیں رہی۔ بعض وقت ایسا ہوا کہ عالمِ سرور میں نواب نے لپٹا لپٹا کے پوچھا کہ کیا چاہتے ہو۔ لیکن صفی ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ سرکار میرے لیے سب کچھ ہیں۔ سرکار سلامت رہیں۔

### تندرستی چاہیے سرکار کی!

معین الدولہ نے مانگنے والوں کو کیا نہیں دیا۔ اپنے مقربین اور متوسلین پر داد و دہش عالم رہا کہ مناصب دیے، باغات زمینات اور مکانات بخش دیے۔ زیور اور روپے پیسے نوازا۔ لیکن حضرت صفی نے کبھی نہیں مانگا۔ حضرت صفی فرماتے تھے کہ اگر میں نواب کے سے زیادہ مانگتا تو وہ مجھے لالچی سمجھتے اور اگر اندازے سے کم مانگتا تو ان کے نزدیک ٹھہرتا۔ ایسے ہی وقت کے لیے فرمایا ہے:

اب جو بے مانگے کے مل جائے مقدر اپنا
ہم فقط حوصلہ اہلِ کرم دیکھتے ہیں!

بے مانگے علی الحساب سرفرازیاں ان کے لیے کافی تھیں۔ گھر کا تھوڑا خرچ نکل جائے؛ ایک گونہ بے خودی کے لیے مے نوشی کا سامان ہو جائے۔ اس سے زیادہ کی انھیں خیال نہیں ہوتا۔

## مدح سرائی و قصیدہ خوانی

دربار سے وابستہ ہو کر حضرت مکی نے عمر اسم جہاں داری بادشاہ کی مدح میں نہ جانے کتنی نظمیں کہی ہوں گی۔ ویسے وہ اپنی بے بہا جاہ و جلالت کو بر کف بے نیاز و مدبر رہے۔ وہ بہت خوددار اور مستغنی المزاج واقع ہوئے تھے۔ یقیناً ایک طویل عرصہ تک دربار میر عثمان سے وابستہ ہو کر قصیدہ خوانی ہوگی۔ تعریف میں اشعار کہے ہوں گے۔ وقتاً فوقتاً ضرورت ہوئی تو شعر لکھ کر پیش کرتے تھے۔

گھر جا کے پھر آ جاؤں نہ ہو دیر ذرا بھی
سرکار سے ہو جائے اجازت کی علامت

حسنِ طلب کا ایک انداز دیکھیے:

سچ کی جلوہ فرمائی پہ مجھ تک یہ خبر آئی
بر آمد ہو چکے سرکار چل امید بر آئی

یاد فرمائی ہوئی تو شعر لکھ کر پیش کر دیا:

آج دیکھی یاد فرمائی میں یہ تاثیر بھی
میں جو جاگا خواب سے جاگی مری تقدیر بھی

مزاج پرسی بھی شعر کی زبان میں ہوتی ہے:

جو کہا انھیں شدت نزلہ سے تھی بیمار کیسی ہے
طبیعت کا لکا نسبت آج اب سرکار کیسی ہے

عینک عطا ہوئی تو کہا:

"سرکار نے عینک نہیں بینائی دی"

گھڑی ملی تو:

"گھڑی پل ملی کہ وقت پہ کام کریں"

قصیدہ ہو، نظم ہو، قطعہ، رباعی یا کوئی شعر۔ ایک کاغذ پہ اپنے ہاتھ سے خوش خط لکھ کر

نواب کے آگے پیش کرتے یا مقربین میں سے کسی کے ذریعہ بھیجتے۔ نواب حُسنِ طلب
اشناس تھے۔ کام ہو جاتا۔

صفی کی پرگوئی اور بدیہہ گوئی تو مشہور اور مسلم ہے۔ صدہا شعر کہے ہوں گے لیکن دست
نہ سے کچھ محفوظ نہ رہا۔ اگر وہ تمام ذخیرۂ شعری دستیاب ہو جاتا تو ایک نایاب اور دلچسپ
مجموعہ مرتب ہو سکتا تھا۔ حضرت صفی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اشعار کے نہایت خوش خط
محترم جناب شمس الدین تاباںؔ (مرحوم) شاگرد حضرت صفی کے ذخیرہ میں ان کی مہربانی سے
کو ملے تھے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

بگرامی ملاحظہ سرکار دام اقبالہٗ

بیدار ہوا ہر سب گھر کسی کے لیے
یا کوئی امیر میز کرسی کے لیے
ہوتے ہی سحر ہر اک کو اپنی سوجھی
فدوی آیا مزاج پرسی کے لیے

خاکسار صفیؔ

ھو المحبی

ہر ایک سے ملاپ مسرت کے ساتھ ہے
برتاؤ جس کسی سے ہے عزت کے ساتھ ہے
مشقِ سخن بھی دادِ سخن بھی ہے ساتھ ساتھ
جینے کا لطف تیری محبت کے ساتھ ہے

عرضی صفیؔ

ھو المحبی

بہار نوجوانی دیکھ لوں آنا زِ پیری میں
نظر آ جائے آزادی کا جلوہ ہر اسیری میں

مرے سرکار کی چشم عنایت پر جو پڑ جائے
امیری کا مزہ آئے فرم کی فقیری میں

عرضی صفی

بتوسط میاں نثار اللہ خاں صاحب

دعا گو ہوں میں مدح خوانی کے ساتھ
عطا اور پھر قدر دانی کے ساتھ
صفی کھانے پینے کی کیا فکر ہے
ملی اشرفی شیر وانی کے ساتھ

ہو المعین

قرض خواہوں سے خلاصی جو ذرا پائی ہے
رات میں کچھ مجھے آرام سے نیند آئی ہے

ـــــــــــــــ لکھا جائے۔ ذہن کیا تھا شاعری کا مشین تھا۔ چلتے پھرتے شعر ڈھلتے تھے۔ جب چاہا ـــــــ تھا۔ بس آمد ہی آمد تھی۔ اگر انھوں نے نواب معین الدولہ کی شان میں دفتر کے دفتر اس ـــــل کے طویل عرصہ میں لکھے ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔

## ـــــاب معین الدولہ کا احترام

ـــــزت صفی حفظ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے وہ کبھی اپنے بے تکلف دوستوں کو خط لکھتے تو ـــــلص لکھنے کی بجائے "صفی" کے اعداد ایک سو اسی (۱۸۰) لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کی اس ـــــــ سے سمجھنے والے سمجھ جاتے۔ حضرت صفیؔ نے جب دیکھا کہ لفظ "معین" کے اعداد ایک سو ـــــ ہیں اور یہ اعداد ایک سو اسی سے کم ہیں تو کس کمالِ فن اور ذہانت سے اپنے سرپرست ـــــی و عظمت کی لاج رکھ لی:۔ ع

ایک سو ۱۳۰ ہی ہوں لیکن ایک سو ستر کے بعد

## ربارِ معین سے وابستگی کی مدت

حضرت صفی نواب معین الدولہ کے انتقال تک ان کے دربار سے وابستہ رہے۔ چناں چہ جب سخن" کی طباعت ۱۳۴۸ف (۱۹۲۸ء - ۱۳۴۷ھ) میں ہوئی (یعنی نواب صاحب کے انتقال سال پہلے) تو حضرتِ صفی دربار سے وابستہ تھے۔ دیوان کی تاریخِ طباعت کئی بلند پایہ نے کہی اور ان شعرا کی محفل میں صفی بھی موجود ہیں۔ انہوں نے جو تیس شعر کہے جو سب سے زیادہ م کی تعریف بھی کی ہے اور صاحبِ کلام کی قصیدہ خوانی بھی۔ یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ نواب بھی انھیں تاریخ لکھنے ارشاد بھی کیا تھا۔ چند شعر پیش ہیں:

معینِ سخن چھپ گیا واہ واہ
یہ آئینِ دلکش یہ طرزِ سخن
امیری میں شانِ فقیری کہیں
کہ ہیں آپ اپنی جگہ ہیں مگن
ان ہی کی بڑی سب سے ہے پائیگا
یہی ہیں امیرِ کبیرِ دکن
غزل کی زباں صاف مضمون صاف
جسے صاف سمجھے ہر اک مرد و زن
زبانی بھی ارشادِ عالی ہوا
تمہیں اولاً ثانیاً ثالثاً
کہو صاف تم طباعت کا سال
ہے موزون و دلکش معینِ سخن

۱۳۵۸ھ

آخر میں ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ حضرتِ صفی نواب معین الدولہ کی سرکار سے کب تک وابستہ

رہے اور کیوں؟ نواب معین الدولہ کے دربار سے وابستہ ہونے کے دو ماہ بعد لکھے گئے حضرت صفی کے ایک خط کا ہم نے حوالہ دیا ہے جس پر تاریخ ۱۳۳۸ ف درج ہے۔ نواب معین الدولہ کا انتقال ۱۹ آبان ۱۳۵۰ ف (۲۴ ستمبر ۱۹۴۱ء) سرورنگر میں ہوا۔ اگر ہم متذکرہ خط کی تاریخ کو وابستگی کی تاریخ قرار دیں تو ۱۳۵۰ ف تک کا درمیانی فصل بارہ سال کا ہوتا ہے اس طرح وہ بارہ سال نواب معین الدولہ کی سرپرستی میں رہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ صفی جیسا خوددار، مستغنی المزاج، نازک طبیعت، شوریدہ سر قلندر کسی امیر کے دربار سے بارہ سال وابستہ رہ کر قصیدے کرے اور مراسم درباری ادا کرتا رہے جبکہ ان کی فقیرانہ شان تو یہ ہے۔

آبرو کھو کر کوئی کیا اہلِ دولت سے ملے
پاؤ روٹی لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

مگر وہ خدائے سخن میر تقی میر نے فرمایا ہے بجا ہے اور صادق آتا ہے:

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

یہ تو معین الدولہ جیسے شہباز کا کمال ہے کہ انھوں نے صفی جیسے آہوئے رم خوردہ کو رام کیا اور اسے دام رکھا۔ کئی امیر حضرت صفی کے گھر کے چکر لگاتے تھے۔ ایسے طوطیٔ زمزمہ پرداز کو اپنے دربار کے پنجرے میں بند کرنے کے لیے انھیں لالچ دیتے تھے مگر وہ اپنے آزادہ و خود بیں تھے کہ از خود کسی دروازے پر نہیں گئے۔ معین الدولہ ان سے ملنے کی آرزو رکھتے تھے۔ کئی بار بلوایا آخرکار پتنگوں کے جلسے سے اٹھا کر انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ معین الدولہ کے دربار سے حضرت صفی کے طویل عرصہ تک وابستہ رہنے کا راز یہ ہے کہ نواب صاحب اہلِ جاہ کی خودداری کا نباہنا جانتے تھے۔ حسبِ طلب کے بڑے ادا شناس تھے۔ حضرت صفی کے لیے ان کے دل میں بڑی قدر تھی اور جو برتاؤ ہوتا تھا عزت کے ساتھ ہوتا تھا خیرات کا انداز نہ تھا جیسا کہ ان کا منصب تھا تو کیوں نہ وہ نواب معین الدولہ کے گن گاتے اور ان کے لیے وظیفہ دعا گوئی کا حق ادا کرتے

جو دوست ہیں وہ خوش رہیں ہر وقت اے صفی　دشمن رہیں ذلیل ہمارے نواب کے

# راشد مفتی

○

نشاں افق پہ ہویدا ہوئے سحر والے
اب اپنی کھوج میں نکلیں گے اس نگر والے

ہزار پھول کھلائے وہ ریگ زاروں میں
شجر تو اس نے جلائے ہیں رہ گزر والے

مکیں تو خیر ہوئے تھے سو نہیں باقی
مکان کیا ہوئے آخر وہ بام و در والے

اگرچہ صلح ہے مدت سے خیر و شر میں مگر
بضد دست و گریباں ہیں خیر و شر والے

ہوس نہیں ہے دلوں میں اگر کلاہوں کی
تو کس لیے ہیں یہ جھگڑے کلاہ و سر والے

نظر کبھی جو شکستہ پروں پہ جاتی ہے
تو پر سمیٹنے لگتے ہیں بال و پر والے

نقوش چھوڑتا جاتا ہوں اپنے قدموں کے
مری تلاش میں آئیں گے جیسے گھر والے

ہمیں کو گھر سے نکلنے کا ڈر نہ تھا راشد
لے ہم، مرحلے درپیش تھے سفر والے

○

سلگتے دشت میں ہے آج دستیاب تو کیا
رہے گا سر پہ سدا سایۂ سحاب تو کیا

یہی بہت ہے جو کچھ روز ساتھ دے جائیں
حقیقتوں میں ڈھلیں گے ہمارے خواب تو کیا

مزہ تو جب تھا اُفق سے اُتار کر لاتے
زمیں سے تم نے اُبھارا ابھی آفتاب تو کیا

چمکتی دھوپ کے نیزے گڑے ہیں جسموں میں
شفق ہوئی بھی نگاہوں پہ بے نقاب تو کیا

جو بے حسی تھی مزاجوں میں سو ابھی تک ہے
ہوئے ہیں لوگ خجالت سے آب آب تو کیا

ہر ایک سطر مرے تجربوں کے ہے برعکس
کھلی ہوئی ہے مرے سامنے کتاب تو کیا

کبھی جو ہم نے ترے غم سے بھاگنا چاہا
تو ساتھ دے نہ سکا زہر بھی، شراب تو کیا

دلوں کی آگ تو راشد ابھی سلامت ہے
فسانہ ہو گئی چہروں کی آب و تاب تو کیا

# حامدی کاشمیری

یقیں کا سلسلہ اوہام تک ہے
ترا جلوہ گلی کے بام تک ہے

دہن وا کردہ قبریں منتظر ہیں
یہ ہنگامہ ورودِ شام تک ہے

بڑھ آئیں گے گلو تک نوکِ خنجر
ابھی تو بات بس الزام تک ہے

سلائے گی ہوا پھر فرشِ گل پر
سفر تو وادیٔ بے نام تک ہے

ڈروں کیا تجھ سے میں اے جادۂ شب
نظر میری ترے انجام تک ہے

فضائے دل کی یخ بستہ خموشی
نزولِ شعلۂ الہام تک ہے

نگاہِ شوق کیوں مائل نہیں ہے
کوئی دیوار اب حائل نہیں ہے

سحر دم ہی گھروں سے چل پڑے ہیں
کوئی جادہ، کوئی منزل نہیں ہے

ہے مشکل ٹوٹنا طوقِ گلو کا
نظر شعلہ ہو تو مشکل نہیں ہے

مری خاطر ہیں گریاں شام سے سب
مرے دکھ میں کوئی شامل نہیں ہے

سبھی کی نظریں ہیں کشتی کے رخ پر
مگر اس بحر کا ساحل نہیں ہے

کریں کس سے توقع منصفی کی
کوئی ایسا ہے جو قاتل نہیں ہے

# اعتماد صدیقی

ہر شخص کو خود اپنی ہی پرچھائیں کا ڈر ہے
یہ شہر تمنا نہیں آسیب نگر ہے
کب جانے مرے نام کا اُترے گا صحیفہ
اب تک تو وہی سلسلۂ شام و سحر ہے
اب کوئی دریچے سے نہیں جھانکنے والا
ہر شخص کو اس شہر میں پتھراؤ کا ڈر ہے
بس میری سلگتی ہوئی تنہائی ہے گھر میں
دیوار پہ سایا ہے نہ آنگن میں شجر ہے
کیوں آبلہ پائی نے قدم روک لیے ہیں
یہ آبلہ پائی نہیں ترغیب سفر ہے
پہچان نہیں پاتے در و بام کی مجھ کو
نقشے پہ تو لکھا ہے کہ یہ میرا ہی گھر ہے

اک شکستہ صدائے شب میں ہوں
نوحۂ شہرِ بے طرب میں ہوں
مجھ سے ملتی ہیں سب جڑیں غم کی
کون کہتا ہے بے نسب میں ہوں
ایک چڑھتا ہوا سا دن تو ہے
ایک ڈھلتی ہوئی سی شب میں ہوں
صاف گوئی مری علامت ہے
اپنی رسوائی کا سبب میں ہوں
تیرہ بختوں میں نام ہے میرا
یوں سمجھ لو امیرِ شب میں ہوں

# غزلیں

**ایم اے کے ماہر**

میں یوں تو اپنے شہر میں ہوں اپنے گھر میں ہوں
جی چاہتا ہے میرا مسلسل سفر میں ہوں

ٹلتا نہیں جو سر سے وہ سیلابِ غم بلا
غرقاب جیسے اپنی ہی چشمِ تر میں ہوں

ہر صبح مجھ کو شوق کا موسم نیا لگا !
ہر شام حسنِ دوست کے حیرت نگر میں ہوں

میں مدعا ہی بھول گیا ہوں اٹھا کے ہاتھ
دنیا یہ کہہ رہی ہے دعائے سحر میں ہوں

قرب ہے نظر سے دور، مقدر کی بات ہے
کچھ کم نہیں ہے یہ بھی کہ تیری نظر میں ہوں

قسمت چمک اٹھی جو ترا قرب مل گیا
اک ذرۂ حقیر ہوں لیکن گہر میں ہوں

قیدِ قلم سے نام نہ پہنچا مرا کہاں !
میں گوشہ گیر ہو کے بھی ماہر سفر میں ہوں

**بشیر فاروقی**

میں جتنی دیر تری یاد میں اداس رہا
بس اتنی دیر تو دل میرا میرے پاس رہا

یہ تشنگی تھی کہ جلتا رہا بدن سارا
تمام عمر وہ ہونٹوں پہ ہو کے پیاس رہا

مجھے یہ خوف تھا وہ کچھ سوال کر دے گا
میں دیکھ کر بھی اسے اس سے ناشناس رہا

گلے لگا کے سمندر حسین کشتی کو !
سکوتِ تیرہ فضائی میں بدحواس رہا

زمانہ سیکھ سکے شاید سبق محبت کا
یہ چاند اس لیے تاروں کے آس پاس رہا

مرے لبوں پہ شرافت ہے اگلے وقتوں کی
تکلفات میں خالی مرا گلاس رہا

بشیر میں اسے کس طرح بیوفا کہہ دوں
نگاہ بن کے جو اس دل کے آس پاس رہا

محمد طارق

# بے ساعت گھڑی

دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کے ایک سے بارہ تک اعداد میں میری زندگی منقسم ہو چکی ہے۔ گھڑی کی سوئیاں میری زندگی کو حسب معمول بانٹتی رہتی ہیں . . .

علی الصبح چھ بجے ٹن ٹن کی آواز میرے کانوں میں پہنچتے ہی میری آنکھوں کے پٹ کھل جاتے ہیں اور کبھی میری آنکھ نہیں کھلتی تو میری بیوی مجھے جگا دیتی ہے۔ لیکن ایسا موقع شاذ ہی آیا ہوا یہ موقع بھی کبھی کبھی ہی باقی آیا ہے کہ مجھے اپنی بیوی کو جگانا پڑا ہو۔ وہ بھی میری طرح صبح چھ بجے اُٹھنے کی عادی ہو گئی ہے۔ ہاں، جب وہ نئی نویلی تھی تب کچھ دنوں تک مجھے جگانا پڑا تھا . . . رفتہ رفتہ ماحول نے اُسے چھ بجے اُٹھنے کا عادی بنا دیا ہے۔

کڑاکے کی سردی ہو یا موسم گرما میں میٹھی میٹھی تھپکیاں دے کر سلانے والی صبح کی ہوائیں یا برسات کی خوشگوار صبحیں۔ کبھی اس نے جاگنے پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا اور کرے بھی کیوں؟ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ پڑھی لکھی سمجھ دار ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میرے دیر سے جاگنے پر کیا کیا ہو سکتا ہے۔

دفتر دیر سے پہنچوں گا، ڈیوٹی پر لیٹ پہنچنے کے جرم میں میری ملازمت پر آنچ آ سکتی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دن کی تنخواہ کٹ جائے اور ایک دن کی تنخواہ کم ملنے پر کفایت شعاری سے بنائے ہوئے ماہانہ بجٹ میں یقیناً گڑبڑ ہو جائے گی۔

. . . ہمیشہ کا یہ معمول رہا تو ملازمت بھی جا سکتی ہے اور وہ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ ملازمت ہے تو تنخواہ ہے تنخواہ ہے تو گھر ہے (جس کا ماہوار کرایہ ستر روپیہ ہے) گھر کے چولہے میں آگ

ہے۔ بدن پر صاف ستھرا اور عمدہ قسم کا لباس ہے۔ کچھ ضرورتوں کی تکمیل ہے اور سینے کے کہستانوں میں کچھ سر اُٹھاتی ہوئی آرزوؤں کو سلانے کے لیے میٹھی میٹھی تھپکیاں ... سو جاؤ! ابھی تنخواہ کم ہے اور مہنگائی زیادہ، ابھی سو جاؤ، آنے والے ماہ تک میری پیاری کومل آرزوؤ!!

پہلے پہل جب میری بیوی نے اپنی آرزوؤں کی فہرست میرے سامنے پیش کی تھی تب میں نے اسے ایسا ہی سمجھایا تھا جس طرح میں برسوں سے اپنے دل کو سمجھاتا آرہا ہوں اور میری بیوی سمجھ گئی ہے۔ کیوں کہ وہ بھی ایک معمولی کلرک ہی کی بیٹی ہے۔

صبح اُٹھتے ہی وہ میرے لیے چائے بناتی ہے ... اور میں "شیو" کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔

— میں "شیو" روز کرتا ہوں اس لیے کہ "شیو" نہ کرنے سے مجھے اپنا چہرہ اچھا نہیں لگتا۔ صاف ستھرا، اُجلا اُجلا ....

— میں خود کو دکھانے کے لیے شیو کرتا ہوں ؟!

نہیں —، یہ فریب ہے جو میں خود کو دے رہا ہوں، کہیں یہ بھی سچ ہے کہ آدمی خود اپنے لیے بنے سنورے ....

اچھا لباس پہننا، شیو کرنا، بال سلیقے سے سنوارنا، اپ ٹو ڈیٹ رہنا، عورتوں کا بناؤ سنگھار کرنا۔ یہ سب اپنے لیے نہیں ہوتا۔ یہ انسانی فطرت ہے اُس کا جذبۂ خود نمائی، اس طرح وہ اپنے جذبے کی تسکین کر لیتا ہے۔ پھر میں خود کس لیے روز شیو کرتا ہوں۔

— مجھے ایک سچ چھپانے کے لیے کتنی پیچ در پیچ باتیں کرنی پڑ رہی ہیں۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ میرے دفتر میں ایک لیڈی کلرک ہے "انیتا"۔

میں انیتا کو جنت کی حور نہیں کہوں گا، کیوں کہ وہ حور نہیں ہے۔ میں اُسے پری پیکر بھی نہیں کہوں گا کیوں کہ میں نے پری نہیں دیکھی۔ نہ ہی وہ میرے خوابوں کی ملکہ ہے۔ کیوں کہ وہ کبھی میرے خوابوں میں نہیں آئی۔ میرے خوابوں میں تو کبھی میری بیوی بھی نہیں آتی۔ کیوں کہ خوابوں میں وہی چیزیں آتی ہیں جس کا حاصل کرنا زیادہ محال ہوتا ہے۔

میرے لیے سب سے مشکل ہے پیسہ کمانا۔ اس لیے میرے خوابوں میں صرف نوٹیں آتی

بیٹا، پیسہ آیا ہے۔ جو خوش حال زندگی گزارنے کے لیے بے حد لازمی اور ضروری ہے۔

—— انیتا ایک عام شکل و صورت کی گوری چِٹی والی لڑکی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ہی اس کا ٹیبل ہے۔ ایک بار میں پندرہ منٹ لیٹ جاگا تھا اس لیے میں نے "شیو" نہیں کیا تھا۔ بال سلیقے سے نہیں سنوارے تھے اور آفس چلا آیا تھا وہ مجھے دیکھ کر حسبِ معمول مسکرائی اور پھر میرے قریب آکر کہنے لگی تھی۔

"کیوں ——' آج آئینہ نہیں دیکھا ؟!"

"نہیں —— آج آئینے نے مجھے دیکھ لیا ہے۔"

وہ میری بات سمجھی تھی یا نہیں، مَیں نہیں جانتا۔ ہاں اس کے لبوں سے صرف یہ جملہ نکلا "واہ ! خوب کہتے ہیں آپ بھی !"

تب سے مَیں بلاناغہ "شیو" بنا کر آفس جانے لگا ہوں۔ لیکن میں یہ یقین سے کہتا ہوں انیتا سے میرا کوئی سمبندھ نہیں، کوئی ایسا رشتہ نہیں جس سے میرا کردار داغ دار ہو ...

شیو کرنے کے بعد میری بیوی مجھے چائے پیش کرتی ہے۔ چائے پی کر میں غسل کرتا، تب تک وہ ناشتہ تیار کر لیتی ہے اور ساتھ کے لیے "ٹفن" بھی۔

مَیں غسل کر کے آتا ہوں اور جلدی جلدی ناشتہ کرتا ہوں۔ دفتر جانے کے لیے جو کپڑے استری کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ جسے میری بیوی کھونٹی سے نکال کر اپنے ہاتھوں سے مجھے دیتی ہے پہنتا ہوں۔ تب تک پورے سات بج چکے ہوتے ہیں۔

—— پھر میرے پاس اتنا وقت نہیں رہتا کہ مَیں اپنے سوئے ہوئے منّے کو جگاؤں اور اُس سے کہوں "اچھا بیٹا ! اب ہم آفس جا رہے ہیں۔ تو دس بجے رات تک آئیں گے، تم جاگتے رہنا" اس لیے میں اُس کا ایک خوش بوسہ لیتا ہوں اور اپنی بیوی کو "اچھا خدا حافظ" کہہ کر "بیگ" لے کر آفس کے لیے نکل پڑتا ہوں۔ اس سے زیادہ کہنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔

میری بیوی دروازے تک مجھے چھوڑنے آتی ہے اور جب تک مَیں اُس کی آنکھوں۔

ں نہیں ہو جاتا وہ چوکھٹ پر کھڑی مجھے دیکھتی رہتی ہے۔ میں بھی پلٹ پلٹ کر اُسے دیکھتا
ں جاتا ہے واپس پلٹ کر جاؤں اور اُسے اپنی بانہوں میں دبوچ لوں اور کبھی جی یہ بھی
ہے کہ دروازے میں کھڑی ہوئی اپنی بیوی کو دیکھتا رہوں ... دیکھتا رہوں ... اور
یعت بھی چاہتی ہے کہ اُس سے کہہ دوں " دروازے میں مجھے دیکھتے ہوئے کھڑی نہ رہا کرو،
یرے پیر پکڑ لیتی ہے۔"

مگر میں نے اُسے کبھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ کیوں کہ اُس کے اِس فعل پر کہیں
دل کے گوشے میں انوکھی مسرت اپنی پلکیں جھپکاتی ہیں...

میں اس مسرت کی لذت اُس وقت تک محسوس کرتا ہوں جب تک کہ فٹ پاتھ پر
ے بھاگتے، ہانپتے ہوئے، بے قرار مشینوں کی طرح مصروف انسانوں کے بے پناہ ہجوم
ں مل جاتا۔

میں بھی انسانوں کی بھیڑ کے ساتھ تیز تیز چلتا ہوں، سر جھکائے اپنی ہی فکر میں ملوث۔
پہنچنا ہے، ٹائم کم ہے اور پلیٹ فارم دور ہے۔

یرے قدم تیزی سے تیز تر ہوتے جاتے ہیں، کون پاس سے گزر رہا ہے، کون کس کو دھکا
ہا ہے، کون کس کو مار رہا ہے، کون کس کو گالی بک رہا ہے... کس کے پیٹ میں
نپ دیا گیا۔ کون مدد مدد کے لیے پکار رہا ہے، کون کار سے کچل گیا۔ کس نے بس کے
ں دم توڑ دیا۔ ٹرین سے کس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کسی کو خبر نہیں۔ کوئی کسی
کا ہمدرد نہیں۔ دیکھنے تک کے لیے کوئی تیار نہیں — کسی کے پاس اتنا فضول وقت
ب اپنی اپنی فکر میں ملوث چلے جا رہے ہیں۔ سر جھکائے، سر اٹھائے، بھاگتے ہوئے
ہانپتے ہوئے...

[illegible] بجے پہنچنا ہے، پلیٹ فارم دور ہے اور ٹرین چھوٹنے کا وقت قریب آ گیا

اُس کا مختصر سا جواب دے دیتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میرا مختصر سا جواب سُن کر وہ کبھی چڑ بھی جاتی ہے۔ مگر میں اُسے منا لیتا ہوں۔

——— عورت کی محبت، مرد کی محبت سے زیادہ گہری ہوتی ہے۔ وہ پیار میں شدّت چاہتی ہے۔ سمندر کی طوفانی لہروں کی سی شدّت، آبشاروں کی روانی کا سا زور۔ لیکن وقت نے میرے جذبات سے بہت کچھ نچوڑ لیا ہے۔ وہ میری اس مجبوری کو سمجھتے ہوئے اکثر مان جاتی ہے۔ اور...

کبھی اُس کے جذبات کی شدّت، نہیں میرے جذبات کا زور، نہیں ہم دونوں مل کر اُس فعل کا اعادہ کرتے ہیں جو انسان ہمیشہ سے کرتا چلا آرہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر وہ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے ہولے ہولے کنگھی کرنے لگتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اُس کی انگلیوں میں وہ پہلا سا تناؤ نہیں اور میرے دل کی دھڑکنوں کا طرز بھی معمول پر آگیا ہے۔

میں اپنے اندر ایک جمود سا محسوس کرتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔

ایک سناٹا

ایک ٹھہراؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوچتا ہوں، ہماری محبت، ہمارے پیار میں جو شدّت ہے، جو اپنائیت ہے، جو زور ہے، جو روانی ہے وہ صرف ایک ہی جذبے کے زیر اثر تو نہیں۔ ۔ ۔ ۔

وہ جانے کیا سوچتے ہوئے میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے ہولے ہولے کنگھی کرتی رہتی ہے۔

——— اکثر میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں جیسے اس کی اُنگلیاں میرے ذہن کی اُلجھنوں کو سلجھا رہی ہیں۔ ۔ ۔

——— پھر نیند سے میری پلکیں بوجھل ہونے لگتی ہیں، لیکن میں اپنے منّے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جیسے نیند نے اپنی پُرسکون آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔

——— میری بیوی بالعموم مجھے کہتی ہے "راجہ! ہمیشہ تمھیں یاد کرتے کرتے سو جاتا ہے، ابّو کب آئیں گے، مجھے کہانی کب سنائیں گے، صرف ایک ہی روز آتے ہیں ابّو!!"

اس کا سوال کتنا درست ہے اس کی حد تک بالکل بجا۔ ہفتے میں وہ ایک بار مجھے دیکھتا

گھڑی دیکھتا ہوں . . .

— کبھی ساڑھے سات بجتے ہیں

کبھی سات بج کر چالیس منٹ

ٹرین کے آنے کا ٹائم پونے آٹھ بجے کا ہے۔ لیکن اکثر ٹرین پونے آٹھ بجے نہیں آتی۔ کبھی آٹھ بجے آتی ہے۔ کبھی سوا آٹھ بجے۔ کبھی تو نو بجا بج جاتے ہیں۔

ٹرین کبھی بھی آئے۔ مگر ہمیں تو وقت سے پہلے ہی ٹرین کا انتظار کرنا ضروری ہے نا۔ کیونکہ ہم ٹرین کے غلام ہو چکے ہیں، ٹرین ہماری غلام نہیں ہوتی۔

حسب معمول دھڑ دھڑاتی ہوئی بجلی کی دیو قامت ٹرین پٹری پر پھیل جاتی ہے —— مسافروں کا اژدحام بے تحاشا ٹرین کی طرف بڑھتا ہے . . . میں بھی افتاں و خیزاں ٹرین میں ایک منٹ کے اندر اندر سوار ہو جاتا ہوں کیونکہ ٹرین ایک منٹ کے لیے ہی رکتی ہے۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے دفتر شروع ہوتا ہے اور میں قبل از وقت دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ آٹھ گھنٹے فائلوں میں سر کھپانے کے بعد واپس اپنے گھر روانہ ہو جاتا ہوں۔ دوڑتے بھاگتے، ایک لمحہ بھی فارغ کئے بغیر . . . .

گھر تک پہنچنے میں میری حالت اس مریل بیل کی طرح ہو جاتی ہے جسے قصائی مذبح خانے میں ڈھکیل ڈھکیل کر لے جاتا ہے . . . .

—— میرا منا ہمیشہ سو چکا ہوتا ہے۔ میری بیوی بغیر کھائے پیئے میرے انتظار میں جاگتی رہتی ہے۔ میں کپڑے بدلتا ہوں، منہ ہاتھ دھوتا ہوں تب تک وہ کھانا گرم کر لیتی ہے۔ پھر ہم دونوں مل کر کھانا کھاتے ہیں اور بستروں پر دراز ہو جاتے ہیں . . . .

—— کبھی میری بیوی میرے پیر دباتی ہے . . . . کبھی میرے الجھے ہوئے تیز رفتار زندگی کی گرد میں اٹے ہوئے بالوں کو اپنی لانبی مخروطی انگلیوں سے سنوارتی رہتی ہے۔ تکان سے میری آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگتی ہے۔ وہ کبھی کچھ پیار، محبت کی باتیں بھی کرتی ہیں۔ لیکن مجھے صاف سنائی نہیں دیتا۔ کانوں میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ کبھی کوئی بات سنائی دیتی ہے تو میں

ہے ___

میں اُسے کہانیاں سناتا ہوں۔ اُس سے باتیں کرتا ہوں وہ دن چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ باقی چھ روز تو میں اُسے سویا ہوا پاتا ہوں۔

ہر چھٹی کے دن میں اُس سے وعدہ کرتا ہوں "بیٹا میں کل تمھیں کہانی سنا دوں گا۔ بہت ساری باتیں کروں گا تم سے۔ بہت ساری باتیں بیٹا"

حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ کل ابھی نہیں آنے والا۔ وہ کل آئے گا۔۔ ضرور آئے گا وہ کل ...

---

میں اپنے اس کل کو پُرسکون بنانے کے لیے۔ اُس کل میں خوش حال رہنے کے لیے دوڑتا رہا ... اپنی اور اپنی بیوی اور بچے کی زندگی کی جائز ضرورتوں، خواہشوں کے لیے بھاگتا رہا ...

اس دوڑ دھوپ میں وقت گزرتا رہا ...

گزرتا رہا ... کبھی جیٹ کے پر لگا کر، تو کبھی کچھوے کی چال سے۔ بہرحال دن ہفتوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ عمر کا خزانہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔

برسوں بعد میری زندگی کی دہلیز پر دبے پاؤں وہ کل آیا۔

میرے چہرے پر جھریوں کا جال پھیل گیا تھا۔ ہڈیوں کا گودا پگھل پگھل کر زندگی کی موریوں میں بہہ چکا تھا۔ میرا بدن نحیف و کمزور ہو گیا تھا ___ اور زمانے نے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔

آج میرے پاس بہت سارا وقت تھا۔ فضول سا وقت، اپنے بیٹے سے باتیں کرنے کے لیے۔ اپنی زندگی سے جو کچھ سیکھا ہے وہ اُسے بتلانے کے لیے۔

لیکن اب میرے بیٹے کی زندگی گھڑی کے ایک سے بارہ تک اعداد میں منقسم ہو چکی ہے۔

Accession Number.
86090
Date 21.12.87

mber 1986

R. No. 10922/57
Regd. H/HD 134

# *The "SABRAS" Urdu Monthly*

Organ of "Idara-e-Adebiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500482 (A.P.)